

ادارہ
حامد علی خاں بی اے (علیگ)
اطہر پرویز ایم اے (علیگ)

سالانہ چندہ
... روپیہ
... آنے





۱۹۸۵ء گذر گیا، اور نیا سال ہمیشہ کی طرح بڑی اُمیدیں لے کر آیا۔ ہم سب اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور پیارے بہن بھائیوں کو سال نو کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ لیکن بھائی نیا سال مبارک اُسی وقت ہوتا ہے جب ہم سب اس سال اچھے اچھے کام کرنے کا عہد کریں۔ ہم یہ طے کریں کہ اس سال جماعت کی پڑھائی اور کھیل کود میں آگے بڑھیں گے۔ ساتھ ہی اپنے پیام تعلیم سے اور دلچسپی لیں گے۔ آپ نے پچھلے سال اپنے رسالے سے دلچسپی لی اور اس کو آگے بڑھانے میں ہاتھ بٹایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نمبر پچھلے نمبر سے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اگر آپ اس سال بھی یہ طے کریں کہ پیام تعلیم اور ترقی کرے گا، تو پھر بتائیے کہ کون آپ کو اس مقصد کے حاصل کرنے سے روک سکتا

ایران

محمد امین
استاد جامعہ ملیہ

اس کا رقبہ ۶٫۳۰٫۰۰۰ مربع میل اور آبادی ۱٫۵۰٫۰۰٫۰۰۰ ہے۔ لمبائی ۱۲۷۴ میل اور چوڑائی ۸۱۱ میل ہے۔

تاریخ و تمدن کے لحاظ سے ایران ایشیا کے قدیم ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جغرافیائی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت موجودہ دنیا میں اس لئے بڑھ گئی ہے کہ یہاں کے حالات اور وسائل زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ نہیں بدل سکے۔ اور ایران ایک پس ماندہ ملک ہو کر رہ گیا۔ پھر اس کی سرحد افغانستان، پاکستان، عراق، ترکی اور روس سے ملی ہوئی ہے اس لئے اس کا محل وقوع بہت اہم ہے۔ دنیا کی ہر بڑی طاقت یہاں کی سیاست اور اقتصادی مسائل میں ہمیشہ سے دلچسپی لیتی رہی ہے ایران کا کوئی بھی حصّہ کسی بڑے سمندر کی طرف نہیں کھلتا لیکن شمال کی جانب بحر کیسپین اور جنوب کی جانب خلیج فارس بہت حد تک اس کمی کو پوری کر دیتے ہیں۔

ایران کے شمالی حصّہ میں خراسان اور البرز کے مشہور پہاڑ ہیں۔ شمال مشرق اور مشرق کی طرف ہندوکش اور سلیمان نام کے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ مغرب میں خراسان کی پہاڑیاں جنوب اور جنوب مشرق میں بھی



فارس کی پہاڑیاں قائم ہیں۔ الغرض ایران ایک پہاڑی ملک ہے۔ آدھے سے زیادہ حصّہ میں پہاڑ اور پہاڑیاں جگہ بہ جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ باقی رقبہ میں سے صرف چوتھائی حصّہ زراعت کے لئے استعمال ہوتا ہے باقی سب کا سب یا تو ریتیلا ہے یا بنجر۔ ملک کا اندرونی حصّہ ریگستان ہے جس میں چھوٹے چھوٹے نخلستان پائے جاتے ہیں اور ایران کے بڑے بڑے قصبے اور شہر انھیں جگہوں پر واقع ہیں۔

ایران کی آب و ہوا گرمیوں میں بہت گرم اور سردیوں میں بہت سرد

ہے ۔ کنارے کنارے پر اونچے اونچے پہاڑ ہونے کی وجہ سے نم ہوائیں اندر نہیں جانے پاتیں اس لئے سوائے بحر کیسپین کے علاقہ کے کہیں بھی سالانہ بارش ۱۲ اور ۱۴ انچ سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ آب و ہوا کے لحاظ سے ایران کے تین حصے ہیں :

بحر کیسپین کا علاقہ ۔ اندرونی پلیٹو اور خلیج فارس کا علاقہ ۔

بحر کیسپین کے علاقہ میں بارش کچھ زیادہ یعنی ۳۰ اور ۵۰ انچ کے درمیان ہوتی ہے اس لئے یہاں پھل اور گیہوں کثرت سے پیدا ہوتا ہے ۔

اندرونی پلیٹو کا رقبہ ۱،۵۰،۰۰۰ مربع میل ہے ۔ سالانہ بارش یہاں ۶ انچ سے بھی کم ہوتی ہے اس لئے یہ سارا علاقہ بے کار اور بنجر ہے اور دنیا کے خشک ترین حصے میں شمار کیا جاتا ہے ۔ ہوائی جہاز سے نیچے دیکھو تو سارا ملک کالے کالے پہاڑوں کی ایک سنسان زمین معلوم ہوتی ہے، جہاں نہ دریا نظر آتے ہیں ، نہ درخت اور نہ کھیت ۔

خلیج فارس کا علاقہ گرم ہے ۔ بارش زیادہ نہیں ہوتی لیکن سمندر کے نزدیک ہونے کی وجہ سے ہواؤں میں نمی کافی رہتی ہے اور ملیریا بہت پھیلتا ہے ۔

ایران میں بہت سی معدنیات زمین کے اندر پوشیدہ ہیں ۔ یہاں کے وسائل میں کوئلہ ، لوہا ، تانبہ ، مینگنیز ، سونا ، چاندی ، سیسہ ، جستہ اور مٹی کا تیل بھی چیزیں شامل ہیں ۔ کوئلہ اور لوہا تھوڑا بہت نکالا جاتا ہے ورنہ باقی ساری دھاتیں ابھی محفوظ ہیں ۔ البتہ موجودہ حالات میں مٹی کا تیل سب سے زیادہ قیمتی ہے اور اسی کی بدولت آج ایران بین اقوامی سیاست کا ایک اکھاڑہ بن گیا ہے ۔ تیل دو حصوں میں پایا جاتا اور کثرت سے نکالا جاتا ہے ابادان اور کرمان شاہ ۔ ابادان جنوب مغرب کی طرف خلیج فارس کے کنارے واقع ہے ۔ کرمان شاہ مغربی حصہ میں ۔

ایران میں تیل کی پیداوار ۲۲٫۵۶۰۰۰ ۲ ٹن سالانہ ہے۔ اس کی مانگ دُنیا کے ہر ملک میں ہے۔ بین اقوامی کشمکش کی وجہ سے اس تیل کی اہمیت ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ پہلے پہل ایران میں انگریز تیل کی خاطر نہیں گئے تھے بلکہ ہندوستان سے روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو روکنے کے لئے ان لوگوں نے مورچہ قائم کیا تھا۔ بعد میں جب جنوبی ایران میں تیل کے چشمے دریافت ہوئے تو برطانیہ کو اپنا قدم جمانے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آگیا۔ وہاں ایک اینگلو ایران آئل کمپنی قائم کی گئی اور اس کمپنی نے تیل نکالنے، صاف کرنے اور باہر بھیجنے کی تمامتر ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس پیداوار سے اینگلو ایرانی آئل کمپنی کو بہت زیادہ نفع ہونے لگا اور سال بہ سال اس کی رقم بڑھتی رہی۔ ۱۹۴۹ء میں کمپنی کو ۶۲۰ لاکھ پونڈ نفع ہوا تھا جس میں سے برٹش گورنمنٹ کو مختلف ٹیکسوں کی شکل میں ۲۳۰ لاکھ پونڈ ملے تھے۔ اس کے برخلاف ایران کو بطور معاوضہ کے صرف ۹۰ لاکھ پونڈ ملے تھے۔ وقتاً فوقتاً جب حکومت ایران اور وہاں کے عوام احتجاج کرتے تو کمپنی صرف یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی کہ ہماری وجہ سے ۷۲ ہزار ایرانی ملازم ہیں اور حکومت کو ۹۰ لاکھ پونڈ کی سالانہ رقم مُفت ہاتھ آتی ہے۔ رفتہ رفتہ ایرانی مجلس کے نمائندوں اور عوام میں بیداری پھیلی اور جلد ہی ہر ایرانی یہ محسوس کرنے لگا کہ برطانیہ ایران اور اس کی دولت کو اپنی غرض اور نفع کے لئے استعمال کر رہا ہے۔

آنے والے خطرہ کو انگریزوں نے پہلے ہی بھانپ لیا چنانچہ دور اندیشی سے کام لے کر رضا شاہ پہلوی کے زمانہ میں انھوں نے حکومت ایران سے معاملہ طے کر لیا تھا اور ۶۰ سال تک تیل نکالنے کی اجارہ داری حاصل کر لی تھی۔ گویا ۱۹۹۳ء سے پہلے اس معاہدہ کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا اور اگر ایسا کیا گیا تو برٹش گورنمنٹ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے سامنے مسائل کو پیش کرے گی۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو رضا شاہ پہلوی تخت سے اُتار دیئے گئے

اس لیے کہ وہ جرمنی کے ہمدرد تھے۔ روس اور برطانیہ کی فوجوں نے شمالی اور جنوبی حصّوں پر قبضہ کر لیا اور اینگلو ایرانی آئل کمپنی حسب دستور تیل کے چشموں پر غالب رہی دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد برطانوی اور امریکی سامراج نے اینگلو امریکن بلاک میں شامل کرنے پر بہت زور دیا۔ ایران کے نئے شاہ امریکہ گئے اور صدر ٹرومین نے ایران کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کے لئے اڑھائی کروڑ ڈالر کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ حکومت برطانیہ نے بڑھتے ہوئے خطرہ کو ٹالنے کے لئے کمپنی سے معاوضہ کی شرح بڑھانے کے لئے کہا لیکن اس دوران میں ایران کے عوام بیدار ہو چکے تھے اور اپنے اور اپنے ملک کے فائدے کی خاطر انگریزوں کے دشمن ہو چکے تھے۔ جرنیل علی رزم آرا جب ایران کے وزیر اعظم بنے تو اکتوبر ۱۹۵۰ء میں انھوں نے کمپنی سے نیا معاہدہ کرنا چاہا لیکن آئل کمیشن کی رپورٹ تیل کے سارے چشموں کو ایرانیوں کی ملکیت بنانے کی سفارش کر چکی تھی۔ اس لئے ان کی بات نہ سُنی گئی اور انگریزوں کے خلاف جذبات اس قدر بڑھ گئے کہ جرنیل علی رزم آرا کو قتل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر مصدق نئے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے کمپنی سے کسی قسم کا معاہدہ کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور تیل کی صنعت کو قومی ملکیت بنانے کا قانون پاس کرا لیا۔ اینگلو ایرانی آئیل کمپنی اور برطانیہ کی حکومت نے بہت شور مچایا اور یہ معاملہ انٹرنیشنل کورٹ کے سامنے پیش کیا لیکن حکومت ایران نے اس کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔

ایران کی سرزمین سے برطانیہ کے قدم اُکھڑتے دیکھ کر امریکہ کو بڑی پریشانی ہوئی اس لئے اس کے صدر نے ڈاکٹر مصدق پر زور دیا کہ برطانیہ سے جھگڑا چکانے کے لئے وہ امریکہ کے مشورہ کو مان لیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے مسٹر ایورل ہیری من ایران پہنچ گئے، جو صدر ٹرومین کے خاص نمائندے تھے۔ کافی طویل گفت و شنید کے

بقیہ صفحہ ۲۹ پر



سیّد منیر الحسن

مسکراہٹ

کسی بڑے شہر کی بات ہے۔ سردی کا موسم تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے چاروں طرف کہر اور دُھند کی حکومت تھی کوئی تیسرے پہر کا وقت تھا۔ بارش بھی ہو چکی تھی کہ اتنے میں میں نے سات آٹھ گاڑیاں بچوں سے بھری دیکھیں۔ یہ بچے سویرے سویرے سیر کرنے اور کھیلنے کودنے گئے تھے مگر اس بارش نے ان کی سیر کا مزہ کرکرا کر دیا تھا اور ان کو وقت سے پہلے ہی واپس لوٹنا پڑا تھا۔ کچھ لڑکے اُداس تھے اور کچھ چونچال۔ لیکن بے وقت کی بارش سے کڑھ ضرور رہے تھے۔

پھر بھی سب کے سب اپنے اس دن کو ہنس بول کر پورا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوئی گا رہا تھا کوئی ہنس رہا تھا اور کوئی آنے جانے والوں کی طرف شرارت بھرے اشارے کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اُن سب کے چہروں پر ہنسی کھیلنے لگتی تھی۔ اگر کوئی زیادہ اُداس ہوتا تو دوسرا اُسے اپنے گُدگُدی سے خوش کر دیتا۔ کام کاج میں لگے ہوئے لوگ ان کی کھلکھلاہٹ سنتے تو وہ

بھی ہنسنے لگتے ۔ اُس وقت انھیں ایسا معلوم ہوتا کہ گویا آسمان کی کالی گھٹا کچھ کم گہری ہو گئی ہے۔

اسی طرح ہنستے بولتے خوش گپیاں کرتے چلے جا رہے تھے کہ اتنے میں اُن کے ساتھیوں میں سے ایک نے کچھ کہنا شروع کیا تو سب اُس کی بات کان لگا کر سننے لگے۔ اُس نے یوں کہنا شروع کیا۔

"خراسان میں ایک شہزادہ تھا اُس کا نام تھا عبد اللہ۔ خوب ٹھاٹھ کی تھی اس کی زندگی۔ ایک بار جب وہ لڑائی کے میدان میں گیا تو ں کے کھانے پینے کے سامان کو لے کر تین سو اونٹ اس کے ساتھ گئے مت کا ہیٹا تھا۔ دشمن نے اسے قید کر لیا۔ لیکن اُس سے کیا؟ اُس ، بھوک تو مٹی نہیں۔ اُس نے پاس کھڑے ہوئے باورچی سے جو ایک چھا آدمی تھا کہا۔" آج کچھ کھلاؤ گے نہیں؟"

اُس بے چارے کے پاس صرف گوشت کا ایک ٹکڑا باقی بچا تھا۔ س نے ہانڈی میں اُبلنے کے لئے چڑھا دیا اور اُس کو مزیدار بنانے کے لئے کچھ لینے چلا گیا۔ اتنے میں وہیں سے ایک کتّا گذرا۔ جب اُس کتّے کو گوشت کی خوشبو آئی تو وہ اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر ٹکریں ارنے لگا۔ اتنے میں اس کی نظر چولھے پر چڑھی ہانڈی پر پڑی اُس نے سوچا ہو نہو بس گوشت اسی میں ہے اُس نے جلدی سے اپنا مُنہ ڈالا ہی تو دیا۔ مگر بھاپ کی گرمی سے گھبرا کر وہ کچھ اس طرح پیچھے ہٹا کہ اُس کا سر اُس ہانڈی میں پھنس گیا پھر تو وہ اتنا گھبرایا کہ بس پوچھئے نہیں ور اسی گھبراہٹ میں وہ ہانڈی سمیت وہاں سے بُری طرح بھاگا۔

عبداللہ نے جب یہ دیکھا تو وہ خوب زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔

(اس پر سب لڑکے بھی ہنسنے لگے) ایک افسر جو اس کی چوکیداری کر رہا تھا کہنے لگا "یہ ہنسی کیسی؟ اس مصیبت کے وقت جب کہ تم قید خانے میں ہو ہنس رہے ہو!" عبد اللہ نے بھاگتے ہوئے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آج صبح سویرے میرے کھانے کا سامان ڈھو لے جانے کے لئے تین سو اونٹوں کی ضرورت پڑی تھی مگر اب اس کے لئے ایک کتا ہی کافی ہوگیا ہے۔"

یہاں تک کہانی سنا چکنے کے بعد لڑکے نے کہا "عبد اللہ کو خوش رہنے میں مزا آتا تھا لیکن ایک بات ہے دوسروں کو خوش رکھنے کی وہ کوئی کوشش نہیں کرتا تھا پھر بھی ہمیں اس کی اس ہمت کی داد تو دینی ہی پڑے گی کہ وہ خود کتنا خوش مزاج تھا۔ اگر کوئی اتنی مصیبت کے وقت خوش رہ سکتا ہے تو کیا ہم لوگ صرف اس غم میں کہ آج کھیلنے کو نہ ملا منہ پر ایک مسکراہٹ بھی نہیں لا سکتے" سب نے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "سچ ہے بھائی سچ ہے۔"



ان قہقہوں کی گونج میں ایک دوسرے لڑکے نے کہا کہ اچھا ایک اور کہانی سنیے

فارس دیش میں ایک عورت تھی جو شہد بیچنے کا روزگار کرتی تھی۔ اس کی بول چال کا ڈھنگ بڑا لبھانے والا تھا۔ اس کی دکان کے چاروں طرف خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ شہد کی جگہ زہر بھی بیچنے لگتی تو لوگ اسے بھی شہد سمجھ کر خرید لیتے۔

ایک سخت مزاج آدمی نے جب یہ دیکھا کہ ادھر یہ عورت تو اس روزگار اور اس کاروبار میں بہت فائدہ اٹھا رہی ہے تو پھر اس نے سوچا کہ میں بھی کیوں نہ ایک ایسا ہی خوانچہ یا دوکان کھول لوں



خوب خوب نفع ہوگا اور پھر بڑے مزے آئیں گے۔ اس آدمی کے پاس پیسوں کی تو کچھ کمی تھی نہیں۔ دو ایک روز کی محنت کے بعد شہد کی دوکان اس نے کھول لی۔ لیکن شہد کے سجے سجائے برتنوں کے پیچھے اس کا اپنا مزاج سخت کا سخت ہی بنا رہا۔ جب بھی کوئی خریدار اس آدمی کی دوکان پر شہد خریدنے کے لئے آتا تو وہ اپنی ڈراؤنی اور ٹیڑھی نظروں سے اس طرح گھورتا اور دیکھتا کہ لوگ اس کی چیز کو چھوڑ آگے بڑھ جاتے۔ اور تو اور مکھیاں بھی اس کے شہد کے پاس پھٹکنے کی ہمت نہیں کرتی تھیں۔ شام ہوتی اس کے ہاتھ خالی کے خالی ہی رہ جاتے۔ ایک دن ایک راہگیر عورت اس آدمی کو دیکھ کر اپنے بھائی سے کہنے لگی —

"کڑوا بول یا کڑوی بات شہد جیسی میٹھی چیز کو بھی کڑوا بنا دیتی ہے۔"

اتنی کہانی سنا چکنے کے بعد لڑکے نے کہا اب سوال یہ ہے کہ وہ عورت

ایک تھے نجومی



آپ نے نجومیوں کا ذکر تو ضرور سنا ہوگا۔ وہی نجومی جو ستاروں کا حال جانتے ہیں اور اس کی مدد سے دنیا بھر کی تمام باتیں بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آیئے آج ہم آپ کو ایسے ہی ایک نجومی صاحب کا حال سنائیں۔ یہ بھی ستاروں کی باتیں کرتے تھے۔ دِن رات اُن کے چکر میں رہا کرتے تھے۔ جہاں کوئی ستارا دیکھا اس کے بارے میں بتانے لگے۔ ایک روز یہ نجومی صاحب کہیں جارہے تھے۔ راستے میں کہیں کھڈ تھے تو کہیں گڑھے۔ لیکن نجومی صاحب زمین دیکھ کر چلتے تو معلوم ہوتا وہ تو آسمان کے تارے دیکھتے ہوئے، چلے جارہے تھے۔ آخر کو نجومی جو تھے۔ ایک مرتبہ جو سامنے ایک گڑھا آیا تو دھڑام سے گڑھے میں جا پڑے۔ گڑھے میں بھرا تھا پانی۔ کپڑے تمام کیچڑ میں لت پت ہوگئے۔

اُن کے پیچھے ایک اور مسافر آرہا تھا۔ وہ دیکھ رہا
سر اٹھائے ستاروں کو دیکھتے ہوئے اس کے خیال میں
ہیں۔ اس نے کئی بار آواز بھی لگائی۔
"بھئی نجومی صاحب ذرا دیکھ کے"
مگر بھلا نجومی صاحب اتنی آسانی سے سننے والے۔
میں گر ہی تو گئے۔
اب اس مسافر نے اُن کو گڑھے میں سے نکالا "بھائی جان! ستاروں کو
چُپ چاپ اپنے راستے پر چلنے دو۔ تم اپنا راستہ دیکھ کر چلو — یہ
ستارے تم کو راستہ بتانے سے رہے۔ اُن پر بھروسہ کیا تو اسی طرح
گڑھے میں گروگے"
آخر نجومی صاحب اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔
آخر کہتے بھی تو کیا۔ اپنا راستہ دیکھ کر نہیں چلیں گے تو ستارے
کہیں گرنے سے بچا سکتے ہیں۔

اطہر پرویز



آپ کی لائبریری

پرتھوی ناتھ کول
ایم۔ایل۔ایس سی (دہلی) ڈی۔ایل۔ایس سی۔(بنارس)



آپ اسکول تو جاتے ہی ہیں۔ اسکول کے استاد صاحبان وقت کی پابندی اور اسکول کی حاضری پر کافی دباؤ ڈالتے ہیں۔ دوسرے رشتہ دار بھی اسکول جانے پر زور دیتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں؟ کیا یہ سب لوگ گھر سے غیر حاضر ہونے پر خوش ہوتے ہیں؟ کیا وہ آپ کے اسکول جانے کی تکلیف کو محسوس نہیں کرتے؟

لیکن اسکول جانا ہر ایک بچے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور نہ یہ کسی دوسرے شخص کے فائدے کے لئے ہے۔ یہ صرف آپ کے فائدے کے لئے ہے۔ آپ کو اسکول کا کام باقاعدگی کے ساتھ کرنے کو کہا جاتا ہے۔

اسکول جانے میں کیا فائدہ ہے؟ اس کا اب جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ عام طور پر اسکول کو اپنا نگہبان سمجھنے لگے ہیں اور آپ کی دماغی قوت آج ایسی نہیں ہے جو پچھلے سال تھی۔ ایک ایک جماعت پاس کرنے کے بعد دماغی قوت بڑھتی جاتی ہے اور آپ رفتہ رفتہ اس میں اضافہ کر رہے ہیں۔

لیکن کیا یہ دماغی طاقت صرف آپ کی جماعت کی پڑھائی سے ہو سکتی ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں! جماعت کی پڑھائی صرف امتحان پاس کرنا سکھاتی ہے۔ لیکن قابلیت بڑھانا بہت کم۔ بلکہ اچھی طرح امتحان پاس کرنے میں بھی صرف جماعت کی پڑھائی ہی کام نہیں دیتی۔ یہ پڑھائی اور کچھ ہے جس کو میں آپ کو بتانے کی کوشش کروں گا۔

جماعت کی پڑھائی درسی کتابوں سے ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جماعت کا کورس پورا کرنے کے لئے چند مخصوص کتابوں کی ضرورت ہے۔ امتحان انہیں سے لیا جائے گا اور پاس ہونے کے لئے یہ کافی ہیں۔ وہ یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ لڑکے اسکول میں اپنی دماغی قابلیت بڑھانے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور نہ خالص مصنوعی طور سے جماعتیں پاس کرنے کے لئے۔

مگر ایسے استاد صاحبان بھی ہوتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ درسی کتابیں آپ کے ذہنی مادّہ کو بڑھانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ جماعت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بھی یہ پوری نہیں ہیں اور صرف انھیں پر دار و مدار رکھنا دماغی طاقت کو محدود کر دینا ہے۔ وہ طرح طرح کی مثالیں دیتے ہیں اور جماعت کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے پر زور دیتے ہیں۔

یہ دوسری کتابیں کیا ہیں اور یہ کہاں سے مل سکتی ہیں؟ یہ سوال آپ مجھ سے کر سکتے ہیں۔ یہ کتابیں درسی کتابوں کے علاوہ ہوتی ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آپ شاید یہ سوال کریں گے کہ ان کتابوں کو حاصل کرنا ایک نہایت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ کیونکہ جماعت کی پڑھائی کے لئے دو چار کتابیں خریدنا ہی ایک معمّہ ہے ہر ایک کی مالی حالت خراب ہے۔ والدین امیر آدمی نہیں ہیں۔ گھر کا گزارہ آج کل کی مہنگائی کے زمانے میں مشکل

سے ہوتا ہے اور دوسری چیزیں خریدنے کے لئے کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے والدین کچھ درسی کتابیں خرید لیتے ہیں اور آپ کو پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ اس لئے باقی کتابیں جن کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ وہ کیسے خرید سکتے ہیں؟ — آپ کا سوال بالکل صحیح ہے: میں یہ سب حالت جانتا ہوں۔ آپ کی مشکلات سے آگاہ ہوں۔ لیکن یاد رکھئے ہر ایک مشکل کا کوئی حل بھی ہوتا ہے۔ شاید یہ سب کتابیں آپ کو بالکل مفت مل سکتی ہیں اور وہ بھی اسکول کے اندر۔

آپ تو حیران ہوگئے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ ایک دو درسی کتابیں جب مفت نہیں ملتیں تو اتنی کتابیں کیسے مفت مل سکتی ہیں اور وہ بھی اسکول کے اندر — میں پھر کہتا ہوں اور یقینی طور سے کہتا ہوں۔ ہاں یہ سب مل سکتی ہیں اور مفت مل سکتی ہیں۔



حیران ہونے کی بات نہیں۔ آپ اپنے اُستاد صاحبان سے ذکر کریئے کہ اسکول کی لائبریری کہاں ہے اور اس میں کون کونسی کتابیں ہیں وہ فوراً لائبریری کے کمرے میں لے جائیں گے۔

اور آپ کو وہ سب کتابیں دکھائیں گے جو مفت مل سکتی ہیں۔

لائبریری کیا ہے؟ یہ میں مختصر طور پر بتا دیتا ہوں۔ لائبریری کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ جن کتابوں کو ہر ایک پڑھنے والے کے پاس پہنچانا بہت ضروری ہے۔ اور اس کے علاوہ پڑھنے والے کو پڑھنے میں بھی امداد کرنی ہوتی ہے اگر یہ نہ ہو تو یہ لائبریری نہیں بلکہ ایک عجائب گھر ہے۔ لائبریری کو اُردو میں کتب خانہ اور ہندی میں پستکالیہ کہتے ہیں۔ ہر ایک اسکول کے ساتھ ایک لائبریری ہوتی ہے جس کو اسکول لائبریری کہتے ہیں۔ اس لائبریری کی کتابیں اسکول کے طالب علموں کے لئے ہوتی ہیں جو ان کو مفت ملتی ہیں۔

مفت؟ ہاں! مفت۔ لیکن آپ کہیں گے کہ اُستاد صاحبان اُن کو مفت نہیں دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ مفت دیں گے اور ضرور دیں گے لیکن پڑھنے کے لئے۔ کیونکہ کتابیں پڑھنے کے لئے ہیں، جمع کرنے کے لئے نہیں۔ ملکیت حاصل کرنے کے لئے نہیں اور ان کو ضائع کرنے کے لئے نہیں۔ پڑھنے کے لئے کوئی بھی کتاب مانگئے وہ کتاب مفت اور ضرور مفت ملے گی لیکن اس شرط پر کہ جب اس کو پڑھ لیا تو پھر دوسرے لڑکوں کے پڑھنے کے لئے واپس کرنی ہوگی۔ کیونکہ کتابیں ہر ایک شخص کے لئے ہیں۔ یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بن سکتیں۔ ان کو پڑھنے میں امیری اور غریبی کا امتیاز نہیں۔ چھوٹے اور بڑے کا فرق نہیں اور کم پڑھے لکھے اور زیادہ پڑھے لکھے کا سوال نہیں

اب تو آپ کو معلوم ہوگیا کہ کیا پڑھنا چاہئے؟ صرف درسی کتابوں کو ہی پڑھنا نہیں چاہئے بلکہ اسکول کی لائبریری میں جتنی بھی کتابیں ہیں اُن کو اسکول کے کسی خالی وقت میں بیٹھ کر یا گھر لے جا کر پڑھئے۔ یہ کتابیں آپ کے لئے ہیں۔ اور استاد تو آپ کو راستہ دکھانے کے لئے۔ اپنی دماغی قابلیت کو بڑھائیے۔



دماغی ورزش

سید محمد ذکی گلاؤٹھی

(۱)

ایک تیلی گھر سے کچھ تیل لیکر چلا جب وہ پہلے مزار پر پہنچا تو اس نے کہا کہ اگر میرا تیل دُگنا ہو جائے تو سیر بھر تیل مزار پر چڑھا دوں گا۔ تیل دُگنا ہوگیا۔ اس نے ایک سیر تیل مزار پر چڑھا دیا۔ اسی طرح وہ دوسرے مزار پر گیا اور یہی دعا کی۔ تیل پھر دگنا ہوگیا۔ اس نے ایک سیر تیل چڑھا دیا۔ اسی طرح تیسرے مزار پر اُس نے ایک سیر تیل چڑھا دیا مگر تیسرے مزار پر چڑھانے کے بعد اسکے پاس بالکل تیل نہیں بچا۔

اب بتلایئے وہ گھر سے کتنا تیل لیکر چلا تھا۔

(۲)

آپ اپنے دل میں کچھ روپئے سوچ لیجئے اور اتنے ہی اپنے کسی دوست کے اور ان روپیوں میں صرف دس روپئے میرے بھی جمع کر لیجئے اور کل کے نصف خیرات کر دیجئے اور جتنے روپئے آپ نے اپنے دوست سے لئے تھے اُن کو واپس کر دیجئے۔

اب بتلایئے آپ کے پاس کتنے روپئے بچے؟

ان کا جواب صفحہ ۲ پر دیکھئے۔



تمہارے پتاجی گھر میں ہیں؟
ستیش:- وہ باہر گئے ہوئے ہیں
کب واپس آئیں گے؟
ستیش:- میں ابھی اُن سے معلوم کرکے آتا ہوں۔



جیسے کو تیسا

اطہر پرویز

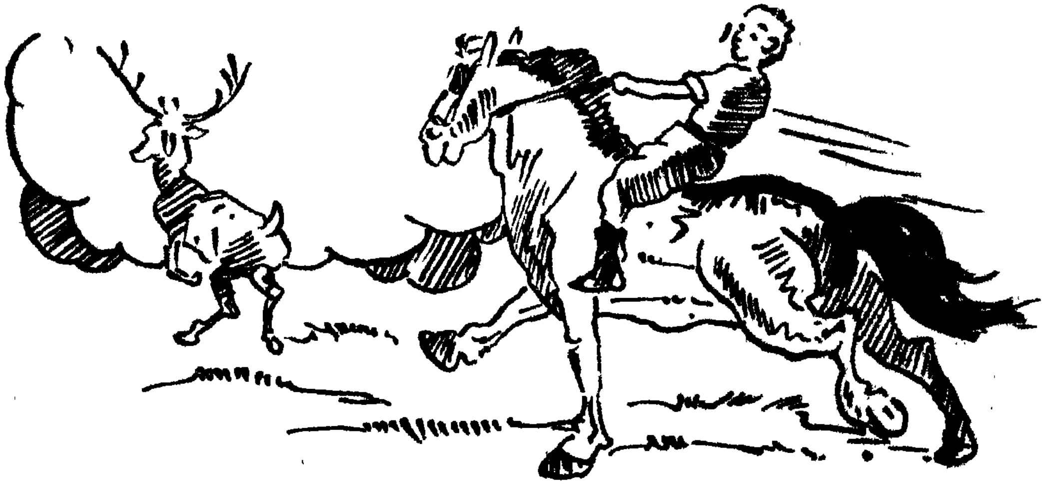
ایک تھے ٹٹو، صبح شام اپنی چراگاہ میں گھومتے پھرتے تھے۔ وہاں کون تھا جو اُنکو روکتا، آخر وہ چراگاہ اُن کی جو تھی۔ کسی گھوڑے کی ہمت نہ پڑتی تھی جو وہاں دم بھی مار لیتا۔ لیکن ایک بارا سنگھے نے جو یہ لمبی چوڑی چراگاہ دیکھی تو موقع پا ایک دن گھس ہی تو گیا۔ وا بھائی واہ کیا مزے کی گھاس تھی جس کے ابھی تک ٹٹو میاں تن تنہا مالک تھے [illegible] جو بارا سنگھے نے چراگاہ پر قبضہ کیا ہے تو ایسا کر جانے کا نام نہیں لیتے۔ بھلا ٹٹو میاں یہ بات کیسے برداشت کر لیتے کہ ان کے ہوتے ہوئے بارا سنگھا اس چراگاہ میں اس طرح گھومے۔ مگر کرتے تو کیا۔ بارا سنگھا اُن کو دیکھ کر چوکڑی بھرتا اور ٹٹو میاں اپنا سا منھ لے کر رہ جاتے۔

ایک دن ادھر سے ایک آدمی جا رہا تھا۔ ٹٹو میاں نے بڑا گڑگڑا کر کہا" ارے بھائی مسافر۔ میری مدد کرو۔ یہ سامنے جو بارا سنگھا چرتا نظر آرہا ہے۔ اس نے میری چراگاہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسے کسی طرح نکال دو۔

تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مانوں گا۔"

"ارے میاں ٹٹو تم بھی کیا بات کرتے ہو۔ اس بارا سنگھے کو نکالنا بھی کوئی بات ہے۔ بس ذرا تم مجھے اپنی پیٹھ پر چڑھنے کی اجازت دیدو پھر دیکھو میں کس طرح اس کا شکار کرتا ہوں۔"

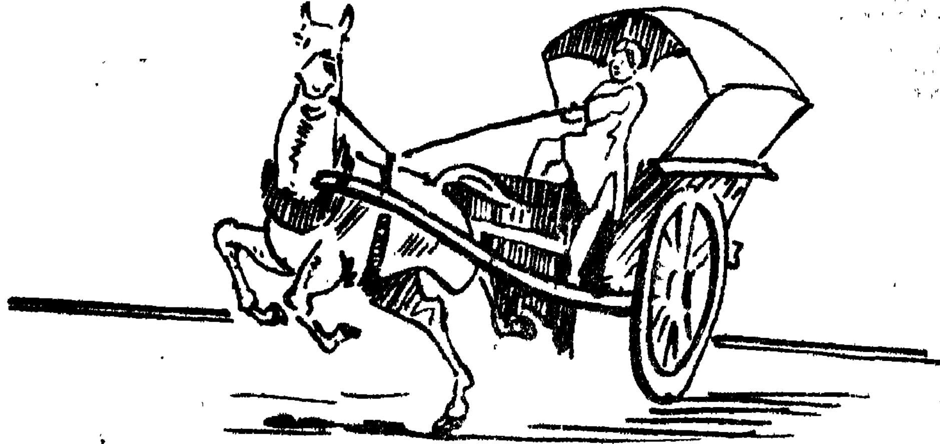
یہ سننا تھا کہ ٹٹو میاں فوراً خوشی خوشی تیار ہو گئے۔



بس پھر کیا تھا اس آدمی نے ٹٹو میاں کے منہ میں لگام لگائی اور ایڑھ لگا کر بارا سنگھے کے پیچھے ہو لیا۔ بارا سنگھے نے بہتیرا بھاگنے کی کوشش کی مگر آخر کتنا بھاگتا۔ ایک مرتبہ جو زد میں آیا تو اس آدمی نے اُسے گولی سے مار گرایا۔

اب تو ٹٹو میاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے آدمی کا بڑا شکریہ ادا کیا۔

اس آدمی نے جواب دیا۔" بھائی شکریئے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہارے بارے میں یہ معلوم نہ تھا کہ تم اتنے کام کے ہو۔ اب تو میں ہی تمہارا شکریہ ادا کردوں گا۔"



اس کے بعد سے آج تک ٹٹو میاں کے منھ سے لگام نہیں نکلی اور پیٹھ سے زین نہیں اُتری ۔ اور اب میاں ٹٹو کیے تانگے میں جُتتے پھرتے ہیں ـــ بارا سنگھے کا خاتمہ تو ہوا لیکن ٹٹو میاں نے تو جیسے ہمیشہ کے لئے اپنی آزادی کھودی۔

بقیہ مسکراہٹ صفحہ ۱۷ سے آگے

جو شہد بیچتی تھی تو کیا وہ صرف خریداروں کو لبھانے کے لئے ہی مسکراتی تھی ! کوئی کچھ کہے مگر مجھے تو یقین ہے کہ اس کی مسکراہٹ اس کی نیک طبیعت کا ایک حصہ بن گئی تھی ۔ اس پر سب لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے ۔ اتنے میں ان کی گاڑیاں اسکول پہنچ چکی تھیں ۔ سب بچے ان سے اُترے اور مسکراتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے ۔

بچوں کی کوشش



بے وقوف نوکر

ایک دفعہ تین دوست قیمتی کپڑے پہن کر ایک ہوٹل میں پہنچے اور ہوٹل والے سے کھانا لانے کو کہا۔ اس نے لباس سے سمجھا کہ یہ آدمی مالدار ہیں۔ اس لئے اس نے اچھے اچھے کھانے لاکر دیئے۔ دوستوں نے کھانا خوب مزے لے لے کر کھایا۔ جب ہوٹل والا بل لے کر آیا تو ان میں سے ہر ایک کہنے لگا کہ میں بل چکاؤں گا۔ ایک دوست نے کہا کہ نوکر آنکھیں بند کرکے جس کو چھو دے وہی بل چکائے۔ باقی دوست اس بات پر راضی ہو گئے۔ نوکر بھی اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ لوگ بیٹھ گئے اور نوکر کو دیوار کے پاس کھڑا کر دیا۔ اور کہا تو چھوؤ۔ نوکر نے جب میز کے پاس آکر آنکھیں کھولیں تو تینوں کے تینوں غائب تھے



ایس۔ ام۔ ماجد۔ رامپور

نپولین اور فقیر

نپولین لوگوں کو فوج میں بھرتی کرتے وقت صرف تین سوال پوچھتا تھا۔ "تمہاری عمر کیا ہے؟" "تم کب سے ہمارے راج میں ہو؟" اور "صرف کھانا لوگے یا تنخواہ بھی؟" ایک فقیر فرانس میں بڑی تنگی ترشی سے زندگی کے دن پورے

کر رہا تھا۔ ایک شخص نے اسے فرانسیسی زبان میں بتا دیا کہ بادشاہ کو کیا جواب دینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اُسی زبان سے ناواقف تھا۔ "تیس برس"، "دس برس" "دونوں"......؟

وہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔
بادشاہ۔ تم کب سے ہمارے راج میں ہو؟
فقیر۔ تیس برس۔
بادشاہ۔ تمہاری عمر کیا ہے؟
فقیر۔ دس برس۔
بادشاہ۔ (جھنجھلا کر) میں پاگل ہوں یا تم؟
فقیر۔ (بڑی نرمی سے) دونوں۔

(محمد منظور الحسین پورنیوی)

کڑوی بات

ایک بادشاہ نے بڑی محنت سے ایک غزل لکھی اور ملک کے سب سے بڑے شاعر کو بلا کر دکھایا اور کہا کہ جب میں غزل پڑھ چکوں تو جس شعر پر تمہیں اعتراض ہو اس پر اپنی انگلی رکھ دینا۔

جب بادشاہ غزل پڑھ چکا تو شاعر نے تمام غزل پر پورا ہاتھ پھیر دیا۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر حکم دیا کہ اُسے دو دن تک جیل میں رکھو۔ دو دن کے بعد جب شاعر جیل سے چھوٹ کر آیا تو بادشاہ نے دوبارہ ایک اور غزل شاعر کو سنائی اور کہا جو شعر قابل اعتراض ہو اس پر اُنگلی رکھ دو۔

جب شاعر غزل سن چکا تو آداب بجا کر چل پڑا۔ بادشاہ نے غصّے سے شاعر سے پوچھا:۔
بادشاہ "کہاں جا رہا ہے ــ؟"
شاعر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "دوبارہ جیل میں ــ!"

(سید ذوالفقار قطب طارق)

محمد سلیم دہرا

کوّے کی چالاکی

ایک پُرانا پیڑ تھا۔ اس پر ایک کوّے کا جوڑا رہتا تھا۔ اُسی پیڑ کے نیچے ایک سانپ رہا کرتا تھا۔ سانپ کوّیے کے بچے ھا جاتا تھا۔ کوّیے کی جوڑی سانپ سے بہت تنگ آگئی تھی۔

پیڑ کے نزدیک ایک ندی بہتی تھی۔ لوگ اس میں نہاتے تھے۔ ایک ن ایک امیر کا لڑکا اور اس کے نوکر چاکر ندی پر نہانے آئے، اسلم کے گلے ں سونے کی زنجیر تھی۔ اس نے اتار کر رکھ دی۔ کوّا اور اس کی مادہ پیڑ ر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک کوّیے کی نظر زنجیر پر پڑی۔ کوّا نیچے اترا اور بجیر اُٹھا سانپ کے گھونسلے میں پھینک دیا۔ اور خود پیڑ پر آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسلم اور اس کے نوکر چاکر سب باہر آئے تو زنجیر کو نہ پاکر ھونڈنے لگے۔ پیڑ کے پاس آئے تو دیکھا زنجیر سانپ کے گھونسلے میں پڑی ہے ور سانپ اس کے اوپر منڈلا رہا ہے۔ یہ دیکھ سب لاٹھیاں لے آئے اور سانپ کو مار دیا۔ اور زنجیر لے کر چلے گئے۔ کوّا اور اس کی مادہ یہ سب دیکھ رہے تھے، سانپ کے مرجانے پر انھیں بہت خوشی ہوئی۔



عمیق ملک ایم اے

نیکی کا پھل

اونچے پہاڑی علاقوں اور سرد ملکوں میں سردیوں میں رہنا بڑا بے مزہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جب وہاں برف پڑتی ہے۔ تو اس قدر سردی ہوتی ہے کہ آدمی کا جسم سُن ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس آب و ہوا میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، وہ تو ایسی سخت سردی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ مگر اوروں کے لئے وہاں زندہ رہنا مشکل ہے۔ اللہ میاں نے سرد ملکوں میں خاص خاص جانور پیدا کئے ہیں۔ جن کی کھال اور چربی وغیرہ استعمال کرکے وہاں کے باشندے۔ اپنے آپکو سردی سے بچاتے ہیں۔

ہم آپ کو ایک واقعہ سناتے ہیں کہ کس طرح ایک پہاڑی علاقے میں ایک آدمی نے دوسرے کی جان بچانے کی وجہ سے اپنی جان بھی بچا لی۔ کیونکہ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ جو دوسرے کا بھلا چاہے اُس کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔

گھنا اور سوہنا پہاڑی علاقے کے دو کسان تھے۔ ایک دفعہ انھیں دور کسی اونچی پہاڑی پر ایک گاؤں میں جانا تھا۔ پہاڑوں پر چاہے کوئی جگہ دس بارہ کوس دور کیوں نہ ہو۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دس بیس قدم پر ہے۔

وہ دن ڈھلے روانہ ہوئے ابھی راستے ہی میں تھے۔ کہ برف کا طوفان آگیا۔ عام طور پر جب برف پڑتی ہے تو اس وقت ہوا بند ہو جاتی ہے اور سردی معلوم نہیں ہوتی۔ مگر جب ہوا زور سے چلنے لگتی ہے تو ٹھنڈ بڑھ جاتی ہے۔

برف کے طوفان سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ برف تیزی سے پڑ رہی تھی۔ یہ دو ہٹے کٹے، موٹے تازے نوجوان کبھی پہاڑی کے اوپر اور کبھی نیچے تیز تیز قدم اُٹھائے چلے جا رہے تھے کہ ایکاایکی طوفان بہت زیادہ بڑھ گیا۔ بجلی چمکتی تو یہ راستہ دیکھ کر آگے بڑھتے۔ بہت گھبرائے مگر ہمت نہ ہاری۔ بڑھتے ہی چلے گئے۔

اچانک ایک جگہ اُن کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔ جو زمین پر پڑا ٹھٹھر رہا تھا۔ اور قریب تھا کہ برف میں دب کر مر جائے گہنا خاں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ”اس کو کسی طرح اٹھالیں۔ یہ سردی سے سُن ہو کر گر پڑا ہے۔ اور اب برف میں دب کر مرجائے گا۔ شاید ہماری مدد سے اس کی جان بچ جائے۔

سوہنا خاں کہنے لگا ”ہم خود مر رہے ہیں۔ سردی سے ہاتھ پاؤں ہلتے نہیں۔ بلا کا طوفان ہے۔ اور پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا خود ہی بچ نکلیں تو غنیمت ہے۔ اس کی جان کیسے بچائیں؟“

مگر گہنا خاں نہ مانا وہ خدا ترس آدمی تھا۔ اُس نے خیال کیا۔ ”موت سامنے نظر آرہی ہے۔ اگر کسی کی خدمت کرتے کرتے جان نکل جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ اور کچھ نہیں تو مرتے وقت روح تو خوش خوش نکلے گی۔

سوہنا خاں بڑبڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ مگر گہنا خاں سے اس بیکس کی موت نہ دیکھی گئی وہ جھکا اور اس ادھ موئے سردی سے اکڑے ہوئے آدمی کو بھری ہوئی گون کی مانند اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ اور تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔

اس کی خوشی کی حد نہ رہی جب اسے کچھ فاصلے پر گاؤں دکھائی دیا۔ گاؤں والے ہاتھوں میں ڈنڈے لئے کھڑے تھے۔ تاکہ اپنے آگے سے برف ہٹا ہٹا کر چل سکیں۔ ان کے پاس لالٹینیں بھی تھیں۔ اور سردی سے بچنے کے لئے گرم کمبل اور راہ بتانے کے لئے ہوشیار پہاڑی کتے بھی۔ وہ گاؤں کے باہر کھڑے سوچ رہے تھے کہ اپنے آدمی کو کہاں تلاش کریں اور کدھر ڈھونڈنے جائیں۔ کہ اتنے میں انھیں ایک آدمی دوسرے آدمی کو اٹھائے ادھر آتا دکھائی دیا۔



گاؤں والوں نے آوازیں دیں۔ خوشی کے نعرے لگائے اور کچھ آگے بڑھ کر دونوں کو گاؤں کے اندر گرم گرم جھونپڑیوں میں لے گئے۔ گرما گرم چائے پلائی چربی سے مالش کی اور بڑی خوشی منائی۔ غرض اپنے گاؤں

کے آدمی کو بچانے والے کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مگر سوہنا خاں کا کوئی پتہ نہ چلا۔ رات گزر گئی اور وہ گاؤں میں نہ پہنچا۔

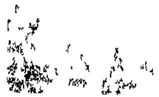
صبح جب طوفان تھما۔ آسمان صاف ہوا تو لوگ سوہنا خاں کی تلاش میں ادھر ادھر گئے۔ اور کیا دیکھا کہ گاؤں کے تھوڑے فاصلہ پر وہ ایک کھوہ میں سردی سے اکڑ کر مرا پڑا ہے۔

ایسی سخت سردی گہنا خاں بھی کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اور اکڑ کر مر جاتا۔ مگر اس نے جو ایک آدمی کا بوجھ اٹھا کر چلنا شروع کیا تو اس کی وجہ سے اس کے جسم میں گرمی پیدا ہوئی۔ اور اس کا جما ہوا خون رگوں میں دوڑنے لگا۔ اور اس کو اپنی خدمت کا اچھا بدلہ مل گیا۔ یعنی اس کی جان جس سے وہ نا امید ہو چکا تھا۔ بچ گئی۔ لوگوں نے تعریف الگ کی۔

بقیہ ایران صفحہ ۱۳ سے آگے

بعد بھی تصفیہ نہ ہو سکا۔

برطانوی سامراج کی بنیاد ہل چکی ہے اور وہاں کے عوام دنیا کی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر ایران کو اینگلو امریکی بلاک سے نجات دلانے کے لیے، آگے بڑھ رہے ہیں۔



لطیفے

اُستاد۔ نقشے میں خشکی اور پانی بتاؤ کہاں ہیں۔
شاگرد۔ جناب اس میں خشکی ہی خشکی ہے۔ پانی نظر نہیں آتا۔
اُستاد۔ کیوں ؟
شاگرد۔ جناب پانی ہوتا تو نقشہ ضرور بھیگ جاتا

اونچے قد کا خریدار۔ (دکاندار سے) یہ گلاس چھوٹا ہے ذرا اور بڑا چاہیئے۔
دُکاندار۔ جناب آپ اونچائی سے دیکھ رہے ہیں۔ اسی لئے چھوٹا معلوم ہو رہا ہے۔ ذرا آپ بیٹھ کر دیکھیئے۔

خریدار:۔ کل آپ نے مجھے کچی برف دی تھی
دکاندار:۔ تو آپ نے گھر میں پکا لی ہوتی۔

ایک لڑکے نے ایک مالدار آدمی سے گڑگڑا کر کہا "کیا آپ مجھے مہربانی کرکے ایک اٹھنّی دے دیں گے۔ تاکہ میں اپنے باپ کے پاس پہنچ سکوں"۔ مالدار آدمی کو رحم آگیا۔ اس نے اٹھنّی نکال کر دیدی اور پوچھا "کہاں ہیں تیرے باپ ؟"
لڑکا:۔ سینما دیکھنے گئے ہیں۔

اس۔ ام۔ ماجد۔ رامپور

مالک:۔ موٹر کیوں رُک گئی ؟
ڈرائیور:۔ حضور پٹرول ختم ہوگیا۔
مالک:۔ تو گھر واپس لے چلو۔

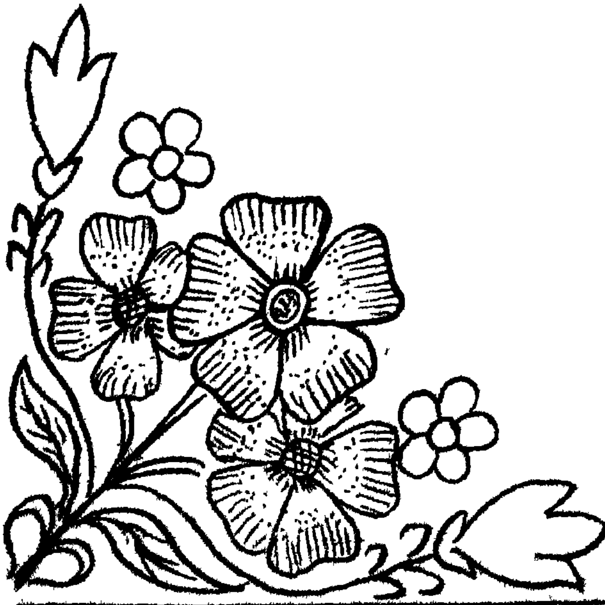
مالک:۔ (ڈرائیور سے) کیا بات ہے؟ آج موٹر کیوں آہستہ چلا رہے ہو؟
ڈرائیور:۔ حضور سامنے گڑھا ہے۔
مالک:۔ تو پھر ہارن بجاؤ۔ اپنے آپ ہٹ جائے گا۔

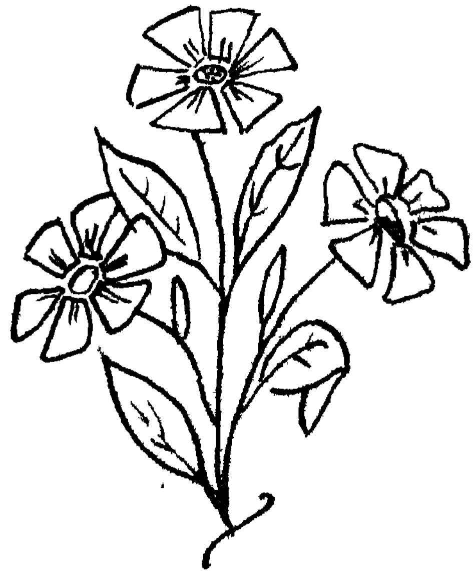
عاصی۔ انصاری
گھریا۔



کشیدہ کاری

شمس الہدیٰ
صدر بچوں کا کلب بتیا
چمپارن





آزاد کتاب گھر کی بچوں کی چٹ پٹی کہانیاں

نیّر صاحب کی کہانیاں

- منی کا پرستان ۵/
- ٹلو میاں ۵/
- کھلو میاں ۸/
- طلسمی مینا ۵/
- بونے کا بٹوا ۳/
- پری کی چھڑی ۴/
- پرستان کی سیر ۳/
- بچوں کا تحفہ حصہ دوم ۱۲/
- میاں مٹھو ۵/
- چُنّن مُنّن ۳/
- نئی کہانیاں ۸/
- تارا کا ڈنڈا ۳/
- انار راجہ ۳/
- ابلی شہزادی ۴/
- بچوں کا تحفہ حصہ اول ۱۰/
- سنی کا تحفہ زیر طبع

حیات اللہ انصاری کی کہانیاں

- کالا دیو ۵/
- میاں خوں خوں ۳/

کچھ اور مزیدار کہانیاں

- پتھر کا چور ۷/
- جنّاتوں کا شہر ۷/
- ننھے میاں ۷/
- زمرد شہزادہ ۶/
- شاہی فقیر ۵/
- طلسمی کڑیاں ۷/
- شہزادی بدر کمال ۷/
- شیخ چلی نے جنت کی سیر کی ۷/
- فقیر شہزادہ ۷/
- مُلا دو پیازہ کی عقل ۵/
- چاندی کا محل ۸/

ایک کتاب مُفت

جو بچے کتابیں دو روپے کی قیمت کی منگائیں گے، اُن کو "آزاد کتاب گھر" کتاب "سراغ رساں کتا" مفت پیش کریگا۔ اور جو بچے پانچ روپے کی کتابیں منگائیں گے ان کی خدمت میں "شہزادی بدر کمال" مفت پیش کی جائیگی۔ بچوں کے لیے یہ رعایت صرف اٹھائیس فروری ۱۹۵۲ء تک ہے۔

اپنا آرڈر جلد بھیجئے

آزاد کتاب گھر
کلاں محل۔ دہلی

پیامی معمّا نمبر ۸ کا صحیح حل اور نتیجہ

دائیں سے بائیں:- (۱) کوہ نور (۳) عقاب (۵) سیر (۸) ایمان (۹) کرم -
اوپر سے نیچے:- (۲) رائٹ (۴) سونا (۶) یسیر (۷) ماں -

اس بار صحیح حل صرف دو موصول ہوئے چنانچہ پہلے انعام کی ۸ کتابیں علی شاہد رضوی معرفت شاہد حسین نائب تحصیلدار گورکھپور اور انوارالحسن خاں معرفت ایم ایچ خاں سگریٹ ہاؤس نیا گاؤں لکھنؤ نے حاصل کی۔

ایک غلطی والے تین حل موصول ہوئے۔ (۱) کمال انصاری دہلی۔ (۲) آغا عبدالزہرا نجفی کرنول (۳) میمونہ بیگم عثمانی جودھپور۔

تیسرا انعام دو غلطی والے ۹ حل موصول ہوئے جن میں سے چار بچوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام ملا۔ (۱) عبدالمومن نیاز مراد آباد (۲) قمرالنساء میسور (۳) محمد انوراللہ ضلع پربھنی (۴) نور احمد میسور۔

شرائط پیامی معمّا

(۱) فیس داخلہ کچھ نہیں لیکن ایک حل چھپے ہوئے کوپن کے ساتھ آنا ضروری ہے البتہ چھپے ہوئے کوپن کے ہمراہ ایک حل اور بھیج سکتے ہیں (۲) حل روشنائی سے صاف ہونا چاہیئے مشکوک اور کٹے پھٹے حل مقابلے میں شریک نہ ہونگے (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ لڑکے ہوں گے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائیگا۔ (۴) ایک لڑکے کو ایک ہی انعام یا انعام کا ایک ہی حصہ ملے گا (۵) معمے کے متعلق تمام معاملات میں ایڈیٹر پیامِ تعلیم کا فیصلہ آخری ہوگا۔

اپنے حل آپ اس پتہ پر بھیجیں۔ ایڈیٹر پیامی معمّا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی۔

پیامی معمّا نمبر ۹

حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء

پہلا انعام:- بالکل صحیح حل بھیجنے والے کو ۸ کتابیں

دوسرا انعام:- ایک غلطی والے کو ۶ " "

تیسرا انعام:- دو " " " ۴ " "

دائیں سے بائیں:-

(۱) — کی شہری آبادی ۸۰ لاکھ ہے۔

(۴) آجکل — کا استعمال سمجھداری سے کرنا چاہیئے

(۵) بغیر سوچے سمجھے کوئی کام — بیٹھنا اچھا نہیں (دو حرفی)

(۶) طویل — کی صورت میں مستقل مزاج آدمی بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔

(۷) زمانۂ قدیم کا ایک مشہور حکیم۔

پیامی معمّا نمبر ۹

۳ م	۲		ن	د		۱ ل
	ر	۵		ٹ	و	۴
	ی	ر	ا		ی	۶ ب
و		ط	۹ ا	ر	۸ ق	۷
ر	۱۰ ہ				و	
	ن		ی			
	د		ر			

اوپر سے نیچے:-

(۲) — بات ہر ایک کو بُری معلوم ہوتی ہے

(۳) ایسے آدمیوں سے امید لگاتے وقت اکثر پس و پیش کرنا ہی پڑتا ہے۔

(۸) انسان کو ہر حالت میں اپنے — کا پاس کرنا چاہیئے۔

(۹) — آدمی عام طور پر پریشان ہی رہتے ہیں

(۱۰) بحر — ۳۰۰۰۲ فٹ گہرا اور ۶۲۷۶۲۵۶۳۲ مربع میل وسیع ہے۔

کوپن پیامی معمّا نمبر ۹

نام ....

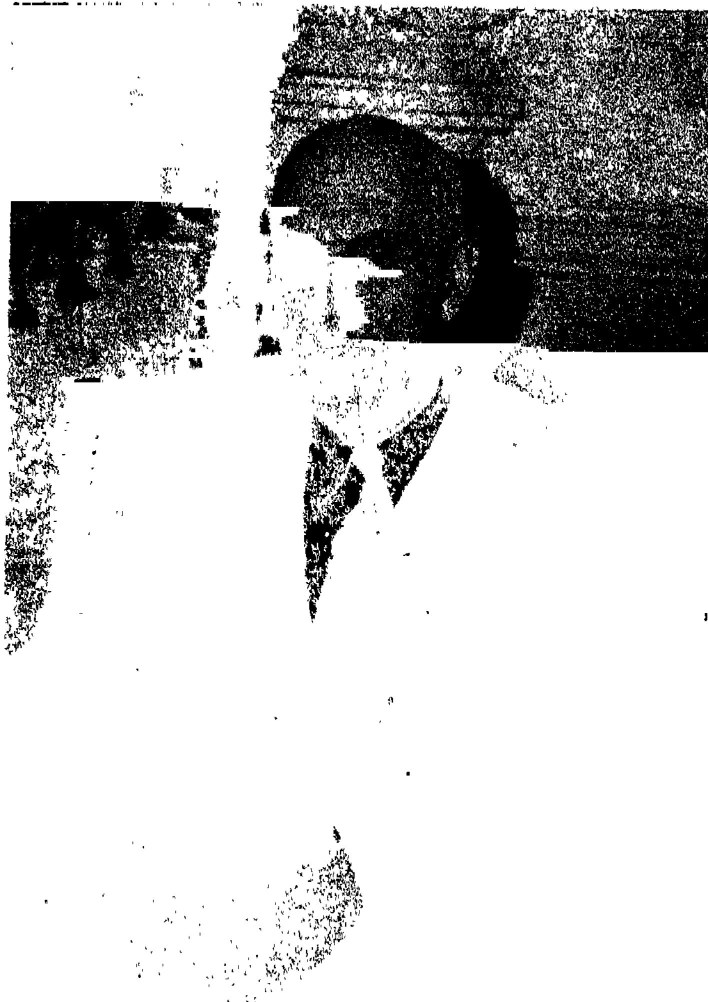
پتہ ....

....

ایڈیٹر پیامی معمّا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

محمد حسین حسّان پرنٹر و پبلشر

مطبوعہ:- دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

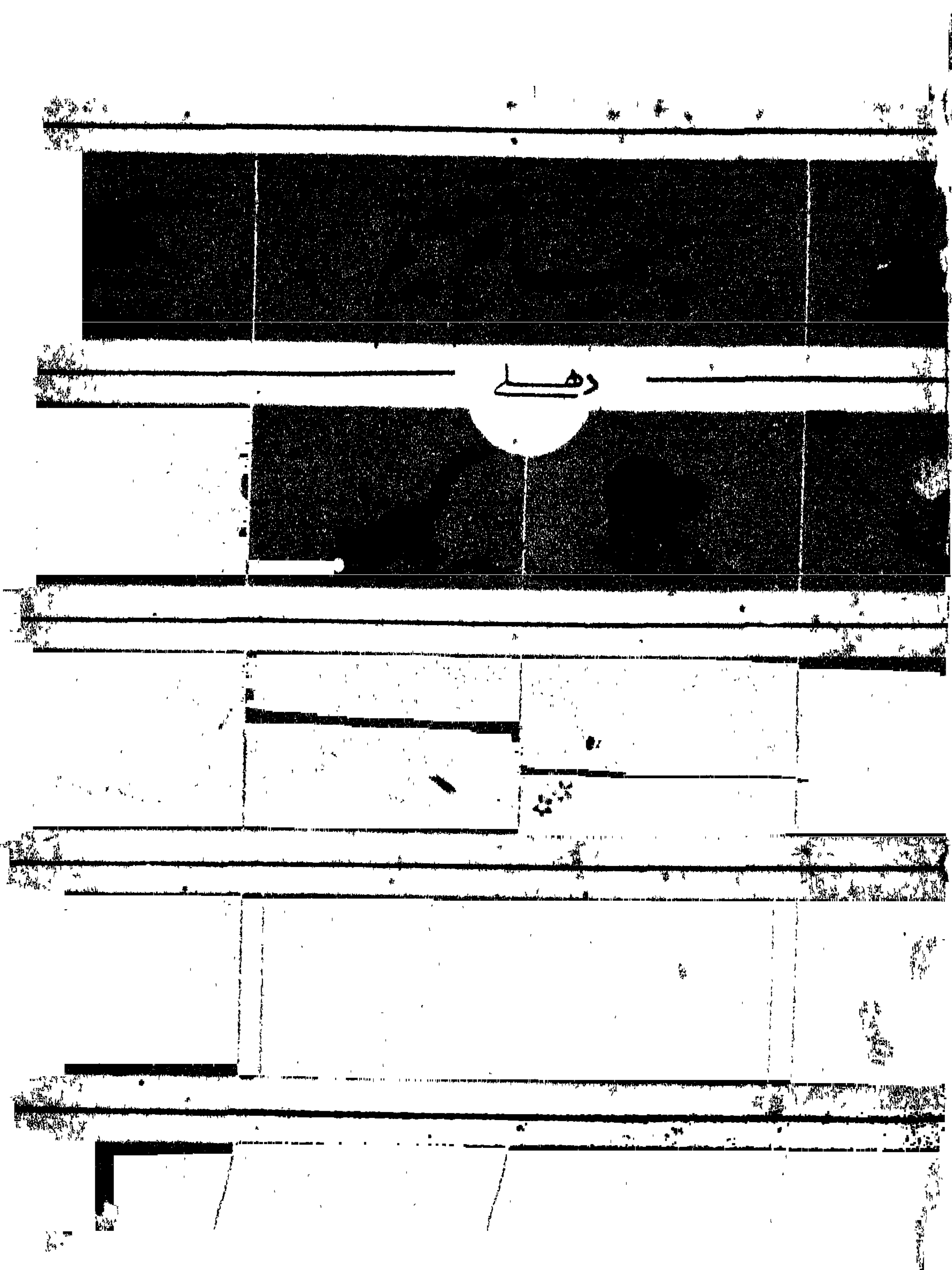


ایران کے وزیر اعظم

ڈاکٹر محمد مصدق

Regd. No. D. 96.

JANUARY 1952

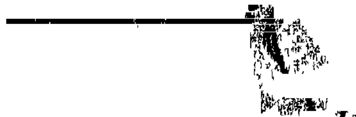

دھلی











ننھی منّی کہانیوں کا مقابلہ

- 2 APR 1952 -

۵ برس سے ۱۵ برس تک کے بچوں کے لئے نقد انعام پانے کا

بہترین موقع

گروپ ا۔ ۵ برس سے ۸ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں۔

گروپ ب۔ ۹ برس سے ۱۲ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں۔

گروپ ج ۱۳ برس سے ۱۵ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں

• ہر گروپ میں تین انعام دیئے جائیں گے۔ جو پہلی، دوسری اور تیسری بہترین کہانیوں کو دیئے جائیں گے۔

•• تینوں انعام نقد روپے کی شکل میں دیئے جائیں گے۔

شرائط مقابلہ

۱۔ پیام تعلیم پڑھنے والے تمام بچے اس مقابلہ میں شرکت کر سکتے ہیں مستقل خریدار ہونے کی کوئی شرط نہیں۔

۲۔ کہانیاں اردو میں ہونی چاہیئے۔

۳۔ کہانی کہیں سے نقل نہ کی گئی ہو۔ بلکہ خود بچوں کی لکھی ہوئی چاہیئے۔

۴۔ ہر کہانی کے ساتھ آپ کا پورا نام عمر اور پتہ ضرور ہونا چاہیئے۔

۵۔ کہانی اس سے پہلے کہیں چھپی نہ ہو۔

۶۔ کہانی صاف اور خوشخط لکھی ہوئی ہونی چاہیئے کٹی پھٹی نہ ہونی چاہیئے ایسی کہانیاں مقابلہ میں شریک نہ کی جائیں گی۔

۷۔ کہانی پر "انعامی مقابلے کے لئے" ضرور لکھئے۔

۸۔ • گروپ الف کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۲ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے

•• گروپ ب کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۴ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے

••• گروپ ج کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۶ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے

کہانی بھیجنے کا پتہ:- اڈیٹر پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی



اپریل ۱۹۵۲ء

چھبیسواں سال

ادارہ

حامد علی خاں
بی۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز
ایم۔ اے (علیگ)

سالانہ چندہ ۴ روپے

فی پرچہ
۶ آنے



بچوں سے باتیں

خدا خدا کر کے الکشن کا شور ختم ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی آندھی آئی اور نکل گئی۔

ہمارے ملک کی سیاست میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ ہندوستان کے نئے دستور کے مطابق ملک بھر میں چناؤ ہوئے۔ جس میں ۲۱ سال کے اوپر کے مرد اور عورتوں نے حصہ لیا۔ اپنے اپنے شہروں میں اپنے نمائندے چنے

آپ کو معلوم ہی ہے کہ یوں تو دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ ہے۔ لیکن وہ ایک الگ صوبہ بھی ہے! جس کا انتظام چیف کمشنر صاحب کرتے تھے۔ لیکن نئے دستور کے مطابق یہاں بھی ایک اسمبلی بن گئی۔ اس کا چناؤ پچھلے دنوں ہوا۔ اس کے مطابق دہلی میں پہلی بار ایک عوامی حکومت قائم ہوئی۔ ایک اسمبلی بنی اور اس کے ممبروں میں سے تین وزیر حکومت کا کام چلانے کے لئے چنے گئے۔

آپ نے قصے کہانیوں میں سنا ہوگا کہ اگلے وقتوں میں بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ ان کا ایک وزیر بھی ہوتا تھا۔ اب نہ وہ بادشاہ ہیں اور نہ وہ وزیر۔ اب الکشن میں جو پارٹی جیتتی ہے وہ اپنا لیڈر منتخب کر لیتی ہے۔ لیڈر صوبے یا ریاست کی مالی حیثیت دیکھ کر دو، تین یا اس سے زیادہ آدمی ان لوگوں میں سے چن لیتا ہے۔ جو اسمبلی کے ممبر بنے ہوں

حکومت کے مختلف کام ہوتے ہیں۔ مثلاً تعلیم، صحت، زراعت، پولس وغیرہ۔ لیڈر ان کاموں میں سے کچھ اپنے ذمہ رکھتا ہے، کچھ اپنے چنے ہوئے ساتھیوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ لیڈر کے چنے ہوئے وہ لوگ جو ان کاموں کے خاص طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وزیر کہلاتے

ہیں.....!

خوشی کی بات ہے کہ دہلی میں ہماری جامعہ کے ایک پرانے اور اچھے کارکن جناب شفیق الرحمٰن قدوائی کو وزارت تعلیمات کا عہدہ سپرد کیا گیا ہے۔ قدوائی صاحب جامعہ کے ان طالب علموں میں سے ہیں۔ جنھوں نے ذاکر صاحب کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کیا اور جامعہ کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔

ہم ادارۂ پیام تعلیم اور پیامیوں کی جانب سے شفیق الرحمٰن صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ دہلی کے بچوں کی تعلیم کا انتظام پہلے سے بہتر کرسکیں گے۔ ان کے لئے کھیل کود اور جسمانی ورزش کا انتظام پہلے سے بہتر ہو جائے گا اور وہ ایسے بہت سے کلب اور ریڈنگ روم قائم کرسکیں گے۔ جہاں غریب بچے بھی آسانی سے پہنچ کر اپنی تعلیم اور صحت کو بہتر بنا سکیں گے۔

ہم پیام تعلیم کی طرف سے شفیق صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کا کام خود ہمارا کام ہے ہم ہر طرح ان کی مدد کو حاضر ہیں۔

اسی شمارے میں ہم کہانیوں کے مقابلے کا اعلان کر رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ پیامی اس مقابلے میں دلچسپی سے شرکت کریں گے، خود بھی کہانیاں لکھیں گے۔ اور اپنے دوستوں سے بھی لکھوائیں گے۔ امید ہے کہ آپ اپنی چھٹیوں میں کہانیاں لکھ ڈالیں گے اور ہیں ۱۵ جون سے پہلے بھیج دیں گے۔ تاکہ ہم جولائی کے شمارے میں نتیجہ کا اعلان کرسکیں۔ اس کے بعد اگست میں ہم اپنا سالنامہ پیش کریں گے۔ جن میں یہ تمام کہانیاں چھپیں گی۔

انعام پانے والے بہت سے بچوں کی تصویریں بھی سالنامہ میں چھپیں گی۔

علامہ اقبال کی تین نظمیں

ایک مکڑا اور مکھی

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اس راہ سے ہوتا ہے گذر روز تمھارا
لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے — اپنوں سے مگر چاہیے یوں کھنچ کے نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری — وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا!
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی — حضرت! کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اترا

مکڑے نے کہا واہ۔ فریبی مجھے سمجھے — تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہوگا
منظور تمھاری مجھے خاطر تھی۔ وگرنہ — کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا
اڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے — ٹھہرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں برا کیا
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں — باہر سے نظر آتی ہے چھوٹی سی یہ کٹیا!
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے — دیواروں کو آئینوں سے ہے ہم نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے — ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا
مکھی نے کہا خیر یہ سب ٹھیک ہے لیکن — میں آپ کے گھر آؤں۔ یہ امید نہ رکھنا

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں سنی بات جو اس کی — پھانسوں اسے کس طرح؟ یہ کمبخت ہے دانا

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا

یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی!
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا!

ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا

آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا

یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا

مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی!
بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا!

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا

یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

ایک پہاڑ اور گلہری

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے۔ اس پر غرور کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ۔ یہ شعور۔ کیا کہنا!

خدا کی شان ہے ناچیز، چیز بن بیٹھیں!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے۔
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھکو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں۔ جانور غریب کہاں

کہا یہ سن کے گلہری نے منھ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا!

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجھکو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا مجھ میں
تری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
اڑنے چگنے میں دن گذارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا!
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
کام آتے ہیں جو دوسروں کے

راشد حسن قادری

بچوں کے اقبال

لاہور میں ایک بڑے عبادت گذار اور اللہ والے بزرگ رہتے تھے۔ ان کا نام تھا نور محمد۔ وہ بڑے نیک اور خدا ترس بزرگ تھے۔ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بالکل سفید کبوتر ہوا میں خوب اونچا اڑ رہا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ کبوتر اترا اور ان کی گود میں بیٹھ گیا۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد نور محمد صاحب کی آنکھ کھل گئی اور انھوں نے خواب کا مطلب یہ سمجھا کہ میرا جو لڑکا ہوگا وہ بہت نیک اور اچھا ہوگا اور قوم کی خدمت کرے گا۔ جس کی وجہ سے اسے بڑائی اور نیک نامی حاصل ہوگی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو ان کے یہاں ایک خوبصورت گورا چٹا لڑکا پیدا ہوا۔ نور محمد صاحب بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ بچہ ذرا بڑا ہوا تو نور محمد صاحب نے خود ہی گھر پر تعلیم دینی شروع کی۔ اچھی شکل و صورت کے ساتھ ساتھ وہ بچہ نہایت ذہین اور سمجھدار تھا لوگ اس ننھی سی عمر میں اس کی بڑی بڑی عقل کی باتیں سنکر دنگ رہ جاتے۔ شروع شروع میں گھر پر پڑھاکر نور محمد صاحب نے اپنے صاحبزادے کو اسکول میں داخل کرادیا۔ وہ بچہ ذہین تو تھا ہی۔ اور پڑھنے کا شوقین۔ خوب محنت سے پڑھا۔ پانچویں درجے میں اول آیا۔

ایک دن اتفاق سے اسکول پہونچنے میں دیر ہو گئی۔ ماسٹر صاحب درجے میں

آچکے تھے۔ جب درجہ میں داخل ہوا تو ماسٹر صاحب نے پوچھا "اقبال دیر میں کیوں آئے" تو اس بچے نے ذرا شرمندگی کے ساتھ جواب دیا "جناب اقبال دیر ہی میں آتا ہے" ماسٹر صاحب یہ جواب سن کر اس بچے کی عقل پر دنگ رہ گئے کیوں؟ اس لئے کہ ماسٹر صاحب نے پوچھا کہ اقبال تم دیر میں کیوں آئے۔ اقبال کے معنی ہیں بڑائی اور بزرگی۔ تو اس بچے نے جواب دیا کہ اقبال یعنی بڑائی اور بزرگی دیر ہی میں ملتی ہے ـــــ تو دیکھا آپ نے کس قدر عقلمند تھا وہ گیارہ برس کا بچہ! اب آپ سمجھے۔ یہ تھے حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ جن کو آج ساری دنیا شاعر مشرق کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

دسواں درجہ اول نمبر سے پاس کرنے کے بعد اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور وہاں سے ایف اے پاس کرکے لاہور میں گورنمنٹ کالج میں بی۔اے میں داخلہ لیا ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے میں بھی اول آئے اور عربی اور فارسی میں سب سے زیادہ نمبر لانے پر دو انعام حاصل کئے۔ ۱۸۹۹ء میں ایم اے پاس کیا اور ساری پنجاب یونیورسٹی میں اول آنے پر انہیں ایک سونے کا تمغا بھی انعام ملا۔

ایم۔اے پاس کرنے کے بعد آپ کو اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسری مل گئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے اور انگلستان کی مشہور کیمبرج یونیورسٹی اور جرمنی کی مشہور میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ نے وہاں ایک کتاب ایران کے متعلق لکھی جس سے تمام یورپ میں آپ کی قابلیت کا سکہ جم گیا۔ اسی عرصے میں علامہ اقبالؒ نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ تین سال انگلستان میں رہ کر اور اتنی ساری شہرت لے کر علامہ اقبالؒ ہندوستان واپس آئے اب وہ صرف محمد اقبال ایم اے نہ تھے بلکہ ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر تھے واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر اعلیٰ مقرر ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ بیرسٹری کا سلسلہ ۱۹۳۴ء تک قائم رہا اور اس کے بعد لگاتار

بیماری کے سبب اس کو بھی چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

۲۰ راپریل ۱۹۳۶ء کی شام کو ایک صاحب آپ سے ملنے گئے۔ اس زمانے میں آپ کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی وہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے لڑکے جاوید اقبال اندر آئے تو علامہ اقبالؒ نے فرمایا "بیٹا تم میرے پاس آکر بیٹھا کرو میں شاید چند روز کا مہمان ہوں۔" ایک اور صاحب کا بیان ہے کہ علامہ نے انتقال سے دس منٹ پہلے یہ قطعہ پڑھ کر اپنے انتقال کی اطلاع دیدی تھی۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

یعنی سرود دار لغمہ جو جا چکا ہے معلوم نہیں کہ واپس آئے یا نہ آئے اور معلوم نہیں کہ حجاز سے ہوا لوٹ کر آئے یا نہ آئے۔ اب اس فقیر کا تو وقت آچکا ہے، اب خدا جانے کہ کوئی دوسرا راز کو جاننے والا آئے یا نہ آئے۔

۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو صبح سوا پانچ بجے شاعر مشرق نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ آپ کا مزار مبارک شاہی مسجد کے دروازے کے بائیں جانب لاہور میں ہے۔

علامہ اقبالؒ نے بچوں کے لئے بھی بہت سی پیاری پیاری نظمیں کہی ہیں اور عمدہ عمدہ نصیحتیں کی ہیں۔ آپ نے "بچے کی دعا" تو سنی ہی ہوگی۔ اس دعا میں انھوں نے کتنی عمدہ عمدہ باتیں کہی ہیں یہ ہی تو دعائیں ہیں جو ایک اچھے بچے کو مانگنی چاہیئے۔

"ایک پہاڑ اور گلہری"، کتنی عمدہ نظم ہے۔ اس میں انھوں نے پہاڑ اور گلہری کی باتیں لکھی ہیں کہ پہاڑ سمجھتا تھا کہ گلہری تو ایک چھوٹا سا جانور ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی، بے کار سی چیز ہے اور میں اتنا شاندار اور اونچا پہاڑ ہوں۔ اس پر گلہری نے جواب دیا کہ خیر میں چھوٹی ہی سہی۔ لیکن تم ذرا یہ چھالیہ کا ٹکڑا کاٹ کر دکھا دو۔ یہ سن کر پہاڑ خاموش ہو گیا۔ اس پر علامہ اقبال نصیحت فرماتے ہیں۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں !
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ بے کار نہیں ہے۔ سب کے الگ الگ کام ہیں کسی کو بُرا یا بے کار مت کہو۔

ایک اور نظم "ہمدردی" میں علامہ اقبالؒ نے کتنی عمدہ نصیحت کی ہے فرماتے ہیں کہ

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ہوا یوں تھا کہ ایک بلبل کو رات میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے اپنا گھونسلہ نہیں مل رہا تھا، تو ایک جگنو نے کہا کہ آؤ میں اپنی روشنی میں تمھیں گھونسلہ تک پہنچا دوں وہ فرماتے ہیں کہ وہی لوگ اچھے ہیں جو مصیبت اور مشکل کے وقت دوسروں کے کام آتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور نظم "ایک پرندہ اور جگنو" میں ایک پرندے نے جگنو کو کھانا چاہا تو جگنو نے کہا اے پرندے تو مجھے کیوں مارتا ہے۔ مارنے اور جھگڑنے سے کیا فائدہ؟ میل جول سے رہنے میں ہی فائدہ ہے کہ اس سے رونق ہوتی ہے اور سب ہنسی خوشی رہتے ہیں۔

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی!
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

علامہ اقبال رحمت اللہ علیہ نے اور بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ جن میں بچوں کو عمدہ عمدہ نصیحتیں کی ہیں۔ اور وہ باتیں بتائی ہیں۔ جو اچھے اور نیک بچوں میں ہونی چاہیئے۔

ایک سائنس داں کی کہانی

مشتاق بھائی

۲

سائنس داں نے کچھ سوچا تو ہوٹل میں جانا خطرے سے خالی نظر نہ آیا۔ بیچارے نے پیٹ پر پتھر باندھا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔

جب رات ہوگئی تو سائنس داں نے کچھ کپڑے اور چند کتابیں ایک بکس میں رکھیں اور گھر سے باہر آگیا وہ باغ میں پہنچ کر ٹھہر گیا۔ پیچھے مڑا اور اپنے گھر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچنے لگا یہ گھر کیسا بھرا بھرا تھا۔ اس میں کتنی چہل پہل تھی۔ آج وہی گھر اُجاڑ ہے۔ چاروں طرف ایک ہُو کا عالم ہے۔ اور یہ سب میری ایک خواہش ایک کوشش کا نتیجہ ہے۔ لوگ اپنی کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں تو دنیا انھیں مبارک باد پیش کرتی ہے۔ اور میں ــــــ مجھے میری بیوی، میرے بچے، میرے نوکر چاکر سب چھوڑ کر چل دیئے ــــــ میں جیتے جی آدمی سے بھوت بن گیا۔

یہ سوچ کر سائنس داں کا گلا رندھ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ یہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ پر اس نے سوچا کہ رونے دھونے سے فائدہ؟ پھر ایک سائنس داں کے لئے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا کہاں مناسب ہے سائنس داں

تھا نا اسلئے عقل نے دل پر فتح پائی۔ ہم تم ہوتے تو وہیں باغ میں آنسوؤں کی گنگا جمنا بہا دیتے۔ اس نے اپنے گھر پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور اپنے دوست موہن کے گھر کی طرف چل پڑا۔

کافی رات جا چکی تھی۔ گلیاں اور سڑکیں خالی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی سائنس داں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ بیچارہ ڈرتا تھا کہ کہیں کسی نے دیکھ لیا تو بھوت بھوت کا ڈنکا بج جائے گا۔ اسی سائنس داں سے ملنے کے لئے لوگ اس کے دروازے پر گھنٹوں کھڑے رہتے تھے۔ آج وہی سائنس داں لوگوں سے منہ چھپاتا پھر رہا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں "دن کے پھیر" سائنس داں نے موہن کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ اور ایک طرف



دم سادھ کر کھڑا ہو گیا۔ موہن کو تعجب ہوا کہ اتنی رات گئے اس کے گھر کون آسکتا ہے۔ پھر بھی وہ اٹھا دروازے کے پاس آیا اور اندر ہی سے پوچھا "کون"

"میں" سائنس داں نے جواب دیا۔

"ارے تم ..... خیریت تو ہے۔" یہ کہتے کہتے موہن نے دروازہ کھول دیا۔ اور باہر جھانکا۔ باہر جھانکتے ہی وہ دھک سے رہ گیا۔ لیکن کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایک آدمی کھڑا ہے۔ جس کی گردن اور ہاتھ کے پہنچے غائب ہیں۔

یہ بھی تھے اسی تھیلی کے چٹے بٹے۔ چیخے چلائے نہیں۔ بلکہ بڑے سکون سے پوچھا۔

"تم ہو احمد۔ پر یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

سائنس داں:۔ جو کچھ دیکھ رہے ہو۔



ٹھیک ہی دیکھ رہے ہو۔ شکر ہے کہ تم نے مجھے بھوت نہیں سمجھا۔ دروازہ کھولو۔ مجھے اندر آنے دو۔ پھر میں اپنی رام کہانی سناؤں گا۔

موہن نے دروازہ کھول دیا اور سائنس داں کو لے جاکر اپنے کمرے میں بٹھایا۔ جب دونوں اطمینان سے بیٹھ گئے تو سائنس داں نے اپنے آدمی سے بھوت بننے کا قصہ سنایا اور آخر میں کہا " دوست موہن اب میں اپنی اس زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ الوپ ہونے کے شوق نے میری مٹی پلید کر دی۔

موہن :۔ تو اب تمھارے دوبارہ آدمی بننے کی سبیل کیا ہے۔

سائنس داں (کچھ خفا ہوکر) اچھا تو تمھارے خیال میں میں آدمی ہی نہیں رہا۔

موہن :۔ یار برا نہ مانو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اب دوبارہ تم اپنے اصلی روپ میں کیسے آسکتے ہو۔

سائنس داں :۔ یہی تو مجھ سے بھول ہوئی۔ پہلے میں نے اپنی اصلی شکل میں آنے کا انتظام نہیں کیا۔ اور نظروں سے اوجھل ہونے والی دوا اپنے بدن پر مل لی۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ میں دوبارہ اپنی شکل میں آسکتا ہوں۔ بس شرط یہ ہے کہ مجھے اطمینان سے ایک دو مہینے مطالعہ کرنے کو مل جائیں۔ میں کتابیں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تم اپنے گھر میں کوئی ایسی جگہ دے دو۔ جہاں میں بیٹھ کر سکون سے پڑھ سکوں اور تجربات کرسکوں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ جب میں

کامیابی کے قریب ہوں تو بھوت بھوت کا ڈنکا بج جائے اور مجھے یہاں سے بھی بوریا بستر باندھنا پڑے۔

موہن :۔ دوست احمد مجھے گھر میں جگہ دینے سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ہے اسے اپنا ہی سمجھو۔ پر ہاں اس کا ڈر ضرور ہے کہ کوئی نہ کوئی تمھیں دیکھ لے گا۔ بچے سارے دن ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں ناممکن ہے کہ کوئی نہ کوئی تمھیں نہ دیکھے۔ اب تم ہی سوچو کہ انھیں جب بے گردن اور بے ہاتھ پاؤں کا آدمی نظر آئے تو وہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر نہ اٹھالیں میں تو کیا پرماتما بھی انھیں چیخنے سے نہیں روک سکتا۔

سائنس داں :۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے وہ جو شہر سے باہر ہوٹل ہے نا اسی میں ایک کمرہ لے لوں۔

ہوٹل میں بغیر میری اجازت کے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ یوں مجھے سکون سے پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔

موہن :۔ ٹھیک ہے۔ جاؤ کوشش کرو شاید تم پھر ہم آدمیوں میں مل سکو۔

سائنس داں ۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ اس وقت تمھاری بن آئی ہے۔

اڑالو مذاق ۔ اچھا رخصت۔

(ہوٹل میں سائنس داں کا کیا حال ہوا۔ اس کے لئے اگلا پرچہ پڑھئے)

سید منیر الحسن

بین او لائے گن



یہ ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جو ترکستان کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ بے چارا پانچ سال کا تھا کہ اس کا باپ مرگیا۔ اب کیا ہوتا؟

بے یار و مددگار ماں نے لاچار ہو کر اپنے چچا کے پاس پہنچا دیا۔ وہ چچا کے کھیتوں پر چڑیاں اڑاتا اور مدرسے میں پڑھنے بھی جاتا۔ درجہ میں وہ اکثر چپ بیٹھا رہتا۔ نہ لڑکوں سے ہنستا نہ بولتا۔ صرف اپنے پڑھنے لکھنے سے کام، لیکن شریر لڑکے یہ نہ دیکھ سکے۔

ایک نے پوچھا "میاں اتنے چپ چاپ کیوں رہتے ہو؟ اور دل ہی دل میں کیا پلاؤ پکایا کرتے ہو؟ کچھ بتلاؤ تو سہی۔"

اس نے جواب دیا "بین او لائے گن"

دوسرے لڑکے نے دانتوں میں انگلی دبا کر پوچھا "کیا کہا بھائی؟"

وہ پھر بولا "بین او لائے گن"

جب دونوں لڑکوں نے بین ادلائے گن کا مطلب ذرا زور دیکر پوچھا تو اس نے کہا کہ اس کا مطلب ہے۔ "میں کچھ نہ کچھ بنوں گا۔"

لڑکے تو پھر لڑکے ٹھہرے۔ انھوں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ پوچھا ارے میاں لاٹ صاحب کیا بنوگے؟

اس نے جواب دیا "ترکستان کا بادشاہ"

اور بھائی سچ تو یہ ہے کہ ہوا بھی ایسا ہی۔

کچھ دنوں بعد اس نے اپنے کہنے کو کر کے بھی دکھا دیا اور آگے چل کر چڑیاں اڑانے والا یہی بچہ سچ مچ ترکستان کا صدر یعنی ایک طرح کا بادشاہ بنا۔

اس نے ترکستان کو آزاد کرایا اور وہاں جمہوری یعنی لوگوں کی حکومت قائم کی۔ اور پچھڑے ہوئے سماج کو گھسیٹ کر اوپر اٹھایا۔ عورتوں کو بھی آزادی کا سانس لینے کا موقع دیا۔ مطلب یہ کہ اس نے ایک طرح سے ترکستان کی دنیا ہی بدل دی۔

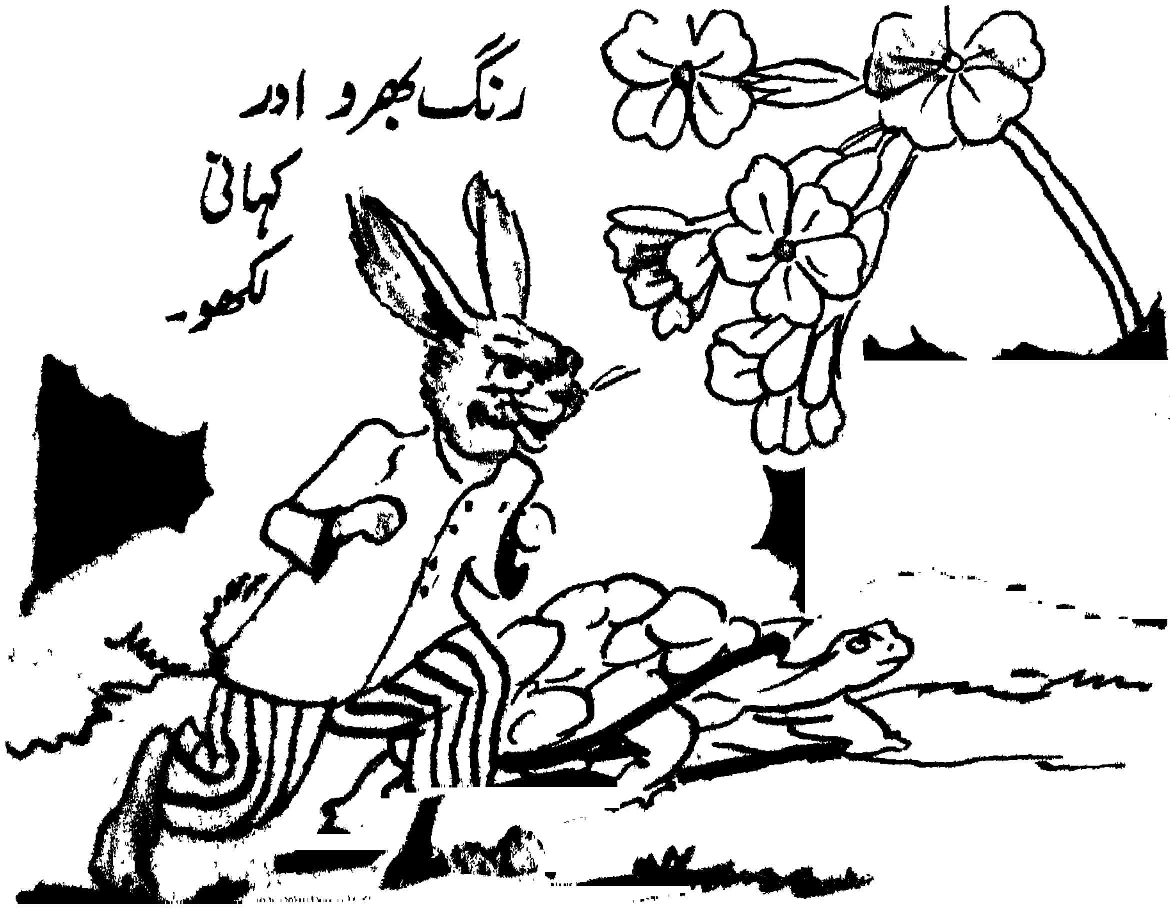
یہ بہادر آج سے پندرہ یا چودہ سال پہلے اس دنیا سے چل بسا۔ لیکن اس کا نام کمال اتاترک یا مصطفےٰ کمال ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آج کل ہمارے ملک میں کمال اتاترک کے وطن کے کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ یہ پڑھنے لکھنے کے شوقین اور اخبار و رسالوں وغیرہ کے ایڈیٹر ہیں۔ جو سارے ہندوستان کا دورہ کر رہے ہیں۔ اسے خوب گھوم پھر کر دیکھ رہے ہیں ابھی ابھی حیدرآباد، بمبئی، کلکتہ، بنگلور، مدراس وغیرہ صوبے اور شہر دیکھ کر آئے ہیں اور آج کل دہلی میں ہیں۔ دو ایک دن میں کشمیر کی سیر کو جائیں گے۔ ایک روز جب یہ دہلی آئے ہی تھے ہم بھی کسی طرح ان سے ملنے چلے گئے۔ ہم نے جاتے ہی بس پہلا سوال یہ کیا کہ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے ملک کے بچے کیسے ہوتے ہیں۔

کہنے لگے "بڑے فرماں بردار ہوتے ہیں۔ وہ حکومت کا حکم خوشی خوشی مانتے ہیں۔ مثلاً اگر حکومت طے کرے کہ سارے بچوں کو ٹیکہ لگوانا چاہیئے تو سب خوشی خوشی اس حکم کو مان لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کو اپنے نونہالوں پر بڑا اعتماد

ہے۔ اور ہاں ہمارے ملک کے بچے کچھ نہ کچھ بن رہے ہیں۔"

ہمیں یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ جب ہم چلنے لگے تو بجائے سلام کرنے کے ہم نے ان سے کہا "بین او لائے گن"، یہ سن کر وہ مسکرائے اور جواب میں انھوں نے بھی مصطفےٰ کمال کی بات "بین او لائے گن"، کو بار بار دہرایا اور کیوں نہ دہراتے وہ تو پیار میں مصطفےٰ کمال کو "اپنا باپ" یا بابو کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور برابر اپنے اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔



لطیفے

ماں۔ بیٹا! تمہارا منہ تو صاف ہوگیا۔ لیکن ہات پھر بھی گندا ہے۔ یہ کیا بات ہے؟

بیٹا۔ جی ہاں اماں۔ ہاتھ ہی سے تو منہ صاف کیا تھا۔

لطیف۔ کیوں ندیم! تمہارا بھائی کیسا ہے۔ کئی دن سے نظر نہیں آیا۔

ندیم۔ جی بیمار ہے۔ اس کے چوٹ لگ گئی تھی۔

لطیف۔ چوٹ کیسے لگی؟

ندیم۔ ہم لوگ ساتھ کھیل رہے تھے کہ کھڑکی سے کون زیادہ جھانک سکتا ہے اور وہ جیت گیا۔

لڑکے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک لڑکا ٹیلیفون کرنے لگا

لڑکا۔ (ٹیلیفون پر) کیوں صاحب! میں نے سنا ہے کہ آپ کو ایک نوکر کی ضرورت ہے۔ اگر ہو تو میں خدمت کے لئے تیار ہوں (ٹیلیفون رکھ دیتا ہے)

دوست۔ ارے یار تم اب بھی نوکری کی تلاش کر رہے۔ ابھی تو نوکری طے ہوئی ہے۔

لڑکا۔ میں نئی نہیں تلاش کر رہا ہوں۔ جن صاحب کے یہاں نوکری ملی ہے۔ اُن سے ہی بات پکی کرنا چاہتا تھا کہ کہیں کسی اور نوکر کے چکر میں تو نہیں۔

پولیس (چور سے) تم اندھیرے میں کیا کر رہے ہو؟

چور۔ چپ رہو تم کو بھی آدھا حصہ دوں گا۔

پولیس۔ میں چور نہیں ہوں پولیس ہوں۔

چور۔ ارے بابا میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ

تم پولس نہیں ہو۔

(نسیم احمد - بنارس)

ایک دوست:۔ یار تم نے کان میں چونی کیوں رکھ چھوڑی ہے؟

دوسرا۔ اس لئے کہ کہیں کانوں میں سردی نہ لگ جائے۔

محمد شکیل جمال مرادآباد

ایک شخص نے جیل خانے جاکر ایک قیدی سے کہا۔

"افسوس کہ تم جیسا نمازی یہاں ہے"

قیدی۔ جی میں مسجد ہی میں جانے کا قصوروار ہوں۔

آدمی:۔ وہ کیسے؟ مسجد میں جانے سے کوئی گرفتار ہوتا ہے۔

قیدی نہیں مجھ پر جوتیاں چرانے کا الزام تھا۔

لطیف، احمد اور شمیم ایک ساتھ جا رہے تھے۔ احمد میاں بیچ میں چل رہے تھے۔ لطیف اور شمیم دونوں ان کے دائیں بائیں تھے۔ لطیف کو مذاق سوجھا تو وہ احمد سے بولے۔

لطیف:۔ کیوں احمد میاں! سچ سچ بتاؤ تم گدھے ہو یا الو"

احمد میاں۔ دونوں کے بیچ میں۔

مجسٹریٹ:۔ (ملزم سے) تمہارے خلاف یہ الزام ہے کہ تم نے اس عورت کو ایک تھپڑ مارا

ملزم - جی ہاں

مجسٹریٹ۔ تم نے کیوں مارا؟

ملزم - وجہ یہ تھی کہ میں اور عورت بس میں پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت نے پہلے سیٹ پر بیٹھتے ہی اپنا پرس کھولا اور بند کردیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر پرس کھولا اور بند کردیا پھر کنڈکٹر کو دیکھتے ہی پرس کھولا اور بند کردیا پھر پرس کھولا اور بند کردیا پھر کنڈکٹر ہمارے پاس آگیا، اس عورت نے پرس کھولا اور بند کردیا، پھر پرس کھولا اور بند کردیا۔

مجسٹریٹ:۔ (بات کاٹ کر) تم نے یہ کیا کہ پرس [illegible]

رکھی ہے۔ مجھے "پرس کھولا اور بند کر دیا" کہہ کہہ کر پاگل بنا دو گے۔ بند کرو اپنی بکواس۔

ملزم۔ جی حضور یہی اثر تو مجھ پر ہوا تھا جو میں نے اس کو تھپڑ مار دیا۔

نوکر (اپنے مالک سے) جناب مجھے جتنی تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں میری گذر نہیں ہوتی۔ لہذا میری تنخواہ بڑھا دیجئے ورنہ ــــــ

مالک (بات کاٹ کر) ورنہ کیا کرو گے۔

نوکر جی ــــــ پھر اسی تنخواہ پر کام کروں گا

دفتر سے

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے۔



اندھے کی لاٹھی سے کون بچا

سیف احمد

ہرے ہرے ۔ مڑی ہوئی سرخ چونچ ۔ ٹیں ۔ ٹیں کرتا طوطا آپ نے ضرور دیکھا ہوگا ۔ بہت ممکن ہے پالا بھی ہو ۔ بچپن میں ہم نے بھی ایک طوطا پالا تھا ۔ سبز پروں میں سرخ چونچ کتنی بھلی لگتی ہے ۔ کچھ جملے ہم نے اسے سکھا دیئے تھے ۔ بس صبح و شام رٹ لگائے رہتا ۔ "بی جی بیجو" "میاں مٹھو" طوطے کی رٹ تو مشہور ہی ہے ۔ صبح صبح جب وہ پروں کو پھڑپھڑا کر کہتا "چھوٹے میاں اٹھو" "اٹھو صبح ہوگئی ۔" تو کتنی خوشی ہوتی ۔ بس کچھ نہ پوچھئے ۔ اس خوشی میں ہم اس کو اپنے حصّے کی چیزیں بھی کھلا دیتے تھے ۔ امرود پاتے ہی وہ خوشی سے چلّا اٹھتا ۔ "ٹیں ۔ ٹیں" "کتنا اچھا امرود ہے ۔"

ایک روز ہم سب کی نظروں سے بچتے بچاتے ۔ پنجرے کے قریب پہنچے ۔ ادھر ادھر دیکھا اور پنجرہ کا دروازہ کھول کر طوطے کو پکڑنا چاہا کہ گود میں بٹھا کر بسکٹ کھلائیں ۔ "اُف" جیسے ہی اس کو پکڑا ہماری انگلی لہولہان ہوگئی ۔ خون کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں ۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ۔ امّی دوڑی دوڑی آئیں ۔ چیخا چلّایا ۔ پنجرے کا دروازہ کھلا تھا ۔ طوطا موقع پاتے ہی یہ جا وہ جا ۔ پھُر سے اڑ کر نیم پر جا بیٹھا

سب پکارتے رہے۔ "میاں مٹھو" "میاں مٹھو آجاؤ"

"ٹیں۔ٹیں" نہیں آتے۔ اور وہ نہیں آیا۔ نہ معلوم کہاں کہاں گھوما۔ یہ کون جانے

ہمارے محلے میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام تھا۔ صابر۔ صورت شکل سے بہت بھولا لگتا تھا۔ مگر خدا کی پناہ بہت شریر، بہت تیز تھا۔ جب ہم مدرسہ جاتے تو ہمارا اور صابر کا ساتھ ہوا۔ دن بھر ادھر اُدھر مارے مارے پھرنا اس کا کام تھا۔ آج یہاں کل وہاں۔ ایک روز ایک باغ میں گھس گیا۔ امردوں کا موسم تھا۔ امرود خود بھی کھائے اور دوستوں کو کھلائے جب تک امرود کا موسم رہا وہ یہی کرتا رہا۔

ایک دفعہ اس کو کسی نے سکھا دیا کہ ماسٹر صاحب جب کچھ کہیں تو جی ہاں ضرور کہا کرو۔

ایک روز کسی لڑکے نے میز کا قلمدان الٹ دیا۔ سب لڑکوں سے پوچھا گیا۔ نہیں، نہیں کی آوازیں آنے لگیں۔ صابر سے پوچھا کیا تم نے روشنائی گرائی ہے ؟

وہ بولے "جی ہاں" بس پھر کیا تھا خوب پٹائی ہوئی۔ پھر تو یہی طے ہو گیا کہ صابر طوطا ہیں۔ رٹتے ہیں۔ سبھی لڑکے۔ اس کو طوطا کہہ کر پکارنے لگے۔ کھیل رہے ہوں تب۔ مدرسہ میں ہوں تب۔ اس کے اصلی نام کے بجائے طوطا طوطا کہنے لگے۔ نہ معلوم کیوں۔ جب کوئی طوطا کہہ کر پکارتا تو وہ اپنی مڑی ہوئی ناک کو کھجانے لگتے۔ "امی ہیں برابر ٹوکتی رہتیں۔" بڑے لڑکوں میں نہ بیٹھو۔ شریر لڑکوں میں نہ کھیلو" وہ مدرسہ کا ساتھی تھا۔ ہم کو اکثر کھانے پینے کے لئے جو پیسے ملا کرتے تو ہم اس کو شریک کر لیا کرتے۔ ایک روز ماسٹر صاحب نے ان سے کوئی سوال کیا۔ طوطے صاحب اپنا پیر ہلاتے رہے۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کوئی جواب نہ دے سکے۔ "تم بتاؤ" ماسٹر صاحب نے ہم سے دریافت کیا۔ ہم نے اس سوال کا جواب صحیح صحیح دیا۔ ماسٹر صاحب خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ "طوطے کے کان کھینچو" ہم طوطے کی صورت کو دیکھنے لگے۔ سانولی سانولی صورت اور کچی

آنکھوں سے جیسے کہہ رہا ہو ، "دیکھو ہم تمہارے ہی محلہ میں رہتے ہیں ۔ مدرسہ کے ساتھی ہیں کان نہ کھینچنا" ۔ مگر پھر ماسٹر صاحب ہمارے کان کھینچتے ۔ مجبوراً ہمیں طوطے کے کان اینٹھنے پڑے ۔ دوسرے دن سے طوطے نے مدرسہ آنا چھوڑ دیا ۔ مگر رہے ہماری تاک میں کہ موقع ملے اور مدرسہ کا بدلا لیں ۔

ایک روز ہم چلے جا رہے تھے ۔ چھوٹی بہن بھی ساتھ تھی ۔ دور سے دیکھا ۔ کچھ لڑکے ایک اندھے کے ارد گرد کھڑے اس کو چھیڑ رہے تھے ۔ قریب پہنچے تو دیکھا ۔ طوطے میاں پیش پیش ہیں ۔ کبھی لکڑی چھینتے ہیں ۔ —— کبھی ایک تھپیڑ مار کر بھاگ جاتے ہیں ۔ بڈھا کالیاں بک رہا ہے ۔ لاٹھی گھما رہا ہے ۔ اور لڑکے ہیں کہ چھیڑ رہے ہیں ۔ کیا منظر تھا ۔ بڈھا پریشان ہو کر لاٹھی گھما رہا تھا ۔





اور لڑکے تالیاں بجا رہے تھے۔

"شی۔ تی۔ بڑے میاں۔ بڑے میاں" بڑھا چونکا اور لاٹھی گھمانا بند کر کے بولا کیا ہے۔ "چپ چپ جس لڑکے نے تم کو چھیڑا تھا وہ آرہا ہے۔"

"اچھا ہے۔" لاٹھی پکڑ کر بڈھے نے اشتیاق سے پوچھا۔ ہم جب قریب آئے تو طوطے نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر بڈھے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم پٹتے رہے، روتے رہے۔ اندھے سے کہتے رہے۔ ہم نہیں تھے۔ ہم نہیں چھیڑ رہے تھے۔ اور لڑکے تالیاں بجا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ اور اندھا تمام غصہ ہمارے اوپر اتار رہا تھا

بہن بھاگی گئی۔ ابا میاں آئے جان بچی۔

ابا میاں کہنے لگے "بدوں کی صحبت دور ... نا چاہیئے"

مختلف بچے





کیسا بدلہ لیا

گھر میں سب بڑے سو رہے تھے۔ ساجدہ اپنے پلنگ پر کروٹیں بدل رہی تھی نیند کا دُور تک پتہ نہ تھا۔ پھر اتنے میں گھڑی نے گیارہ بجائے۔

ساجدہ اپنے دل میں خیال کر رہی تھی کہ یا اللہ آج میری نیند کو کیا ہو گیا۔ گیارہ بج گئے اور کمبخت نیند ابھی تک نہ آئی — ساجدہ کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی اور تھوڑی دیر میں اُسے نیند آگئی اور اس کی آنکھیں بند ہو چلیں [illegible] میں باورچی خانہ میں کسی چیز کے گرنے کی آہٹ ہوئی۔ ساجدہ اٹھ کر بیٹھ گئی سوچنے لگی یا اللہ یہ کیا ہے کہیں چور تو نہیں — اتنے میں پھر کسی چیز کے گرنے کی آہٹ ہوئی۔ اور ساجدہ کے منہ سے ایک چیخ کے ساتھ آواز نکلی۔ چور چور۔ اس آواز کو سنکر سب گھبرا کر جاگ اٹھے۔

حامد۔ کیا ہوا بیٹی

ساجدہ۔ ابا جان چور چور!! (کہتے ہوئے باورچی خانہ کی طرف اشارہ کیا)

حامد [illegible] باورچی خانہ کی طرف چلے ان کے پیچھے رشید بھی

[illegible]

حامد۔ [illegible] تو [illegible] بلی ہی سے ڈر گئیں۔

ساجدہ نے باورچی خانہ میں دیکھا کہ
بی خالہ اپنی سحری کا انتظام بڑے زور سے
کر رہی تھی۔
رشید:۔ آپ کی بیٹی بڑی دلاور ہیں
دیوؤں اور جنوں سے بھی نہیں ڈرتیں۔ کیوں
حمیدہ ہے نا۔
حمیدہ:۔ ہاں بھائی جان جب آپ نے
اس دن دیوؤں کا ذکر کیا تھا تو کہا تھا۔
"میں نہیں ڈرتی کسی دیو سے" حمیدہ
اپنی بھابی سے لپٹتے ہوئے بولی۔
رشید:۔ دیکھو کیسی خاموش بیٹھی ہیں جیسے
دراصل چور انھیں لوٹ کر ہی لے گیا۔
ساجدہ:۔ جی ہاں آپ کو ایسا ہی معلوم
ہوتا ہے جیسے میں بن رہی ہوں۔ چلئے
آپ تو بڑے رستم ہیں۔ ہم ڈرپوک ہی سہی۔
پھر اپنے اپنے پلنگ پر سب دراز
ہو گئے۔ اور ساجدہ اپنے خیالوں میں ڈوب
گئی۔ مجھے انھوں نے شرمندہ تو کیا ہے
میں بھی اس کا بدلہ لئے بغیر نہ مانوں گی
میں بھی تو دیکھوں کتنے رستم ہیں۔ ساجدہ
انھیں خیالوں میں سو گئی۔ صبح ہوئی سب
نے منہ دھویا۔ ناشتہ کے وقت صبح رشید
صاحب بیوی کی طرف دیکھ کر بولے "میاؤں"
اور بڑے بڑے نوالے لینے شروع کر
دیئے۔ ساجدہ رات کے واقعہ کو یاد کر کے
کچھ نہ بولی اور اپنی چائے کی پیالی لے کر
ختم کر کے کھڑی ہو گئی۔
حمیدہ:۔ بھابی آپ نے تو کچھ بھی ناشتہ
نہیں کیا۔
ساجدہ:۔ حمیدہ دیکھو تمھارے بھائی جان
بلّے بن گئے اور میرا کھانا بھی ہضم کر گئے۔
رشید:۔ کھسیانی ہنسی ہنس کے۔ دیکھو!
حمیدہ ڈریں تو یہ، اور الٹا مجھے بنا رہی ہیں
یہ کہکر رشید کالج۔ پڑھانے چلے گئے۔
کچھ دنوں کے بعد رشید اپنے کمرے میں
امتحان کی کاپیاں جانچ رہے تھے۔ اور سب
کو اپنے پاس آنے کو منع کر دیا تھا۔ ساجدہ
دو تین دفعہ زینہ پر گئی اور رشید کو کام کرتا
دیکھ کر واپس لوٹ آئی۔ پھر ساجدہ دوسری
مرتبہ کوٹھے پر گئی اب ساجدہ مردانا بھیس
بدل چکی تھی۔ رشید اپنے کمرے میں سو گیا
تھا۔ ساجدہ میز کی گھنٹی پر انگلی رکھتے

ہوئے میز پر جھکی ۔ گھنٹی کی آواز سے رشید جاگ اٹھا اور دیکھا کہ میز کے پاس ایک سوٹ میں کوئی شخص کھڑا ہے اور اطمینان سے گھڑی ۔ فونٹین پن اور منی بیگ پر قبضہ کر رہا ہے ۔ رشید کے منہ سے بیساختہ نکلا ۔ چور ، چور ، چور ،

رشید کی آواز سن کر ان کے والد بہن اور والدہ دوڑی ہوئی آئیں ۔

حامد :۔ بیٹا کہاں ہے چور

رشید ۔ اس کمرے میں

حامد :۔ اس کمرے میں گئے اور ٹارچ کو جلا کر دیکھا کہ ساجدہ خاموش سر جھکائے تینوں چیزوں پر قبضہ کئے کھڑی ہے

حامد (ہنس کر) رشید بڑے بیوقوف ہو اپنی بیوی کو چور بنا دیا ۔

رشید :۔ نہیں ابا جان وہ تو سوٹ بوٹ میں تھا ۔ کیا میں مردانے اور زنانے کپڑے نہیں پہچانتا ۔

ساجدہ :۔ لیجئے رستم صاحب آپکی امانت چور واپس کرتا ہے

رشید شرما گیا اور کمرے میں قہقہوں کی آواز بلند ہوئی

قیصر حسین عمر ۱۲ سال

لالچ کا نتیجہ

ریاض اور منیر دو کسان تھے ۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے ۔ ریاض کے پاس بیس بیگھے کھیت اور ۶ بیل تھے اور منیر کے پاس صرف ۸ بیگھے کھیت اور ۳ بیل ۔ اس لئے ریاض اس کو ذلیل سمجھتا اور حقارت سے پیش آتا تھا ۔ مگر منیر، ریاض کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا اور اس کی عزت کرتا تھا ۔ ریاض بالکل اس کے برعکس تھا ۔ ریاض کی خراب حرکتوں سے سارا گاؤں تنگ آچکا تھا ۔

قدرت بھی منیر ہی کے ساتھ تھی ۔ خدا کے فضل سے منیر کے یہاں ریاض کی بہ نسبت کچھ زیادہ غلہ پیدا ہوا تھا ۔ اس لئے ریاض منیر سے جلنے لگا ۔ ایک روز کا قصہ ہے کہ جب منیر اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا ، ریاض نے اسے پیچھے سے جا کر ایک زوردار طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا ۔ "بدمعاش ! بتا تو مجھے کون سا ایسی ترکیب

معلوم ہے جس سے تو مجھ سے کم کھیت اور بیل رکھنے کے باوجود مجھ سے زیادہ غلّہ پیدا کرتا ہے؟" غریب منیر کچھ نہ کر سکا۔ اور ریاض کی اس حرکت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے ریاض سے جان چھڑانے کے لئے کہا "بھئی میں کیا بتلاؤں۔ صرف اتنا سن لو کہ میں نے اپنے تین بیلوں میں سے ایک کو ختم کر ڈالا۔ اور اس کی کھریں لیکر "رام پور" نامی ایک گاؤں میں گیا۔ وہاں لقمان نامی ایک بہت بڑے جادوگر رہتے ہیں۔ میں نے ان کی سرپرستی میں ان کھروں کی بدولت ان سے کچھ جادو سیکھا۔ اب ان کھروں میں یہ اثر ہو گیا ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر جو مراد بھی مانگی جائے، پوری ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کھروں کی بدولت زیادہ غلہ پیدا کرتا ہوں۔"

ریاض بڑا لالچی تھا۔ اس نے فوراً ہی منیر کی باتوں پر یقین کر لیا اور بغیر سوچے سمجھے اپنے کل بیلوں کو مار ڈالا اور منیر کے کہنے کے مطابق "رام پور" کی طرف روانہ ہوا۔ پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ وہاں لقمان نام کا کوئی جادوگر نہیں ہے۔ چنانچہ ریاض چپ چاپ منہ لٹکائے واپس آگیا۔ وہ اپنی قسمت کو کوستا ہوا اپنے گاؤں واپس آیا۔ اب ریاض کے کل بیل ختم ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ بیکار ہو گیا۔

منیر نے اور بھی اچھے اچھے بیل خرید لئے۔ منیر کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی دیکھ کر ریاض اور جل گیا۔ اسے خبر نہ ہوئی اور پھر منیر سے جا کر اس نے سوال کیا "یہ بیل تمھیں کہاں سے ملے؟" ریاض کو دیکھتے ہی منیر کچھ گھبرا گیا۔ مگر فوراً ہی متین صورت بنا کر اس نے جواب دیا "کوئی چھ سات مہینے کی بات ہے میں فلاں دریا میں نہانے گیا۔ وہاں پریوں نے میرا شاندار استقبال کیا اور مجھے اچھے اچھے بیل بطور تحفہ دیئے۔" ان سب باتوں کو سنکر ریاض کے دل میں پھر لالچ پیدا ہوئی اور دوسرے ہی روز وہ دریا کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وہ دریا میں کود پڑا اور ڈوب گیا۔ اس کے مرنے کی خبر سنکر سارا گاؤں خوش ہوا..... سچ ہے لالچ اور نفرت، بغض اور کدورت انسان کی جان لے لیتے ہیں انسان کو ہمیشہ ان سے بچنا چاہئے۔

محمد کلیم خاں مہر پور

سید جمال علی نظامی

اگر میرے پاس علا دین کا چراغ ہوتا

تو سب سے پہلے میں اُس کے دیو کو حکم دیتا کہ مجھے تمام آسمان کی سیر کرا، تاکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ چاند اور تارے کس چیز کے بنے ہوئے ہیں۔ اور سورج کیا چیز ہے اور اس کا اثر موسم پر کس طرح اور کیوں پڑتا ہے۔ پھر کہتا کہ مجھے ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچا کہ میں ہمالیہ کی سیر کروں اور اس کی لمبائی چوڑائی وغیرہ معلوم کرکے اپنے ساتھیوں کی معلومات بڑھاتا۔ اگر وہ سچ نہ سمجھتے تو دیو سے کہہ کر پہاڑ کی برف منگا کر دکھاتا۔ پھر دو چار دن آرام کرنے کے بعد دنیا کے تمام بڑے بڑے سمندروں کی سیر کرانے کے لئے دیو کو حکم دیتا۔ وہ فوراً میرے حکم کی تعمیل کرتا جیسے علا دین کی کرتا تھا۔ اور مجھے بھی آناً فاناً تمام سمندروں کی سیر کرا دیتا۔ میں ہر سمندر کی ایک بڑی سے بڑی مچھلی پکڑوا کر ساتھ لاتا اور اس کا بچا ہوا اپنے مرغی خانہ کی مرغیوں کو کھلاتا۔ اور مچھلی کے گوشت سے تمام شہر کی دعوت کرتا۔ اگر کھانے میں کمی ہوتی تو فوراً دیو کو ایک ڈانٹ سنا کر کھانا منگاتا اور برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی منگا کر اپنے مہمانوں کو پلاتا۔ کسی کسی دن اپنے ماسٹر صاحب اور اپنی جماعت کے ساتھیوں کی بھی دعوت کرتا اور ایسے عمدہ عمدہ کھانے کھلاتا کہ بس ساتھی بھی انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ پھر میں اس دیو کو حکم دیتا کہ تمام جامعہ کو

سونے کا بنا دے جب وہ بنا دیتا تو بجری کے بجائے ہیرے جواہرات بچھواتا۔ جب ان پر سورج کی پیاری کرنیں پڑتیں تو وہ ساری عمارت جگمگا اٹھتی۔ پھر دیو سے کہتا کہ تمام دنیا میں جتنے غریب ہیں ان کے گھروں میں ایک ایک تھیلی اشرفیوں کی ڈال کر آ۔ جتنا حصہ ہمارے ملک کا قحط میں گرفتار ہے وہاں اناج کے ڈھیر لگا دے۔

۲ دو کارٹون





ویرن بوجھ نے
یہ کارٹون بنایا
عمر ۱۴ سال
بمبئی

اطہر پرویز

ایماندار لکڑہارا



ایک بڈھا لکڑہارا دریا کے کنارے لکڑی چیرا کرتا تھا۔ ایک دن اس کا کلہاڑا دریا میں گرگیا۔ بچارا غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ بھی تو نہ تھا کہ اور کلہاڑا خرید سکے۔ مگر کرتا تو کیا کرتا۔ چپ چاپ اُداس ہوکر ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ دریا کے اندر سے اِندر دیوتا نکلے۔ لکڑہارا بیچارہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اندر نے پوچھا کہ "بڑے میاں کیا حال ہے۔ کیوں چپ چاپ بیٹھے ہو" بڑے میاں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھوں نے کل ماجرا کہہ سنایا۔ اِندر دیوتا نے کہا۔ "اچھا ٹھہرو میں تمھارا کلہاڑا پانی میں سے نکال کر لاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ پانی کے اندر چلے گئے اور ذرا سی دیر میں سونے کا ایک کلہاڑا لے کر نکلے۔ لکڑہارا غریب تھا تو کیا، آدمی تو ایماندار تھا



سونے کا کلہاڑا دیکھ کر بولا۔

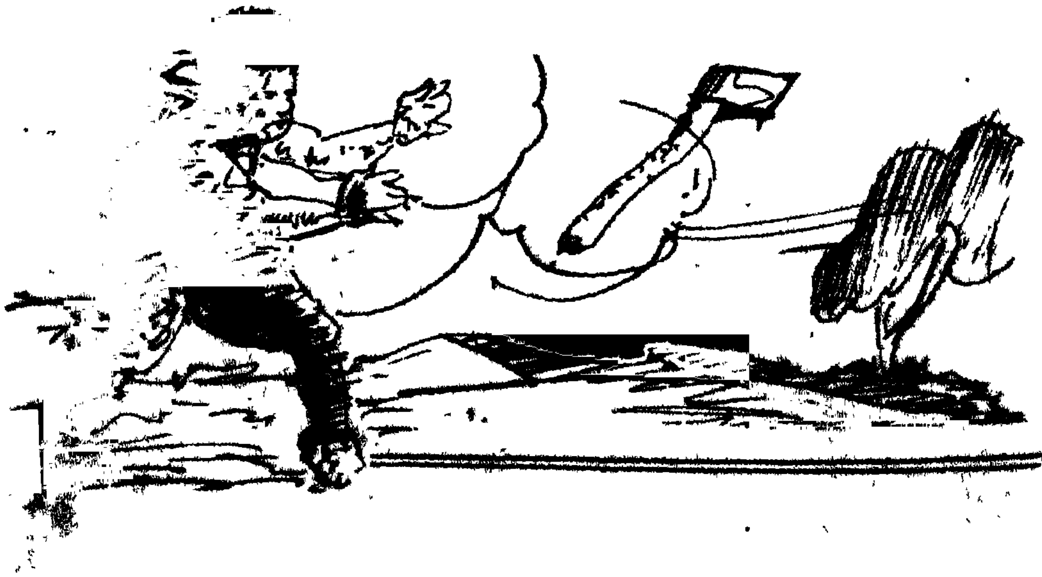
"نہیں جی۔ یہ میرا نہیں ہے۔ میرا تو لوہے کا تھا۔"

اندر دیوتا نے پھر پانی میں ایک غوطہ لگایا اور اس بار جو نکلے تو ان کے ہاتھ میں چاندی کا ایک کلہاڑا تھا۔ اس بار بھی بڑے میاں نے وہی جواب دیا۔

"بھئی یہ بھی میرا نہیں۔ میرا تو لوہے کا ہے"

اب کے بار جو اندر دیوتا نے غوطہ لگایا تو لوہے کا ایک پرانا کلہاڑا ان کے ہات میں تھا۔ "یہ ہے میرا" بڑے میاں چیخ ہی تو پڑے۔ بھئی آپ کا بڑا احسان ہے جو آپ کی بدولت مجھے اپنی چیز واپس مل گئی۔ ورنہ پھر میرا تو کوئی اور سہارا بھی نہ تھا۔"

"تم تو بڑے ایماندار آدمی ہو ــــ اس ایمانداری کے بدلے میں تم کو سونے اور چاندی کے دونوں کلہاڑے انعام میں دیئے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اندر دیوتا نے وہ دونوں کلہاڑے بھی بڑے میاں کے حوالے کر دیئے۔ اب تو بڑے میاں مالامال ہو گئے۔ ان کے دن سچ پوچھو تو پلٹ گئے۔ اور پاس پڑوسیوں کو معلوم ہو گیا کہ لکڑہارے کے پاس بہت دولت اکٹھا ہو گئی۔ سب لوگ اس سے حسد کرنے لگے۔ اس کا ایک پڑوسی بڑا لالچی تھا۔ اس نے بھی سوچا کہ کیوں نہ اپنی





قسمت آزمائی کی جائے۔ بس پھر کیا تھا وہ اسی دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے اپنے کلہاڑے کو جان بوجھ کر دریا میں گرا دیا پھر اسی طرح اندر دیوتا آئے۔ ویسے ہی سونے کا ایک کلہاڑا لیکر نکلے اور بولے۔ کیوں جی یہی تمھارا کلہاڑا ہے" وہ آدمی تھا لالچی قسم کا۔ بولا جی ہاں میرا ہی ہے" "بیوقوف گدھے" اب مت پوچھئے اس کے غصہ کا کیا حال ہوا۔

پھر تو اس کو اتنی سزا دی کہ جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔

اندر دیوتا اس کو مارتے جاتے اور کہتے جاتے "جھوٹے بدمعاش لوہے کا کلہاڑا اور وہ بھی ٹوٹا ہوا ـــــ پھر جان بوجھ کر پھینکا۔ اور دھوکا دیتا ہے"۔ بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر بھاگا۔ چلو لوہے کا کلہاڑا گیا تو گیا، جان تو بچ گئی۔



جادو سے بتاؤں

آئیے ہم آپ کو ایک ایسی ترکیب بتائیں جس سے آپ دوسروں کے بارے میں بغیر جانے بتا سکتے ہیں اور لوگ یہ سمجھیں گے کہ آپ جادو جانتے ہیں۔

مثلاً آپ بغیر یہ جانے کہ کس کے گھر میں کتنی لڑکیاں اور کتنے لڑکے ہیں۔ اپنے حساب کی مدد سے صحیح صحیح بتا سکتے ہیں۔

پہلے تو آپ اپنے دوست سے پوچھئے کہ بتاؤ۔ ہمارے پڑوسی کے کتنے لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ وہ بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی نہیں بتا سکتے۔ اب آپ کہئے کہ "آپ نہیں بتا سکتے۔ لیکن میں بتا سکتا ہوں کہ آپ کے پڑوسی کے کتنے لڑکے اور لڑکیاں ہیں"

وہ کہیں گے۔" اچھا بتایئے۔

اپنے دوست سے کہئے "آپ کے پڑوسی کے جتنے لڑکے ہوں اُن کی تعداد کو دوگنا کر دیجئے۔"

وہ کہیں گے "کر دیا"

تو پھر کہئے۔

"اب اس دوگنے کا پانچ گنا کر دیجئے۔"

وہ پھر کہیں گے کہ کر دیا۔

اب ان سے کہئے کہ "اس طرح جو عدد آیا ہو اس میں ان کی لڑکیوں کی تعداد

کو جمع کر دیجئے ــــــ اور بتائیے کہ کل کتنا ہوا۔

اب جو تعداد بتائیں اس کی اکائی کا ہندسہ تو لڑکیوں کی تعداد کا ہوا اور دہائی کے ہندسے میں لڑکوں کی تعداد ہوئی۔ آپ بتا دیجئے کہ اتنی لڑکیاں ہیں اور اتنے لڑکے۔

فرض کیجئے کہ چار لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں لہذا۔

۴ لڑکوں کا دگنا ۸

۸ " " پچگنا ۴۰

۲ لڑکیاں ہونے پر برہوگیا ۴۲

اس میں اکائی کا ہندسہ ۲ ہے اور دہائی کا ۴ اس طرح حساب ٹھیک آگیا۔

آپ کہیں گے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ بھئی بڑا آسان طریقہ ہے ہم نے دراصل لڑکوں کی تعداد کو دس گنا کردیا ہے۔ پہلے دگنا بعد میں پچ گنا جس سے اصل تعداد کی اکائی میں صفر بڑھ جاتا ہے اور دہائی کی جگہ اصل ہندسہ اپنی جگہ پر رہتا ہے وہ نہیں بدلتا۔ اس کے بعد جب لڑکیوں کی تعداد جمع کی جاتی ہے تو آپ کو اکائی کے ہندسے میں لڑکیوں کی تعداد صحیح صحیح معلوم ہوجاتی ہے۔

بس اس بات کا خیال رکھئے کہ لڑکوں کی تعداد کو اپنے دوست سے دس گنا نہ کرائیے ورنہ آپ کا دوست فوراً سمجھ جائے گا کہ آپ کس طرح بتاتے ہیں۔ اس کے بعد پہلے دگنا کرائیے پھر پچ گنا۔

اب تو آپ لوگوں کو کافی حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔

کلّو اور مینا کی کہانی









پروفیسر سوماناتھ در

درزی اور جن کی کہانی

ایک قدیم کشمیری کہانی

ایک درزی اور جولاہے میں بڑی دوستی تھی۔ ایک بار دونوں سفر کو نکلے۔ وہ جانا چاہتے تھے تو کسی ایسی جگہ جہاں ان کی آمدنی زیادہ ہو سکے۔

دو دن کے سفر کی تکلیف اٹھانے کے بعد جولاہے کی ہمت تو ٹوٹنے لگی اور اسے گھر کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی سے کہا: "کل رات میں نے اپنے بیوی بچوں کو خواب میں دیکھا کہ وہ میرے لئے رو پیٹ رہے ہیں



اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے واپس جانا چاہئے۔

درزی نے یہ سن کر بلا تامل کہا۔ "بھئی اگر یہ بات ہے تو ضرور چلے جاؤ۔"

اب جولاہا تو واپس چلا گیا لیکن درزی اکیلا چل پڑا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیتل کا ایک گز تھا اور دوسرے میں ایک قینچی...... ان کو دیکھ کر اس کی ہمت اور بڑھی۔

اندھیرا ہوتے ہوتے وہ ایک جنگل میں پہنچ گیا۔ اندھیرا گھپ، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ چاروں طرف سے ڈراؤنی

آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اب بچارا درزی کرتا تو کیا کرتا۔ ذرا سی دیر میں اس کی نظر ایک سیڑھی پر پڑی جو پاس ہی ایک اونچے پیڑ سے لگی ہوئی تھی۔ اب تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا لیکن جتنا ہی وہ سیڑھی پر چڑھتا وہ اور اونچی ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا سانس بھی پھولنے لگا۔ لیکن جیسے ہی وہ ہمت ہارنے والا تھا تو اس کا پاؤں جیسے کسی لکڑی کے فرش پر پڑا۔



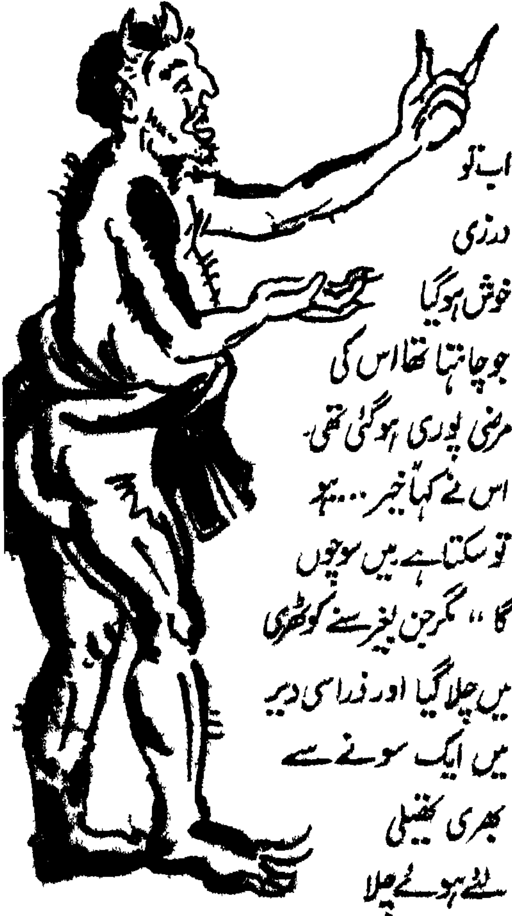
...نے کوٹھری نظر آئی
...یں ایک سوراخ سے روشنی چھن رہی تھی
...کی جان میں جان آئی۔ اس نے سوچا کہ اب
...سیدھا کرنے کو جگہ مل گئی مگر وہ تو یہ سوچ ہی رہا
...کوٹھری کا دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ اس میں سے ایک
...جن نکلا۔ اس کے پیروں سے تو ایسا معلوم ہوا جیسے فرش چڑ چڑ بول رہا ہے....

...... وہ درزی کو دیکھتے ہی دہاڑا۔ "تم یہاں کیسے آئے"

درزی اس کے تیور دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ اس کا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ لیکن وہ آدمی تھا بہادر اور دماغ کا تیز اس نے اپنے آپ کو فوراً سنبھالا۔ اور جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف دی مگر کیا کروں حضرت سلیمان کا حکم ہے کہ جاڑوں کے لئے انھیں کپڑے چاہیئے۔ معاف کیجئے کہ اس کے لئے مجھے آپ کی کھال چاہیئے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ ہی میں قینچی چلائی جیسے وہ اُسے تیز کر رہا ہو۔

"اوہ"....... جن چیخ اٹھا اور اس نے اپنا قدم پیچھے ہٹالیا۔ اب تو درزی میاں مزے میں تھے اور جن صاحب کانپ رہے تھے۔ ویسے تو وہ جن لمبا تڑنگا تھا۔ مگر جتنا ہی موٹا تازہ تھا۔ اتنی ہی اس کی عقل چھوٹی تھی۔ اس لئے ڈر گیا اور بولا۔

"نہیں نہیں ایسا مت کرنا۔ تم اس کے لئے کسی اور کو ڈھونڈھ لو میں تم کو خوش کروں گا"



اب تو درزی خوش ہو گیا جو چاہتا تھا اس کی مرضی پوری ہو گئی تھی۔ اس نے کہا "خیر..... یہ تو سکتا ہے میں سوچوں گا" مگر جن بغیر سنے کوٹھری میں چلا گیا اور ذرا سی دیر میں ایک سونے سے بھری تھیلی لئے ہوئے چلا آیا۔ اور درزی سے بولا "لو بھئی یہ تھیلی اور اپنے کام کے لئے کسی اور کو تلاش کر دو"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کر لیا۔ درزی میاں کا یہ حال کہ ان کو اپنی سدھ نہ رہی کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں یا سر کے بل انھوں نے کسی نہ کسی طرح ساری رات درخت

جڑ میں گذار دی۔ صبح ہوتے ہی اپنے گھر کا راستہ پکڑا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے۔ اور سب سے زیادہ تو جولاہا جس نے اُسے آدھے راستہ سے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے درزی سے پوچھا۔

درزی نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اب تو جولاہا بھونچکا رہ گیا۔ چنانچہ اس نے درزی سے کہا کہ کیوں نہ دوبارہ پھر چلا جائے ہو سکتا ہے کہ کچھ اور مل جائے۔

درزی میاں کو تو اس کا مزا مل ہی گیا تھا۔ خوشی خوشی تیار ہو گئے۔ ایک دن صبح صبح دونوں دوست نکل پڑے۔ تین دن کے بعد وہ اسی جنگل میں پہنچے۔ اندھیرا گھپ تھا۔ مگر ذرا سی دیر میں انھیں سیڑھی مل گئی۔ ہانپتے کانپتے وہ اوپر پہنچے۔ وہاں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوٹھری سے سانس تک کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ نیچے شور کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے جو دیکھا تو ان کا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بیسیوں جن آگ کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے حضرت سلیمان سے کچھ دعا مانگ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک پجاری بنا ہوا تھا۔ جو آگ میں کچھ ڈال رہا تھا۔

اب تو جولاہے کی حالت خراب ہو گئی۔ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ اتفاق سے درزی کے ہوش و حواس قائم تھے۔ اس کو وقت پر سوجھ ہی تو گئی فوراً چیخ کر بولا۔

" جلدی جلدی باندھو میں قینچی اور گز لاتا ہوں "

یہ سننا تھا کہ جنوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ سب کے سب جنگل کی طرف بھاگے پجاری جن بھی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ درزی کی نظر جو آگ کے پاس پڑی تو اس نے دیکھا کہ وہاں سونے اور قیمتی پتھروں کا ڈھیر ہے۔

درزی نیچے اتر آیا اور اس نے جولاہے کو اٹھایا اور دونوں نے وہ سب دولت اکٹھا کی اور گھر واپس آ گئے۔ اب درزی اور جولاہے نے اس کو آپس میں تقسیم کر لیا



اور بڑی شان و شوکت سے رہنے لگے۔ اب جب یہ دونوں دوست کسی راستے سے گذرتے تو گاؤں کے لوگ یہی کہتے "یہ دو بہادر جا رہے ہیں جنھوں نے جنگل کے جنوں کو ہرایا ہے"

ترجمہ — اطہر پرویز

کارٹون



نوبل پرائز

دنیا کا سب سے بڑا انعام

نوبل پرائز کا ذکر تو آپ نے سنا ہوگا۔ آیئے ہم آپ کو اس انعام کے بارے میں کچھ بتائیں اور اس کے جاری کرنے والے الفرڈ نوبل کا حال بتائیں۔

نوبل پرائز ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو کوئی بڑا کام کرتے ہیں یا کوئی بڑی اچھی کتاب لکھتے ہیں، یا دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے کوئی کام کرتے ہیں۔ یہ انعام آٹھ ہزار پونڈ کا ہوتا ہے جو لگ بھگ سوا لاکھ روپیہ کے برابر ہوتا ہے۔ ہمارے ہندستان میں کئی آدمیوں کو یہ انعام ملا ہے۔

ایک تو بنگال کے مشہور شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو ایک کتاب "گیتانجلی" لکھنے پر ملا تھا۔ ایک انعام سر جگدیش چندر بوس کو بھی مل چکا ہے۔ یہ ہمارے ملک کے بہت بڑے سائنس داں گذرے ہیں۔ انھوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ انسانوں کی طرح پودوں میں بھی تو جان ہوتی ہے بس فرق اتنا ہے کہ وہ ہماری طرح بات چیت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس تحقیقات کی وجہ سے ان کو نوبل پرائز دیا گیا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ آخر یہ الفرڈ نوبل کون تھا جس کا انعام ہمیشہ دیا جاتا ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آیئے ہم آپ کو اس کا حال سنائیں۔

الفرڈ نوبل سویڈن کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ تجارت کرتا تھا۔ نوبل

کی پیدائش سویڈن کے دارالخلافہ اسٹاک ہالم میں ۲۱ر اکتوبر ۱۸۳۳ء کو ہوئی اور ۱۸۹۶ء میں ۶۳ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ الفرڈ نوبل کی پیدائش کے وقت اس کا باپ کنگال ہو گیا تھا۔ یوں تو الفرڈ کا باپ بڑا پڑھا لکھا اور ذہین انسان تھا۔ مگر اسے تجارت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے رہی سہی پونجی ختم ہو گئی۔

جب الفرڈ نوبل نو برس کا ہو گیا تو اس کے گھر والے غریبی سے تنگ آکر وطن سے رخصت ہوئے اور سینٹ پیٹرس برگ میں چلے گئے۔ یہ شہر روس کا پایہ تخت تھا۔ اب اسے لینن گراڈ کہتے ہیں۔ اس بڑے شہر میں الفرڈ کچھ عرصے گھر ہی پر لکھتا پڑھتا رہا۔ پھر آگے کی تعلیم کے لئے گھر سے باہر نکلا اور پورے یورپ کی خوب سیر و تفریح کی۔ اس نے پانچ زبانیں سیکھ لی تھیں۔ اب اس نے اپنے باپ کے ساتھ سائنس کے تجربات کرنے میں بہت سا وقت گذارا۔ جب وہ انجینیری اور کیمسٹری میں ماہر ہو گیا تو ۲۹ سال کی عمر میں اس نے "نیٹرو گلیسرین" دریافت کی ــــــ نیٹرو گلیسرین کی ملاوٹ سے بعد میں ڈائنامیٹ تیار ہوئی۔ پھر تو اس نے لگاتار محنت شروع کر دی۔ اور بہت خطرناک تجربوں کے بعد ۱۸۶۷ء میں ڈائنامیٹ ایجاد کی۔ یہ بارود کی قسم کی ایک چیز ہے۔ بڑے بڑے پہاڑوں کا نام و نشان اس سے مٹایا جا سکتا ہے۔ اس کا گولہ کہیں پڑ جائے تو پاس پڑوس کے لوگ مر جائیں۔ الفرڈ کا چھوٹا بھائی بھی ایک بار گولہ پھٹنے سے مر گیا تھا۔ ایسی خطرناک چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا کتنا مشکل ہے۔ اس لئے الفرڈ نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔

جب اس نے "ڈائنامیٹ" کی ایجاد کی تو اسے فوراً پیٹنٹ کرا لیا تاکہ کوئی اس کی نقل تیار کر کے اس تجارت میں اس کو نقصان نہ پہنچائے۔ وہ بڑا سمجھدار تاجر تھا۔ اس نے اپنی ایجادوں کی سختی سے حفاظت

کی اور دنیا میں ایک نئی صنعت کی بنیاد رکھی اور بے انتہا دولت پیدا کی۔ اب تو اس کے تجربہ اور تجارت کی شہرت دور دور پھیلنے لگی وہ لگاتار سفر میں رہنے لگا۔ لوگ اسے مذاق میں "یورپ کا سب سے بڑا آوارہ گرد" کہتے تھے۔

الفرڈ نوبل بڑا محنتی تھا۔ رات دن کام میں لگا رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کافی دولت پیدا کی۔ وہ دولت مندوں کی طرح کنجوس یا لالچی نہ تھا۔ اس نے اپنے ملازموں اور مزدوروں کے رہنے سہنے کے لئے اچھے ہوادار مکان بنوائے۔ انھیں اپنے نفع میں سے حصہ بھی دیتا تھا۔

اس نے ڈائنامیٹ کی ایجاد اس لئے نہ کی تھی کہ لڑائیوں میں اس سے جان لی جائے اس نے کئی بار صاف صاف کہا میں نے یہ ایجاد صرف اس لئے کی ہے کہ اس سے دنیا بھر میں چٹانیں اور پہاڑوں سے پتھر اکھاڑے جا سکیں اور کانوں کے اندر سے ہر قسم کی دھات نکالی جا سکے۔"

الفرڈ نوبل جنگ کا سخت دشمن تھا۔ وہ کبھی یہ پسند نہ کرتا تھا کہ دو قومیں ایک دوسرے سے جھگڑا کریں بلکہ آپس میں امن اور صلح سے رہیں۔

الفرڈ نوبل نے اسی واسطے ایک خاص انعام بھی مقرر کیا کہ اگر کوئی شخص ایسا اچھا کام کرے جس سے قوموں میں آپس میں دوستی پیدا ہو جائے یا فوجیں بالکل نہ رہیں یا کم ہو جائیں یا اس قسم کی انجمن بنائے جس سے دنیا میں امن ہو جائے۔ تو وہ انعام اسے دیا جائے۔

وہ ایک عورت سے شادی کرنا تھا مگر اتفاق سے اس کا انتقال ہو گیا۔ اسی سے اس نے اپنی تمام جائداد نیک کاموں میں خرچ ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے تمام عمر شادی

اس نے اپنی جائداد خرچ کرنے وصیت خود لکھی۔ اب اس کی آمد سے ہر سال ہزاروں انعام دیئے جاتے ہیں۔ یہ انعام ہر قوم، ہر ملک، اور ہر مذہب کے عورت مرد لے سکتے ہیں۔ اس میں رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں۔

رفیق ملک

آدھی ملاقات

جب میں جامعہ میں پڑھتا تھا تو اس زمانے میں بھی پرچہ نکلتا تھا۔ مگر اب تو اس ننھے سے پیام تعلیم نے کافی ترقی کر لی ہے۔ پٹنے تک میں نام پیدا کر لیا ہے۔ اس پیام تعلیم کی عمر بھی تو ۲۶ سال کی ہو گئی ہے۔ آپ دس پرچے کمیشن کاٹ کر نادر اینڈ کو کو بھیج دیا کریں۔ میں اور خریدار بنانے کی کوشش کروں گا۔

آفتاب محسن۔ پٹنہ ۴

آپ کا لکھا ہوا خط ملا۔ پڑھ کر مسرت ہوئی۔ پچھلے پیام تعلیم میں مجھے کئی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ یہ خبر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ خریدار ڈھونڈنے پر انعام دیتے ہیں۔ تو میں نے دو خریدار بنوا دئے ہیں۔ اور بنوانے کی کوشش کر رہی ہوں تاکہ اچھی اچھی کہانیوں کی کتابیں انعام میں حاصل کروں۔

یاسمین ریحان۔ گیا

آپ کا کارڈ اور رسالہ ملا۔ پڑھ کر ایسی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ رسالہ ہاتھ میں آنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہا۔ میں دو ایک لطیفے ارسال خدمت کروں گا۔

میں عنقریب گھر جانے والا ہوں۔ کیوں کہ میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ دعا فرمائیں۔ اگلے ماہ سے رسالہ گھر کے پتہ پر روانہ کریں۔

تسنیم الدین حماد۔ گلاوٹھی

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے

۱۰ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ ڈاک کے ٹکٹ کی صورت میں

پیامی معمہ نمبر ۱۲

دائیں سے بائیں

(۱) دنیا کا سب سے بڑا ____ بیجاپور میں ہے

(۴) بعض حالات میں ذاتی ____ کا اظہار نہ کرنے والے عموماً زندگی میں کامیاب رہتے ہیں۔

۶۔ ____ کی زندگی ہی کیا؟

۷۔ ____ یہ خطرناک شے ہے

۸۔ ____ اس کے خلاف قدم اٹھانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ (چار حرفی)

۹۔ اچھے بچے ہمیشہ استادوں کی ____ کرتے ہیں

اوپر سے نیچے

۱۔ دنیا کی سب سے بڑی سڑک ____ ٹرنک روڈ ہے

۲۔ بعض اوقات اس سے کام لینا ہی پڑتا ہے

۳۔ جس معاملے سے اپنا تعلق نہ ہو اس کی ____ کرنے سے فائدہ؟

۵۔ ضعیف آدمی ____ کھانا پسند کرتے ہیں (تین حرفی)

حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۵۲ء ہے۔

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر پانچ روپے

دوسرا انعام ایک غلطی پر تین "

تیسرا " دو " " ۲ "

پیامی معمہ نمبر ۱۲

	گ		د		ں	گ
ہ	ب	۵		غ	ا	گ
ت	ر	ر		ر	ہ	ا
		م		گ	ا	ں
د	ج	ا				د
		ی		ت	ت	

کوپن پیامی معمہ نمبر ۱۲

نام ....

پتہ ....

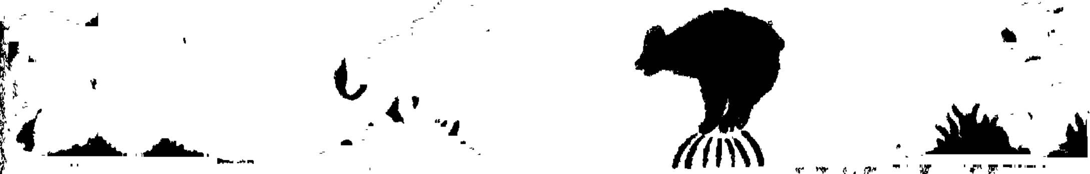
....

نوٹ:۔ پیامی معمہ ۹ میں انعام پانے والوں کے نام مئی کے پرچے میں شائع کئے جائیں گے۔

پرنٹر پبلشر: محمد حسین حسان نے دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ جامعہ نگر سے شائع کیا۔

علامہ اقبال مرحوم

Regd. No. D. 96.
APRIL. 1952.





پیامِ تعلیم

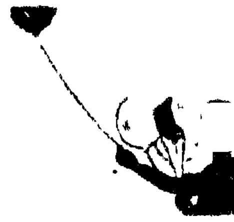


دہلی







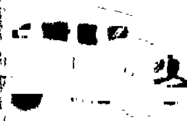












مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ

جامعہ نگر، دہلی













ے مزے میں بیٹھی کھانا کھا رہے
ں - ڈائننگ ہال میں نہیں -- کھلی
ھوا میں



آپا جان پڑھا رہی ہیں



ج کے اخبار کی خبریں کیا ہیں ؟
پڑھ کر دیکھئے

پیام تعلیم

چھبیسواں سال



فہرست

ادارہ

حامد علی خاں

بی۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز

ایم۔ اے (علیگ)

سالانہ چندہ

۴ روپے

فی پرچہ

۶ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ دہلی

بچوں سے باتیں

پچھلے سال کی طرح اس سال پھر مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے کھلی ہوا کے مدرسے کا لطف اُٹھایا ۔ آپ سوچیے گا کہ وا بھائی واہ ! یہ کس قسم کا نیا مدرسہ ہے ، مگر بھئی چونکنے کی بات ن بس ذرا سوچنے کی بات ہے ۔ سال بھر تو بچے اپنے مدرسے کی عمارتوں میں پڑھتے ہیں لیکن ایک سا ایسا بھی ہوتا ہے جب اُن کا مدرسہ ان عمارتوں سے نکل کر خیموں میں پہنچ جاتا ہے ۔ جہاں یہ دن رات رہتے ہیں ۔ اس سے تفریح تو خیر ہوتی ہی ہے ، لیکن بہت سے تعلیمی فائدے بھی ایک جگہ پڑھتے پڑھتے بچے گھبرا جاتے ہیں ، اُنھیں گھٹن سی ہونے لگتی ہے ۔ پڑھنے لکھنے سے د دلچسپی کم ہو جاتی ہے ۔ اسی لئے جامعہ میں یہ کھلی ہوا کا مدرسہ کیا جاتا ہے تاکہ بچوں کو موقع وہ فطرت کو قریب سے دیکھ سکیں ۔ خیموں میں سپاہیانہ زندگی گذاریں ۔ پڑھنے لکھنے کے ساتھ انھیں ہاتھ سے کام کرنے کا موقع ملے ۔ اس طرح استادوں کو بھی درسی کتابوں سے ہٹ کر اور سکھانے پڑھانے کا موقع آسانی سے مل جاتا ہے ۔

اسی لئے تو مدرسہ ابتدائی کے بچے اور استاد سال میں چند دنوں کے لئے اپنے مدر سے ہٹ کر کسی پُر فضا مقام پر جا کر خیمے لگاتے ہیں اور ایک ہفتہ تک بڑی دلچسپ ز گذارتے ہیں ۔ اس کا حال آپ کو اندر کے صفحات میں ملے گا ۔

اس سال بھی یہ مدرسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا اور سچ پوچھئے تو جہاں آندھی اور ا نے بچوں کے خیمے کو گر گرا گیا ، وہاں اس میں جان بھی ڈال دی ۔ ہم سب کو یہ دیکھ

طالب بچوں میں کتنا حوصلہ ہے - وہ مصیبتوں کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے نہیں - اس بار جب آندھی آئی تو سب یہی سوچنے لگے کہ اب مدرسہ کیا ہو سکے گا۔ لیکن بچے کہیں آندھی اور طوفان سے گھبرانے والے تھے - انھوں نے جامعہ کے پرچم کو اسی طرح لہرایا -

ہمیں افسوس ہے کہ صفحوں کی کمی کی وجہ سے اس مدرسے کی زیادہ تفصیلات ہم نہ دے سکے۔ مگر نجمہ سلطان صاحبہ کا مضمون پڑھ کر آپ کے سامنے مدرسہ کی پوری تصویر آ جائے گی -

ٹائٹل کے صفحات میں آپ کو کھلی ہوا کے مدرسے کی کچھ تصویریں ملیں گی - جن کو دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدرسہ کیسا ہوگا - تصویروں کے لئے ہم عبید الحق صاحب کے شکر گذار ہیں -

اس مدرسے کی کامیابی پر ہم بچوں کے ساتھ ساتھ مدرسہ ابتدائی کے نگراں جناب سید حسن صاحب اور پروگرام ڈائرکٹر محترمہ مشیر فاطمہ صاحبہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں جنھوں نے اپنی کوششوں سے اس کو دلچسپ اور کارآمد بنایا -

---

شرائط پیامی معمّا (۱) ایک خانہ کی فیس داخلہ ۱ر - ۶ خانوں کی فیس ۵ر فیس ٹکٹوں کی صورت میں آنا چاہیئے (۲) سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو اسپیشل انعام بھی ملے گا (۳) ایک روپیئے انعام تک کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کی جائے گی ـــــ (۴) حل روشنائی سے صاف ہونا چاہیئے مشکوک اور کٹے پھٹے حل مقابلے میں شریک نہ ہوں گے (۵) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ لڑکے ہوں گے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائے گا (۶) ایک لڑکے کو ایک ہی انعام یا انعام کا ایک ہی حصہ ملے گا (۷) معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری ہوگا -

اپنے حل آپ اس پتہ پر بھیجیں - اڈیٹر پیامی معمّا - مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر دہلی -




چاند میں پریاں رہتی ہیں

افسر کی تین نظمیں

اماں! باجی کہتی ہیں
"چاند میں پریاں رہتی ہیں"



رات کو پر پھیلاتی ہیں اور اتر کر آتی ہیں
سب بچوں کو سلاتی ہیں اور پھر خواب دکھاتی ہیں

اماں! باجی کہتی ہیں
چاند میں پریاں رہتی ہیں




میں تو آج نہ سوؤں گا رات گئے تک جاگوں گا
باہر باغ میں بیٹھوں گا چاند کی پریاں دیکھوں گا

اماں! باجی کہتی ہیں
چاند میں پریاں رہتی ہیں

علم کی مایا

جاگو جاگو سونے والو سو سو کر دن کھونے والو
دنیا جاگ اٹھی ہے کب کی نیند تمھاری ہے کس ڈھب کی
جاگنے والوں نے سب کچھ پایا اُٹھ کے سمیٹو علم کی مایا
علم نے گرتوں کو بھی سنبھالا علم سے ہے دنیا میں اجالا
جن قوموں نے ترقی کی ہے وہ سب لکھ پڑھ کر ہی کی ہے

آؤ آج سے کرلیں ارادہ
ان پڑھ اب کوئی نہ رہے گا

بیٹے کا جھوٹ

اک گھوسی کے اک لڑکا تھا سیدھا سادھا بھولا بھالا
گھوسی بولا اس لڑکے سے "پانی کا لوٹا تو اٹھا لا"
وہ لڑکا جب لوٹا لایا باپ نے دودھ اس لوٹے میں ڈالا
اور پھر پوچھا اس لڑکے سے "سمجھا کچھ گڑ بڑ جھالا؟"
لڑکا بولا "ہاں میں سمجھا دودھ میں پانی آپ نے ڈالا"
اتنا جھوٹ ارے او لڑکے تیرا منھ ہو جائے کالا
پانی میں دودھ ہے ڈالا میں نے یا ہے دودھ میں پانی ڈالا؟
جھوٹ نہ سیکھ ابھی سے بیٹا
"تو ہے بہت ہی بھولا بھالا"

حامد اللہ افسر

مشتاق بھائی

ایک سائنس داں کی کہانی

ہوٹل شہر کے باہر ایک جنگل کے قریب تھا۔ یہاں دور دور کے سیاح، مسافر اور سیلانی آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ رات کافی جا چکی تھی۔ لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ نیچے کے بڑے کمرے میں صرف چند لوگ اور منیجر اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ منیجر نے سوچا اب اتنی رات گئے اس آندھی طوفان میں بھلا کون مسافر آئے گا۔ اس لئے اب وہ بھی چلنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اتنے میں سامنے کا دروازہ کھلا۔ ایک عجیب آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں ایک لمبا تڑنگا آدمی ہاتھ میں بیگ لئے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک کپڑوں میں ڈھک رکھا تھا۔ ہاتھ میں دستانے تھے۔ سر پہ ہیٹ۔ آنکھوں پر موٹی عینک، گردن، کان، منہ، ناک غرض گردن سے اوپر کا پورا حصہ ڈھکا ہوا۔

ہوٹل کا منیجر اور بیرے آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بھوت کے قصے کی بھنک ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ انھیں کچھ کچھ شبہہ ہونے لگا۔

سائنس داں ہوٹل کے منیجر کی طرف بڑھا اور اس نے کہا "مجھے ایک کمرہ چاہئے سب سے الگ تھلگ۔ اور جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے کمرے میں نہ آنے پائے



ملازموں کو بھی ہدایت کر دو کہ بغیر میری اجازت کے، میرے کمرے میں پاؤں نہ رکھیں۔"

منیجر:۔ بہت اچھا جناب۔ منگو! صاحب کو ۱۳ نمبر میں پہنچا دو۔ اور صاحب کی خدمت تمھارے ہی ذمہ ہے۔"

منگو صاحب ذرا ضرورت سے زیادہ بہادر واقع ہوئے تھے۔ سائنس داں کا حلیہ دیکھ کر انھیں پہلے ہی کپکپی چڑھ رہی تھی۔ اب جو وہی اس کی خدمت پر مقرر کئے گئے تو ان کا دم ہی تو نکل گیا۔ گر مرتا کیا نہ کرتا آگے آگے ہو لئے۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے جاتے تھے کہ ان کے اور سائنس داں کے بیچ کا فاصلہ کہیں کم نہ ہو جائے۔

بارے خدا خدا کر کے وہ سائنس داں کو لئے کمرہ نمبر ۱۳ کے قریب پہنچے۔ وہ ہی سے انھوں نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"حضور وہ رہا آپ کا کمرہ" یہ کہا اور الٹے پیر واپس۔

سائنس داں نے اندر جا کر کمرہ بند کر لیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا کپڑے اتارے اور لیٹ گیا۔ وہ روز صبح تڑکے

اٹھتا اور اپنے جسم کو کپڑوں میں لپیٹ کر مطالعہ کرنے بیٹھ جاتا۔ وہ ہمیشہ اپنا کمرہ اندر سے بند رکھتا۔ کبھی کمرے کے باہر نہ نکلتا۔ بس وہ تھا اور کتابیں۔ ملازم کھانا لے کر آتا تو پہلے دروازے پر دستک دیتا سائنس داں اپنا کان، ناک، منہ سب کچھ کپڑے میں لپیٹ لیتا۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیتا۔ اس کے بعد اٹھ کر دروازہ کھولتا۔

اس طرح اس نے پندرہ دن سکون سے گزارے۔ اس کا مطالعہ کامیاب رہا جیوں جیوں وہ پڑھتا جاتا تھا اسے کامیابی کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ لیکن ادھر ہوٹل میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ جدھر دیکھو لوگ بیٹھے کھسر پھسر اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے پر ایک نظر دیکھنے کے لئے بیتاب بھی تھے۔ یہ دنیا بھی عجیب چیز ہے۔ ذرا کوئی عام ڈگر سے ہٹا اور پیچھے پڑ گئے۔ گویا لوگوں سے الگ ڈھنگ سے رہنے کی خواہش کوئی بہت عجیب خواہش تھی۔ بہت سے لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کے درازوں میں سے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن شکر ہے کہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور وہ ڈرنے اور بھوت چلانے کی خوشی سے محروم رہے۔

پر قسمت کو منظور نہ تھا کہ سائنس داں یہاں بھی سکون سے رہ سکے۔ ایک روز وہ دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ وہ ایک نیکر اور ہاف قمیض پہنے میز پر چڑھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اتنے میں استاد منگو جھوٹے برتن لینے آئے۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی ہی تھی کہ دروازہ کھل گیا ——— سامنے کرسی پر صرف نیکر اور ہاف قمیض بیٹھی تھی۔ منگو کو اپنی طرف گھورتا دیکھ کر سائنس داں کا پارا آسمان پر پہنچ گیا۔ استاد منگو منہ پھاڑ کر "بھوت" ہی کہہ پائے تھے کہ سائنس داں ان کی طرف تیزی سے بڑھا۔ نیکر اور قمیض کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر استاد منگو دیو کی طرح وہیں جم کر رہ گئے۔ سائنس داں نے ان کی گردن دبوچ لی۔ یہ چلانے اور چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ سائنس داں نے ان کی گردن کسنی شروع کر دی

اس ہاتھا پائی میں استاد منگو کی گردن کستی گئی سانس گلے میں اٹک گیا اور استاد منگو کی جان کا پنچھی ان کے بدن سے اڑ گیا۔

ادھر ان کا بے جان جسم دھڑ سے فرش پر گرا۔ ادھر بہت سے لوگ اور پولیس کمرے میں گھس آئی۔ سائنس داں ایک طرف کو بھاگا۔ نیکر اور قمیض کو بھاگتے دیکھ کر پہلے تو لوگ گھبرائے۔ مگر پولیس والے سیٹیاں بجاتے اور ڈنڈے گھماتے اس کی طرف کو جھپٹے۔ سائنس داں نے جلدی سے قمیض اتار کر پھینک دی۔ اب کمرے میں چاروں طرف صرف ایک نیکر بھاگتا پھر رہا تھا۔ جب پولیس والے ڈنڈے گھماتے نیکر کے قریب آگئے تو سائنس داں نے نیکر اتار کر ان کے منہ پر دے مارا۔

سائنس داں اب سب کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑا مسکرا رہا تھا اور لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ جو اس کے قریب سے گزرتا سائنس داں اس کے سر پر ایک ٹیپ جماتا۔ جب کئی لوگ چپت کھا چکے تو لوگوں نے بے تحاشا ڈنڈے گھمانے شروع کر دیئے۔ یہ دیکھ کر کہ اب جان بچنی مشکل ہے۔ سائنس داں کھڑکی میں سے اتر کر ایک طرف کو چل دیا۔ (باقی آئندہ)

جواب

بڑھیا کی وصیت

" بڑھیا نے جو وصیت کی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے دو باپ اور دو بیٹے دراصل تین ہی آدمی ہیں۔ دادا۔ باپ اور بیٹا۔ ان میں باپ بیٹا بھی ہے اس طرح یہ تین آدمی دو باپ اور دو بیٹے بھی ہو سکتے ہیں۔

ان تینوں آدمیوں میں ۹۹۹ روپیہ تقسیم کر دیجئے۔ تو ہر ایک کے حصہ میں ۳۳۳ روپے آ جائیں گے۔



ہمارا کھلی ہوا کا مدرسہ

نجمہ سلطان اتالیق مدرسہ ابتدائی جامعہ

آیئے ہم آپ کو کھلی ہوا کے مدرسہ کا کچھ حال سنائیں۔ جامعہ کے بچے تو اس سے لطف اٹھا چکے ہوں گے۔ لیکن اور لوگ حیران ہو رہے ہوں گے کہ یا اللہ یہ کھلی ہوا کا مدرسہ کیسا ہوتا ہے ہم تو روز صبح اٹھتے ہیں۔ منہ دھو، ناشتہ کر، بستہ بغل میں دبا، سیدھے اسکول پہنچے۔ جہاں کلاس کے بند کمرہ میں بیٹھ کر پڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں کھلی ہوا کہاں۔

اچھا تو سنئے۔ جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کے بچے ۱۷ مارچ کو کھلی ہوا کے مدرسہ کے لئے تیار ہوئے۔ مدرسہ ابتدائی کے بچوں کو تو آپ سب جانتے ہی ہوں گے۔ وہی جنہوں نے ۲۱ فروری کو ایک دن کا مدرسہ چلایا تھا

ہاں تو تیاری تو بہت دنوں سے تھی۔ ارے خوشی کے بچوں کی نیندیں حرام ہوگئیں خیر صاحب ۱۷ مارچ بڑی خوشی کا دن تھا۔ خیمے۔ تانا تیں، اور بچوں کا سامان لاری کے ذریعہ اوکھلے کی نہر کے پار پہونچا دیا گیا اس کے بعد ہر بورڈنگ کے استاد اور اتالیق صاحبان نے اپنے بچوں کو قطاریں کھڑا کیا اور چل کھڑے ہوئے

نہر پر پہنچ کر سب بچوں نے اپنا اپنا کام بانٹ لیا اور بڑی مستعدی سے خیمے کھڑے کرنے لگے۔ ہمارے ننھے معمار کس خوشی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ کوئی کھونٹے گاڑ رہا تھا کوئی رسّہ پکڑے کھڑا تھا۔ کوئی چلّا رہا تھا۔ دیکھئے باجی یہ اپنا کام چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔

کوئی کہتا تھا۔ ماسٹر صاحب! ماسٹر صاحب! یہاں نہر میں کچھوے بہت ہیں۔ اور کیا کچھوے کے کان بھی ہوتے ہیں؟۔ دوسرے لڑکے نے کہا "ارے بھئی خاموشی سے کام کرو ورنہ ماسٹر صاحب کا اسٹیم تیز ہو جائے گا" غرض اسی طرح ہنسی خوشی سب نے اپنے اپنے خیمے کھڑے کر لئے۔ اب سجاوٹ کی باری آئی۔ کوئی جنگلی پھول لا رہا تھا۔ تو کوئی پورے درخت ہی اکھاڑ لاتا تھا۔ ہر جماعت کے پاس دو خیمے تھے۔ سب نے الگ الگ طریقہ سے ان کو سجایا تھا۔ دو خیمے استادوں کے لئے تھے۔ ایک خیمے میں سب استاد تھے اسی میں ہسپتال بھی تھا۔ دوسرے میں، میں اور اول جماعت کی آپا جان تھیں۔ اسی کیمپ میں لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک جگہ قناتیں تان کر مسجد بنائی گئی تھی۔ اور ایک خیمہ مطبخ کے لئے تھا۔ اگرچہ کھانا جامعہ ہی سے پک کر آتا تھا۔ مگر ہر جماعت روز کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور پکاتی تھی۔ چہارم جماعت کے بچے بھی کام کرنے اور سجاوٹ میں کسی طرح اپنے بڑے بھائیوں سے کم نہیں تھے۔ سوم۔ دوم اور اول کے بچے بھی پیچھے نہیں تھے۔ بچے استاد اور اتالیق سب مل کر کام کر رہے تھے کیونکہ اگر سب مل جل کر کام نہ کرتے تو کیا مزا آتا۔

خیر بھائی پہلا دن تو چیزیں بنانے اور سامان ٹھیک کرنے ہی میں کٹا۔

لیجئے شام تک ایک نئی دنیا تیار ہو گئی۔ ہر جماعت نے اپنے اپنے خیموں کے نام چونے سے لکھ دیئے۔ مثلاً ششم جماعت کے بچوں کے کیمپ کا نام تھا "گلزار کیمپ"۔ پنجم کا تھا "نئی زندگی کیمپ"۔ چہارم جماعت کا تھا "نوبہار کیمپ"۔ سوم کا تھا "شہاب کیمپ"۔ اول اور دوم کے چھوٹے بچے ایک جگہ تھے۔ ان کے کیمپ کا نام تھا "پھول کیمپ"۔

رات ہو گئی۔ اب سب کو پہرے کی فکر ہوئی۔ جلدی جلدی ٹارچیں دیکھی گئیں۔ پھر پہرے والے لڑکے جمع ہو گئے۔ ہر جماعت سے آٹھ لڑکے اور چار استاد پہرہ کے لئے لئے گئے تھے۔ اور اس طرح ترتیب دی گئی تھی کہ دس سے بارہ تک ایک استاد اور اس کے ساتھ ہر جماعت کے دو لڑکے۔ پھر بارہ سے دو تک دوسرا استاد اور دوسرے دو لڑکے۔ اس طرح ایک وقت میں ایک استاد اور مختلف جماعتوں

کے آٹھ لڑکے پہرہ پر ہوتے تھے۔ ہر گھنٹہ کے بعد پہرہ والے لڑکوں کو چائے دی جاتی تھی۔ پہلے رمز کی پہچان کا لفظ (Watch Word) تھا۔ زندہ باد۔ یعنی اگر رات کے کسی حصہ میں کوئی لڑکا اپنے خیمہ سے باہر نکلتا تھا تو پہرہ دار کے پوچھنے پر کہ کون ہے۔ بجائے اپنے نام کے " زندہ باد" کہتا تھا۔

سب لڑکے صبح ہی گھنٹی کی آواز پر اٹھ بیٹھے، منہ دھویا، دانت صاف کئے۔ کپڑے بدلے۔ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد اک اک پیالی چائے پی۔ اور اپنے اپنے استادوں کے ساتھ لالٹین بتاتے ہوئے مشاہدہ کے لئے چلے گئے۔ ہر جماعت سے چار لڑکے خیمہ کی حفاظت اور آرائش کے لئے مقرر کئے گئے۔ یہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ان کو جنرل مانیٹر نے رات ہی کو منتخب کر دیا تھا۔ اب کل دوسرے چار لڑکوں کی باری ہوگی۔

آٹھ بجے سب بچے مشاہدہ سے واپس آگئے۔ ناشتہ کی پہلی گھنٹی بجی۔ کھانا مانیٹر اپنی اپنی ڈیوٹی پر بھاگے جارہے تھے باقی لڑکے جلدی جلدی بال درست کرنے لگے۔ ورنہ پھر مانیٹر صاحب ناشتہ میں کیسے بیٹھنے دیں گے۔ یہاں بڑی زوردار بھوک لگی ہے۔ بھلا مشاہدہ میں گئے تھے۔ سورج نکلتے دیکھا۔ بڑی خوبصورت چڑیاں دیکھیں۔ اور دنیا بھر کی چیزیں دیکھ کر آئے ہیں۔ آخر کیسے بھوک نہ لگتی۔ ناشتہ ہو گیا جامعہ کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ کچھ بچوں کو جوش جو آیا تو لگے گانے :" یہ جامعہ کا پرچم "

اب نو بج گئے۔ لیجئے گھنٹہ بجا۔ اب پڑھائی کا وقت آگیا۔ ہر استاد اپنی اپنی جماعت کے ساتھ کسی سایہ دار درخت کی تلاش میں ہے۔ پرانے زمانہ کی طرح درختوں کے نیچے بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔

گیارہ بج گئے۔ گھنٹہ بج گیا۔ ارے یہ سب بچے اپنی اپنی تولیہ صابن اور جانگیہ لئے کہاں بھاگے جارہے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا استاد یا اتالیق اپنے بچوں کو تیراکی کے لئے لئے جارہے ہیں۔

ذرا سی دیر بعد تیراکی بھی ختم ہو گئی۔ اب ذرا سستا لیں۔ یہ کون بچہ ہے۔ جو ہاتھ میں لالٹین دار کاغذ لئے ہر استاد یا اتالیق کے پاس چکر لگا رہا ہے۔ اب سمجھ میں آیا۔ بچوں

کے اخبار کے ایڈیٹر صاحب ہیں۔ مضمون کے لئے ہر جماعت کو کاغذ دے رہے ہیں۔ اور قلم دوات کا بھی وعدہ کرتے جاتے ہیں کہ اگر کسی لڑکے کے پاس نہ ہو تو مجھ سے لے۔ ہر جماعت مضمون لکھے گی۔ اور پھر یہاں روزانہ اخبار نکلے گا۔

اب کھانا کھایا۔ اور سب بچے اپنے اپنے خیموں میں آرام کے لئے پہنچ گئے۔ استادوں نے کاپیاں دیکھیں۔ سب نے مشاہدہ کی رپوٹیں تیار کیں۔ جس لڑکے کا مضمون اچھا تھا۔ جلدی سے اخبار کے لئے خوشخط لکھنے بیٹھ گیا لیجئے وہ ایڈیٹر صاحب پھر آموجود ہوئے۔ یہ مضمون لئے بغیر نہیں جائیں گے۔

اب یہ کیا کاغذ ہے جو جنرل مانیٹر لئے پھر رہے ہیں۔ کبھی سمجھے نہیں۔ یہ کیمپ فائر کی نقلوں کا چارٹ ہے۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج کون کون سی نقلیں ہوں گی۔ جو لڑکے یا لڑکیاں اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان کو جمع کیا گیا اور ایک دفعہ نقلیں مشق کے طور پر کرلی گئیں۔ اب تین بج گئے پھر مشاہدہ کے لئے تیار ہوئے۔ ساڑھے چار بجے مشاہدہ سے واپس آئے۔ چاء پی ناشتہ کیا۔ اور اب "پسند اپنی اپنی" کا وقت ہے دیکھئے کیا تماشہ ہو رہا ہے۔

ششم کے لڑکے تو اپنے مرغی خانہ کی فکر میں تھے۔ پنجم کے لڑکے خوانچہ سنبھال رہے تھے۔ یا نئے اور پرانے گاؤں کا ماڈل بنانے کی فکر میں تھے۔ چہارم کے لڑکے اپنے خیموں کے سامنے چونے سے جامعہ کا مونوگرام بنا رہے تھے۔ کوئی بینک کی فکر میں تھا اور کسی کو بینک سے پیسے تو نہیں نکلوانے ہیں۔

عشاء کی نماز کے بعد کیمپ فائر ہوا۔ بھئی کیا مزے مزے کی نقلیں تھیں۔ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ساڑھے نو بجے کیمپ فائر بھی ختم ہوا سب مہمان اپنے اپنے گھر گئے۔ اب پہرے کی تیاری ہونے لگی۔

اسی ہنگامے میں دوسرا تیسرا دن بھی گذر گیا تیسرے دن رات کو کیمپ فائر کے وقت سے ہوا تیز تھی۔ کسی نے زیادہ پرواہ بھی نہیں کی کہ کیا ہونے والا ہے۔ قریب بارہ بجے ہوا نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع

کیا۔ اس کے بعد تو اچھا خاصہ طوفان تھا۔
اندھیرا گھپ اور ہوا کی شائیں شائیں۔ واقعی
ڈر لگنے لگا۔ مگر بہادر اور نڈر بچے اپنے اپنے
استادوں کے ساتھ خیموں کو پکڑے کھڑے تھے
یا اللہ خیر کر۔ "چل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو"
کی آوازیں اس آندھی کے شور میں دب کر رہ
جاتی تھیں۔ اسی طرح چار بجنے کو ہوئے۔ اب
تک ایک خیمہ بھی نہیں گرا تھا۔ جامعہ کا پرچم بھی
شان سے لہرا رہا تھا۔ اور آندھی کی رفتار بھی
سست پڑ گئی تھی۔ بچے سوچنے لگے۔ اب دعائیں
قبول ہو گئیں۔ مگر کہاں چلتے چلتے آندھی نے
وہ زور باندھا کہ جامعہ کا جھنڈا بھی سرنگوں ہوا
اور اس کے ساتھ دیکھتے دیکھتے اول دوم اور
چہارم کے خیمے اور پھر ہمارا خیمہ جھک گیا۔

بچوں کو اسی جھکے ہوئے جھنڈے کے
نیچے بٹھایا گیا۔ بچے سب خاموش تھے۔ اس
کے بعد چند استاد بچوں کو لیکر جامعہ چلے گئے
صرف ششم، پنجم الف اور ب کے بچے اور
کچھ چہارم کے رہ گئے۔ اور صبح کو نکلتے ہوئے
سورج نے گرے ہوئے خیموں اور گرد میں
اٹے ہوئے بچوں اور استادوں کو دیکھا۔

مگر بچے کب ہار ماننے والے تھے۔ صبح ہوئی ا
سب بچے پھر کھلی ہوا کے مدرسہ کی طرف بھاگے
پھر وہی رسی اور کھونٹے۔ اِدھر آندھی کہتی تھی
کہ اب کھلی ہوا کا مدرسہ ہو نہیں سکتا۔ ادھر خیمہ
کھڑا کیا ادھر گرا۔ نہ آندھی رکتی تھی۔ اور نہ ہم سب
ہی جانے کا نام لیتے تھے۔

آخر کب تک۔ استاد تھک گئے۔ کچھ لوگو
نے مشورہ دیا۔ بس اب چلنا چاہیئے۔ اخبار دیکھا
گیا کہ موسم کا اندازہ ہو جائے۔ مگر اس سے
بھی اطمینان نہیں ہوا۔ مگر بھئی بغیر بچوں کی مرضی
کے کیسے جا سکتے ہیں۔ پہلے ان کی رائے تو لی
جائے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے سیٹی دی۔ اور سب
ایک ایک کر کے آموجود ہوئے۔ پوچھا گیا
سب نے کہہ دیا نہیں جائیں گے۔ ہم یہیں تعلیم
کریں گے۔ ایک چھوٹے بچے نے کہا "ا
ہم ابھی سے اسی طرح ہمت ہاریں گے
بڑے ہو کر کیا کر سکتے ہیں۔ ہم بہادر ہیں
ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔" دوسرے نے
"ڈر کر بھاگ جانا بزدلوں کا کام ہے۔"
اسی طرح بچے چلاتے رہے۔ پھر کیا

بچوں کی بات مانی پڑی۔

اور پھر آن کی آن میں دوبارہ خیمے کھڑے ہوگئے۔ شام ہوتے ہوتے۔ پھر وہی بہار تھی۔ دیکھو بچو! اگر انسان ہمت نہ ہارے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو نہیں ہرا سکتی۔ اب بچوں میں نیا حوصلہ تھا۔ اسی لئے تو چہارم کے بچوں نے مٹی سے کنول کا پھول بنایا تھا۔ اور اس پر نیا خون، نیا حوصلہ چاقو سے کھود کر سیندور بھرا تھا۔ سوم کا خیمہ بھی کھڑا ہوا۔ مگر ایک بچی کا خیال تھا کہ ہمارا خیمہ کبھی نہ گرتا اگر اس کا نام "شہاب ثاقب" نہ ہوتا۔ کیونکہ شہاب ثاقب ٹوٹنے والے تارے کو کہتے ہیں

اس دفعہ اور زیادہ احتیاط برتی گئی۔ بچوں کا خیال تھا کہ چاہے کچھ ہو یہاں سے نہیں جائیں گے۔ ارادہ کی مضبوطی ہو تو ایسی ہو آخر بچوں کے اس حوصلہ اور استقلال کا موسم کو بھی ساتھ دینا پڑا اور آندھی بھی بڑبڑا کر مدرسہ ابتدائی کے ننھے معصوم بچوں کی بہادری اور استقلال پر آفریں کہہ کر چپ ہوگئی۔

پھر وہی سرگرمیاں تھیں۔ وہی شاندار مشغلے اسی طرح ۲۵ مارچ کا آخری دن آپہنچا۔ سب دل بھر کر اپنے خیموں کو سجا رہے تھے کیونکہ کل تو جانا ہی ہے۔ نئے نئے ماڈل بن رہے تھے۔ اخبار بھی بڑی آن بان کے ساتھ نکلا۔ چہارم کے بچوں نے مدرسہ ابتدائی کا ماڈل مٹی سے تیار کیا تھا۔

شام ہوگئی بڑی چہل پہل تھی۔ بہت سے مہمان آئے تھے۔ جن کو لڑکے سیر کراتے پھر رہے تھے۔ لیجئے معائنہ کا وقت بھی آگیا جو لوگ معائنہ کے لئے تشریف لائے تھے انھوں نے بچوں سے مختلف سوالات کئے مثلاً چہارم کے بچوں سے پوچھا۔ یہ کنول کی کلی کیوں بنائی اور اس پر نیا خون اور نیا حوصلہ کیوں لکھا۔ جو بچہ وہاں اس وقت کھڑا کیا گیا تھا اس نے جواب دیا " اس لئے کہ ہم ابھی کلی ہیں۔ اور آپ پھول ہیں۔ ہمارا نیا خون ہے آپ کا خون پرانا ہوچکا ہے " اس پر سب بہت ہنسے۔ کھلی ہوا کے مدرسہ کی تصویریں آپ کو پیام تعلیم کے اسی پرچے میں نظر آئیں گی۔

۲۶ مارچ کو ہم سب وہاں سے روانہ ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے وہ جگہ ویران ہوگئی۔

جہاں دس دن تک خوب چہل رہی۔ وہ بھی عجیب منظر تھا۔ روز تو سجاتے تھے۔ اس دن اجاڑ رہے تھے۔ بستر بندھے رکھے تھے، سامان لاری میں لادا جا رہا تھا۔ کوئی پھاوڑے سے زمین برابر کر رہا تھا۔ کوئی کوڈالی لئے کے گڑھوں کو بند کر رہا تھا۔ لیجئے سب کام ہو گیا۔ اور دوپہر تک ہم سب جامعہ آگئے۔

اعلان

۱۔ دفتر سے خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیئے۔

۲۔ اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے

۳۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع دفتر میں ۲۰ تاریخ تک ضرور بھیج دیجئے

منیجر پیام تعلیم

کھُلی ہوا کے مدرسے کے اخبار کی چند خبریں

آپ جانتے ہیں کہ ہماری کھلی ہوا کا مدرسہ ایک ایسی جگہ ہو رہا ہے جہاں کوئی آبادی نہیں۔ کھیت ہیں، ببول کے کانٹے ہیں، سورج ڈوبتے ہی ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ البتہ کیمپ کی وجہ سے یہاں زندگی پیدا ہوگئی ہے۔ ایسے سناٹے میں چوروں کو اچھا موقع ہاتھ لگتا ہے۔

اس لئے ہم نے پہرے کا انتظام کر رکھا ہے۔ پہرے والوں کی چار ٹولیاں ہوتی ہیں۔ ہر ٹولی دو گھنٹے کی ڈیوٹی کرتی ہے۔ ہر ٹولی کے ساتھ ۸ لڑکے اور ایک استاد ہوتے ہیں۔ چائے کا دور چلتا رہتا ہے اور لڑکے ٹارچ اور ڈنڈے کے ساتھ خیموں کی نگہبانی کرتے رہتے ہیں۔

رات بہت مزا آیا۔ پہلی بار خواتین کا خیمہ لگا تھا رات آپا جان اور باجی بہت ڈریں۔ بار بار خیمے میں سے پہرے والوں کو پکارتی تھیں۔ انھیں ہر آہٹ پر خطرہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب تک ہم پہرا دیتے رہیں گے بھلا ڈر کس چیز کا ہو سکتا ہے۔ ہاتھ میں ڈنڈے ہوں اور دل میں حوصلہ ہو تو کس کی ہمت ہے کہ ہمارے خیمے کا رخ کرے۔

فیروز احمد۔ درجہ چہارم۔ جامعہ نگر۔ دہلی۔

چوہوں کی فوج اور میری بہادری :- دوستو! آؤ میں ایک کہانی سناؤں یہ کہانی نہیں آپ بیتی ہے۔ میرے پہرے کی باری ۲ سے ۴ تک کی تھی۔ میرے ایک ساتھی نے مجھ کو اٹھایا اور کہا تمہاری پہرے کی باری ہے۔ جاؤ پہرا دو۔ میں اٹھا اور جیکٹ پہن کر جرابیں پہنیں اور کمبل اوڑھ کر چا ڈٹا۔ مجھ کو اور مغیض کو ماسٹر صاحب

نے کہا تم دونوں خیمے کے پیچھے جاکر پہرا دو۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اور مغیض دونوں پہرا دینے لگے۔ مغیض نے مجھ سے کہا جاؤ اگر چائے تیار ہو تو پی آؤ۔ میں گیا اور گرم گرم چائے پی آیا پھر مغیض چائے پینے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا جاؤ تم خیمے کے آگے پہرا دو میں آیا اور کیمپ کے آگے پہرا دینے لگا میں پہرا دے رہا تھا کہ مجھ کو کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی میں چونک گیا۔ کہیں کوئی چور نہ ہو۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ایک چوہا اپنے کیمپ کی طرف آرہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پھونکتا جا رہا تھا میں اس کی خبر لینے کے لئے آگے بڑھا وہ میرے ہاتھ نہ آیا اور ادھر اُدھر بھاگنے لگا جیسے ہی میں اس کے پاس پہنچا ایک دم دوسرا چوہا نکلا۔ اب تو چوہوں کی فوج سے مقابلہ تھا۔ میں ڈر گیا اور بھاگ کر جان بچائی اس کے بعد میں نے اپنے ڈر کو دور کرنے کے لئے دو پیالیاں چائے کی پی لیں۔ کہو دوستو۔ چوہوں کی فوج سے مقابلہ کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

انور

گلزار کیمپ کی خبریں:۔ پروگرام کے مطابق ہم لوگ ۱۹ کی صبح کو ۶ ½ بجے روانہ ہوئے۔ آج ہم پرندوں کا مشاہدہ کرنے کے لیئے نکلے تھے۔ اور ہم نے مختلف پرندے دیکھے۔ جن کا ذکر میں نیچے لکھتا ہوں۔

بھجنگا۔ یہ بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ اور اس جنگل میں جو ہمارے کیمپ کے قریب ہے۔ بہت ملتا ہے۔ اس کی دم کے بیچ سے دو حصے ہوتے ہیں۔ یہ بڑا بہادر اور دلیر ہوتا ہے۔ کوآ، مینا اور ایسے جانور اس سے ڈرتے ہیں۔ یہ کسی کو اپنے گھونسلے کے قریب نہیں آنے دیتا ہے اسی وجہ سے کمزور جانور۔ یعنی فاختہ وغیرہ اس کی بہادری سے فائدہ اُٹھا کر اس کے گھونسلے کے قریب اپنا گھونسلہ بناتے ہیں۔

سات بہنیں۔ آپ نے باغوں میں اگر ٹیں ٹیں کی آواز سنی ہوگی۔ اور اگر کبھی دیکھا ہوگا تو کچھ مٹیالی سی چڑیاں پھدکتی اور چیختی ہوئی دکھائی دی ہوں گی یہ سات ہوتی ہیں۔ جن میں ایک نر اور چھ مادہ ہوتی ہیں۔ یہ زیادہ تر دانہ کھاتی ہیں۔ ان کی چونچ گوریا کی سی ہوتی ہے۔

محمد سلیمان بیگ

شفاخانوں کی خبروں کا ایک دن

۱۷ مارچ	۱۔ مشیر فاطمہ صاحبہ	پیٹ میں درد	
	۲۔ سید احمد علی صاحب	آنکھ میں درد	
	۳۔ تحیہ سلطان صاحبہ	سر میں درد	
	۴۔ رشید نعمانی صاحب	گھر میں درد	
	۵۔ تصدق حسین صاحب	جسم میں درد	

گلزار کیمپ (ابتدائی ششم) آج کیمپ کا آخری دن ہے۔ گلزار کیمپ کی آخری خبریں آج پیش کی جا رہی ہیں۔

کیمپ کی زندگی کے نو دن محنت مشقت جوش ولولے اور کام کرتے گذر گئے۔ بہت سی چیزیں بنائیں ان میں سے کچھ قدرت نے بگاڑیں کچھ ہم نے بگاڑیں۔ ہر جگہ دوبارہ حوصلہ کرکے کام کرتے کرتے اس کے علاوہ ہوگئے۔ ہماری جماعت نے اس دوران میں بہت کچھ سیکھا لیکن بہت کچھ سیکھنے سے رہ بھی گیا۔ اس لئے کہ سیکھنے کا میدان بہت وسیع تھا۔ اور وقت بہت کم۔

رات حلوہ کھانے کے بعد کچھ لڑکوں کے پیٹ میں گڑبڑ ہوگئی تھی۔ ایک دو کے درد ہوتا۔ صبح چہرے مرجھائے ہوئے تھے بہرحال ½ ۷ بجے مشاہدے کو نکلے۔ دریائے جمنا کے کنارے کنارے چلتے چلے گئے آج اس خیال کے ماتحت نکلے تھے کہ کچھ آس پاس کی نادر اور عجیب چیزیں جمع کریں۔ لیکن بہت دور جاتے کے بعد بھی کچھ نہ ملا۔

واپس ہو رہے تھے کہ دیکھا ہمارے کچھ ساتھی پٹسن کے درخت کے پتے کاٹ کاٹ کر جمع کر رہے ہیں۔ اُس کا پھول ایک لمبے تنے پر کچھ اسی طرح ترتیب دیا ہوا تھا۔ کہ ساتھیوں کو بہت بھایا اور کوشش کرنے لگے کہ اسے کاٹ لیا جائے۔ لیکن وہ اس قدر خاردار جھاڑیوں میں واقع تھا۔ کہ ہمت نہ ہوتی تھی۔ پھر بھی ہمارے چند بہادر ساتھ گھس گئے اور اسے کاٹ کر نکال لائے۔ اب اس کو خیمے تک لے جانا بھی ویسا ہی دشوار تھا جیسے کاٹنا تھا۔

اس لئے کہ یہ کئی من کا تھا۔ لیکن یہ مشکل بھی آسان ہوگئی اور اب آپ اسے گلزار کیمپ میں کھڑا دیکھیں گے مسعود صاحب حسرت سے اسے دیکھ کر کہہ رہے تھے "کہ اسے تو ہم لانے والے تھے"

نہانے دھونے کا کام بھی بدستور ہوا۔۔۔۔ رام شاستری صاحب نے تیرنا سکھایا۔ ہم ان کے بہت مشکور ہیں۔

موسم کی رپورٹ دینے والے لوگ روز لکھا کرتے تھے۔ کہ آندھی آئے گی گرج کے ساتھ چھینٹے پڑیں گے تاکہ ہم لوگ ڈر کر بھاگ جائیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ہم ڈٹے ہوئے ہیں اور بھاگتے نہیں تو آج یہ لکھ دیا ہے "موسم خوش گوار رہے گا"

کرشن کمار (ابتدائی ششم)

شیخ جی نے مَنّت مانی

اطہر پرویز



چڑھنے کو تو شیخ جمن چڑھ گئے پیڑ کے اوپر
اور وہ بھی کوئی دوسرا پیڑ نہیں، کھجور کا پیڑ جس میں نہ کوئی
شاخ ہوتی ہے اور نہ ڈنٹھل — لیکن شیخ جی دھن
کے پورے تھے کام کر گئے۔ مگر اب سوال یہ کہ آئیں
تو کیسے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اکدم سے گر پڑیں دھڑام سے اور
مفت میں جان جائے۔
ہمارے شیخ جی مَنّت اور چڑھاوے کے بڑے قائل تھے۔
ادھر مصیبت پوری پوری آئی تھی جھٹ بلبل ہی تو پڑے۔
" اے اللہ میاں! اگر تو نے اپنے اس ناچیز بندے کو صحیح و سالم

اتار دیا تو بس گھر پہنچتے ہی دس روپیہ کی نیاز دلاؤں گا۔"

یوں تو اب مَنّت مان لی تھی۔ مگر خالی مَنّت سے کہیں کام چلتا ہے۔ کچھ تدبیر تو اُترنے کی کرنی ہی چاہیئے تھی۔ اب شیخ جی اُترنے کی کوشش کرنے لگے۔ اتفاق سے کچھ اتر آئے۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو اُمید بندھ گئی۔ مگر ابھی تو کافی اُترنا تھا۔ شیخ جی نے سوچا کہ اس مہنگائی کے زمانے میں پیڑ سے اترنے کے لئے دس روپیہ کی مٹھائی چڑھانا کون سی عقل مندی ہے۔ جھٹ بول اٹھے "اے اللہ میاں! دس روپے کی مٹھائی بہت ہوتی ہے۔ کون اتنی مٹھائی کھا سکے گا۔ لیکن ساتھ خیریت کے اُتر گیا تو آٹھ روپیہ کی مٹھائی ضرور چڑھاؤں گا۔

اب شیخ جمن نے اللہ کا نام لے کر پھر آنکھ بند کر لی اور لگے پیڑ سے نیچے سرکنے اب تو کچھ اور نیچے آگئے۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو ذرا اطمینان کے سانس لئے اور بولے۔

" اے اللہ میاں! آٹھ اور دس روپیہ کی مٹھائی میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پانچ روپیہ کی مٹھائی بھی بہت ہوتی ہے۔ بس ساتھ خیریت کے اتار دے۔ آج ہی پانچ روپیہ کی مٹھائی چڑھاؤں گا۔

اب شیخ جمن کو ذرا اطمینان ہوا۔ اس لئے کہ آدھی دور آگئے تھے۔ لیکن پیڑ اونچا جو تھا۔ ذرا بھی ہاتھ چھوٹ جائے تو بس یہ سمجھئے کہ ہڈی پسلی سلامت نہ بچے۔ شیخ جمن نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بولے۔

" اے اللہ میاں! تو بھی کیا کہے گا کہ تیرا یہ بندہ کتنا بزدل ہے کہ ایک پیڑ سے نیچے اترنے کے لئے پانچ روپیہ کی مَنّت مان لی۔ پانچ روپئے آج کل کے زمانے میں بہت ہوتے ہیں۔ بس تین روپیہ کی نیاز کافی ہوگی۔"

یہ کہہ کر شیخ جمن نے پھر ہمت باندھی اور اُترنا شروع کر دیا۔ اب تو شیخ جی کافی اتر آئے۔ سر اٹھا کر اُوپر دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔

دل میں افسوس کرنے لگے کہ میں بھی کیا آدمی ہوں۔ جو اتنے سے پیڑ سے گھبرا گیا



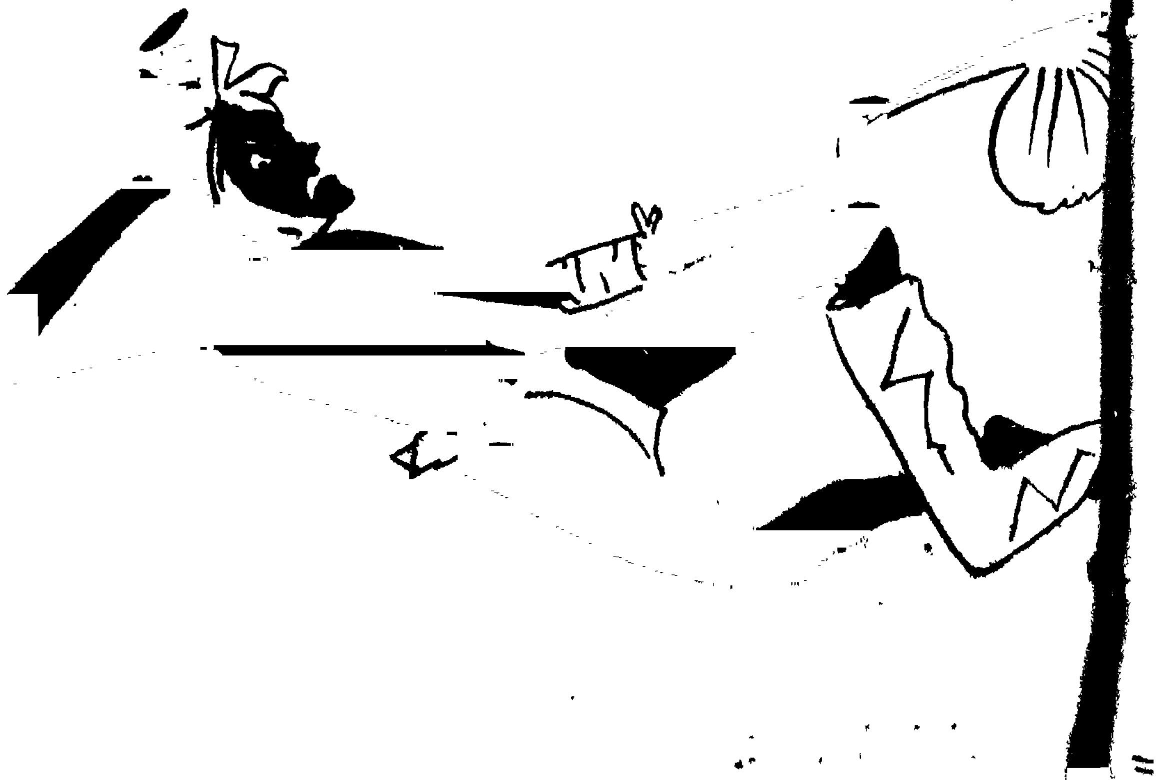
اور یہ منت مان لی - وہ بھی تھوڑی نہ بہت اکٹھا تین روپیہ کی - میں سمجھتا ہوں کہ منت تو منّت ہے - جیسے تین کی دیسے ایک کی - ثواب تو سب کا برابر ہوتا ہے - مطلب تو ثواب سے ہے - بس ایک روپیہ کی مٹھائی منگواؤں گا۔"

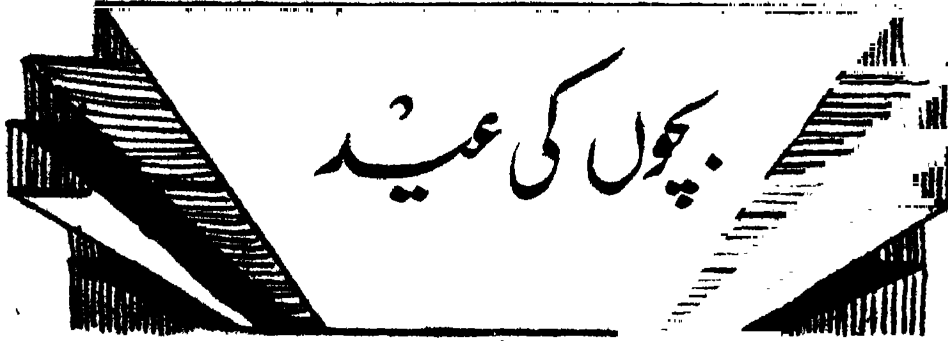
ایک روپیہ کی منّت مان کر ان کو اطمینان ہوا اور لگے اترنے اب پھر کچھ دور آگئے - ذرا تھک گئے تھے - سوچا سانس لے لیں - آخر اتنی دور آگئے اور اب سچ پوچھو تو خطرے سے بھی بچ نکلے تھے - اطمینان کا سانس کیوں نہ لیتے - اسی لئے تو فوراً بولے :" اے خدا جب منت ہی کی بات ہے تو کیا ضروری ہے کہ ایک روپیہ کی مٹھائی چڑھائی جائے - میں سمجھتا ہوں کہ دس پیسے کے بتاشے کا چڑھاوا بھی کافی ہو سکتا ہے - بات وہی ہوئی چاہے دس روپیہ کا چڑھاوا ہو یا دس

پیسے کا۔ مطلب تو ثواب سے ہے۔ بس دس پیسے کے تباشے لے کر چڑھاؤں گا۔ اللہ میاں اُتار دو۔ بس ذرا سی دیر ہی تو رہ گیا ہوں۔"

شیخ جی نے بس ایک آخری ہمت اور کی۔ لیکن تھک کے چور ہو گئے تھے۔ اتنے اونچے تاڑ پر چڑھنے اترنے کی مشق نہ تھی۔ ایک پاؤں جو نیچے سرکایا تو دونوں ہاتھ چھوٹ گئے۔ اور یہ دھڑام سے نیچے آگرے۔ بیچارے کے بہت چوٹ آئی۔ سر میں چوٹ، ہاتھ میں چوٹ، پیر میں چوٹ۔

اب یہ اسپتال میں پڑے خدا سے لو لگائے ہیں۔ ہر وقت یہی رٹ ہے: "اللہ میاں ذرا جلدی سے اچھا کر دو تو پورے دس روپے کی نیاز دلاؤں گا، ایک پیسہ کم نہ کروں گا۔"



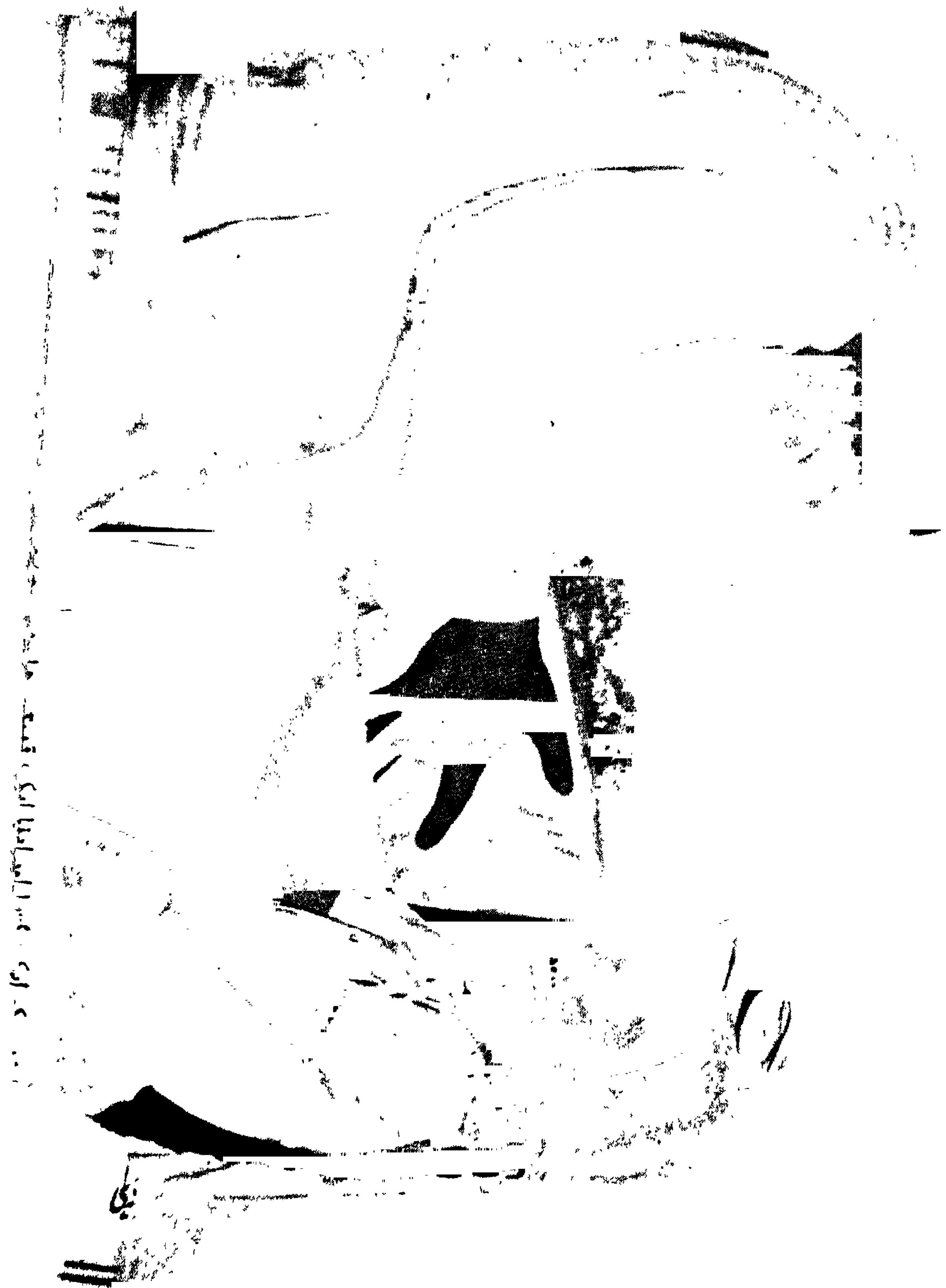


نئی دہلی کا کانسٹیٹیوشن ہاؤس تو آج دیکھنے کے لائق تھا اور خصوصاً وہ حصہ جہاں آج شنکرز ویکلی کے مقابلے کے انعامات تقسیم کئے جانے والے تھے ہر طرف بچے ہی نظر آرہے تھے۔ آج ان کی عید تھی۔ پھر آپ پوچھیں گے یہ کیسا مقابلہ اور کیسی عید! آپ نے پیام تعلیم میں پچھلے دنوں پڑھا ہوگا کہ شنکرز ویکلی کی طرف سے دنیا بھر کے بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں اور کہانیوں کا مقابلہ ہوا تھا جس میں حسب ذیل ملکوں کے بچوں نے انعامات حاصل کئے۔ انعام پانے والے لڑکوں کے نام مع تعداد انعامات حسب ذیل ہیں

آرجنٹائنا	۱	انڈونیشیا	۲
آسٹریلیا	۴	ہندوستان	۱۲۵
لنکا	۲	جاپان	۴
چین	۳	سوئٹزرلینڈ	۱
چیکوسلواکیا	۱۵	ترکی	۴
فن لینڈ	۵	برطانیہ	۲
روس	۲	امریکہ	۱۰

ہندوستان کی جمہوریہ کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کی طرف سے جو سنہرا تمغہ تھا وہ ماسکو کی ایک چودہ سالہ لڑکی نے حاصل کیا۔

آج انعام تقسیم کرتے وقت ہمارے پنڈت جی کا چہرہ خوشی سے تمتما



سید منیر الحسن

ایک عجیب کہانی سنو!

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک آدمی ایک چھوٹے سے بچے کے ساتھ، ہاتھ میں ک
لئے کچھ چیزیں خریدنے شہر جارہا تھا جب بازار پہنچا تو وہاں پر اچانک ایک بدمعاش اس کے
لگ گیا۔ اور اس آدمی کے ہاتھ سے تھیلا چھیننے لگا۔ اس آدمی نے زور سے چلانا شروع کی
دوڑو بھائیو! دوڑو!! مجھے اس چور سے بچاؤ!

شوروغل کی آواز سن کر کچھ لوگ دوڑ کر آئے اور جھگڑے کی وجہ معلوم کرنے لگے
جھگڑا زیادہ بڑھ گیا تو طے ہوا کہ ان دونوں کو پولیس چوکی لے جایا جائے۔ جب یہ پولیس
پہنچے تو تھانیدار صاحب نے دونوں سے پوچھنا شروع کیا۔

چور فوراً آگے آیا اور کہنے لگا ــــــ "حضور یہ تھیلا میرا ہے، یہ کھو گیا تھا، جس کی
سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔"

"تمہارا تھیلا کب کھویا تھا؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"کل"

"اگر یہ تھیلا تمہارا ہے، تو بتاؤ اس کے اندر کیا ہے؟"

"حضور!" چور نے کہنا شروع کیا۔

میرے تھیلے میں پہننے کے کچھ کپڑے ہیں۔ دو سونے کے پیالے ہیں، دو چاندی کے

ہیں۔ دو چمچے ہیں، ایک کھانا پکانے کا برتن ہے۔ ایک تیل کا لیمپ ہے۔ دو چینی کی پتلیں ہیں۔ ایک بلی، دو کتے اور دو کرسیاں ہیں۔ ایک کوٹ ہے۔ ایک گائے اور دو بچھڑے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک بکری، دو بھیڑیں، چار مینڈھے، ایک اونٹ دو اونٹنیاں ایک شیرنی اور دو شیر ہیں۔ اتنا ہی نہیں، حضور، اس میں ایک پلنگ بھی ہے۔ ایک اوپر کا کمرہ اور ایک باورچی خانہ ہے۔ جس میں دو دروازے ہیں۔ اس کمرے میں میرے وطن کے آدمی ہیں، جو یہ گواہی دیں گے کہ یہ تھیلا میرا ہے۔"

جب مالک سے پوچھا گیا کہ کہو تمہیں کیا کہنا ہے؟

اس پر مالک آگے آیا اور بولا

"حضور تھیلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بالکل جھوٹ کہتا ہے۔ اس میں صرف ایک چھوٹا سا مکان ہے، اور ایک بغیر دروازہ کا کمرہ ہے ایک اسکول ہے جس میں لڑکے کھیل رہے ہیں۔ بغداد کا شہر ہے، اور ایک لوہے کی ... ہے۔ اس کے علاوہ مچھلی پکڑنے کا



جال ہے۔ کچھ چھڑیاں اور پتھر ہیں۔ ایک ہزار تین وکیل ہیں۔ جو اس بات کو ثابت کر دیں گے کہ یہ تھیلا میرا ہے۔

مالک کی بات سن کر چور مارے غصے کے پیر پٹکنے لگا، اور کہنے لگا۔

"حضور، یہ تھیلا میرا ہے۔ میں اس کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس تھیلے میں صرف تھوڑی سی کتابیں ہیں۔ کچھ چڑیاں اور کچھ جنگلی جانور ہیں۔ اس میں کچھ آدمی گانا گا رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔ اس میں ایک بوڑھا گھوڑا ہے، دو بچے ہیں، ایک گاؤں ہے۔ کچھ

سونے کی انگوٹھیاں ہیں۔ ایک چاقو ہے۔ مچھلی کا شکار کھیلنے والی ایک ناؤ ہے اور چار مچھلیاں ہیں۔ دو آدمی ہیں، جن کے پیر نہیں ہیں۔ دو ڈاکو اور تین منصف ہیں، جو آپ کو یہ یقین دلائیں گے کہ یہ "تھیلا میرا ہے"۔

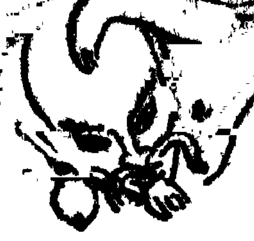
پھر مالک سے پوچھا گیا کہ تمہیں کچھ اور کہنا ہے۔

مالک نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا یہ چور صاف جھوٹ بول رہا ہے حضور! میرے اس چھوٹے سے تھیلے میں ایک کوٹ اور ایک تلوار ہے۔ ایک ہزار مرغی کے بچے ہیں۔ ایک کھیت اور پھل پھولوں سے لدے ہوئے کچھ باغ ہیں۔ اس کے سوا کچھ لڑکیاں ہیں، جو گانا گا رہی ہیں ایک سڑک ہے جس پر کچھ سپاہی کھڑے ہیں اور ایک بڑی خوفناک لڑائی ہو رہی ہے ایک جیل ہے، جس میں کچھ آدمی بند ہیں۔ کچھ توپیں ہیں۔ کچھ جھنڈے ہیں۔ پانچ ابی سینیا کی عورتیں ہیں۔ تین ہندوستانی ہیں۔ بیس لونڈیاں، چار عرب، اسی کردو اور تیرہ دمشق کی عورتیں ہیں۔ نیل دریا ہے اور بہت سے پل ہیں۔ کچھ گھوڑے اور م[illegible] ہیں۔ ایک کاریگر ہے۔ کچھ لکڑی کے [illegible] ہیں۔ سلیمان کی ریاست ہے۔ ایک ایک استرے ہیں جس سے تھانید[illegible] بال کاٹے جائیں گے۔ اگر وہ یہ کہے گ[illegible] یہ تھیلا تمہارا نہیں ہے۔"

جب ان دونوں کی پوری بات [illegible] تو تھانیدار نے کہا "میں دیکھتا [illegible] دونوں بہت شیطان ہو! ذرا بھی نہیں [illegible] اور میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ جیسی تم [illegible] باتیں تم دونوں کر رہے ہو، و[illegible] کسی نے نہیں کیں۔ یہ چھوٹا سا [illegible] کوئی بہت بڑا سمندر، کہ جو اس میں [illegible] بھری ہیں! تھیلے کو کھولو!"

تھیلا کھولا گیا۔ اس میں کچھ [illegible] تھا۔ صرف روٹی کا ایک سوکھا [illegible] مالک [illegible] سے جان لے کر [illegible] چور پکڑ لیا گیا۔

لطیفے



ماسٹر - ظفر! تم بتاؤ، دنیا کی سات عجائبات کون کون سی ہیں -

ظفر - جناب میری امی کہتی ہیں کہ میری چھ بہنیں اور میں، سب کے سب عجیب و غریب ہیں - تو پھر کیا ہم عجائبات میں سے نہیں ہو سکتے -

حسن علی احمد علی - اندور

[illegible]کا - ابا جان! آج کسی نے میری گھڑی صاف کر دی -

[illegible] - چلو بیٹا صفائی کے پیسے تو بچ گئے - ورنہ گھڑی ساز دو روپے تو ضرور لے لیتا

احمد سراج الدین - [illegible]

[illegible]یل - کہو دوست رشید! کیا کھا رہے ہو -

رشید (جوش کھاتے ہوئے) کچھ نہیں زہر کھا رہا ہوں -

[illegible] - ٹھیک [illegible] کر تو پھر تو تمہارے بغیر میں [illegible] کیا کروں گا -

ندیم - ابا! آج فرید سے میری لڑائی ہو گئی - اگر میرے ہاتھ نہ پکڑ لئے جاتے تو میں اس کو ایسا پیٹتا کہ یاد ہی تو رکھتا -

باپ - تمہارے ہاتھ کس نے پکڑ لئے تھے ؟

ندیم - فرید نے

باپ - بیٹا اشرف! کہو آج تمہارے حساب کے پرچے میں کتنے سوال آئے تھے

بیٹا - اباجان! آٹھ سوال تھے جس میں سے میرے چار غلط ہیں -

باپ - کوئی بات نہیں باقی چار تو صحیح ہیں -

بیٹا - وہ تو میں نے کئے ہی نہیں -

بیوی - ارے ننھے کے ابا! دوڑو ننھا ایک پیسہ نگل گیا - ہائے اللہ! اب کیا ہوگا

شوہر - رہنے دو ایک پیسے کی کیا بات ہے ! بے کار پریشان ہو رہی ہو -

استاد۔ ایک بٹا پانچ (⅕) کیا ہوتا ہے؟

شاگرد۔ مجھے نہیں معلوم۔

استاد۔ فرض کرو کہ تمھارے پانچ لڑکے مہمان ہیں۔ اور تمھارے پاس ایک تربوز ہے تو اس صورت میں تم کیا کروگے؟

شاگرد۔ میں تربوز کو چھپا کر رکھ دوں گا اور جب مہمان چلے جائیں گے تو تنہا کھالوں گا۔

ثریا بیگم۔ کورکی

بیٹا۔ کیوں ابا جان! آپنے تو فرمایا تھا کہ ہر رنگ میں سفید رنگ ملانے سے وہ ہلکا بن جاتا ہے اور بھڑک کم ہو جاتی ہے۔

باپ۔ ہاں ٹھیک تو کہا تھا۔

بیٹا۔ مگر جب ابھی میں نے پسی ہوئی زرد ہلدی کو سفید چونے میں ملایا تو بجائے پھیکا ہونے کے رنگ تو نارنگی بن گیا۔ کیا جادو ہے۔

شیخ جلال الدین

احمد۔ بھئی کل میں کرنل محمود کے یہاں گیا تھا۔ وہاں سگریٹ پینے کی بڑی دقت ہوئی۔

صابر۔ وہ کیسے؟

احمد۔ ماچس ختم ہو گئی اور وہاں مانگنے کی ہمت نہ پڑی۔

صابر۔ کیوں کیا ان کے یہاں بجلی نہ تھی۔

احمد۔ بجلی تو تھی لیکن بجلی سے کیا ہوتا ہے۔

صابر۔ بجلی سے ہی سگریٹ جلا لیتے۔

تیسرا دوست۔ تم تو ان سے بھی بڑے بیوقوف ہو ایک آنے کی سگریٹ کے لئے ایک روپیہ کا بلب توڑنے کا مشورہ دے رہے ہو

کوّے اور مور کی کہانی

عبدالستار صدیقی





ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ کسی بن میں ایک پیڑ پر ایک کوّا اور ایک مور رہا کرتا تھے۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں ایک ساتھ کھاتے۔ ایک ساتھ ٹہلنے جاتے۔ غرض ہر کام وہ ساتھ ساتھ کرتے تھے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ کوّا فطرتاً چالاک ہوتا ہے اور دھوکہ باز۔ جب تک شرارت نہ کرلے اس کا کھایا پیا ہضم نہیں ہوتا۔ اور مور — اس کی عادت سے بھی شاید آپ واقف ہوں۔ بڑا نیک طبیعت اور ملنسار ہوتا ہے

ایک روز کی بات ہے اس بن میں ایک مسافر آنکلا۔ سر پہ گٹھری۔ ہاتھ میں لاٹھی پیر ننگے۔ چلا جا رہا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور اس پر دوپہر کا وقت۔ جانور گرمی کی شدت سے اپنی زبانیں نکالے پانی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ پھر آپ ہی سوچئے ایسی سخت گرمی میں اس بیچارے مسافر کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے خیال سے وہ بھی کسی سایہ دار درخت کی تلاش میں اپنے قدم تیز تیز بڑھانے لگا۔ سچی کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ آخر کار وہ مسافر بھی اس درخت کے نیچے پہنچ ہی گیا۔ جہاں یہ دونوں پکے دوست رہتے تھے۔ پیڑ تھا بڑا گھنا اور سایہ دار۔ دور تک اس کی ٹھنڈی چھاؤں پھیلی ہوئی تھی۔ چھاؤں میں جو نہی بیٹھا ویسے ہی طبیعت چاہنے لگی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور نیند نے اُسے دبوچ لیا۔ اپنی گٹھری کا سہارا

رکھ ۔ لاٹھی بغل میں دبا ۔ گہری نیند کے مزے لینے لگا ۔

سورج مہاراج بھی تھوڑا تھوڑا کھسکتے رہے اور آخرکار ان کی چنچل کرنوں نے بھی پتوں کے بیچ سے مسافر تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ ہی لیا ۔ کرنیں چوری چوری مسافر پر حملہ کرنے لگیں ۔ اور مسافر بے چین ہونے لگا ۔ کبھی ادھر کروٹ بدلتا، کبھی اُدھر ۔ لیکن کرنیں تھیں کہ برابر ستا رہی تھیں ۔ انھیں تو پریشان کرنے میں مزا آرہا تھا ۔ مور سے مسافر کی یہ حالت نہ دیکھی گئی ۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنے پروں سے مسافر پر سایہ کر دے اور ان شریر کرنوں کے آنے کا راستہ روک دے تو بے چارہ مسافر کچھ دیر آرام کی نیند سو سکے گا ۔ اس نے فوراً اپنے لمبے چوڑے پر اُسی ڈالی پر پھیلا دئے جہاں سے یہ کرنیں داخل ہو رہی تھیں ۔ اور مسافر پھر میٹھی نیند میں خراٹے بھرنے لگا ۔

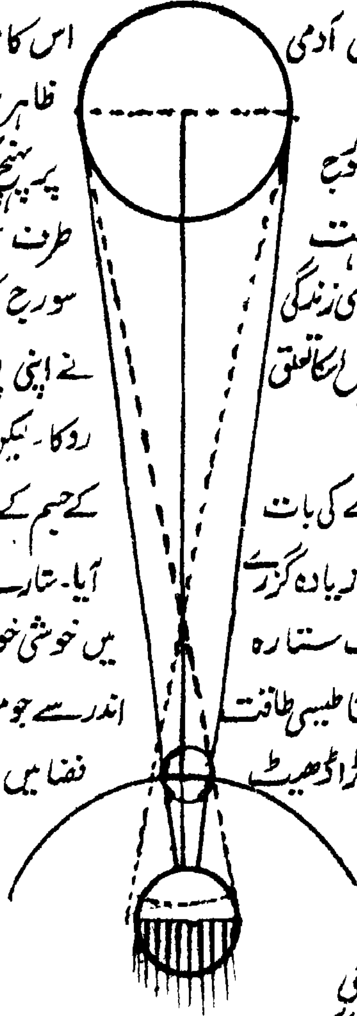
کوّے سے یہ نہ دیکھا گیا ۔ اس نے بھی سوچا کہ کچھ شرارت کرنی چاہیے ۔ فوراً وہاں سے اُڑا اور ایک ہڈی تلاش کر کے لے آیا ۔ پھر جیسے ہی مور کی آنکھ لگی اس نے وہ ہڈی مسافر پر دے ماری ۔ اب کیا تھا ۔ مسافر چونک کر اُٹھ بیٹھا ۔ مارے غصہ کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔ آپ جانتے ہی ہیں آنکھ بے وقت کھل جانے سے کیسا غصہ آتا ہے ۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ جوں ہی اس کی نگاہ مور پر پڑی بھنا گیا ۔ جلدی جلدی گٹھری کھولی ۔ غلیل نکالی اور غلّہ رکھ مور کو مار گرایا ۔ کوّا دور بیٹھا "کائیں کائیں" کر رہا تھا ۔

آپ نے دیکھا اس دوستی کا کیا انجام ہوا ۔ ۔ ۔ ؟
بُروں کی دوستی میں ہمیشہ نقصان ہی رہتا ہے ۔

عبدالستار صدیقی
استاد میک پرائمری اسکول ۔ اوکلا

محمد امین ۔ استاد مدرسہ ثانوی جامعہ ملیہ

سورج گرہن



ہمارے دیش کے کروڑوں آدمی سورج کو دیوتا مانتے ہیں۔

آخر کیوں؟ — بات یہ ہے کہ سورج کا اثر ہماری روزمرہ زندگی پہ بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ نہ صرف ہماری زندگی بلکہ اس زمین کا جس پر ہم رہتے ہیں اسکا تعلق بھی سورج کے ساتھ گہرا ہے۔

آئیے ہم آپ کو ایک مزے کی بات سنائیں۔ کروڑوں برس سے بھی زیادہ گزرے جبکہ سورج کے قریب سے ایک ستارہ گزرا۔ میاں سورج کے اندر مقناطیسی طاقت تو زیادہ ہے ہی۔ لیکن ستارہ بڑا اڑھیٹ تھا۔ اس کے اندر سورج سے بھی زیادہ مقناطیس تھا۔ اب تو دونوں میں رسہ کشی شروع ہوگئی ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ ستارہ جیسے جیسے سورج کے قریب آتا گیا اس کا مقناطیسی اثر زیادہ سے زیادہ ظاہر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر تو ستارہ نے سورج کو اپنی طرف بہت زوروں سے کھینچا۔ مگر سورج بھی کوئی کمزور تھوڑا ہی تھا۔ اس نے اپنی پوری طاقت سے اس کشش کو روکا۔ لیکن گھبراہٹ اور پریشانی میں اس کے جسم کے اندر سے تھوڑا بہت مواد باہر نکل آیا۔ ستارے صاحب جیت گئے اور فاتحانہ انداز میں خوشی خوشی آگے بڑھ گئے۔ سورج کے اندر سے جو مواد باہر نکلا تھا۔ وہ گیس کی مانند فضا میں ادھر ادھر چکر کھانے لگا۔ جوں جوں وقت گزرنے لگا وہ مواد ٹھنڈا پڑتا گیا اور ٹھوس شکل اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ لاکھوں برس کے بعد وہ باقاعدہ نو سیارے بن گئے۔

انھیں سیاروں میں ایک سیارہ ہماری زمین بھی ہے۔ زمین کی اس پیدائش سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سورج کے ساتھ اس کا تعلق وہی ہے۔ جو بیٹی کا تعلق ماں سے ہوتا ہے۔ بعد میں زمین نے سورج کی طرح ایک لڑکا پیدا کیا جسے ہم آپ چاند کہتے ہیں۔ اس طرح چاند، زمین اور سورج تینوں کا رشتہ ایک دوسرے سے ہے۔

ہماری کائنات میں سورج اپنی جگہ ایک مقررہ راستہ پر قائم ہے اور وہ چکر بھی کرتا ہے۔ چاروں طرف سے اس کے بیٹے، بیٹیاں، پوتے پوتیاں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ باوجود کروڑوں برس گذرنے کے سورج کی ساری اولاد اس کا حکم مانتی ہے۔ اور اس خوشی میں سورج ان کو روشنی، غذا اور طاقت دیتا رہتا ہے۔

ساری کائنات میں سورج کی حیثیت بہت ممتاز ہے۔ اس کے بل بوتہ پر زمین اور باقی آٹھ سیاروں کی زندگی کا دارومدار ہے سورج روزانہ اور ہر وقت اپنے خاندان کے تمام اجسام فلکی کو نہایت ہنسی خوشی سے سخاوت کے ساتھ روشنی اور طاقت پہنچاتا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی سورج خود بھی اپنے اوپر مصیبت جھیلنے کی عادت ڈالتا ہے۔

زمین سورج کے چاروں طرف چکر کاٹتی ہے اور چاند زمین کے اردگرد کائنات میں ان کے راستے الگ الگ متعین ہیں۔ چاند اور زمین اپنے اپنے راستہ پر سورج کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ کبھی کبھی چاند گھومتے گھومتے زمین اور سورج کے بیچ میں آجاتا ہے اور سورج کا جتنا حصہ وہ ڈھک لیتا ہے۔ وہی حصہ ہمیں زمین سے تاریک دکھائی دیتا ہے جسے ہم دوسرے الفاظ میں سورج گرہن کہتے ہیں۔

روزانہ جب سورج چمکتا رہتا ہے تو اس کی چمک یا روشنی اتنی زیادہ اور تیز ہوتی ہے کہ سائنس داں دوربین کی مدد سے بھی اس کا مطالعہ نہیں کر پاتے۔ اسی لئے وہ لوگ ہمیشہ اس موقع کی تاک میں لگے رہتے ہیں اور جب کبھی سورج گرہن کا وقت آتا ہے وہ لوگ فوراً اپنے اپنے آلے یعنی دوربین، مختلف قسم کے فوٹو اتار نے والے کیمرے لے کر ان جگہوں پر پہلے ہی سے

پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں پورا گرہن لگتا ہے۔

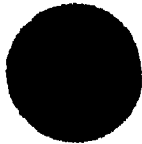
ابھی حال ہی میں ۲۸ فروری کو ایک سورج گرہن ہوا تھا۔ دہلی میں ہم نے اُسے دو بج کر ۵۵ منٹ پر دیکھا تھا۔ لیکن ہمارے دیش میں کہیں بھی مکمل گرہن نہیں ہوا تھا۔ فرانسیسی استوائی افریقہ سے لیکر خلیج فارس کے ساحل تک کل فاصلہ نو ہزار میل اور چوڑائی پچاسی میل ہے۔ اس علاقہ میں ۳ ہزار میل کی دوری تک مکمل سورج گرہن لگا تھا۔ روس میں سائبریا کے علاقہ میں بھی مکمل سورج گرہن لگا تھا۔

دنیا میں علم نجوم اور ستاروں کی سائنس کے ماہر بہت سے لوگ ہیں۔ ان کی تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے۔ علاوہ اس کے روس میں بھی اسی طرح کے کئی ایک ماہر سائنس داں ہیں۔ اب کی بار امریکہ، برطانیہ اور دوسرے آٹھ ملکوں کے مشہور سائنس داں سوڈان میں خرطوم کے مقام پر سورج گرہن کے موقع پر سورج کی سطح اور اس کی بناوٹ کی تحقیقات کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔ وہاں مکمل طور سے سورج گرہن تین منٹ تک لگا۔ موسم کے متعلق پہلے ہی سے پیشن گوئی کی تھی کہ بہت صاف رہے گا۔ اس لئے سائنس دانوں نے پوری آزادی کے ساتھ سورج کا مطالعہ کیا تھا۔ لی بر دیل (lilirrullle) سے لے کر سعودی عرب کے سارے علاقہ میں۔ جگہ جگہ دوربین بجلی سے کام کرنے والے سل (cell) لگا دیئے گئے تھے۔ جونہی کہ سورج گرہن کا وقت آیا سارے سائنس داں ہوشیار ہو گئے۔ اور تیزی سے سورج کا فوٹو لینے لگے۔ بہت سے لوگوں نے بغور سورج گرہن کے اندر روشنی کی تیزی اور شعلوں کی لپک کو دیکھا۔ بہتوں نے سورج کی سطح اور اس کی بناوٹ کی تحقیقات کی۔ امریکہ کی ہوائی فوج کا بھی ایک وفد سوڈان میں سورج گرہن کا مطالعہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے سائنس دانوں نے فوٹو لینے والے سل (cell) کی مدد سے ایسی اعداد شمار فراہم کی ہیں۔ جن سے فضا کے نئے نئے

نقشے بن سکیں گے اور ان کی مدد سے فضا کی سائنس ہوائی جہاز کی اڑان کے لئے نئے نئے تجربے کرے گی۔

امریکہ کی نیشنل جغرافیہ سوسائٹی نے بھی تین منٹ تک مسلسل سورج گرہن کی تصویر کھینچی تھی اور ان کا کیمرہ ایک بہت بڑی دوربین سے لگا ہوا تھا۔ تین منٹوں میں سے ایک منٹ تک سورج آنکھوں

۱ ۲ ۳








۴ ۵ ۶

سورج گرہن کی یہ چھ تصویریں سائنس دانوں کے وفد نے سوڈان میں لیں تھیں۔ ان میں گرہن کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ چھٹی تصویر میں گرہن ختم ہونے کے بعد سورج چاند کے اوٹ سے نکلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

سے بالکل چھپ گیا تھا اور اس پر تاریکی چھا گئی تھی۔ یعنی چاند زمین اور سورج کے درمیان بیچوں بیچ میں آگیا تھا اور اس نے سارے سورج کو ڈھک لیا تھا۔

سورج گرہن کا بغور مطالعہ کرنے کے لئے امریکہ، برطانیہ، کناڈا، آئرلینڈ، فرانس

اٹلی، ہالینڈ، یونان، سوئٹزرلینڈ اور مصر ان تمام ملکوں نے ہزاروں روپے خرچ کئے تھے اور لاکھوں روپے کا سامان اکٹھا کیا تھا۔ اگر عین وقت پر سورج کے سامنے کوئی بادل کا ٹکڑا آ گیا ہوتا تو ان ملکوں کی ساری تیاری بے کار ہو گئی ہوتی۔

اسی قسم کا دوسرا موقع اب ۱۸ سال کے بعد آئے گا۔ یعنی ۱۹۷۰ء میں جبکہ مکمل سورج گرہن میکسکو، امریکہ میں جارجیا اور فلاریڈا کی ریاستوں میں دکھائی دے گا۔

خوش قسمتی سے فضا بالکل صاف تھی اس لئے تمام سائنس دانوں نے سورج کی سطح اور اس کی درجۂ حرارت کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کیں۔ اٹلی کے مشہور شہر روم میں اگلے دسمبر میں بین الاقوامی نجومی یونین کی کانفرنس منعقد ہوگی اس موقع پہ دنیا کے تمام سائنس داں جمع ہوں گے۔ اور ایک دوسرے کی تحقیقات اور نتائج پر غور کریں گے اس وقت ہم یہ جان سکیں گے کہ سورج گرہن کے موقع پہ سائنس دانوں نے کون کون سی نئی باتیں معلوم کی ہیں۔


بھیا! اس سے پانی سے آگ تو بجھ جائے گی مگر
شکر کے بورے جو بھرے ہیں

بچوں کی کوشش

جیت کی ہار

ہمارے اسکول میں لمبی دَوڑ کا مقابلہ تھا۔ ہم پانچ طالب علم تھے جن میں ایک لڑکی سعیدہ بھی تھی۔ دَوڑ میں، مَیں اور سعیدہ سب سے آگے تھے۔ مگر پھر سعیدہ مجھ سے بھی آگے نکل گئی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ مَیں سعیدہ سے دَوڑ میں کسی طرح آگے نہیں بڑھ پا رہا ہوں تو میری سمجھ میں ایک بات آئی۔ اور وہ بات یہ تھی کہ میں ہمت کرکے تیزی سے آگے بڑھ کر سعیدہ کے قریب پہنچا۔ مَیں نے اس کو لنگڑی مار کر گرا دیا۔ اور مَیں اس سے آگے نکل گیا۔ سعیدہ لنگڑی کھا کر مُنہ کے بل زمین پر گری۔ سعیدہ کی ناک پر سخت چوٹ لگی اور مُنہ اور گھٹنوں سے خون نکلنے لگا۔ اس بیچاری کے اتنی بُری طرح چوٹ لگی۔ کہ وہ خود اُٹھ کر کھڑی بھی نہ ہوسکتی تھی۔ دو تین لڑکوں نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا۔ تو اس نے مجھے بڑی حقارت سے دیکھا۔

مجھے اور سعیدہ کو لڑکے ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ کئی لڑکوں نے مجھے اُس لڑکی کے لنگڑی مارتے ہوئے دیکھا۔ کچھ لڑکے میرے اوّل آجانے پر ہی مجھ سے جل رہے تھے۔ میری شکائتیں خوب نمک مرچ لگا کر ماسٹر صاحب سے کر رہے تھے۔ لیکن مَیں تو حیران رہ گیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ کیا سُن رہا ہوں۔ سعیدہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی:۔ "نہیں ماسٹر صاحب یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ میرے کسی نے ٹانگ نہیں ماری مَیں تو خود ٹھوکر کھا کر گر گئی تھی"۔ اوّل انعام تو مجھے ضرور ملا، لیکن مجھے دل ہی دل میں شرم محسوس ہورہی تھی۔ چھٹی کے وقت میں سعیدہ کے پاس گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے

گے۔ اور میں نے اس سے بہت معافی مانگی
اس طرح میں جیتنے پر بھی ہارا

جمیل اشرف نعمانی مدرسہ ثانوی جامعہ

اگر میں بلبل ہوتی

اگر میں بلبل ہوتی تو ہر وقت باغوں میں رہتی اور پھولوں پر بیٹھتی اور اس کی خوشبو سونگھتی درختوں کے اوپر گھونسلہ بناکر رہتی اور صبح سویرے سب کے ساتھ مل کر گاتی۔ ہر وقت آسمان کی سیر کرتی اور کوئی مجھے نہ پہچان سکتا۔ لوگ سویرے باغ میں ٹہلنے آتے تو ہمارا گانا سن کر دل خوش کرتے۔ اگر باغوں میں ہم نہ ہوتے تو اتنی رونق نہ ہوتی۔

زیب النساء درجہ پنجم مدرسہ ابتدائی جامعہ

الو کی کہانی

آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ الو منحوس اور اداس سا بیٹھا رہتا ہے۔ اس لئے کبھی اداس رہنے والے لڑکے کو بھی لوگ غصے میں "الو" کہہ بیٹھتے ہیں۔ لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہ ہوگا کہ الو کی اداسی کا سبب کیا ہے؟

بہت دن ہوئے اس زمین پر یوں تو ہر طرح کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ لیکن بانس کا کہیں پتا نہ تھا۔ الو نے جو دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے بانس کا ننھا سا پودا اُگ رہا ہے تو اس نے فوراً سب پرندوں کو بلایا۔ اور ان سے کہا کہ سب مل کر اس پودے کو اکھاڑ ڈالو، نہیں تو ایکدن اس کے پیڑ سے تیر کمان بنیں گے اور یہ تیر کمان تم لوگوں کی جان لیں گے۔

پرندہ ہنس کر بولا — تم تو نرے الو ہو بھلا یہ ذرا سا بانس ہم لوگوں کا کیا بگاڑے گا تم اسے اُگنے دو ہمیں اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں، اس طرح پرندوں نے الو کی بات ہنسی میں ٹال دی اور بانس دن بدن بڑھنے لگا۔

کچھ دنوں بعد آدمیوں نے پہلے پہل کپاس بونا شروع کی۔ الو نے پھر سب پرندوں کو بلایا اور ان سے کہا — اگر تم اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان پودوں کو ابھی سے چن ڈالو نہیں تو

ایک دن کپاس اُگے گی۔ ان سے آدمی پھندے بنائیں گے اور تم لوگوں کو پھنسا پھنسا کر ماریں گے۔

پرندہ ہنس کر بولا۔" تم تو نرے اُلّو ہو۔ بھلا یہ ننھے ننھے بوٹے ہمارا کیا بگاڑیں گے۔

پرندوں نے اُلّو کی بات ہنسی میں ٹال دی۔ اور کپاس کے پودے دن دُگنے اور رات چوگنے بڑھنے لگے۔

وقت جاتے دیر نہیں لگتی۔ کچھ دنوں میں بانس کا پیڑ بڑھ گیا اور کپاس کے پودوں میں ڈھیروں کپاس جمع ہوگئی۔ پھر کیا تھا تھوڑے دنوں کے بعد لوگوں نے تیر اور کمان سے پرندوں کا شکار شروع کردیا۔ اب تو پرندوں کو اُلّو کی باتوں کا خیال آیا۔ وہ لوگ پھر اُلّو کے پاس پہنچے اور بولے ـــ ہم نے آپ کی بات نہیں مانی اس کا پھل ہمیں مل رہا ہے۔ اب کچھ ایسا انتظام کیجئے کہ ان تیر کمان اور پھندوں سے ہم لوگوں کی جان بچے۔

اُلّو نے غمگین ہوکر کہا۔" اے بھائی میں تو بڑا اُلّو ہوں۔ اور اب میرے ہاتھ میں کیا ہے جو میں تمہیں بچا سکوں۔ پہلے تم نے میرا کہنا نہیں مانا۔ اب اس کا پھل تم لوگوں کو مل رہا ہے۔

بس اسی دن سے اُلّو اداس بنا بیٹھا رہتا ہے کہ پہلے تو پرندوں نے اس کا کہنا نہیں مانا۔ اور اب میں ان کے بچانے کے لئے کوئی انتظام بھی نہیں کرسکتا۔ اس سے وہ کبھی کبھی رات کے سناٹے میں مارے دکھ کے "گھو گھو" کرکے رونے لگتا ہے۔

نثار احمد تبسّم بازیدپوری

شیر کی خالہ

کسی جنگل میں ایک شیر جا رہا تھا راستہ میں اس کو ایک بلی ملی۔ بلی نے جھک کر شیر کو سلام کیا اور کہا کہ اے بہادر شیر مجھکو اپنی ذات میں شامل کرلے۔ شیر نے کہا اچھا آج تو مجھکو بہت کام ہے تم کل آؤ۔ بلی نے پوچھا کل میں کس وقت آؤں۔ شیر نے کہا" کل صبح چھ بجے سے دس بجے تک میں اپنے گھر میں رہتا ہوں۔"

اگلے دن بلی نے صبح ہی اُٹھ کر کچھ چوہوں کا ناشتہ کیا اور شیر کے گھر گئی۔ سلام کرنے کے بعد شیر نے کہا" میں بہت خوش ہوں کہ تم ہماری ذات میں شامل ہونا چاہتی ہو۔ میں

کچھ کہتا ہوں تم بھی ویسا ہی کہنا۔ بلّی نے جواب دیا جی اچھا اب شیر نے کہنا شروع کیا کہ "میں شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔ میں بھی شیر کی ذات میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ اور جو چاہے میرے ساتھ سلوک کرے"۔ اتنا کہہ کر شیر نے کہا کہ اب جاؤ اور روز ہمارے دربار میں آیا کرو۔ بلّی نے شیر کو سلام کیا اور رخصت ہوگئی۔ دوسرے دن بلّی دربار میں حاضر ہوئی شیر نے حکم دیا کہ سب جانور اپنے اپنے کمالات دکھائیں۔ سب سے پہلے بلّی اٹھی اور اپنے کمالات دکھلانے لگی۔ پہلے تو اس نے شیر کو شکار سکھایا۔ شیر بہت خوش ہوا اور بلّی کو بہت چاہنے لگا۔ اب ہر روز بلّی ایک نیا کمال شیر کو دکھلانے لگی۔ ایک روز بلّی اور شیر کی کسی بات میں لڑائی ہوگئی۔ شیر کو بہت غصہ آیا۔ اور کہنے لگا تو میرے پاس رہتی ہے۔ اور میرا نمک کھاتی ہے۔ مگر نمک حرامی بھی کرنے لگ گئی! شیر کو اب بلّی سے دشمنی ہوگئی۔ ایک روز شیر آدھی رات کو بلّی کے پاس گیا اور بلّی کو مارنے لگا۔ بلّی بہت پریشان ہوئی مگر فوراً اس نے سوچا کہ وہ کمال کرنا چاہیے جو شیر کو نہ آتا ہو، فوراً وہ درخت پر چڑھ گئی شیر کو یہ دیکھ کر اور غصہ آیا کہ اس نے مجھکو پیڑ پر چڑھنا نہیں سکھایا۔ اس طرح اب بھی شیر کو پیڑ پر چڑھنا نہیں آتا۔

بلّی کو شیر کی خالہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہے

آغا عبدالزہرا نجفی

ایک بڑھیا کی وصیت

ایک بڑھیا کا انتقال ہوگیا۔ اب جو اس کی وصیت دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ ۹۹۹ روپیہ چھوڑے ہیں اور یہ رقم دو باپ اور دو بیٹوں میں برابر تقسیم ہونی چاہیئے۔ لیکن شرط یہ کہ ہر ایک کو ۳۳۳ روپے ملنے چاہئیں۔

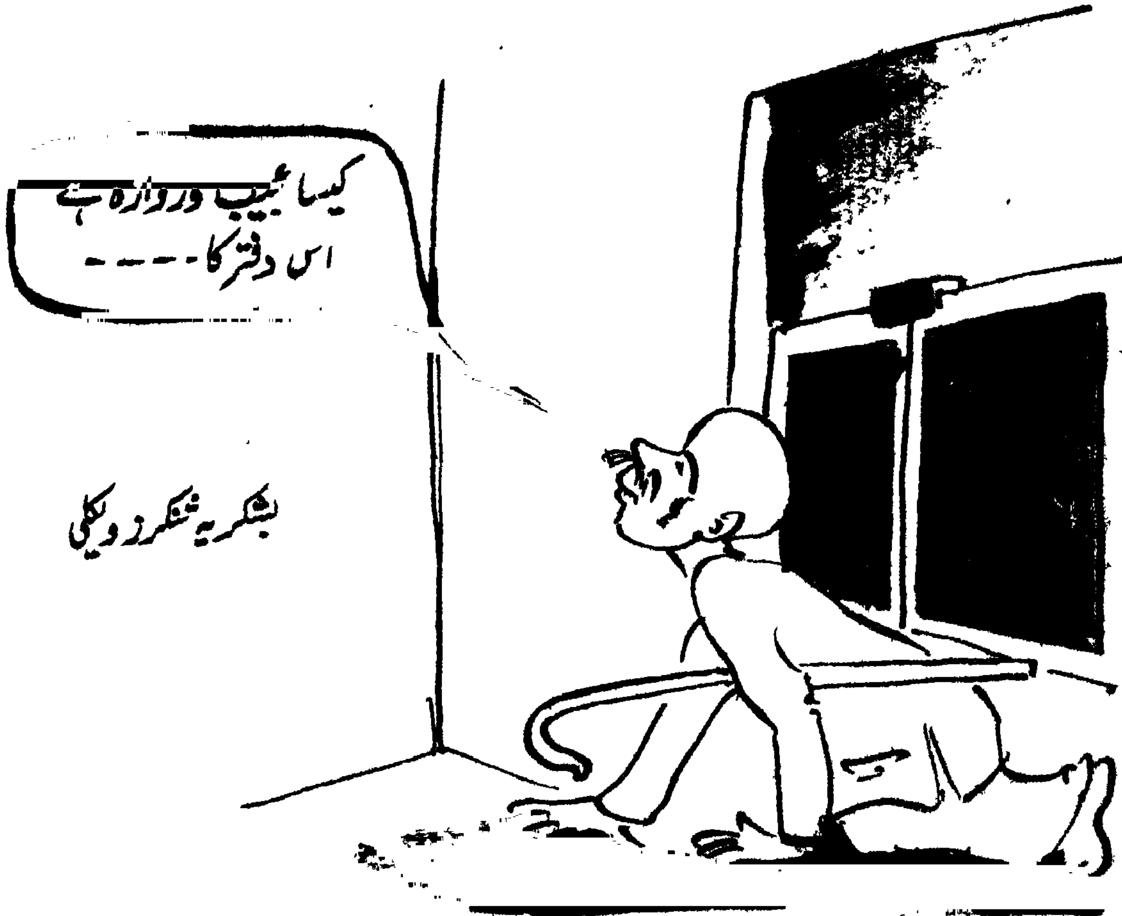
وکیل صاحب یہ وصیت دیکھ کر گھبرا گئے کہ ۹۹۹ روپیہ کس طرح بانٹے جائیں کہ ہر ایک کے حصہ میں ۳۳۳ روپیہ آجائیں؟

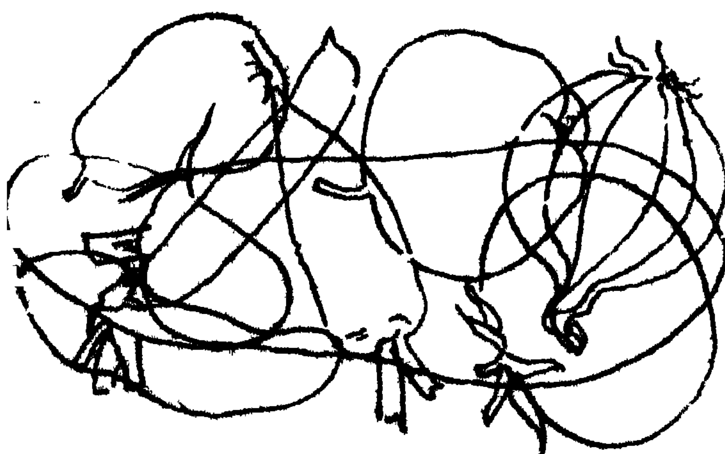
لیکن بڑھیا بیوقوف تو نہ تھی کہ جس نے ایسی وصیت کی۔ اس پیچیدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔

اس نے کہا بڑھیا ٹھیک کہتی ہے۔ ہر ایک کو ۳۳۳ روپے مل سکتا ہے۔

آپ بتائیے کیسے۔

پہلے خود سوچئے پھر جواب صـ ۹ پر ملاحظہ کیجئے۔





اس میں سبزیاں اور پھل ہیں۔
ذرا آپ تلاش تو کیجئے کہ کون کون
سے پھل اور سبزیاں ہیں۔

ننھی منی کہانیوں کا مقابلہ

۵ برس سے ۱۵ برس تک کے بچوں کے لئے نقد انعام پانے کا

بہترین موقع





گروپ ا۔ ۵ برس سے ۸ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں۔

گروپ (ب) ۹ برس سے ۱۲ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں۔

گروپ ج۔ ۱۳ برس سے ۱۵ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں

• ہر گروپ میں تین انعام دیئے جائیں گے۔ جو پہلی، دوسری اور۔۔۔ تیسری بہترین کہانیوں کو دیئے جائیں گے۔

•• تینوں انعام نقد روپے کی شکل میں دیئے جائیں گے

شرائطِ مقابلہ

۱۔ پیامِ تعلیم پڑھنے والے تمام بچے اس مقابلہ میں شرکت کر سکتے ہیں مستقل خریدار ہونے کی کوئی شرط نہیں۔

۲۔ کہانیاں اردو میں ہونی چاہیئے

۳۔ کہانی کہیں سے نقل نہ کی گئی ہو۔ بلکہ خود بچوں کی لکھی ہوئی چاہیئے۔

۴۔ ہر کہانی کے ساتھ آپ کا پورا نام، عمر اور پتہ ضرور ہونا چاہیئے۔

۵۔ کہانی اس سے پہلے کہیں چھپی نہ ہو۔

۶۔ کہانی صاف اور خوشخط لکھی ہوئی ہونی چاہیئے۔ کٹی پھٹی نہ ہونی چاہیئے ایسی کہانیاں مقابلہ میں شریک نہ کیجائیں گی

۷۔ کہانی پر "انعامی مقابلے کے لئے" ضرور لکھئے۔

۸۔ • گروپ الف کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۲ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے۔

•• گروپ ب کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۴ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے۔

••• گروپ ج کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۶ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے

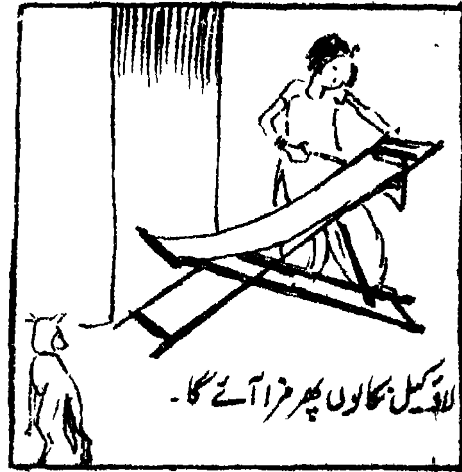
کہانی بھیجنے کا پتہ :۔ اڈیٹر پیامِ تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی۔

کلو مینا کی کہانی

۱



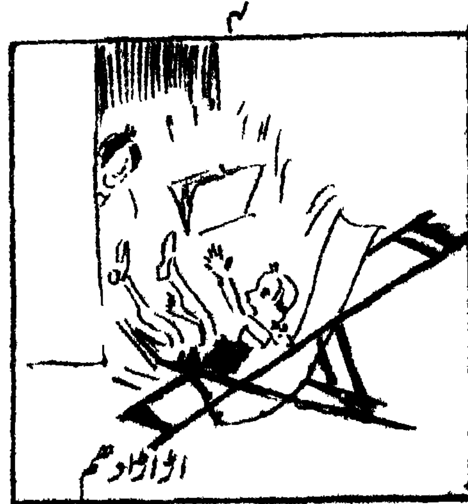
۲



۳



۴



بشکریہ شنکرز ویکلی

پیامی معمہ نمبر ۱۱ کا نتیجہ

اس بار صحیح اور ایک غلطی والا حل کوئی بھی موصول نہیں ہوا۔ چنانچہ پہلے اور دوسرے انعام کی ۱۲ کتابیں دو غلطی والے چھ حضرات پر تقسیم کر دی گئیں۔

(۱) سید نثار احمد۔ جھریا (۲) اختر حسن۔ گیا (۳) محمد اقبال احمد۔ الہ آباد۔ (۴) رفیق احمد۔ چامرا (۵) محمد یونس انصاری۔ ٹانڈہ (۶) شکیل احمد۔ کانپور

تین غلطی والے بارہ حل موصول ہوئے۔ چنانچہ دوسرے انعام کی بارہ کتابیں ان حضرات پر تقسیم کر دی گئیں۔

(۱) ریحانہ خانم۔ کھام گاؤں (۲) معین الدین۔ گورکھپور (۳) بلقیس ناظرہ۔ ہردہ (۴) این۔ ایس محمد حسین۔ کٹرپہ (۵) گور دیال سنگھ بھاٹیہ۔ ٹاٹا نگر (۶) زبیر احمد۔ اعظم گڑھ (۷) محمد اسماعیل۔ شیو گنج (۸) موثق اللہ خاں۔ کھام گاؤں (۹) کفیل احمد۔ کوڑکی۔۔۔ (۱۰) سیدہ محمودہ بیگم۔ الہ آباد (۱۱) ایم۔ فرہاد۔ کلکتہ (۱۲) ست پال عشرت۔ دہلی۔

صحیح حل

دائیں سے بائیں

(۱) سندریں (۴) بابر (۱۰) اصرار
(۵) ذکر۔ (۸) عامل (۱۱) جبر

اوپر سے نیچے

(۲) بد۔ (۴) حشمت (۸) عقل
(۳) اعتبار (۶) آج (۹) مرض

شرائط پیامی معمہ۔ صفحہ نمبر پر دیکھئے

ہر حل کے ساتھ کوپن **۲۰ روپے کے نقد انعامات** فیس داخلہ ار کے ٹکٹ کی صورت میں بھیجنا ضروری ہے

آخری تاریخ داخلہ ۱۰ / جون ۵۲ء

پیامی معمہ نمبر ۱۳

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۶ روپے

دوسرا انعام ایک غلطی پر ۴ ″

تیسرا انعام دو غلطی پر ۳ ″

دائیں سے بائیں

۱۔ پاکستانی بچے مکتبہ ۔۔۔۔ کو مبلغ چار روپے کا منی آرڈر کرکے پیام تعلیم کے خریدار بن سکتے ہیں۔

۴۔ سخت قسم کی ۔۔۔ بہادروں کا بھی دل توڑ دیتی ہے۔

(۶)۔ ایسا کھانا ہر آدمی پسند کرتا ہے

(۷)۔ کچھ ۔۔۔۔ ایسے ہوتے ہیں جن سے ڈاکٹر بھی تنگ آجاتے ہیں

(۹) زیادہ ۔۔۔ سے طبیعت پریشان ہوجاتی ہے

۱۰۔ یہ ۔۔۔ آدمی کبھی ہر دل عزیز نہیں ہوتا۔

اوپر سے نیچے

۲۔ یاد رکھئے ننھی منی کہانیوں کے مقابلے کی آخری تاریخ پندرہ ۔۔۔۔ ہے

۳۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تک چلنے کے بعد تھکن ہو ہی جاتی ہے (تین حرفی)

۵۔ جس باغ میں ۔۔۔ نہیں وہ باغ ہی کیا؟

۸۔ یہ لفظ کبھی اپنی زبان پر مت لائیے

پیامی معمہ نمبر ۱۳

۳ د	۲ ج		د	ه		۱ ش
	■	۵ ■		ر	ا	۴
ر	ل	ا		م	ر	۶
ت		■		گ	و	۷
	۸ خ	ی		■	۹ ■	■
	■			ی	ر	۱۰ ش

کوپن پیامی معمہ نمبر ۱۳

نام ــــــــــــــــــــــــــــــــ

پتہ ــــــــــــــــــــــــــــــــ

ــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

پرنٹر پبلشر: محمد حسین حسان ۔۔۔ پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ ۔۔۔



بچے تنکوں سے ایک گاؤں کا نمونہ بنا رہے ہیں



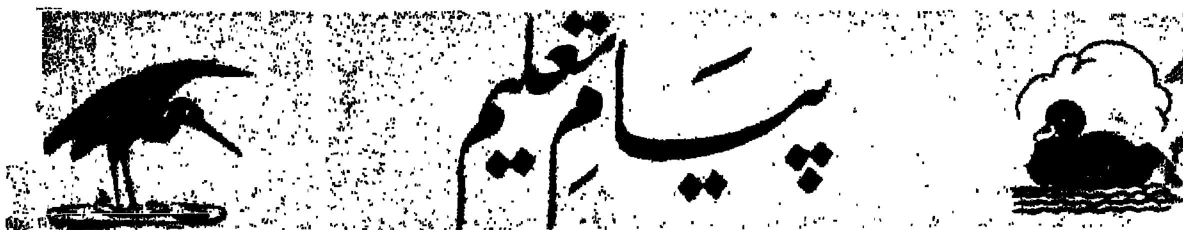
پسند اپنی اپنی [illegible] کا وقت ہے۔ یہ بچے [illegible] کی دیکھ بھال کر رہے ہیں



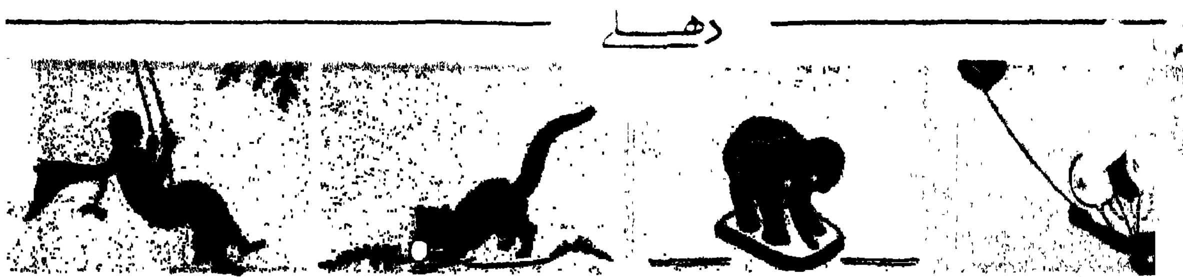
آس پاس کی چیزوں سے اپنے کیمپ کو سجا رہے ہیں

Regd No. D. 96.
MAY 1952

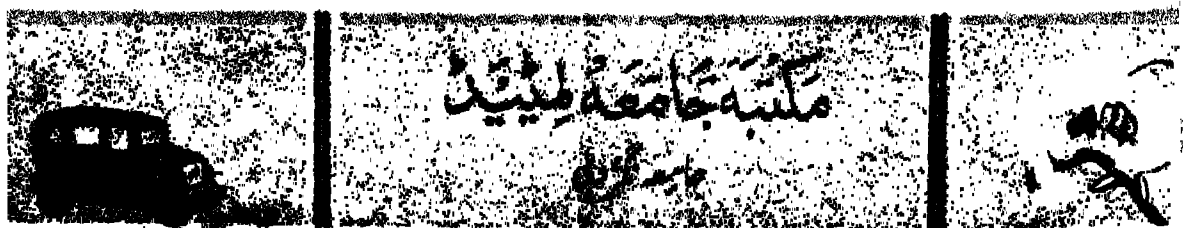


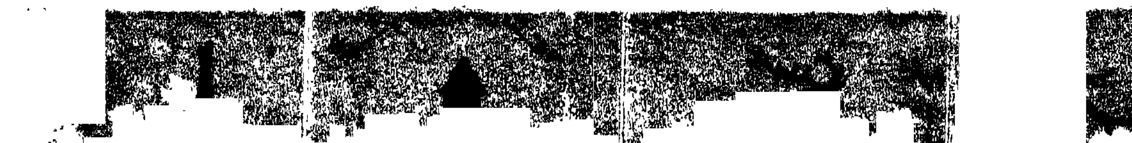


دہلی











محمد معین

آپکی کتاب ''چمپاوت کے آدم خور شیر'' پر اسی شمارے
میں تبصرہ ملاحظہ فرمائیے



پیام تعلیم

جون ۱۹۵۲ء

ادارہ

حامد علی خاں بی، اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم اے (علیگ)

چندہ سالانہ ۴ روپیہ

فی پرچہ ۶ آنہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، دہلی



بچوں سے باتیں

جون کا پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں آپ کو کچھ تبدیلی نظر آئے گی ہم نے اس بار آٹھ صفحے اور بڑھا دئے ہیں۔ اس طرح اب یہ نمبر ۵۶ صفحوں کا ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ پیامی چھٹیاں منا رہے ہوں گے۔ خوب فرصت ہوگی۔ کئی پیامیوں نے ہمیں لکھا کہ ۴۸ صفحے تو ہم دو روز میں پڑھ ڈالتے ہیں۔ اور اب تو چھٹیاں ہیں۔ اس مہینے میں خاص طور پر کچھ صفحے بڑھا دیجئے۔ اسی لئے ہم نے اس بار یہ صفحے بڑھائے ہیں۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ کا پیام تعلیم ہمیشہ چھپّن صفحوں کا نکلے مگر یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب آپ خود بھی دلچسپی لیں۔ یہ کوئی مشکل کام بھی تو نہیں۔ اگر آپ یہ طے کر لیں کہ اس چھٹی میں آپ دو خریدار بھی بڑھائیں گے تو یہ بہت آسان ہو جائے۔ آپ جن دوستوں سے چھٹیوں میں ملیں اگر وہ اب تک پیام تعلیم کے خریدار نہیں ہیں تو انھیں خریدار بنائیے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ میں سے ہر ایک بڑی آسانی سے دو خریدار تو بنا سکتا ہے۔ اس طرح اگر آپ نے خریدار بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹایا تو پھر ہم

مستقل طور پر ۵۶ صفحہ کا پیام تعلیم نکال سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پیامی کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔

ننھی منی کہانیوں کے مقابلے کی آخری تاریخ ۱۵ جون تھی۔ مگر بعض پیامیوں کا تقاضا تھا کہ یہ تاریخ بڑھا دی جائے۔ اس لئے کہ پچھلے دنوں بچے عام طور پر امتحانوں میں مشغول رہے۔ یہ دیکھتے ہوئے ہم نے یہ تاریخ بڑھا کر ۱۵ر جولائی کر دی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پیامی جلد ہی اپنی کہانی روانہ کر دیں گے۔ اس بار انعام کی رقم کا فیصلہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ہم نوّے روپے کے نقد انعامات تقسیم کریں گے۔ اس کا مفصل اعلان اس شمارے میں کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمایئے

ادارہ



مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

کی تین نظمیں

گرمی کا موسم

مئی کا آن پہنچا ہے مہینا
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینا

بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا!
ہُوا پیروں تلے پوشیدہ سایا

چلی لُو اور تڑخنے کی پڑی دھوپ
لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ

زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے
کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے

در و دیوار ہیں گرمی سے تپتے!
بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے

پرندے اُڑ کے ہیں پانی پہ گرتے
چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے

درندے چھپ گئے ہیں جھاڑیوں میں
مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں

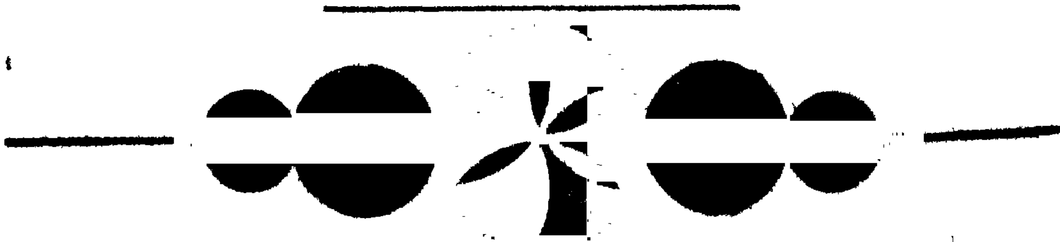
نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی
زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی

نہ پنکھا ہے، نہ ٹٹّی ہے، نہ کمرہ
ذرا سی جھونپڑی، محنت کا ثمرہ

امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

ایک وقت میں ایک کام

ہے کام کے وقت کام اچھا
اور کھیل کے وقت کھیل زیبا
جب کام کا وقت ہو کرو کام
بھولے سے بھی کھیل کا نہ لو نام
ہاں کھیل کے وقت خوب کھیلو
کودو پھاندو کہ ڈنڈ پیلو
خوش رہنے کا ہے یہی طریقہ
ہر بات کا سیکھئے سلیقہ
ہمّت کو نہ ہاریو خدارا
مت ڈھونڈھیو غیر کا سہارا
اپنی ہمّت سے کام کرنا
مشکل ہو تو چاہیئے نہ اڑنا
جو کچھ ہو سو اپنے دم قدم سے
کیا کام ہے غیر کے کرم سے
مت چھوڑیو کام کو ادھورا
بے کار ہے جو ہوا نہ پورا!
ہر وقت میں صرف ایک ہی کام
پاسکتا ہے بہتری سے انجام
جب کام میں کام اور چھیڑا
دونوں ہی میں پڑ گیا بکھیڑا
جو وقت گذر گیا اکارت
افسوس! ہوا خزانہ غارت
ہے کام کے وقت کام اچھا
اور کھیل کے وقت کھیل زیبا



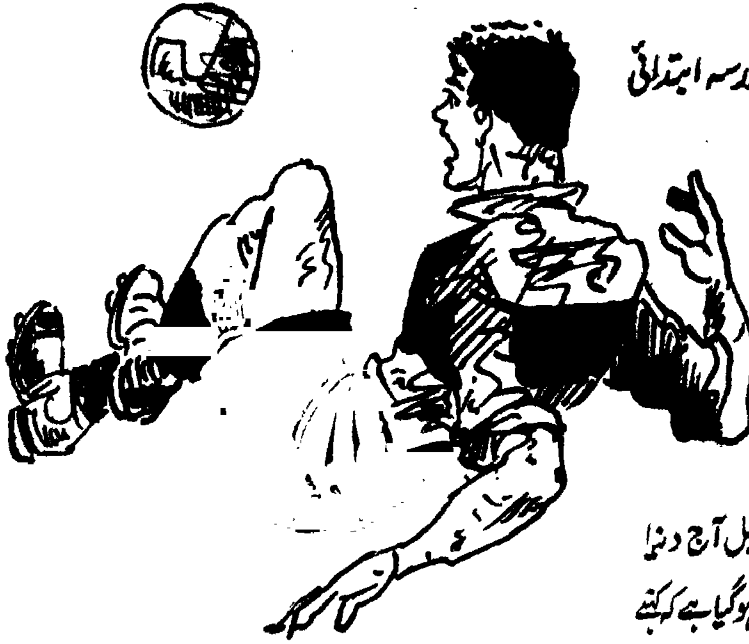
پودا اور گھاس

اتفاقاً ایک پودا اور گھاس
باغ میں دونوں کھڑے تھے پاس پاس
گھاس کہتی تھی "کہ اے میرے رفیق!
کیا انوکھا اس جہاں کا ہے طریق!
ہے ہماری اور تمھاری ایک ذات
ایک قدرت سے ہے دونوں کی حیات
مٹی اور پانی ہوا اور روشنی
واسطے دونوں کے یکساں ہے بنی
تجھ پہ لیکن ہے عنایت کی نظر
پھینک دیتے ہیں مجھے جڑ کھود کر
سر اٹھانے کی مجھے فرصت نہیں
اور ہوا کھانے کی بھی رخصت نہیں
کون دیتا ہے مجھے یاں پھیلنے
کھا لیا گھوڑے گدھے یا بیل نے
تجھ پہ منہ ڈالے جو کوئی جانور
اس کی لی جاتی ہے ڈنڈے سے خبر
اولے پالے سے بچاتے ہیں تجھے
کیا ہی عزت سے بڑھاتے ہیں تجھے
چاہتے ہیں تجھ کو سب کرتے ہیں پیار
کچھ پتا اس کا بتا اے دوستدار"
اس سے پودے نے کہا یوں سر ہلا
"گھاس، سب بیجا ہے یہ تیرا گلا
مجھ میں اور تجھ میں نہیں کچھ بھی تمیز
صرف سایہ اور میوہ ہے عزیز
فائدہ اک روز مجھ سے پائیں گے
سایہ میں بیٹھیں گے اور پھل کھائیں گے"

ہے یہاں عزت کا سہرا اس کے سر
جس سے پہنچے نفع سب کو بیشتر



سید حسن۔ نگراں مدرسہ ابتدائی



فٹ بال کا کھیل

فٹ بال کا کھیل آج دنیا میں اتنا مقبول اور عام ہوگیا ہے کہ کہتے ہیں اس کھیل کے لئے کبھی سورج ڈوبتا ہی نہیں، اپنے دیس ہی کو لے لیجئے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلے جایئے ہر جگہ اس کھیل کے جاننے والے اور کھیلنے والے بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو یہ کھیل ہے بھی بہت پرانا، یونان کا نام آپ نے سنا ہوگا اور شاید اسپارٹا کے نام سے بھی واقف ہوں، یہ یونان کا ایک شہر ہے، تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ۵۰۰ ق م میں ایک ایسا کھیل کھیلا جاتا تھا جس میں گیند کی طرح کی ایک چیز کو کھیلنے والے اپنے پیر سے ایک جگہ سے کک کرتے تھے اور جب یہ گیند مخالف ٹیم کے میدان کی آخری لکیر کو پار کرجاتی تھی تو گول مان لیا جاتا تھا۔ بعد میں اسے رومنوں نے اپنایا اور پھر تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ان رومنوں کے ذریعے انگلستان پہنچا، جہاں اس کھیل نے آہستہ آہستہ وہ شکل اختیار کی جسے آج ہم سب دیکھ اور کھیل رہے ہیں۔ اس طرح فٹ بال کے کھیل نے انگلستان میں ہی سب سے پہلے جنم لیا۔

ہاں تو اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ فٹ بال کہاں سے اور کیسے شروع ہوا۔ اب ذرا اور آگے بڑھیں۔ انگریزوں کو آپ جانتے ہی ہیں۔ دنیا کا کون سا کونا ایسا ہوگا جہاں یہ نہ پہنچے ہوں۔ چنانچہ یہ جہاں گئے اپنی اور چیزوں کی طرح فٹ بال کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ خود کھیلے دوسروں کو کھلایا، یہاں تک کہ وہاں بھی فٹ بال عام طور سے کھیلا جانے لگا۔ اس طرح ہوتے ہوتے اب تو دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں فٹ بال نہ کھیلا جاتا ہو۔

ہمارے دیس میں بھی فٹ بال کا کھیل انگریزوں کا لایا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آج سے چند سال پہلے ہم غلام تھے، ہمارے دیس پر انگریز راج کرتے تھے، یہ لوگ دوسری چیزوں کی طرح فٹ بال ہمارے دیس میں لائے اور بالکل اپنے لئے لائے شروع شروع میں صرف فوجی کھیلتے تھے۔ کلکتہ بمبئی اور شملہ جیسے شہر جہاں یہ لوگ رہتے تھے کھیلا جاتا تھا، لیکن بعد کے میل جول سے یہاں کے لوگ بھی حصہ لینے لگے، یہاں تک کہ اب ملک کا کون سا حصہ یا شہر ہے جہاں یہ کھیل نہ کھیلا جاتا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت فٹ بال ہمارے دیس کا سب سے زیادہ عام اور مقبول کھیل ہے۔

بنگال کا نام آپ نے سنا ہوگا یہ پورب میں ہمارے دیس کا آخری صوبہ ہے یوں سمجھیئے یہ فٹ بال کا گھر ہے، ہمارے دیس میں سب سے زیادہ فٹ بال یہیں کھیلا جاتا ہے۔ فٹ بال کا سیزن آیا اور پورے صوبے میں ایک لہر دوڑ گئی۔ شام ہوئی اور شہر کی ایک بڑی آبادی جس میں بچے بوڑھے جوان کھلاڑی اناڑی حاکم محکوم، عالم جاہل، مزدور پیشہ لوگ ہیں کھیل کھیلنے یا دیکھنے کسی نہ کسی میدان کی طرف چل پڑے۔ دوسرے صوبوں اور شہروں کے بہت سے کھلاڑی بھی یہیں آکر اپنے کھیل کے جوہر دکھانا پسند کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ پسند کریں، یہاں کی پبلک بھی تو ان کھلاڑیوں کے لئے اپنے دل میں جگہ رکھتی ہے۔ یہاں بہت سی ایسی انجمنیں ہیں جو ان کھلاڑیوں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتی ہیں۔

موہن بگان، محمڈن اسپورٹنگ اور ایسٹ بنگال کے نام اکثر سنے ہوں گے۔ یہ تینوں بنگال کی ٹیمیں ہیں جو فٹ بال میں نہ صرف بنگال بلکہ دیس کی سب سے اچھی اور مشہور ٹیمیں سمجھی جاتی ہیں، دیس میں فٹ بال کے جتنے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں ان میں عام طور سے بنگال ہی کی ٹیمیں جیتتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کھیل کے صوبائی مقابلوں میں بھی بنگال ہی عام طور سے سب سے آگے رہتا ہے۔ بنگال کے علاوہ میسور، مدراس اور بہار میں بھی فٹ بال بہت کھیلا جاتا ہے ادھر چند سالوں سے حیدرآباد نے

بھی اس کھیل میں بڑی ترقی کی ہے یہی وجہ ہے کہ دیس کے اچھے کھلاڑی زیادہ تر ان ہی صوبوں کے ملتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ جہاں کھیل کا اتنا چرچا ہو، وہاں کے کھیل کا معیار کتنا بلند ہو گا۔ پھر دیس بھی بہت بڑا ہے، لہذا ہمارے دیس میں اچھے کھلاڑیوں کی کمی نہیں۔ ایک سے ایک اچھا کھلاڑی موجود ہے، مثلاً میوا لال، منا، وردراج لطیف، صالح، احمد خاں وغیرہ۔

ہمارے کھلاڑیوں کے کھیلنے کا طریقہ دوسرے دیسوں کے کھلاڑیوں سے بہت مختلف ہے یہ لوگ عام طور سے ننگے پیر کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ جوتا پہن کر کھیلنا انہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اب آہستہ آہستہ یہ لوگ اس کی عادت ڈال رہے ہیں، اس لئے کہ یہ محسوس ہوا کہ اگر دیس کو اس کھیل میں دوسرے دیسوں سے آگے کرنا ہے تو جوتا پہن کر کھیلنا ضروری ہے۔ جوتا پہن کر کھیلنے میں بہت سے فائدے ہیں۔

ہمارے کھلاڑیوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ آپس میں چھوٹے چھوٹے پاس دے کر کھیلتے ہیں، اسی طرح کھیل میں تیزی پھرتی اور خوبصورتی بھی دوسرے دیسوں کے کھلاڑیوں سے زیادہ ہمارے کھلاڑیوں میں نظر آتی ہے۔ لیکن ہمارے کھلاڑیوں میں ایک دو کمیاں بھی ہیں، مثلاً گول کم کر پاتے ہیں۔ نشانہ اکثر چوک جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گول کے قریب آ کر گھبراہٹ سے کام لیتے ہیں جس سے گیند گول میں پھینکنے کی بجائے ادھر ادھر چلی جاتی ہے۔ آج ہمارے کھلاڑیوں سے یہ بات نکل جائے اور وہ آخر وقت میں بھی سکون اور اطمینان کو قائم رکھ سکیں تو پھر کوئی دوسرا دیس مقابلہ نہیں کر سکتا ہے، ہمیشہ پالا ہمارے ہی ہاتھ آئے۔

۱۹۴۸ء کے دنیاوی اولمپک میں ہمارے دیس نے بھی پہلی مرتبہ شرکت کی۔ مقابلہ فرانس سے پڑا جس میں ایک گول سے ہمارے دیس کو ہار ہو گئی۔ ہونے کو تو ہار ہوئی تھی لیکن ہمارے کھلاڑیوں کا کھیل اتنا اچھا تھا اور دیکھنے والوں کو اتنا پسند آیا کہ تماشائیوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں اور ہر زبان پر یہ تھا کہ "اچھی ٹیم ہار گئی"۔

جن کھلاڑیوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا اور اپنے دیس کا نام اتنا اونچا کیا تھا ان کے نام یہ ہیں
کے۔ وی۔ وردراج۔ تاج محمد۔ ایس منا۔ ایس، اے بشیر۔ ٹی آو (پاکستان)، جہاں پرشاد۔ روپی داس۔ پی ہر ایپ، ایس میوا لال، ایم احمد خاں، ایس رامن۔

کھیل کے معیار کو اونچا کرتے اپنے آپ کو جانچنے دیس کا نام روشن کرنے اور دوسرے ملکوں سے دوستانہ میل جول بڑھانے کے لئے ہمارے دیس کی ٹیمیں دوسرے دیسوں میں بھی جا کر کھیلتی ہیں۔ اسی طرح خود دیس میں

بھی ہر سال بہت سے ٹورنامنٹ ہوتے رہتے ہیں جس میں ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک کی ٹیمیں آپس میں مقابلہ کرتی ہیں۔ ایک دوسرے سے سیکھتی ہیں اور مشق اور تجربہ حاصل کرتی ہیں۔

سال میں ایک مرتبہ ایسا مقابلہ بھی ہوتا ہے جس میں صوبے صوبے کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہمارا صوبہ اس کھیل میں چمپین ہے یعنی اول نمبر پر ہے۔ جو ٹیم جیتتی ہے اسے سنتوش نام کی ایک بہت خوبصورت سی ٹرافی پیش کی جاتی ہے، جسے وہ صوبہ سال بھر تک اپنے پاس رکھتا ہے۔

اس طرح کے کھیلوں کا انتظام کرنے اور پورے ملک میں کھیل برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے آل انڈیا فٹبال فیڈریشن کے نام سے ایک انجمن ہے جس کے ماتحت کم وبیش تمام صوبوں اور ریاستوں میں اپنی اپنی الگ انجمنیں ہیں۔

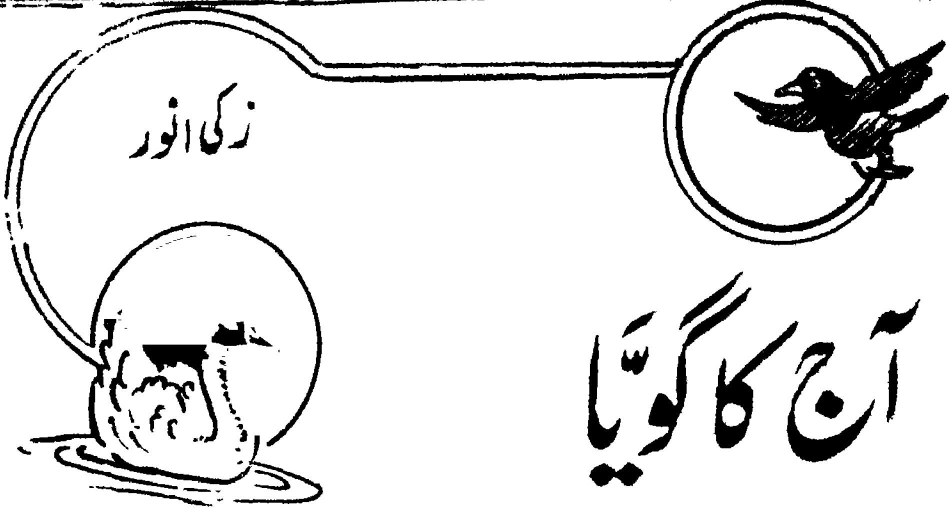
فٹ بال بہت دل چسپ اور سستا کھیل ہے ایک گیند، چند کھلاڑی اور تھوڑی سی صاف ستھری زمین بھی ہو تو کھیلا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دوسرے کھیلوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوا۔ صحت، تندرستی میل جول، کسی مقصد کی خاطر دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا، اور تفریح ان جیسے میدانی کھیلوں کی خوبیاں ہیں، دن بھر کے کام کے بعد تمام فکروں اور پریشانیوں سے آزاد ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اس طرح کے کھیل کھیل لینا، آدمی کو ہر وقت تازہ دم رکھتا ہے۔

(بقیہ مضمون ایک یادگار کتاب صفحہ ۱۵)

اور زندہ رہتے۔ اور اسی طرح اچھی اچھی کتابیں لکھتے مگر افسوس کہ موت نے انھیں وقت نہ دیا۔

ہم پیامی بچوں سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ کتاب کے شروع میں محمد معین کی ایک بڑی تصویر ہے۔ ٹائٹل دو رنگا اور خوب صورت ہے۔

آپ،



آج کا گویّا

زکی انور

کسی کوئل کو اپنے گانے پر بڑا ناز تھا۔ وہ ہمیشہ گاتے وقت سوچا کرتی کہ شاید ہی جنگل میں کوئی اور پرند مجھ جیسا گاتا ہوگا۔ لیکن ایک دن اُس نے بُلبل کا گانا سُنا۔ وہ اس کا گانا سُن کر خوش تو بے شک ہوئی لیکن اُسے یہ ماننا پڑا کہ بُلبل یقینی طور پر اس سے زیادہ اچھا گاتی ہے۔

تب سے جب بھی کوئل گانے لگتی، اُسے بُلبل کی سُریلی آواز اور مدھبری تان یاد آجاتی اور وہ بڑے رشک کے انداز میں سوچنے لگتی کہ کاش میں بھی بلبل جیسی سُریلی آواز میں گاسکتی!

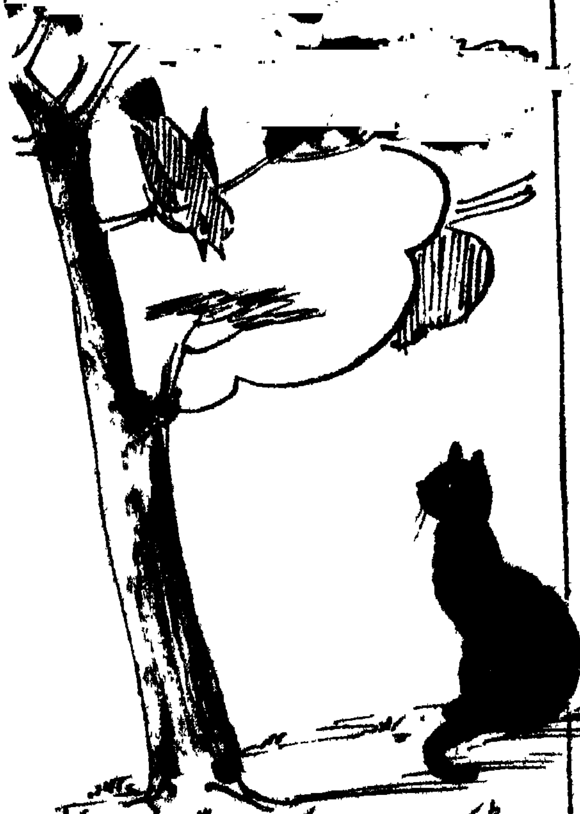
ایک دن وہ آم کی ایک ڈالی پر بیٹھی گارہی تھی اور روز کی طرح یہ تمنّا کررہی تھی کہ کاش اس کی آواز میں بھی بُلبل کی آواز جیسا لوچ اور مٹھاس پیدا پیدا ہوجائے۔

اتنے میں ایک بِلّی گھومتی پھرتی اُدھر آنکلی۔ اور کوئل کے گانے کی آواز سُن کر آم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ گانے بجانے سے تو بلّی کو کوئی دل چسپی تھی نہیں۔ لیکن کوئل کو دیکھ کر اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ وہ سوچنے

لگی کہ کسی طرح اس کوئل کو چٹ کر سکوں!
بلّی نے سوچا۔ یہ گانے بجانے والے لوگ ہیں اپنے راگ رنگ کی ہی دنیا میں مست رہتے ہیں۔ انھیں نہ تو اپنے پاس۔ پڑوس کی خبر ہوتی ہے اور نہ یہ لوگ کچھ سوچتے ہی ہیں۔ انکی اس حماقت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اس کوئل کو بھی معمولی سا چکمہ دے کر ہضم کر جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

سوچتے سوچتے اُسے اِسی قسم کے ایک شکار کا واقعہ یاد آگیا ۔ چند سال پہلے اس نے ایک گویتے مرغ کا شکار بڑی آسانی سے کر لیا تھا۔

بات یہ ہوئی تھی۔ مُرغ کو اپنے گانے پر بڑا ناز تھا۔ ایک دن وہ گا رہا تھا تو بلّی نے اُسے رائے دی تھی۔ کہ آنکھیں بند کرکے گانے میں، گانے والے کو بھی زیادہ مزا آتا ہے اور آس پاس سے بےخبر اور بےفکر ہوجانے کے بعد گانے والا مست ہوکر کہیں زیادہ اچھا گا سکتا ہے ۔ مُرغ تھا بےوقوف وہ بلّی کے چکمے میں آکر آنکھیں بند کرکے گانے لگا تھا اور بلّی نے بڑی آسانی سے اُسے پکڑ کر چٹ کر لیا تھا



ٹھیک وہی ترکیب بلّی نے کوئل کو بتائی۔

"واہ وا ۔ واہ وا"۔ بلّی چیخی ۔"کیا کہنے ہیں؟ کیا کہنے ہیں بی کوئل!۔ کیا رس بھرا گلا پایا ہے تم نے ۔ بس کمال ہوگیا۔ جواب

نہیں بھئی!"

کوئل چپ ہوگئی۔ اس نے نیچے دیکھا تو سامنے بلّی بیٹھی تھی اس وقت وہ اپنی تعریف سُن کر کچھ ایسا محسوس کرنے لگی تھی کہ اُسے یہ خوف بالکل نہیں ہوا کہ دشمن کی باتیں ہمیشہ ہی گھاتوں سے بھری ہوتی ہیں اُس نے خوش ہوکر پوچھا۔

"کیا میں سچ مچ اتنا اچھا گا سکتی ہوں؟"

"ارے تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں"۔ بلّی بولی۔"ارے جھوٹے کے منہ میں خاک، سچ کہتی ہوں جنگل میں کوئی اور ایسا گانے والا نہیں"۔

کوئل کے دل پر دھچکا سا لگا۔ اس کا زخم ہرا ہوگیا۔ اور اس نے بڑے مایوس انداز میں کہا۔

"نہیں بی صاحبہ! یہ بات نہیں جنگل میں ایک سے ایک فن کار پڑے ہوں گے۔ دُور کیوں جاؤ، بلبل ہی کو لے لو، کتنا اچھا گاتی ہے وہ۔ اہا! ایسا لگتا ہے جیسے اس کی ایک ایک تان کے ساتھ کائنات کا ذرّہ ذرّہ جھوم جاتا ہے۔ کاش میں بھی ویسا گا سکتی!"

"خاک ہے" بلّی نے منہ بناکر کہا۔ "اُس کے گانے میں لال ٹنکے ہیں؟ تمہارے اور اس کے گانے میں بس اتنا ہی تو فرق ہے کہ وہ گاتے گاتے آنکھیں بند کرلیتی ہے اور آس پاس سے بے خبر مست ہوکر گانے لگتی ہے۔ بس یہی اتنی سی بات اُس کے گانوں میں رس ڈال دیتی ہے اور واقعی مست ہوکر آنکھیں بند کرکے گانے میں بات ہی کچھ اور پیدا ہو جاتی ہے"۔

"بس اتنی سی بات؟" کوئل نے بہت خوش ہوکر پوچھا۔

"بس اتنی ہی سی بات تو ہے" بلّی نے جواب دیا۔ "لیکن یہ کوئی مشکل بات تو نہیں۔ ایسا تو تم بھی کرسکتی ہو"۔

"میں ضرور ایسا کروں گی۔ میں ضرور ایسا کروں گی" کوئل خوشی کے مارے

پھولے نہیں سما رہی تھی ۔
"تو پھر شروع کرو میری جان"
بلی مسکرائی ۔
کوئل گانے لگی ، اب کے وہ بڑے لگن سے گا رہی تھی ۔ گاتے گاتے وہ مست ہوگئی ۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ، اور بھی مست ہوکر گانے لگی وہ سچ مچ جیسے پاس پڑوس سے بےخبر ہوکر گائے جا رہی تھی ۔



جب بلی کو پورا یقین ہوگیا کہ اب کوئل بالکل مست ہوچکی ہے ۔ تو وہ آہستہ آہستہ درخت پر چڑھی ۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس ڈالی پر پہنچ گئی جس پر کوئل بیٹھی گا رہی تھی یک لخت بلی جھپٹی اور جھپٹ کر اس نے کوئل کی ٹانگ اپنے منہ میں لے لی ۔
ایک لمحہ کے لئے کوئل ہکا بکا رہ گئی ۔ لیکن فوراً ہی اس نے مسکراکر پوچھا ۔
"یہ کیا ؟ بی صاحبہ"
"مجھے تمہارا گانا بہت پسند آیا" بلی منہ بند کئے بولی ۔ "اور مجھے تم سے اتنا پیار ہوگیا ہے کہ میں تمہیں ، اپنے پیٹ میں ، اپنے دل سے قریب رکھنا چاہتی ہوں"
"کیا سچ مچ میں نے اتنا اچھا گایا کہ تمہیں مجھ سے اس قدر پیار ہوگیا ہے ؟"
کوئل نے پوچھا ۔
"ہاں ـــ"
لیکن ادھر بلی کے منہ سے "ہاں" نکلی اور ادھر کوئل پھر سے اڑ کر خوب اونچی ڈالی پر جا بیٹھی ۔
کوئل بولی "بی ماؤ آج کا گویا مصیبت پڑنے پر اپنے ہوش نہیں کھو بیٹھتا ۔ وہ ماحول سے خبردار رہتا ہے"



مشتاق بھائی

ایک سائنس داں کی کہانی

کچھ دور جاکر وہ سوچنے لگا کہ کدھر جائے۔ غریب کو کوئی پناہ کی جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ اتنی بڑی دنیا اس کے لئے تنگ تھی۔ اس کا گھر اس کے لئے تنگ تھا۔ دوست کا گھر تنگ تھا۔ ہوٹل کا کمرہ تنگ تھا۔ اور اس کا قصور کیا تھا۔ بس یہی، لوگ نظر آتے تھے اور وہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو سامنے ایک کسان کا جھونپڑا نظر آیا۔ جھونپڑے سے کچھ ہی فاصلے پر پیال کا ایک ڈھیر تھا۔ سائنس داں نے سوچا کہ چلو رات تو اسی پیال کے ڈھیر میں گھس کر کاٹ لوں، صبح دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ پیال کے ڈھیر کے پاس پہنچا اور ڈھیر میں گھس گیا۔

صبح ہوئی تو کسان جانوروں کے لئے پیال لینے آیا۔ سائنس داں کی آنکھ کھل چکی تھی اور وہ لیٹا لیٹا پاؤں ہلا رہا تھا۔ پیال میں سے کھڑکھڑ کی آواز آرہی تھی۔ کسان جھک کر پیال نکالنے لگا تو اس کے کانوں میں کھڑکھڑ کی آواز آئی۔ اس نے سمجھا اندر کوئی کتا گھسا بیٹھا ہے۔ اس نے زور سے کہا "دُر"

کھڑکھڑ کی آواز بند ہوگئی۔ لیکن کسان کو اطمینان نہیں ہوا۔ وہ ایک ڈنڈا لے کر ادھر ادھر کھوجنے لگا اور دُر دُر کرنے لگا۔ یکایک اس کا ڈنڈا کسی جسم سے لگا۔ اس نے جلدی جلدی پیال ہٹائی۔ سامنے کچھ نہیں تھا۔ لیکن ڈنڈا ایک جسم کو چھو رہا تھا۔ اور کسی آدمی کے سانس لینے کی آواز برابر آرہی تھی۔

کسان "بھوت" کا قصہ سن چکا تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ پیال کو برابر کرکے چپکے سے اُلٹے قدم واپس ہوگیا سائنس داں دل ہی دل میں "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کی مالا جپ رہا تھا۔ جب کسان چلا گیا تو اس نے

اطمینان کا سانس لیا۔

لیکن غریب سائنس داں کا یہ اطمینان غلط تھا۔ کسان سیدھا ہوٹل میں پہنچا۔ ہوٹل والوں سے پیال کے ڈھیر کا ماجرا بیان کیا۔ اس کے ساتھ ایک گروہ ہولیا۔ یہ بھیڑ سیدھی تھانے میں پہنچی۔ کسان نے داروغہ سے سارا معاملہ بیان کیا۔ داروغہ فوراً پولیس کی گارد لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ کسان نے کچھ فاصلے سے پیال کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ داروغہ نے پولیس والوں کو حکم دیا کہ ڈھیر کے چاروں طرف گھیرا ڈال لو۔ اور قاتل پر بے دھڑک گولی چلاؤ۔

پولیس والوں نے ڈھیر کے چاروں طرف گھیرا ڈال لیا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ اب داروغہ نے ایک سپاہی کو ماچس کی ڈبیا تھمائی اور حکم دیا کہ جاکر ڈھیر میں آگ لگادو۔ پولیس والا دبے پاؤں آگے بڑھا۔ ڈھیر کے پاس پہنچا اور پیال میں آگ لگادی۔ پیال کچھ گیلی تھی۔ تھوڑی دیر سلگتی رہی۔ پھر دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

سائنس داں گھبرا کر پیال سے باہر نکلا۔ چاروں طرف نگاہ ڈالی تو پولیس والے گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اب بچنا مشکل ہے۔ وہ ایک طرف کو بڑھا۔

جُتا ہوا کھیت تھا۔ دو روز پہلے خوب بارش ہوئی تھی۔ مٹی روئی کی طرح نرم تھی۔ اس کے پاؤں مٹی میں گڑ جاتے تھے۔ پولیس والے سائنس داں کو تو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ لیکن اس کے قدم کے نشان اس کا بھانڈا پھوڑ رہے تھے۔ داروغہ نے فائر کا حکم دیا اور پولیس والوں نے قدم کے نشان سے اندازہ لگا کر دنادن گولی چلانا شروع کر دی۔ سائنس داں جان بچانے کے لئے کبھی ادھر بھاگتا کبھی ادھر لیکن جدھر جاتا گولیوں کی بوچھار اس کا پیچھا کرتی۔ آخر ایک گولی اس کے سر میں لگی۔ زمین پر دھپ سے کوئی چیز گری۔

پولیس والے تھوڑا تھوڑا گھیرے کو تنگ کرتے ہوئے تک پہنچے۔ ٹٹول کر لاش کو معلوم کیا۔ چار آدمیوں نے مل کر اسے اٹھالیا۔ اور ہوٹل میں لے جاکر اس کو چارپائی پر ڈال دیا۔

سارے سائنس داں آزاد مرد ہوتے ہیں۔ اگر وہ آزاد نہ ہوتے۔ رسم رواج کے بندھنوں میں جکڑے ہوتے۔ ان کا ذہن بھی صرف وہی باتیں سوچتا جو دنیا سوچتی ہے۔ وہ بھی صرف وہی کرتے جو دنیا والے کرتے ہیں تو آج دنیا اتنی ترقی نہ کرتی۔ نہ بجلی ہوتی، نہ ریل گاڑی ہوتی، نہ موٹریں ہوتیں نہ ہوائی جہاز ہوتے۔ نہ جان بچانے والے طرح طرح کے انجکشن ہوتے نہ کھیتی باڑی کے نئے نئے اوزار ہوتے۔ یہ سب آرام آج آپ کو اسی لیے میسر ہیں کہ سائنس داں عام ڈگر سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک نیا خیال آتا ہے۔ اس خیال کو وہ تجربہ کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ اگر خیال تجربہ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو وہ آگے



پرتھوی ناتھ کول

علم کی دولت

آپ اس وقت چھوٹے ہیں لیکن بڑا بننے کی خواہش سب کو ہوگی۔ بڑا کس لحاظ سے ؟ عمر کے لحاظ سے یا عقل کے لحاظ سے ؟ آدمی دنیا میں دو طرح سے بڑے بن سکتے ہیں ایک عمر کے لحاظ سے۔ دوسرے دماغی لحاظ سے عمر کے لحاظ سے بڑا بننے کے لئے کسی خاص مشقت یا ترکیب کی ضرورت نہیں۔ یہ قدرتی راستہ ہے۔ آج کا بچہ چند سالوں میں لڑکا۔ پھر جوان اور پھر بوڑھا بن جاتا ہے۔ اس لئے عمر کے اعتبار سے بڑا بننے کے لئے صرف وقت درکار ہوتا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اس اعتبار سے بڑا بننے کے لئے زیادہ بیتاب نہیں ہوں گے ؟

دماغی لحاظ سے بڑا بننا قابل تعریف کام ہے۔ اور شاید آپ بھی اسی لحاظ سے ترقی کرنے کے خواہش مند ہوں گے۔ اس کے لئے علم کی ضرورت ہے اور علم حاصل کرنے کے لئے کئی ذرائع ہیں جن میں سے ایک اہم ذریعہ اسکول ہے۔

آپ مجھ سے سوال کریں گے کہ علم کیا ہے ؟ میرا جواب ہے "علم کے معنی ہیں واقفیت" یہ واقفیت کتابوں کے پڑھنے سے ہوسکتی ہے کیونکہ کتابیں علم کا خزانہ ہیں لیکن کیا آدمی کے لئے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے ؟ میں تو کہوں گا ہاں ضروری ہے! دنیا میں ہر بشر کے لئے واقفیت حاصل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مچھلی کے لئے پانی علم کامیابی کی کنجی ہے اور انسان کی خوشحالی کا زینہ ہے۔ جو آدمی کوئی چیز دیکھ کر اس کی پوری واقفیت نہ حاصل کرنا چاہے وہ بھی کیا آدمی

وہ ہکّا بکّا رہتا ہے۔ دنگ رہتا ہے پریشان رہتا ہے۔ اس لئے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہر ایک شخص کو کتابیں پڑھنا یا لوگوں سے سوال کرنا بہت ضروری ہے۔

اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ آپ کو اسکول جانے کے لئے کیوں کہا جاتا ہے؟ آپ میں سے ہر ایک نے سنا ہوگا کہ مہاتما گاندھی دنیا کے سب سے بڑے آدمی تھے۔ وہ ہماری قوم کے پتا تھے۔ اور انہوں نے ہمارے ملک کو غلامی سے آزاد کرالیا۔ نیپولین بوناپارٹ دنیا کے ایک بہت بڑے جرنیل تھے۔ جنہوں نے فرانس میں جنم لیا تھا۔ کارل مارکس ایک بہت بڑے انقلابی تھے۔ جنہوں نے ایک نئے خیال اور فلسفہ کو جنم دیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور بنگالی ادب کے ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ اقبال اردو فارسی کے ایک چوٹی کے شاعر تھے۔ ایڈیسن ایک بہت بڑے سائنس دان تھے۔ بسمارک دنیا کے ایک بہت بڑے سیاست دان تھے۔ ولیم شیکسپیئر انگریزی ادب کے چوٹی کے ڈرامہ نویس تھے۔ یہ سب لوگ کیسے اتنے بڑے آدمی بن گئے اور انہیں کیسے اتنی بڑی کامیابی ہوئی؟ اس کا جواب صرف ایک ہے "علم کی بدولت" آج بھی ہم دیکھتے ہیں، کہ بڑے بڑے فلاسفر کون ہیں؟ سائنس دان کون ہیں؟ سیاست دان کون ہیں؟ ڈاکٹر کون ہیں؟ پروفیسر کون ہیں؟ وکلار کون ہیں؟ یہ وہی ہیں جنہوں نے علم پر عبور حاصل کیا۔ جنہوں نے اپنے اپنے پیشہ میں مکمل واقفیت حاصل کی

علم ایک بڑی دولت ہے علم سے راستے ہے۔ کامیابی اور ترقی کا لازوال راستہ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہوا اُڑا نہیں سکتی۔ پانی بہا نہیں سکتی۔ آگ جلا نہیں سکتی اور نہ کوئی چور چرا سکتا ہے اس کی وسعت لامحدود ہے۔ اس کی گہرائی سمندر سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے روز روز کے استعمال سے اس میں کمی

کمی نہیں ہوتی بلکہ یہ چیز اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جتنا آپ علم کو حاصل کرنے میں دل و جان لگائیں گے اُتنا ہی آپ اِس میں دلچسپی اور ترقی کا راستہ پائیں گے۔

آپ سوال کریں گے کہ علم کے حاصل کرنے میں دولت کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ میں تو کہوں گا۔ "نہیں۔ ہرگز نہیں"! علم خود دولت ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے روپے پیسوں کی ضرورت نہیں صرف رغبت اور محنت چاہئے۔ دل و جان سے اپنے کو اس میں لگائیے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے اور ایک نہ ایک دن بڑے آدمی بن جائیں گے۔

جواب: ذرا بتائیے تو؟

چوکیدار نے لائن ب کی آخری دو سلاخیں چرا لیں پھر اس نے لائن ج کی دو سلاخیں اٹھا کر لائن ا میں رکھ دیں۔ گنتی میں سلاخیں اب بھی پندرہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ دو سلاخیں جو لائن ج سے اٹھائی گئیں ہیں دو بار

(بقیہ مضمون ایک سائنس داں کی کہانی صفحہ ۱۶ کا)

دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کتنے ہی سائنس داں نئی نئی چیزیں معلوم کرنے کی دھن میں دنیا والوں کے سامنے ذلیل ہوئے ہیں۔ کتنے ہی سائنس دانوں نے اپنی اس دھن کے پیچھے اپنی جانیں کھپا دی ہیں۔

ہمارے ان سائنس داں صاحب نے بھی الوپ ہوجانے والی دوا کے پیچھے اپنی جان دیدی تو کیا ہوا۔ ایک کام کے لئے جان دی۔ ایک مقصد کے لئے مرے۔ بدہضمی سے تو نہیں مرے۔

(بقیہ مضمون مٹی کا باغ صفحہ ۸۴)

مٹی کی طرح دیکھ بھال کرنے سے ہمارا باغ ہمیشہ ہرا بھرا بنا رہے گا۔ باغ سے ہمارے گھر کی خوب صورتی دوگنی ہو جاتی ہے۔ ہم پھولوں کا ہار بنا سکتے ہیں ان کے گلدستے بنا کر اپنے کمرے سجا سکتے ہیں مٹی کی طرح ہم سب لوگوں کو اپنے اپنے گھروں اور اسکولوں میں باغ لگانا چاہئے اور ان کی دیکھ بھال کرنا چاہئیے۔

۵۵ گننے میں آتی ہیں

نادم سیتاپوری

مچھلی کا بیاہ



گڈے اور گڑیا کا بیاہ تو سب ہی نے سنا ہوگا۔ مگر "مچھلی کا بیاہ" شاید ہی کسی نے سنا ہو — ! خیر آج ہم ایک مچھلی کے بیاہ کی کہانی سناتے ہیں۔ جس نے ایک امیر آدمی کو تباہی سے بچالیا۔

بابو درگاہی خاں ضلع رائے بریلی (اودھ) کے ایک بڑے زمیندار تھے جن کے باپ دادا نے غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لئے انگریزوں نے ان کو "تعلقدار" یعنی چھوٹا موٹا راجہ بنادیا تھا۔

جب درگاہی خاں کے باپ مرے تو یہ بہت چھوٹے تھے۔ اس لئے ان کی چھوٹی سی ریاست "اونچاہار" کو سرکار نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ مگر بابوجی کے جوان ہوتے ہی انکی ریاست ان کو واپس کردی گئی۔

اودھ کے امیروں۔ نوابوں اور دوسرے تعلقداروں کی طرح بابوجی بھی بڑے ہی فضول خرچ اور "کھانے اڑانے والے" آدمی تھے۔ بلا محنت کئے اتنی بڑی ریاست اور مال تال دیکھتے ہی ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

روپیہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ خود غرض اور مطلبی دوستوں نے چاروں طرف

گھیر لیا۔ نئے نئے ٹھاٹھ باٹ۔ ناچ رنگ کی محفلیں اور سیر و شکار سبھی کچھ شروع ہوگیا۔ بابو جی کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ آئے دن خیمے ڈیرے ڈالے گومتی ندی کے کنارے پڑے رہتے۔ سارا دن دھوپ میں بیٹھے بیٹھے بابوجی پسینے پسینے ہوگئے اور کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی۔ بہت پریشان تھے۔ آخر شام کے ہوتے ہوتے ایک بڑی خوبصورت سنہری



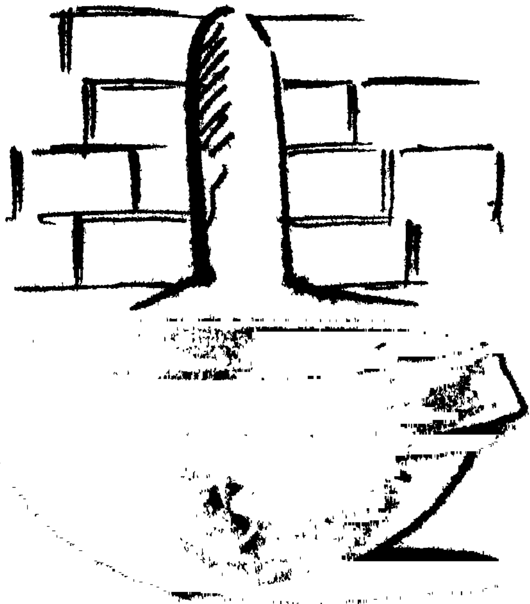
مچھلی آپھنسی۔ جب محنت و مشقت سے

کوئی چیز ملتی ہے تو آدمی اس کی بڑی قدر کرتا ہے۔ یہی حال اس مچھلی کا ہوا۔ بابو جی نے حکم دیا کہ یہ مچھلی زندہ گھر پہنچائی جائے، میں اس کا بیاہ کروں گا۔

بابو جی کے حکم کی دیر تھی۔ ایک بڑے سے مٹکے میں صاف پانی بھر کر مچھلی ان کے گاؤں پہنچائی گئی اور وہاں ایک چھوٹا سا خوبصورت حوض بناکر اس میں مچھلی چھوڑ دی گئی۔ اس مچھلی کا دل بہلانے کے لئے اور بھی بہت سی مچھلیاں اس حوض میں ڈالدی گئیں۔ اور مچھلی کے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

سچے موتیوں کا ہار اور سونے چاندی کے بہت سے گہنے مچھلی کے لئے بنوائے شادی کے خط چھپے۔ لکھنؤ سے بھانڈ بلائے گئے۔ اور طرح طرح کے ناچ رنگ کا انتظام کیا گیا۔ دلہن کے لئے ایک دولہا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ماہی گیروں نے ایک "مہاشیر" مچھلی دولہا بنانے کے لئے بھی ڈھونڈلی۔ بیاہ کا دن آیا

پاس پڑوس سے ہزاروں چھوٹے بڑے زمیندار۔ راجہ نواب اور امیر شادی میں شرکت کے لئے آپہنچے۔ سینکڑوں طرح کے کھانے پکے رنگ رنگ کے باجے بجے۔ ایک شیشے کی بہت بڑی لگن میں جس پر موتیوں سے گندھا ہوا جال پڑا تھا۔ مچھلیوں کا یہ جوڑا تیر رہا تھا۔ یہ لگن محفل میں لاکر رکھی گئی۔ ایک جھوٹ موٹ کے مولوی نے

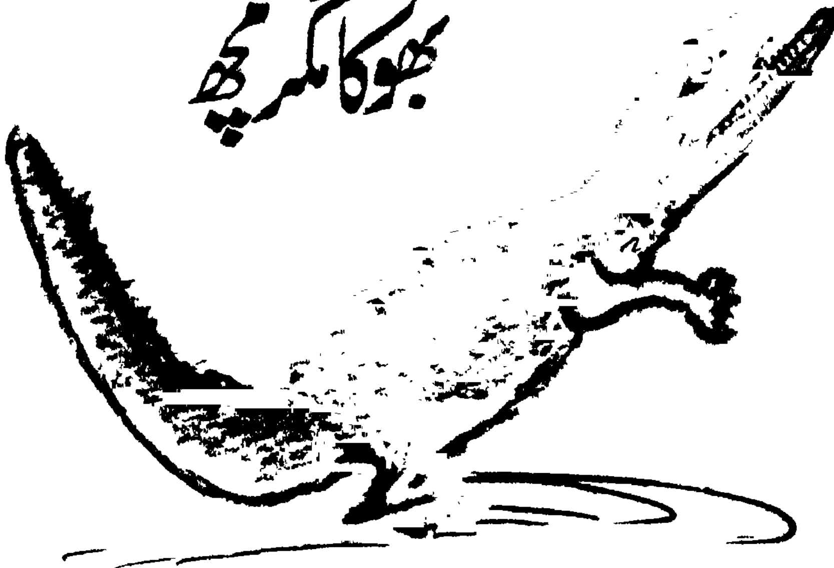


آکر ان کا نکاح پڑھا اور "مبارک سلامت" کا غل مچنے لگا۔

جب دعوت ختم ہوئی تو ناچ رنگ شروع ہوگیا۔ بابوجی اور بہت سے بڑے بڑے راجہ اور امیر گاؤتکیوں سے لگے بیٹھے گانا سن رہے تھے کہ پشاوری پگڑی باندھے ایک "خان" بابوجی کے پاس آیا۔ اس نے بھری محفل میں ان سے اپنے روپے کا تقاضا کیا — بابوجی پر اس پٹھان کا روپیہ سچ مچ باقی تھا مگر اس بھری محفل میں تقاضا کرکے اس پٹھان نے انکی بڑی ہی بےعزتی کی۔ لیکن اس بےعزتی نے بابوجی کی آنکھیں بھی کھولدیں۔ خان کا روپیہ تو اسی وقت ادا کردیا۔ مگر فوراً ہی ناچ رنگ کی محفل بھی اٹھادی گئی سب مچھلیاں اسی وقت گومتی ندی میں ڈلوادی گئیں نظر جھکتے ہی بابوجی پہلے سے نہ رہے تمام امیری کے ٹھاٹھ باٹ ختم کردیئے شان و شوکت کی تمام چیزیں بیچ ڈالیں مسخروں اور مصاحبوں کو نکال دیا۔ فضول نوکروں کو جواب دے دیا۔ اللہ

بھوکا مگرمچھ

راشد حسن قادری



پرانے زمانے میں یونان میں ایک بہت مشہور عقل مند آدمی گذرا ہے اس کا نام تھا سُقراط
ایک دن سقراط ایک اسکول کا معائنہ کرنے گیا۔ جب وہ اسکول کے احاطہ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اسکول کا باغ بالکل اجڑا ہوا پڑا تھا نہ تو کیاریاں ہی ٹھیک بنی ہوئی تھیں اور نہ کوئی پھول ہی کھلا تھا سقراط کے ساتھ جو ماسٹر صاحب تھے انھوں نے بتایا کہ یہ باغ اسکول کے بچوں کا ہے وہ ہی اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں مگر آپس میں بحث اور تکرار کی وجہ سے کام نہیں کر پاتے۔

معائنہ کے بعد سب بچے ہال میں سقراط کی تقریر سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ سقراط نے کہا میں آپ کو ایک کہانی سناؤں گا"

"ضرور، ضرور" بچوں نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا

"شہزادی کی کہانی سنائیے گا" کچھ بچوں نے رائے دی

"نہیں . . . پریوں کی سنائیے" کچھ اور بچوں نے کہا۔

"نہیں . . . میں ایک بھوکے مگرمچھ کی کہانی سناؤں گا" سقراط نے جواب دیا۔



"ضرور سنایئے"

"سنو...... ایک گاؤں کے قریب ایک دریا تھا اس میں ایک مگرمچھ رہتا تھا جو کوئی بھی دریا پر پانی بھرنے یا نہانے جاتا وہ مگرمچھ آہستہ آہستہ پانی کے نیچے نیچے کنارہ تک پہنچ جاتا اور اس آدمی کو پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لیتا اور کھا جاتا۔ تمام گاؤں والے بہت پریشان تھے۔ مگرمچھ روزانہ کسی نہ کسی مرد یا عورت کو کھا لیتا اسی لئے گاؤں والوں نے اس کا نام بھوکا مگرمچھ رکھ دیا تھا۔

ایک دن دو عورتیں پانی بھرنے گئیں۔ ایک عورت پانی بھرنے لگی اور دوسری عورت غور سے پانی کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے مگرمچھ نظر آیا اور وہ چلائی "ہے ہے شی شی او بھوکے مگرمچھ بھاگ" اور زور زور سے ہاتھ ہلایا۔ مگرمچھ یہ دیکھ کر ڈر کر واپس چلا گیا۔ پھر دوسری عورت نے پانی اور پہلی عورت نے مگرمچھ کو بھگا دیا۔

وہ دونوں اپنی اس ترکیب پر خوش خوش گاؤں میں آ گئیں اور انھوں نے دوسرے لوگوں کو بھی یہ ترکیب بتا دی گاؤں والے یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور پھر وہ ساتھ جانے لگے اور اسی طرح پانی بھرتے کہ ایک پانی دوسرا مگرمچھ کو دیکھتا رہتا اور جب مگرمچھ قریب آنے لگتا وہ چلا کر اسے بھگا دیتا۔

جب کسی کو پانی بھرنے، نہانے یا کپڑے دھونے کی ضرورت ہوتی وہ اپنے ہمسائے یا دوست سے کہتا "ذرا دریا تک چلے چلو مجھے پانی لانا ہے" اس ترکیب سے گاؤں والوں کی جانیں بچ گئیں۔

ایک مرتبہ دو آدمی پانی بھرنے گئے۔ ایک نے کہا "میں پانی بھرتا ہوں تم مگرمچھ کو دیکھتے رہنا۔"

دوسرے نے کہا "نہیں پہلے میں بھروں گا تم دیکھنا!"

دونوں ایک دوسرے سے مگرمچھ کو دیکھنے کے لئے کہتے رہے اور جھک کر پانی بھرنے لگے۔ ادھر مگرمچھ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا کنارہ تک آگیا۔ ان دونوں نے جھگڑے کی وجہ سے نہیں دیکھا اور مگرمچھ نے ایک دم دونوں کو پانی میں گھسیٹ لیا اور کھا گیا ......" سقراط نے کہانی ختم کردی اور سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

"چہ چہ کس قدر خراب تھا مگرمچھ" ایک چھوٹے سے بچے نے کہا۔

"اور وہ دونوں آدمی کتنے بُرے تھے" ایک اور بچے نے کہا۔

"مگر کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی" سقراط نے کہا۔

"کیوں .... پھر کیا ہوا" بچوں نے پوچھا۔

"ہر گھر اور ہر اسکول میں بھوکے مگرمچھ ہوتے ہیں اور ایک بھوکا مگرمچھ اس اسکول میں بھی موجود ہے" سقراط نے جواب دیا۔

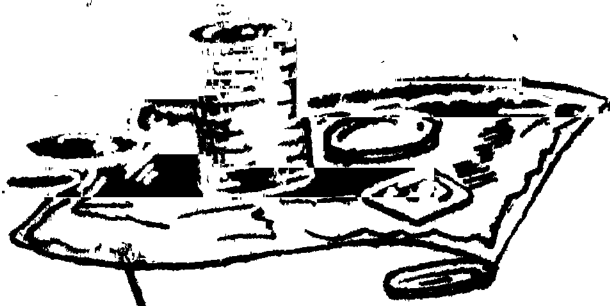
"کہاں ہے" بچوں نے بہت تعجب سے پوچھا۔

"جب آپ کوئی کام اکیلے کرنا چاہتے ہیں تو اچھی طرح نہیں کرسکتے اس لئے کہ مگرمچھ آپ کو روک دیتا ہے۔ جب آپ مل کر ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں تو آپ مگرمچھ کو بھگا دیتے ہیں لیکن جب آپ کسی کام کے کرنے کے لئے لڑتے ہیں اور جھگڑتے ہیں اور بحث کرتے ہیں تو بھوکا مگرمچھ آپ کو کھا لیتا ہے اور آپ کچھ نہیں کرسکتے ..... اب دیکھئے آپ اپنے دماغ کو ٹھیک نہیں کرسکتے۔ ہمیشہ کوشش کیجئے کہ مل کر اور صلح سے کام کریں ورنہ بھوکا مگرمچھ آپ کو کھا جائے گا" سقراط نے کہا۔

اور پھر ایک دفعہ سارا ہال تالیوں سے جھنجھنا اٹھا۔

بقیہ کہانی مچھلی کا بیاہ صے ۲۲

سیدھی سادی زندگی بسر کرنے لگے چالیس پچاس سال اِدھر کی یہ بات ہے — بابو درگاہی خان جب مرے تو ان کے خزانے میں لاکھوں روپیہ کی تھیلیاں اور چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔



روپے پیسے کی کہانی

احسن حامد

جب آپ کو پیاس لگتی ہے تو ایک دو گلاس پانی پی کر اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں اور زیادہ پانی پینے کو دل بھی نہیں چاہتا۔ بھوک لگتی ہے تو جتنی پیٹ میں گنجائش ہوتی ہے اتنا کھا لیتے ہیں۔ پھر کوئی زبردستی بھی کھلائے تب بھی نہیں کھاتے۔ مطلب یہ کہ آپ کی خواہش کبھی نہ کبھی کم ہو ہی جاتی ہے

مگر ایک چیز ایسی بھی ہے جو جتنی ملتی ہے اس کی خواہش اتنی ہی بڑھتی ہے آپ کہیں گے ہو نہ ہو یہ چیز کھیل کود ہے۔ ہاں کھیل کود سے بھی اتنی جلدی نہیں بھرتا ہے جیتنا اور دوسری چیزوں سے۔ مگر کبھی نہ کبھی تو کھیل سے بھی جی اکتا ہی جاتا ہے۔ وہ چیز تو کوئی اور ہی ہے۔

آپ سے پوچھنے کے بجائے اگر آپ کے ابا سے یہ سوال پوچھا جائے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ روپے کے علاوہ ایسی اور کوئی چیز ہو ہی کیا سکتی ہے اور پھر آپ بھی بول اٹھیں گے کہ ہاں بات تو بالکل ٹھیک ہے۔

آپ ابھی چھوٹے ہیں اس لئے آپ کا دھیان اُدھر نہیں گیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کا روپے سے ابھی کچھ زیادہ واسطہ بھی تو نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو ابا ہی اس ضرورت کو پورا کر دیتے ہیں مگر آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ چیزیں نہ مفت ملتی ہیں اور نہ کہیں پڑی ہوتی ہیں کہ آپ کے ابا گئے اور اٹھا لائے۔ بلکہ

یہ سب چیزیں بازار سے خریدی جاتی ہیں اور ان کے بدلے آپ کو یا آپ کے ابا کو کچھ قیمت بھی دینی پڑتی ہے۔

لیکن کبھی یہ بھی سوچا کہ اگر ساری دنیا سے سکے اور نوٹ ایک دم غائب ہو جائیں تو کیا ہوگا؟ لوگ کس طرح اپنی ضروریات کی چیزیں خریدیں گے؟ ابا آپ کے لئے اور آپ کے گھر میں استعمال ہونے والی چیزیں کیسے لائیں گے؟ میرے خیال میں تو ہم لوگ مجبور ہو جائیں گے کہ اپنی بہت سی خواہشات کو چھوڑ دیں اور بس وہی چیزیں استعمال کریں جو ہم خود تیار کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ہم سب اسی جگہ پہنچ جائیں گے۔ جہاں سے چلے تھے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ شروع شروع میں جب دنیا بنی تھی تو نہ سکے تھے اور نہ نوٹ۔ مگر پھر بھی کام اسی طرح چلتا تھا اور لوگوں کی ضروریات بھی پوری ہو جاتی تھیں۔

آپ تو آپ ضرور سوچیں گے کہ ہو نہ ہو پہلے زمانے میں لوگوں کے پاس یا تو الہ دین کا چراغ ہوگا یا پھر جادو کا ڈنڈا۔

تو سنئے! نہ ان بے چاروں کے پاس الہ دین کا چراغ تھا اور نہ جادو کا ڈنڈا۔ بلکہ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں انسان بالکل وحشیوں کی طرح رہتا تھا۔ جو ملا وہ کھالیا جہاں تھک گئے وہیں پڑ رہے۔ اور پتوں سے یا جانوروں کی کھال سے بدن کو ڈھانک لیا۔ بس لے دے کر یہی تین سیدھی سادھی ضروریات تھیں اور ان کو سیدھے سادے طریقے سے پورا کرنے کے لئے سب چیزیں موجود تھیں۔ کھانے کے لئے پھل اور جنگلی جانوروں کا گوشت۔ رہنے کے لئے پہاڑوں کے غار اور تن ڈھانکنے کے لئے پتے یا جانوروں کی کھال۔ البتہ آدمی کو ان چیزوں کی تلاش میں بھی تھوڑی بہت محنت ضرور کرنی پڑتی تھی۔

سچ پوچھئے تو اس زمانے میں ایک آدمی کو دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اپنی ضروریات کی سب چیزیں تو خود ہی ڈھونڈ نکالتا تھا۔ بس اپنا پیٹ ہوتا تھا اور اپنی محنت۔

سینکڑوں کیا ہزاروں سال تک کام یوں ہی چلتا رہا۔ لوگ صرف اپنی ہی کوشش اور محنت سے اپنی ساری ضروریات پوری کرتے رہے۔ مگر ان ہزاروں سال میں انسان نے آہستہ آہستہ بہت کچھ ترقی کرلی جیسے جیسے زمانہ گذرتا رہا ویسے ویسے اس کی خواہش اور ضرورتیں بڑھنے لگیں اور ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے انسان نے مختلف ذریعے اور طریقے بھی ڈھونڈھنے شروع کر دئے۔

جنگلی پھل پھلواری کھانے کے بجائے خود جوت بو کر کھانا شروع کر دیا۔ پتے اور کھالیں چھوڑ کر جسم ڈھکنے کے لئے کپڑا بننا سیکھ لیا۔ جنگلی جانوروں کے ڈر سے غاروں

میں رہنا چھوڑ کر محفوظ مکان بنالئے۔ کنکروں پتھروں کی مدد سے شکار کرنے کے بجائے تیر کمان اور بھالوں کا استعمال سیکھ لیا۔

چونکہ اس زمانے میں ضروریات بہت بڑھ گئی تھیں اس لئے اب انسان کے لئے یہ ناممکن ہوگیا کہ پہلے کی طرح اکیلا اپنی محنت پر بھروسہ کرکے زندگی گزار سکے۔ اب اس کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے دوسروں کی مدد اور سہارے کی ضرورت پڑنے لگی۔

مثال کے طور پر کسان ہی کو لے لیجئے۔ کسان، لوہار اور بڑھئی کی مدد کے بغیر کچھ نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں ہل کر اس کے لئے ہل بناتے تھے۔ دوسری طرف لوہار اور بڑھئی کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کو بھی کسان کی مدد کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کسان کو اُن کی۔ کیونکہ کسان ہی ان لوگوں کا پیٹ بھرنے کا سامان کرتا تھا۔

تو اس زمانے میں دو خاص باتیں غور کرنے کے قابل ہوتیں۔ ایک تو یہ کہ لوگوں نے گاؤں بنا کر رہنا شروع کردیا۔ دوسرے آپس میں پیشے بانٹ لئے۔ اور پھر سب ایک دوسرے کی مدد سے اپنی خواہشات پوری کرنے لگے۔ کوئی ہتھیار بناتا تو کوئی شکار کھیلتا اور پھر دونوں شکار تقسیم کرلیتے۔ کوئی ہل بناتا اور کوئی کھیتی باڑی کرتا اور آپس میں غلہ بانٹ لیتے۔ غرض ہر آدمی الگ الگ اپنا کام کرنے لگا۔ جس کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو دوسرے آدمی کے پاس جاتا اور اپنی چیز کے بدلے اس کی بنائی ہوئی چیز لے لیتا۔ اور یوں ایک دوسرے کی مدد سے اپنی ضروریات پوری کرلیتا تھا۔

مگر انسان جیسے جیسے ترقی کرتا گیا ویسے ویسے لین دین کا یہ طریقہ مشکل نظر آنے لگا۔ اور ان مشکلوں کو دور کرنے کے لئے سکے ایجاد ہوئے۔

کیسے اور کیونکر؟

اگلے پرچے میں پڑھئے

لطیفے

ایک بڑے آدمی نے موٹر خریدی ان کے دوستوں نے اُن سے کہہ دیا کہ آج کل کے ڈرائیور بے ایمان ہوتے ہیں مالک کے پیچھے موٹر کو بدل دیتے ہیں۔
ایک دن مالک موٹر پر جا رہا تھا کھڑ کھڑ کی آواز موٹر کے اندر ہوئی۔ مالک نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔
ڈرائیور: گیر بدل رہا ہوں
مالک: بھئی تم مالک کے سامنے تو گیر بدلنے لگے اور پیچھے تو موٹر ہی بدل دوگے۔

آفتاب محسن۔ پٹنہ

ہوٹل والا: اے دودھ والے! کیا سبب ہے کہ آج دودھ پتلا معلوم ہوتا ہے
دودھ والا: معاف کرنا کل ہماری گائے پانی میں بھیگ گئی تھی۔

سید نذیر۔ ایور

بچہ (اپنے ابا سے) کیوں ابا آپ کے پیر میں کون سی بیماری ہے۔
ابا: کچھ بھی تو نہیں
بچہ: تو پھر آپ کا پیر چلتے میں آگے پیچھے کیوں ہوتا ہے۔

عبدالستار خاں۔ نبتروی

مالک۔ کیوں جی تم ڈاک خانے میں دونوں خط ڈال آئے۔
ملازم۔ جی ہاں ۔۔۔ مگر اس میں ایک بھول ہو گئی تھی۔ غیر ملکی لفافہ پر ۲ آنے کا ٹکٹ ۔۔ اور ملکی لفافہ پر ۱۲ آنے کا ٹکٹ آپ نے غلطی سے لگا دئے تھے۔
مالک۔ ارے ارے۔ یہ تو غضب ہو گیا اور تم نے وہ خط ڈال دیے
ملازم۔ جی! میں نے اسے ٹھیک کر دیا۔ دونوں لفافوں

کے پتے بدل دیئے۔ بارہ آنے والے ٹکٹ کے لفافے پر غیر ملکی پتہ لکھ دیا اور ۲ آنے والے لفافے پر ملکی پتہ کر دیا۔

مجسٹریٹ۔ تم نے یہ کار کیوں چوری کی۔

ملزم ۔ یہ کار قبرستان کے پاس کھڑی تھی۔ میں سمجھا کہ اس کا مالک مر گیا۔ اس لئے میں کار لے کر چل دیا۔

ٹکٹ چیکر۔ (مسافر سے) یہ ٹکٹ تو تھرڈ کا ہے اور آپ انٹر میں بیٹھے ہیں۔ لہذا انٹر کا کرایہ ادا کیجئے۔

مسافر ۔ بابو جی! انٹر میں کیا ہوتا ہے۔

ٹکٹ چیکر۔ انٹر میں گدے ہوتے ہیں جس پر آپ بیٹھے ہیں۔

مسافر (گدوں کو اکھاڑ کر باہر پھینکتے ہوئے) لیجئے اب تو تھرڈ ہو گیا۔ اب تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے۔

نظام علی خاں۔ فرخ آباد

ساہوکار۔ کیوں بے چمن! کتنی بار مانگنے پر بھی ادھار لئے ہوئے پیسے کیوں نہیں دیتا۔

چمن! مگر ادھار دیتے وقت آپ نے کتنی خوشامد کرائی تھی۔ اس کا بھی کچھ حساب ہے۔

شیخ جلال الدین۔ المنیر

طاہر کی نویں سالگرہ کے موقع پر شاندار دعوت ہوئی، دعوت ختم ہو گئی اور طاہر بڑی حسرت بھری نگاہوں سے بچے ہوئے کیکوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا وہ بولا "اماں! کیا میں کیک کا ایک ٹکڑا کھاؤں۔ صرف ایک ٹکڑا!"

ماں بولی " نہیں تم نے کافی کیک کھائے ہیں!"

طاہر نے پوچھا "کیا میں اپنے تکئے کے نیچے ایک ٹکڑا رکھ کر سو جاؤں۔

ماں نے جواب دیا" بہت اچھا، لیکن یہ خیال رہے کہ ٹکڑا تکیہ کے نیچے ہو۔ اچھا اب جلدی سے سو جاؤ۔ کچھ دیر کے بعد جب ماں طاہر کے کمرے میں گئی۔ اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ طاہر بڑے اطمینان سے سو رہا تھا اور تکیہ اس کے پیٹ پر رکھا ہوا تھا۔



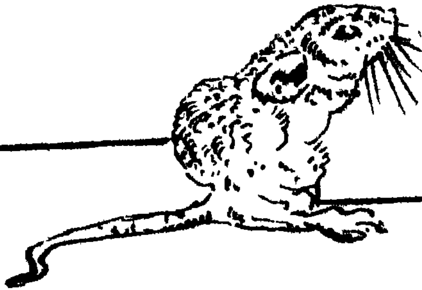
دو دوست

ایک دوست : بھائی کل رات کو میں مرتے مرتے بچ گیا۔
دوسرا دوست : ارے وہ کیسے؟
پہلا : کل آدھی رات کو جب آنکھ کھلی تو اندھیرے میں ایک آدمی کو کھڑا دیکھ کر میں سمجھا کہ چور آیا ہے
دوسرا : تو پھر تم نے کیا کیا؟
پہلا : میں کیا کرتا!! فوراً بندوق اٹھائی اور چلائی گولی۔
دوسرا : بھائی واقعی تم بہادر ہو!!! اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو اتنی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ شاباش تمھاری بہادری اور جوانمردی کے۔
پہلا : ارے بھئی سنو تو ہی۔ وہ چور نہیں تھا!!!
دوسرا : پھر تھا وہ کون؟
پہلا :- وہ میری شیروانی تھی جو اندھیرے میں آدمی کے مانند نظر آ رہی تھی!!!
دوسرا:- تو پھر تم ہی گھاٹے میں رہے بھیا!! ایک شیروانی کا نقصان دوسرا گولی کا۔
پہلا :- ارے بھائی شیروانی اور گولی کا تو خیر کچھ نہیں۔ میں سوچتا ہوں: اگر میں خود شیروانی کے اندر ہوتا تب تو جان کا بچنا مشکل ہوتا۔ اور وہ گولی میرے سینہ پر جا لگی ہوتی۔ آج کے دن تمھارے ساتھ بات چیت کرتا ہوا بھی نظر نہ آتا۔
دوسرا:- بھائی ہے تو پتے کی بات۔ لاکھوں میں ایک بات۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمھاری جان بچ گئی
پھر دونوں خوش ہو کر: جان بچی لاکھوں پائے * خیر سے بدھو گھر کو آئے

عبدالامیر نگینی

ایکا

شاہین سلطان بھوپال



ایک چوہا، ایک کچھوا۔ ۔ ۔ ۔ ایک کوّا اور ایک ہرنی آپس میں بڑے دوست تھے۔ چاروں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے، اور مل جُل کر کھاتے پیتے۔

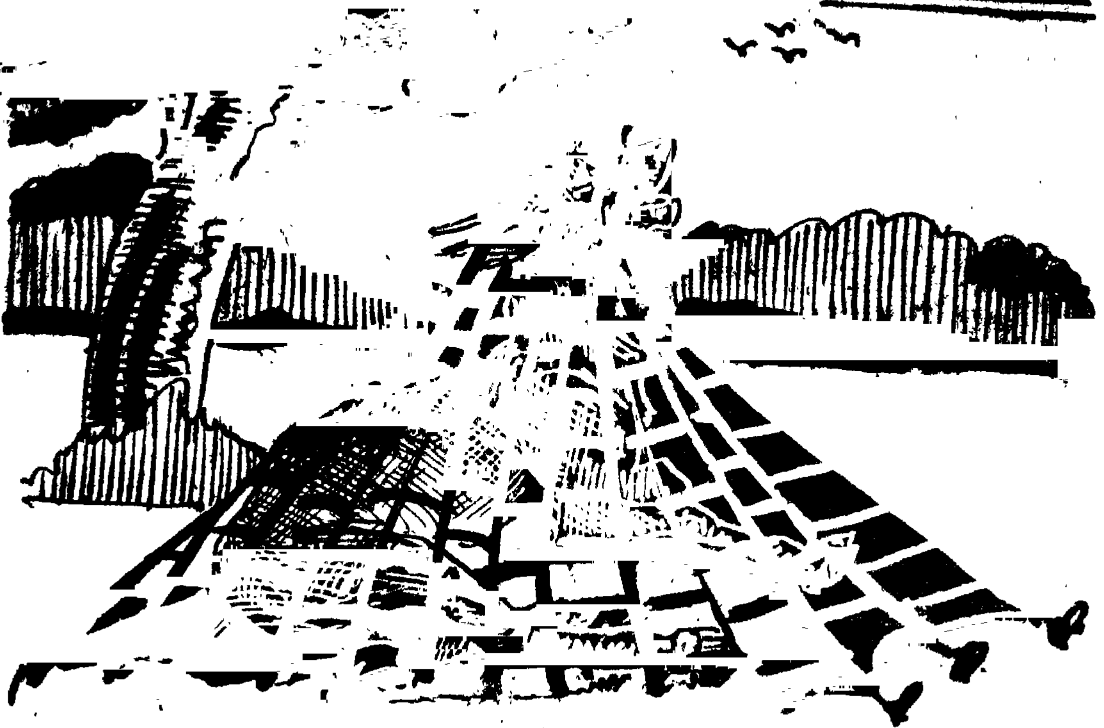
وہ چاروں کسی ندی کے کنارے رہتے تھے۔ رات کے وقت ہرنی ندی کے پاس ہی پہاڑ کے ایک گوشے میں دبک کر سو رہتی، کوّا پاس کے درخت پر سوتا، کچھوا ندّی کے کیچڑ میں سما جاتا اور چوہا کونے کے ایک بل میں دبک جاتا۔

چاروں میں یہ بات طے تھی کہ شام ہوتے ہی سب کے سب ندّی کے پاس آجایا کریں۔ اور ہر روز ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔

ایک دن شام ہوگئی۔ مگر ہرنی جنگل سے واپس نہیں آئی تو باقی دوستوں کو بڑی تشویش ہوئی۔ انھوں نے آپس میں طے کیا کہ کوّا اِدھر اُدھر اُڑ کر ہرنی کا پتہ لگائے اور کچھوا ندیوں اور جھیلوں میں دیکھے، کہیں وہ خدانخواستہ ڈوب تو نہیں گئی۔

دونوں روانہ ہوگئے۔

کچھ دور جانے پر کوّے نے دیکھا کہ ہرنی، جال میں پھنسی تڑپ رہی ہے۔



کوّے نے کائیں کائیں کرنی شروع کی۔ اس کی آواز پر کچھوا اور چوہا بھی دوڑ پڑے۔ چوہا جلدی سے موقع پر پہنچ گیا۔

کوّے نے کہا ــــ

"بھئی چوہے! اب تم جلدی جلدی جال کتر دو۔ اور بے چاری ہرنی کو چھڑاؤ۔"

چوہا اپنے تیز دانتوں سے جلدی جلدی کترنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں ہرنی آزاد ہو گئی۔

ٹھیک اسی وقت ایک طرف سے شکاری آرہا تھا اور دوسری طرف سے کچھوا۔

ہرن، چوہا اور کوّا، تینوں بھاگے، اور دور چھپ کر یہ دیکھنے لگے کہ کہیں کچھوے پر تو کوئی مصیبت نہیں آئی۔

شکاری جال کے پاس آیا تو اُسے جال کترا ہوا نظر آیا۔ اور ہرنی کو غائب پاکر اسے بہت صدمہ ہوا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ گم سُم کھڑا رہا۔ پھر یہ سوچ کر کہ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں ہے۔ اُس نے کچھوے کو اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔

تینوں دوستوں کو کچھوے کے گرفتار ہو جانے کا بے حد ملال ہوا۔ وہ یہ سوچنے لگے کہ کسی طرح اُسے بھی آزاد کرا لیا جائے۔

جلد ہی کوّے کو ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اُس نے

ہرنی نے کہا۔

"دیکھو تم لنگڑاتی ہوئی شکاری کے پاس سے گزرو۔ وہ تمہارا پیچھا کرے گا، اور تم آہستہ آہستہ بھاگتی جانا۔ پھر ممکن ہے کہ شکاری اپنا تھیلا زمین پر رکھ کر تمہارا پیچھا کرنے لگے اگر ایسا ہوا تو کچھوا آزاد ہو جائے گا۔"

بس پھر کیا تھا ایسا ہی کیا گیا۔

ہرنی لنگڑاتی ہوئی شکاری کے پاس سے گزری شکاری اس کے پیچھے بھاگا۔ جیسے جیسے سپاہی دوڑتا جاتا ہرنی تیز بھاگتی جاتی۔ آخرکار شکاری نے اپنا تھیلا کندھے پر سے اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ اور خوب تیزی سے ہرنی کا پیچھا کرنے لگا۔ ہرنی بہت کافی دور تک تو لنگڑا کر بھاگتی رہی۔ لیکن جب اُسے یقین ہو گیا کہ اب تک تو کچھوے کو آزاد کرا کے کہیں چھپا چکا ہوگا تو ہرنی چوکڑیاں بھر کے بھاگنے لگی اور آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اُدھر شکاری نے جیسے ہی تھیلا زمین پر رکھا کوا تھیلے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کچھوے کو جلدی سے باہر نکل آنے کو کہا۔ کچھوا نکل آیا۔ اور لپک کر پاس ہی ایک گڑھے میں چھپ گیا۔

شکاری کا ہرن کا پیچھا کرکے ناکام واپس آیا تو تھیلے سے کچھوے کے بھاگ جانے کا اور بھی افسوس ہوا۔ لیکن اب وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ جہاں رنگ نسل کا امتیاز کئے بغیر ایکا ہو وہاں دشمنوں اور شکاریوں کی چل ہی کیا سکتی ہے؟

اُس دن چاروں دوست بہت خوش تھے انہیں ہرنی اور کچھوے کی جانیں بچ جانے کی بڑی خوشی تھی۔

جی سرام ناتھ
ترجمہ محمد صدیق خاں بہا

رہا گدھے کا گدھا



آئیے آج ایک بہت دلچسپ کہانی سنائیں، یہ اسوقت کی کہانی ہے جب نہ تو ایسے اسکول تھے جیسے آج کل ہیں اور نہ ایسی عدالتیں تھیں جیسی آج کل پائی جاتی ہیں۔ مولوی یا پنڈت اپنے گھروں میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں قاضی ہوتے تھے جو لوگوں کے آپس کے جھگڑے طے کیا کرتے تھے۔

ایک گاؤں میں ایک دھوبی تھا، وہ روزانہ ایک مولوی صاحب کے مکان کے سامنے سے ہوکر گذرتا تھا۔ مولوی صاحب بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن عجیب بات ہوئی۔ جب دھوبی ادھر سے گذرا تو اُس نے سنا کہ مولوی صاحب اپنے شاگردوں سے کہہ رہے ہیں: "شریر بچو، تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میں گدھوں کو انسان بناتا ہوں۔ میں نے بہت سے گدھوں کو انسان بنایا ہے۔ میں نے انھیں لاتیں ماری ہیں اور ڈنڈے بھی" دھوبی کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو دھوبی گھر واپس ہوا تو اس نے اپنی بیوی سے کہا "سنتی ہو، اپنے گاؤں کے مولوی صاحب گدھوں کو آدمی بنا لیتے ہیں۔ وہ بہت ہی ہوشیار آدمی ہیں۔ ہمارے کوئی اولاد نہیں ہے

کتنی اچھی بات ہو اگر ہم اپنے گدھوں میں سے ایک کو آدمی بنوالیں۔" دھوبی کی بیوی بولی "ہاں واقعی کتنی اچھی بات ہے، ہمارا بڑھاپا ہے چل چلاؤ کا وقت ہے۔ گھر کی دیکھ بھال کرنے کو بھی کوئی نہیں ہے۔ ہمارے پاس گدھے تو بہت سے ہیں ہی۔ تم اپنے موتی (گدھے) کو مولوی صاحب کے پاس کیوں نہیں لے جاتے۔ سو دوسو روپیہ خرچ ہو جائیں تو بھی کوئی فکر نہیں۔ مگر دیر مت کرو۔"

دوسرے دن دھوبی مولوی صاحب کے پاس پہونچ ہی تو گیا۔ اس نے مولوی صاحب کو سلام کیا اور درخواست کی "مولوی صاحب، میرے کوئی لڑکا نہیں ہے، اگر آپ میرے ایک گدھے کو آدمی بنادیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو۔" مولوی صاحب تو بس چونک ہی پڑے اور بولے "تم کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تمہارا گدھا کبھی آدمی بن سکتا ہے۔" دھوبی نے کہا "مولوی صاحب! اس طرح اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے کہ آپ گدھوں کو آدمی بناتے ہیں۔ میں آپ کے پیروں پڑتا ہوں آپ میرے گدھے کو بھی آدمی بنا دیں۔"

مولوی صاحب کی دھوبی کے سامنے ایک نہ چلی۔ مگر مولوی صاحب تھے بہت عقلمند سمجھ گئے کہ دھوبی بس نرا بے وقوف ہے اور اس سے روپے اینٹھنے کا اچھا موقع ہے۔ چناں چہ مولوی صاحب بولے "اچھا سنو میرے دوست! گدھے کو آدمی بنانا کوئی بچوں کا کھیل تو ہے نہیں، بہت محنت کرنا پڑے گی۔ مجھے تمھارے ساتھ بہت ہمدردی ہے اس لئے میں تمھارا کام کر دوں گا۔ مگر تمھیں گدھے کے ساتھ ساتھ دوسو روپے دینے پڑیں گے۔"

دھوبی خوش خوش اپنے گھر گیا۔ دوسرے دن وہ مولوی صاحب کے پاس دوسو روپے اور ایک گدھا لے کر آیا۔ روپے مولوی صاحب کو دے دئے اور کہا "مولوی صاحب! گدھا صحن میں کھڑا ہے۔" مولوی صاحب بولے "دوست! اطمینان رکھو۔ میں ضرور اس گدھے کو ایک اچھا آدمی بناؤں گا۔ تم میرے پاس چھ مہینے بعد آنا۔" اُدھر دھوبی کا جانا ہوا، ادھر مولوی صاحب نے اپنے ایک شاگرد کو بلا کر کہا "اس گدھے کو لے جاؤ اور جنگل میں اتنی دور ہانک آؤ کہ یہ پھر واپس نہ آسکے۔"

پھر تو چھ مہینے بھی گذر گئے۔ ایک دن دھوبی پھر مولوی صاحب کے پاس گیا۔ مولوی صاحب نے دیکھتے ہی کہا "میرے دوست! تم اتنے دنوں کہاں رہے تمھارا گدھا تو بڑا ہوشیار آدمی بن گیا ہے۔ اب وہ

بنارس کا قاضی ہے۔ تم اس سے وہیں جاکر ملو تو اچھا ہے۔"

دھوبی نے کہا "مگر میں اسے پہچانوں گا کیسے؟ مولوی صاحب! میں نے اُسے پہلے تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔"

مولوی صاحب بولے "تم بھی گدھے ہی رہے سارا بنارس قاضی کو جانتا ہے۔ اُسے ڈھونڈھنا کیا مشکل ہے۔ سورج کو ڈھونڈھنے کے لئے کہیں چراغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟ لیکن تم وہ بورا ضرور لے جانا جس میں موتی دانہ کھایا کرتا تھا۔ جب وہ بورے کو دیکھے گا تو تمھیں پہچان لے گا۔ سمجھ گئے نا؟"

دھوبی گھر آیا۔ اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے سارا واقعہ اپنی بیوی کو سنایا اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ جب وہ بنارس پہنچا تو قاضی عدالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ دھوبی نے دور سے قاضی کو دیکھا اور دل ہی دل میں کہنے لگا "یہ مولوی بھی بلا کے قابل نکلے۔ میرے گدھے کو کتنا چالاک، پھرتیلا اور خوب صورت آدمی بنا دیا ہے" وہ اس فکر میں تھا کہ موقع ملے تو بورا دکھاؤں۔

جب کبھی قاضی لکھتے لکھتے سر اُٹھاتا اور سامنے دیکھتا۔ دھوبی اسے بورا دکھا دیتا۔ دھوبی گھنٹوں یہی کرتا رہا۔ پھر تو قاضی کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے فوراً دھوبی کو بلوایا۔ دھوبی بہت خوش تھا اور جی ہی جی میں کہہ رہا تھا "آخرکار بے وقوف نے بلوا ہی لیا۔"

قاضی نے بورا دکھانے کا سبب پوچھا۔ دھوبی کو سخت غصہ آیا وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا "ناشکرے! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم اپنے مالک کو نہیں پہچانتے" اتنا کہہ کر اس نے دانے کا بورا دکھایا اور کہا "تم اس بورے کو بھی نہیں پہچانتے جس سے تم روزانہ دانہ کھاتے تھے۔ تمھیں مولوی صاحب نے گدھے سے آدمی بنا دیا تو تم پچھلی باتیں بھول گئے۔ میرے گدھے! اب گھر چلو، میں نہیں چاہتا کہ تم یہ کام کرو۔"

قاضی سارے معاملے کی تہ کو پہنچ گیا۔ مگر دھوبی کو سمجھانا بڑا مشکل کام تھا۔ قاضی کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں لوگ اسے دھوبی کا بیٹا نہ سمجھنے لگیں۔ اس نے اپنے چپراسی سے دھوبی کو باہر نکلوا دیا۔

دھوبی کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ روتا، چیختا اور چلاتا ہوا گیا "یہ کتنا ناشکرا ہے۔ میں نے اسے گدھے سے انسان بنوایا اور یہ مجھے اپنے گھر سے نکلوا رہا ہے کتنی بے انصافی ہے۔ میں اسے مزا چکھاؤں گا۔ اب مجھے اس وقت تک چین نہ آئے گا جب تک میں

اسے پھر گدھا نہ بنوا لوں۔" غم اور غصے سے بھرا ہوا دھوبی گھر واپس ہوا۔ سارا قصہ مولوی صاحب کو سنایا اور بولا "میری درخواست ہے کہ آپ اس آدمی کو





پھر گدھا بنا دیں۔ آپ جو مانگیں گے وہ میں دوں گا۔ میں اسے مزا چکھانا چاہتا ہوں۔"

مولوی صاحب دل ہی دل میں ہنسے۔ دھوبی سے کہا "پانچ سو روپے دے جاؤ اور ایک ہفتے بعد آنا۔" ایک ہفتے بعد دھوبی مولوی صاحب کے پاس گیا۔ اپنے موتی کو صحن میں بندھا دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ دھوبی بول اٹھا "کم بخت! رشوتوں کا مال کھا کھا کر کتنا موٹا ہو گیا ہے۔ اس دن تجھے میرا ذرا بھی خیال نہ آیا۔ اب میں تجھے دیکھوں گا۔" یہ کہہ کر دھوبی نے گدھے کو کھولا، گدھے پر سوار ہوا اور گھر کی طرف چل دیا۔ راستے بھر گدھے کی خوب مرمت کی۔ آپ سمجھے کیوں؟ اُسے بدلا جو لینا تھا۔

(تعمیرِ زندگی میں پہلا انعام
پانے والی ایک قدیم کہانی)

کلو مینا کی کہانی

بشکریہ شنکرز ویکلی



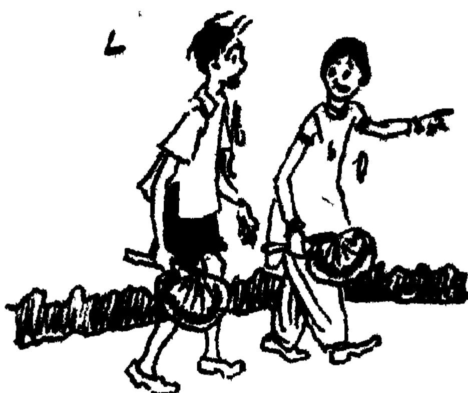






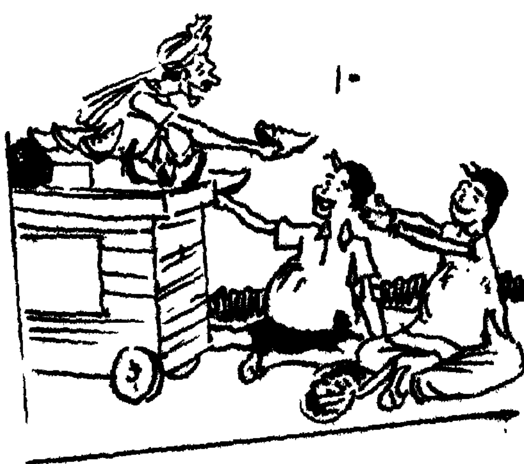





۷


۸


۹


۱۰


۱۱


۱۲

بچوں کی کوشِشیں

ایمانداری کا پھل

مرزا صاحب نے ایک لڑکے کو نوکر رکھا تھا۔ اس کو شریف کہا کرتے تھے۔ اسکی عمر بارہ برس کی تھی۔ ایک دن مرزا صاحب نے شریف سے کہا جاؤ بازار سے چار آنے کے چھوارے لے آؤ۔ وہ تمھیں چودہ چھوارے دے گا۔ کل ہم بھی اسی حساب سے لائے تھے۔ شریف پیسے لے کر بازار گیا۔ دکان دار نے اس کو چار آنے کے پندرہ چھوارے دئے۔ شریف نے اُن کو رومال میں باندھ لیا۔ راستہ میں شریف کا دل للچایا، سوچا کہ مرزا جی نے چار آنے دئے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ چودہ چھوارے آئیں گے۔ دکان دار نے مجھے چودہ کی جگہ پندرہ دئے ہیں۔ لاؤ ایک چھوارا اڑا لیں۔ جھٹ رومال سے ایک چھوارا نکالا اور جیب میں ڈال لیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس کے دل میں خیال گذرا کہ "میں نے بہت بُرا کیا ہے۔ یہ چھوارا میرا مال نہیں۔ تو پھر میں کیوں چور بنوں۔ ادھر شریف کو ماں کی نصیحت بھی یاد آئی کہ چوری کبھی نہ کرنا یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اور اس سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ ان خیالات نے شریف کو مجبور کر دیا کہ وہ اس چھوارے کو پھر باندھ لے۔"

شریف گھر پہنچا۔ اور سارے چھوارے مرزا جی کے سامنے رکھ دئے۔ اور یہ کہا کہ "جناب یہ پندرہ چھوارے ملے ہیں۔" مرزا جی بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے "میاں شریف تم بہت ایماندار ہو۔ لو یہ چھوارہ ہم تمھیں انعام میں دیتے ہیں۔" شریف دل میں بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ "واہ ایمانداری تو بہت اچھی نکلی اس سے بندے بھی خوش، خدا بھی خوش، اور چھوارا بھی مل گیا۔"

اے۔ اشرف تبریزی (جماعت ہفتم) بیگن پلی

جھوٹ کی سزا

کسی ایک گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا جس کے متعلق گاؤں والوں کا کہنا تھا کہ وہ "جھوٹا" ہے اور اکثر جھوٹی جھوٹی باتیں کہا کرتا ہے۔ اس لئے گاؤں والے بھی اس سے نفرت کرتے تھے۔

ایک روز جب وہی جھوٹا لڑکا گاؤں کے باہر کی ندی میں تیرتا تھا تو اسے شرارت سوجھی اور اونچی آواز کے ساتھ چیخنے لگا "بھائیو۔ بچاؤ۔ میں ڈوب رہا ہوں۔ بچاؤ بھائیو۔ بچاؤ"۔

گاؤں والوں نے جب یہ آواز سنی تو پریشان ہو گئے اپنا کام دھام چھوڑ ڈوبنے والے کو بچانے کے لئے ندی کی طرف بھاگے۔ جب لڑکے تک پہنچے تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ گاؤں والوں کو دھوکا دینے پر خوش ہوا۔ گاؤں والوں نے جب اسے ہنستا ہوا دیکھا تو سمجھ گئے کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے۔ اسے بُرا بھلا کہہ کر اپنے اپنے کاموں پر واپس ہو گئے۔ دوسرے دن بھی وہ لڑکا پھر چیخ کر کہنے لگا۔ بھائیو بچاؤ۔ بچاؤ۔ میں ڈوب رہا ہوں۔ بچاؤ بچاؤ۔ بھائیو! "لو" اس مرتبہ بھی بہت سے لوگ پریشان ہوئے۔ اور اس کو بچانے کی غرض سے ندی کی طرف آئے تو معلوم ہوا کہ اس بار بھی اس نے جھوٹ بولا ہے۔ اور سب کی ہنسی اڑائی ہے۔ اس پر گاؤں والوں کو اور طیش آگیا۔ اس مرتبہ تو اُسے بہت ہی ڈانٹا۔

تیسرے روز اتفاق کی بات ہے کہ وہ موجوں کے تھپیڑ میں آگیا۔ اور واقعی ڈوبنے لگا اور چیخیں مار مار کر چلانے لگا "بھائیو! بچاؤ! بھائیو! بچاؤ! میں واقعی ڈوب رہا ہوں"! مگر اس کی مدد کو گاؤں والوں میں سے کوئی بھی نہیں گیا۔ اور یہی سمجھے کہ اس بار بھی وہ دھوکا دے رہا ہے اور جھوٹ بول رہا ہے۔ ادھر گاؤں والے آرام سے بیٹھے تھے اور ادھر وہ جھوٹا لڑکا ڈوب رہا تھا۔ یہی تھی اس کی جھوٹ کی سزا۔ (فارسی سے ترجمہ)

آغا عبدالزہرا نجفی (جماعت ہفتم) بیگن پلی

گھوڑے کی بہادری

پرانے زمانے کا ذکر ہے۔ کہ ایک بادشاہ تھا وہ کسی ملک میں حکومت کرتا تھا۔ اس کی رعایا بہت خوش تھی۔

بادشاہ کو جانوروں کا بہت شوق تھا۔ اُس کے عجائب خانے میں ہر قسم کے جانور تھے۔ شیر تھے، شتر مرغ تھے، ہاتھی تھے۔

بادشاہ سال میں ایک دو بار جانوروں کو لڑاتا تھا۔ اُسے جانور لڑانے کا بہت شوق تھا۔
اُس کے اصطبل میں ہر قسم کے گھوڑے تھے۔ دور دور سے سوداگر اُس کے پاس اچھے اچھے گھوڑے لاتے تھے۔
بادشاہ کے اصطبل میں ایک ایسا گھوڑا تھا۔ جو بہت شریر تھا۔ وہ کسی کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ سائیس اور خدمت گار سب اس گھوڑے سے ڈرتے تھے۔ کوئی مشکل ہی سے اُس کے قریب جاتا تھا۔
بادشاہ بہت پریشان تھا۔ کہ کیا کرے اور گھوڑے کو کس طرح قابو میں رکھے۔ ایک دن بادشاہ کو غصہ آگیا اُس نے حکم دیا کہ گھوڑے کو شیر سے لڑایا جائے۔ ایک بڑے میدان میں گھوڑے اور شیر کے لڑانے کا انتظام کیا گیا۔
بادشاہ درباریوں کے ساتھ تماشہ دیکھنے کے لئے آیا۔ بہت سے لوگ وہاں جمع ہوئے۔ لوگوں کا خیال تھا۔ کہ شیر گھوڑے کو فوراً کھا جائے گا۔ ایک پنجرے میں سے شیر چھوڑا گیا۔ گھوڑا گھاس چر رہا تھا۔ شیر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑا گھاس چرتا رہا۔ شیر گرجا۔
گھوڑا اسی طرح گھاس چرتا رہا۔ اتنے میں بڑی چالاکی کے ساتھ گھوڑے نے مڑکر شیر کے ایسی لات ماری کہ شیر اُچھلا اور پھر گر گیا وہ دھاڑتا رہا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا۔ اور ہڈی میں بڑی گہری چوٹ آئی۔
گھوڑا لات مار کر اب بھی چرتا ہی رہا اور شیر تڑپ تڑپ کر تھوڑی دیر میں مر گیا۔ سب لوگ تماشہ دیکھتے رہ کر کہہ رہے تھے کہ گھوڑا شیر سے زیادہ بہادر نکلا۔
بہادر گھوڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسمٰعیل اطہر عمادی شاہد ۔ بمبئی ۳

ارے یہ تو کوّا ہے

کوّا بڑا سیانا جانور ہے یہ چھوٹے بچوں سے تو بالکل ہی نہیں ڈرتا۔ ان کے ہاتھ سے زبردستی روٹی چھین کر لے جاتا ہے۔ اور ننھے بچے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ فاختہ، مینا طوطے وغیرہ جانوروں کے انڈے بچے بھی کھا لیتا ہے۔ غرض بڑا چوکنا اور چالاک پرندہ ہے۔
ایک دن کوّے میاں کو کیا سوجھی کہ شہر کو چھوڑ کر کسی باغ کی ہوا کھانی چاہیئے۔ مگر باغ میں کوّے کا کیا کام وہاں تو بلبل طوطے فاختہ وغیرہ خوبصورت اور رنگیلے جانور ہوتے ہیں۔ اس کالے کلوٹے کوّے کو وہاں کون رہنے دیتا۔ کوّا آخر تھا سیانا ہی سمجھ گیا۔ کہ ان کالے پروں سے باغ میں جانا ٹھیک نہیں وہاں دال نہیں گلے گی

آپ ایک دن اس جنگل میں پہنچے۔ جہاں مور رہا کرتے تھے۔ جھاڑیوں میں سے مور کی دم کے جھڑے ہوئے پَر اٹھا کر اپنی کمر پر چپکا لئے۔ مور کے سوا جس جانور کا کوئی خوب صورت پَر جنگل میں پڑا پایا۔ وہ بھی کوّے نے اُٹھا کر اپنے بدن میں لگا لیا۔ اب کیا تھا کالا کلوٹا کوا ایک ایک نہایت رنگیلا اور خوب صورت پرندہ بن گیا۔ اور پانی میں اپنی شکل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اسی وقت ایک ہرے بھرے باغ میں جا پہنچا' باغ کے سب پرندے اسے دیکھ کر حیران ہو گئے' اور آپس میں کہنے لگے۔ کہ یہ رنگیلا جانور کسی دوسرے ملک سے آیا ہے ہمیں اس کی عزت اور خاطر کرنی چاہیئے۔ سب پرندے اسے اپنا مہمان سمجھ کر رات دن اس کی خدمت میں رہنے لگے۔

کوّے میاں بولتے نہیں تھے۔ کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ میری کائیں کائیں سے بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ باغ کے جانور بھی سمجھتے تھے کہ یہ کوئی بڑا شریف اور کم بولنے والا جانور ہے۔ آخر کب تک؟ ایک دن باغ کے سب جانور تو کہیں اِدھر اُدھر درختوں میں چلے گئے۔ کوّے نے سمجھا۔ کہ اب میں اکیلا ہوں۔ بہت دنوں سے بولا نہیں اب خوب زور سے چلّا کر آواز نکالوں۔ یہ سوچ کر کوّے نے کائیں کائیں شروع کی۔ تو باغ کے سب پرندے آواز سن کر اکٹھے ہو گئے۔ اور کہنے لگے کہ یہ کوّا ہے کوّا۔ اس نے بھیس بدل کر ہمیں بڑا دھوکا دیا ہے۔ اب کیا تھا باغ کے سب پرندے ایک دم کوّے کو لپٹ گئے۔ اور تمام رنگیلے پروں کو ایک ایک کر پھینک دیا اور یہی نہیں اس کے اصل پروں کو بھی نوچنا شروع کیا۔ اب تو کوّا بہت گھبرایا اور گرتا پڑتا اپنی جان بچا کر باغ سے بھاگ نکلا۔

عبدالستار خاں نبتروی

میرا ٹامی اور جامعہ کی یاد

میرا ٹامی کتنا نیک تھا آپ کتوں کی عادت کو تو جانتے ہی ہوں گے کہ کس قدر بدتمیز ہوتے ہیں لیکن میرا ٹامی ایسا نہ تھا۔ اگر اس کے پاس آپ روٹی کا ٹکڑا بھی رکھ دیں تو کبھی نہیں کھاتا جب تک یہ نہ کہہ دیں کہ ٹامی یہ تمہارے لئے ہے اس کو کھا لو تب تک وہ اپنی دم ہلاتا رہتا۔

جس زمانہ میں دہلی میں فساد ہوا تھا تو ہم لوگ جامعہ میں تھے میرے والد مرحوم جامعہ ملیہ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ تمام مرد اور عورتیں کچھ روز کے لئے جامعہ کے بورڈنگ میں آ گئے تھے۔ اور جھیل کھر نجا ایک گاؤں تھا وہاں سے جو مسلمان لٹ کر آتے تھے ان کا قیام

بھی جامعہ ہی میں تھا اور کھانے کا انتظام مطبخ سے تھا اناج کم ہونے کی وجہ سے بڑوں کو ایک روٹی اور چھوٹو کو آدھی روٹی ملا کرتی تھی میرا ٹامی بھی میرے ساتھ تھا وہ بھوکا رہا کرتا تھا اُس کو دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی تھی میں اپنی آدھی روٹی میں سے اپنے پیارے ٹامی کا پیٹ بھرتی تھی اور میں بھوکی رہا کرتی تھی میرے والد بہت منع کرتے تھے کہ مت دیا کرو لیکن میرا دل نہ چاہتا تھا کہ میں کھاؤں اور میرا ٹامی بھوکا رہے والد صاحب بہت کم کھانا کھاتے تھے وہ اپنی روٹی میں سے مجھے دے دیا کرتے تھے جب کہ خطرہ کم ہوا تو میرے والد اور میری بہن شکیلہ پروین گھر جا کر روٹی پکا کر لاتی تھی کیونکہ عورتوں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ جائیں۔ بسیں وغیرہ سب بند ہو گئیں تھی۔ ایک دفعہ میں ڈاکخانے خط ڈالنے جا رہی تھی میرا ٹامی بھی میرے ساتھ تھا جب میں خط ڈال کر واپس جانے لگی تو کچھ کتے لڑتے ہوئے آتے یہ دیکھ کر میرا ٹامی بھی جانے لگا۔ میں بہت اس کے پیچھے بھاگی تا کہ اُسے پکڑ لوں۔ لیکن افسوس ایک کار سامنے سے آ رہی تھی میں تو سڑک پار کر چکی تھی لیکن میرا پیارا ٹامی سڑک پار کرنے ہی کو تھا کہ کار قریب سے گذری اور ٹامی کو کچلتی ہوئی نکل گئی۔ ہائے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب میرا ٹامی اِس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ میرے حواس ٹھکانے نہیں تھے میں سمجھی کہ چوٹ آ گئی ہو گی لیکن افسوس وہ چوٹ نہیں تھی وہ تو اس کی موت تھی جو اُسے لینے آئی تھی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ٹامی مر گیا تو میں بہت روئی میرے ساتھ میری بہن شکیلہ پروین بھی بہت روئیں والد صاحب نے بہت سمجھایا لیکن دل کو صبر نہیں ہوتا تھا والد صاحب نے ٹامی کو پہاڑیوں میں ڈلوا دیا۔ میں نے ایک گڈھا کھود کر ٹامی کو اس میں دفن کر دیا۔ جب کبھی مجھے اس کی یاد ستاتی تھی تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے کچھ عرصہ تک تو میں اپنے کلاس نہیں جا سکی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد میرا دل پڑھنے میں خوب لگ گیا۔ لیکن افسوس کہ ابھی میں کلاس سوئم میں ہی تھی کہ میرے والد صاحب بیمار پڑ گئے یوں تو اُن کو پہلے ہی سے دل دھڑکنے کی بیماری تھی۔ لیکن دہلی جانے سے وہاں کی آب و ہوا ان کو بہت اچھی معلوم ہوئی اس سے وہ بہت تندرست ہو گئے تھے لیکن اچانک آٹھ روز کے اندر ہی وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ریحانہ بیگم۔ عمر ۹ سال
قائم گنج

محمد متین



منی کا باغ

منی کی عمر اس سال ۹ برس کی تھی مگر اسے پھولوں سے بڑا شوق تھا۔ اس لئے اس نے اپنے مکان کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ لگایا تھا۔ اس باغ میں وہ روز کام کرتی تھی اس نے بہت سے پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ بیلا، چمبیلی جوہی، گیندا، سورج مکھی اور گلاب وغیرہ۔ اس میں طرح طرح کے کیڑوں مکوڑوں نے بھی اپنے رہنے کے لئے گھر بنا لئے تھے۔ ٹڈے ادھر ادھر پیڑوں کی پتیاں کھانے کے لئے کودا کرتے تھے۔ شہد کی مکھیاں پھولوں سے رس چوسا کرتی تھیں پیاری پیاری تتلیاں ادھر ادھر اڑا کرتی تھیں۔ منی کا ننھا سا دل ان رنگ برنگی تتلیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا وہ اسے پکڑنے اور اکٹھا کرنے کے نئے نئے طریقے سوچا کرتی تھی۔

دنیا بھر کے کیڑے مکوڑے اور چڑیاں منی کے اس باغ میں اپنے کھانے کی تلاش میں آتے تھے۔ مگر اس کے پودے اپنا کھانا حاصل کرنے کہیں نہیں جاتے تھے۔ ان کا کھانا کیا تھا! بس یہی پانی، دھوپ اور ہوا یہ سب چیزیں انھیں وہیں مل جاتی تھیں۔ ان کی جڑیں اپنے ضرورت کے مطابق پانی لے لیتی تھیں۔ ان کے ڈنٹھل اور پھول دھوپ کھا لیتے تھے اور ہوا تو ہر وقت چاروں طرف سے ملتی ہی تھی روز صبح سویرے سنہرا سورج نکلتا تھا اور انہیں سنہری کرنوں سے چوم کر چلا جاتا تھا۔ رات ہوتی تو چاند انھیں اپنی دودھ سی چاندنی سے نہلا جاتا تھا صبح کو شبنم کی ننھی ننھی بوندیں آتیں

اور ان کا منہ دُھلا جائیں۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے انھیں جھولا جھلاتے اور ان سے کھیلا کرتے تھے اسی طرح ان پودوں کو کھڑے کھڑے سب کچھ مل جاتا تھا اور وہ خوب پھلتے پھولتے تھے ہاں کبھی کبھی اچھا کھانا دینے کے لئے منی ان کی جڑوں میں کھاد ضرور ڈال دیتی تھی۔

منی کو اپنے پیڑ پودے بہت پیارے تھے۔ وہ روز صبح اور شام اپنے باغ میں جاتی تھی پودوں کے پاس گھاس پھوس جھاڑ جھنکاڑ اُگ آتے تو ان کو اُکھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ کبھی کبھی کیاریوں کو بھی گوڑ دیتی تھی۔ جس سے پانی آسانی سے ان کی جڑوں تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ اپنے پھولوں کے پودوں کو بڑے اور سایہ دار درختوں سے دور ہی رکھتی تھی تاکہ پودوں کو آسانی سے غذا مل سکے۔

پھولوں کے پودے موسم کے مطابق لگائے جاتے ہیں۔ منی کو ان سب باتوں کا پورا علم تھا وہ جانتی تھی کہ کس موسم میں کون سے پودے لگانے چاہئیں۔ گرمی شروع ہونے پر اسے بیلے اور چنبیلی کے پھول ملتے تھے۔ اس کے بعد وہ برسات کے شروع میں گل مہندی لگاتی تھی۔ وہ برسات میں اسے خوب پھول دیتے تھے۔ اکتوبر کے شروع میں جب جاڑا شروع ہوتا ہے تو وہ اچھے اچھے پھولوں کے بیج بوتی تھی۔ جو جنوری کے مہینے میں کھلتے تھے۔ اس باغ میں گلاب کے پودے بھی تھے ان کو وہ برسات میں ویسے ہی چھوڑ دیتی تھی۔ مگر اکتوبر کے مہینے میں ان کی جڑوں کے پاس گوڑائی کر دیتی تھی تاکہ وہ ہوا کھالیں اس کے کھاد ڈال کر ڈھک دیتی تھی اور ان کی لمبی لمبی ٹہنیوں کو کاٹ دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس کے گلاب کے پودے جاڑوں میں خوب بڑے پھول دیتے تھے۔



گرمی کے موسم میں وہ پود گھر میں گل داؤدی کے گملے لگا دیتی تھی اور جولائی میں ان کو وہاں سے نکال کر کہیں دوسری



جگہ جہاں اچھا سمجھتی تھی لگا دیتی تھی جب ان میں کلیاں آنے لگتیں تو چھوٹی چھوٹی کلیوں کو توڑ دیتی تھی۔ اکتوبر کے آخر میں ہی کلی ایک بڑا سا پھول بن کر کھل جاتی تھی اس طرح منی برابر اپنے پیڑوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ اور اس وجہ سے منی کا باغ بڑا خوب صورت لگتا تھا۔ اور جو اس باغ کو دیکھتا وہ منی کو شاباشی دیتا اور خوش ہو کر منی کو پیار کرتا۔

ایک بار منی کو کہیں باہر جانا پڑا۔ اس کے باغ کی دیکھ بھال سورج اور ہوا ہی کرتے تھے۔ کچھ دنوں میں اس کی پتیاں مرجھا گئیں اور پودے کے ڈنٹھل پر گھنڈیاں سی پڑ گئیں انہیں گھنڈیوں میں بیجوں کا خزانہ چھپا پڑا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد گھنڈیاں پھٹ گئیں اور ہوا نے ان بیجوں کو اڑا کر چاروں طرف پھیلا دیا۔ ان بیجوں کو زمین اور پتوں نے چھپا لیا۔ پودے کچھ دنوں میں مرجھا گئے منی کا باغ سوکھ گیا اتنے میں برسات کا موسم آیا اور زمین کو نمی ملی۔ بیج جو زمین میں چھپے پڑے تھے پھر اگ آئے اور پودا بن کر جھانکنے لگے۔ برسات ختم ہونے کے بعد منی پھر اپنے گھر واپس آئی اور آتے ہی وہ اپنے باغ کی طرف بھاگی۔ باغ میں اپنے چاروں طرف پودے ہی پودے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اس کے باپ نے بتلایا کہ اس کی محنت کے بدلے میں اللہ نے بیجوں کو زمین پر پھیلا دیا تھا دھوپ اور ہوا نے اسے بڑا کیا لیکن ان کے ساتھ ساتھ جو گھاس اُگ آئی تھی اُسے اب صاف کر دینا چاہیئے۔ نہیں تو یہ پھولوں کے نرم پودوں کو دبا لے گی اور ان کا سارا کھانا کھا جائے گی۔ کھانا نہ ملنے پر پھولوں کے پودے مرجھا جائیں گے پھر کیا تھا منی نے گھاس کو صاف کرنا شروع کیا اور اس کا باغ پہلے کی طرح خوب صورت بن کر لہلہانے لگا۔ منی بڑی ہوشیار لڑکی ہے وہ پھر پھولوں کے بیجوں کو اکٹھا کرے گی اور برسات میں برسات کا پودا اور جاڑے کے موسم میں جاڑے کا پودا لگائے گی۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۹۱ پر دیکھئے)

دو کارٹون



عملی سبق



میں آپ سے آخری
بار درخواست کرتا ہوں کہ یہ
کتاب آپ کو خریدنی ہے یا
نہیں

ذرا بتائیے تو؟

سیٹھ مول چند کے پاس ۲۳ سونے کی سلاخیں تھیں۔ مگر اتفاق یہ تھا کہ ان کا نوکر بے ایمان تھا۔

سیٹھ جی کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سونا چرالے اس لئے انہوں نے ان سلاخوں کو اس طرح لگایا جیسے تصویر میں دکھایا گیا ہے۔

اب تو سیٹھ جی بہت خوش ہوئے کہ اب جب بھی مجھے شک ہوگا میں اوپر سے گن لیا کروں گا۔ دائیں بائیں دونوں طرف پندرہ سلاخیں دکھائی دیں گی۔ بس ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائیگا کہ چرایا گیا ہے یا نہیں۔

مگر سیٹھ جی کا نوکر تو ان سے بھی زیادہ چالاک تھا۔ اس نے دو سلاخیں ایک طرف سے چرالیں مگر دو سلاخیں دوسری جگہ سے اٹھا کر کچھ اس طرح رکھ دیں کہ پہلے کی طرح پندرہ پندرہ ہو گئیں

اب آپ بتا سکتے ہیں کہ نوکر نے کیسے رکھا کہ دو کو ہٹانے کے بعد بھی گنتی وہی کی وہی رہی۔

آپ سلاخوں کے لئے ۲۳ دیا سلائی کی سینکیں لے لیجئے اور اس کی مدد سے بتائیے

جواب صفحہ ۱۹ پر دیکھئے

ایک یادگار کتاب



نام کتاب: چمپاوت کا آدم خور شیر
لکھنے والے: محمد معین۔
چھاپنے والے:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی
قیمت ـ ۵ر آنے

محمد معین کی بے وقت موت کا حال آپ نے مارچ کے پیام تعلیم میں پڑھا ہوگا۔ ابھی یہ بی۔ اے، میں پڑھ ہی رہے تھے کہ اللہ میاں نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔

محمد معین نے اس چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ کیا۔ انھوں نے اپنے اچھے اخلاق و اطوار سے چھوٹے بڑوں کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کی یہ برادری، ان کو یاد کرکے آج بھی اداس ہو جاتی ہے۔

محمد معین لکھنے سے بے حد دلچسپی لیتے تھے انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں جم کاربٹ کی کہانی "چمپاوت کا آدم خور شیر" کو اردو کا روپ دیا۔ جو یا قساط پیام تعلیم میں شائع ہوا۔ بچوں نے بے حد پسند کیا۔ ترجمے کی سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ اس پر اصل کا شبہ ہو۔ پڑھنے والے یہ سمجھ ہی نہ سکے کہ اصل مضمون کسی دوسری زبان کا ہے!! "چمپاوت کا آدم خور شیر" کی یہی خصوصیت ہے۔ پھر یہ بھی کہ کہانی کی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کتاب کو ایک مرتبہ پڑھنے کے لئے اٹھایئے تو کہانی ختم کئے بغیر اٹھنے کو جی نہ چاہے۔

کتاب کے پڑھنے کے بعد ہم ہات مل کر رہ جاتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ کاش محمد معین

بقیہ مضمون صفحہ ۵۲ پر دیکھئے

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے

فیس داخلہ ار کے ٹکٹ کی صورت میں

۱۰ روپے کے نقد انعامات

پیامی معمّا نمبر ۱۲

حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۰ جولائی ۱۹۵۰ء

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر پانچ روپے

دوسرا انعام ایک غلطی پر تین ″

تیسرا ″ دو ″ ″ ۲ ″

دائیں سے بائیں

۱۔ دنیا کا سب بڑا ... بیجاپور میں ہے

۴۔ بعض حالات میں ذاتی ... کا اظہار نہ کرنے والے عموماً زندگی میں کامیاب رہتے ہیں

۶۔ ... کی زندگی ہی کیا؟ (چار حرفی)

۷۔ یہ خطرناک شے ہے۔

۸۔ اس کے خلاف قدم اٹھانا بڑی ہمت کا کام ہے (چار حرفی)

۹۔ اچھے بچے ہمیشہ استادوں کی ... کرتے ہیں

پیامی معمّا نمبر ۱۲

اوپر سے نیچے

۱۔ دنیا کی سب سے بڑی سڑک ... ٹرنک روڈ ہے

۲۔ بعض اوقات اس سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔

۳۔ جس معاملے سے اپنا تعلق نہ ہو اس کی ... کرنے سے فائدہ۔

۵۔ ضعیف آدمی ... کھانا پسند کرتے ہیں (تین حرفی)

کوپن پیامی معمّا نمبر ۱۲

نام ----------------

پتہ ----------------

شرائط پیامی معمّا

۱۔ ایک خاکہ کی فیس داخلہ ار ۶ خاکوں کی فیس ۵ر فیس ٹکٹوں کی صورت میں آنا چاہیئے۔
۲۔ سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو اسپیشل انعام بھی ملے گا۔
۳۔ ایک روپے انعام تک کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کی جائے گی
۴۔ حل روشنائی سے صاف ہونا چاہیئے۔ مشکوک اور کٹے پھٹے حل مقابلے میں شریک نہ ہوں گے۔
۵۔ اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ لڑکے ہوں گے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔
۶۔ ایک لڑکے کو ایک ہی انعام یا انعام کا ایک ہی حصہ ملے گا۔
۷۔ معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری ہوگا

اپنے حل آپ اس پتہ پر بھیجیں۔ ایڈیٹر پیامی معمّا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی

ضروری اعلان بابت معمّا نمبر ۱۲

پیامی معما نمبر ۱۲ میں غلطی رہ جانے کی وجہ سے اسے اصلاح کے بعد دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ معما نمبر ۱۲ کی تاریخ داخلہ ۱۰ر مئی سے بڑھا کر ۱۰ جولائی کر دی گئی ہے

جو پیامی معمبر ۱۲ کا حل بھیج چکے ہیں۔ وہ بغیر فیس اور کوپن کے اپنے خط کا حوالہ دیتے ہوئے حل روانہ کر دیں۔ ان کے نام ہمارے یہاں رجسٹر میں درج ہیں۔ ہم اس سے ملا لیں گے۔

معمے میں غلطی رہ جانے اور تاریخ بدلنے کا ہمیں بے حد افسوس ہے امید ہے کہ پیامی معمہ سے دلچسپی لینے والے حضرات ہماری مجبوری کا خیال کرتے ہوئے ہمیں معاف فرمائیں گے

اڈیٹر پیامی معمہ

نوّے روپے کے نقد انعامات

۵ برس سے ۱۵ برس تک کے بچوں کے لئے کہانی لکھ کر انعام پانے کا بہترین موقع

گروپ ا۔ ۵ برس سے ۸ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں

گروپ ب۔ ۹ برس سے ۱۲ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں

گروپ ج۔ ۱۳ برس سے ۱۵ برس تک کے بچے شریک ہو سکتے ہیں

ہر گروپ میں ۳ انعام دیے جائیں گے۔ پہلا ۱۵ روپیہ۔ دوسرا انعام۔ ۱۰ روپیہ تیسرا ۵ روپیہ۔

جو بچے انعام کے بجائے کتابیں لینا چاہیں ا[ن] کو ایک روپیہ قیمت کی کتابیں ۱۴ر آنے میں ملیں گی۔

شرائط انعامی مقابلہ

۱۔ کہانی بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء ہے۔

۲۔ پیام تعلیم پڑھنے والے تمام بچے اس مقابلہ میں شرکت کر سکتے ہیں۔ مستقل خریدار ہونے کی کوئی شرط نہیں۔

۳۔ کہانیاں اردو میں ہونی چاہیئے

۴۔ کہانی کہیں سے نقل نہ کی گئی ہو۔ بلکہ خود بچوں کی لکھی ہوئی ہونی چاہیئے

۵۔ ہر کہانی کے ساتھ آپ کا پورا نام، عمر اور پتہ ضرور ہونا چاہیئے

۶۔ کہانی اس سے پہلے کہیں چھپی نہ ہو۔

۷۔ کہانی صاف اور خوشخط لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔ کٹی پھٹی نہ ہونی چاہیئے۔ ایسی کہانیاں مقابلہ میں شریک نہ کی جائیں گی۔

۸۔ کہانی پر "انعامی مقابلے کے لئے" ضرور لکھیے۔

۹۔ • گروپ الف کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۲ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے۔

•• گروپ ب کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۴ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے

••• گروپ ج کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۶ صفحے اسکول کاپی کے صفحوں کے برابر ہونی چاہیئے

کہانی بھیجنے کا پتہ۔ اڈیٹر۔ پیام تعلیم [illegible]

بچوں کے لیے تاریخ کی نادر کتاب

تاریخ ہند کی کہانیاں

تاریخ بچوں کے لئے ایک روکھا پھیکا موضوع ہے اور یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اسے کہانیوں کے انداز میں لکھا ہے۔ بڑی بات ہے کہ تاریخ کا مقصد اپنی جگہ پر رہتا ہے۔

حصہ اوّل

پرانے زمانے کے بادشاہوں کے حالات درج ہیں زبان ایسی پیاری ایسی میٹھی ہے کہ بغیر ختم کئے کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت ۱۰ آنے

حصہ دوم

اس حصّے میں مسلمان بادشاہوں کے عروج و زوال کی کہانی ہے بادشاہ کی زندگی تھوڑے سے لفظوں میں بیان کی گئی ہے لیکن اس طرح کہ اس کی تصویر دماغ میں ہمیشہ قائم رہیگی۔ ۱۰ر

حصہ سوم

اس حصّہ میں اورنگ زیب کے بعد غدر تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں، ہماری تجارت صنعت و حرفت علم اور دولت کو آہستہ آہستہ کیسے ختم کر ڈالا گیا۔ ہر گورنر جنرل کیا مقصد لے کر ہندوستان آتا تھا۔ قیمت ۱۰ آنے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں　　مطبع [illegible]

نونہال بے بی ۱۹۵۲ء
مسز اندرا گاندھی کی گود میں



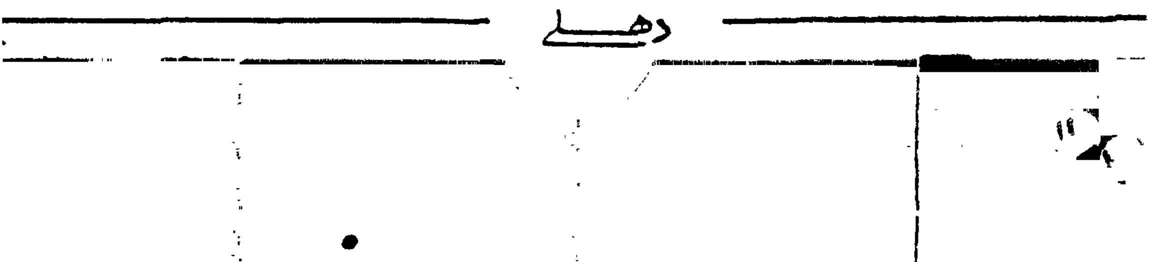
رادیکھی کھنّا عمر دو سال کو ہمدرد دوا خانہ دہلی نے سنہرا تاج دیا اور تین سال تک پچاس روپیہ وظیفہ دینے کا اعلان کیا

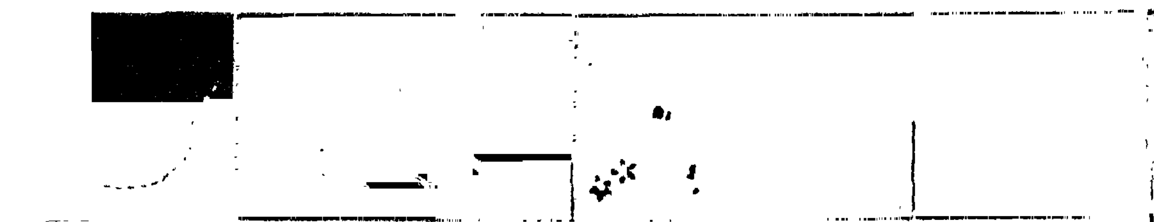
Regd. No. D. 96.
JUNE. 1952.

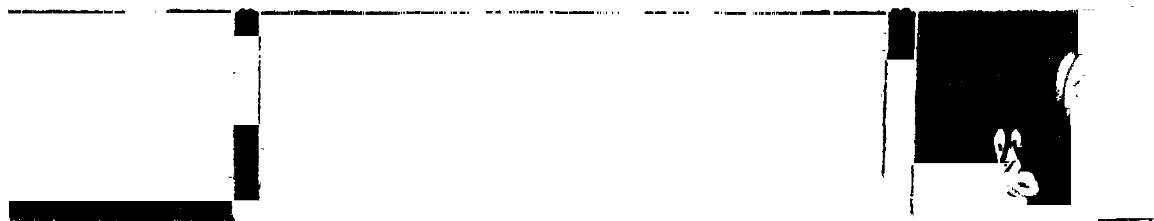




دھلے



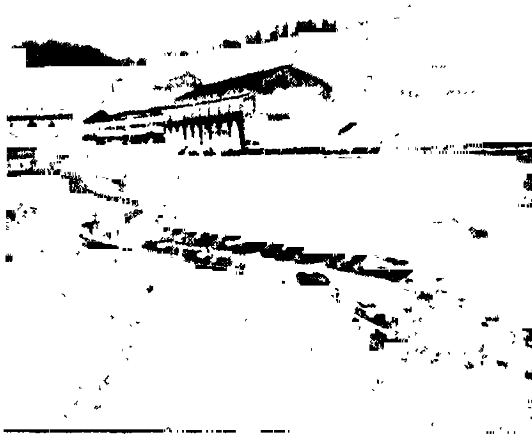








مسوری جانے کے لئے ان بل کھاتی سڑکوں پر سے گذرنا پڑتا ہے



لیجئے مسوری پہنچ گئے۔ گاندھی چوک



گاندھی چوک سے مسوری کا ایک منظر



پیام تعلیم

جولائی ۵۲ء

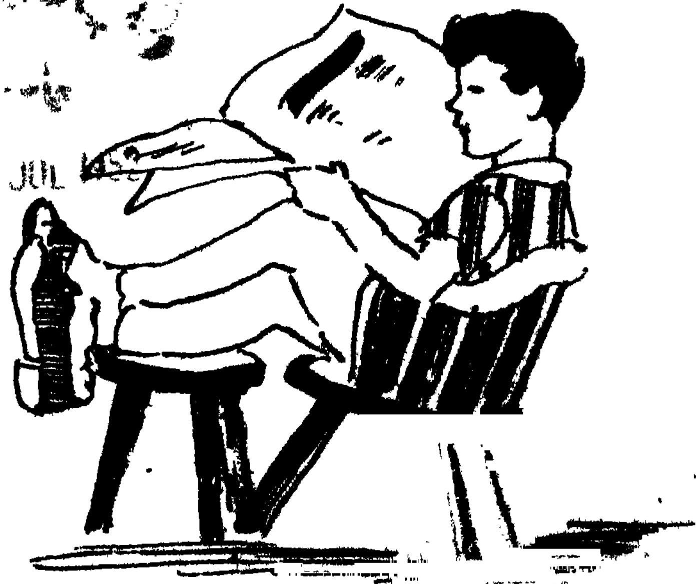
ادارہ
حامد علی خاں بی۔اے (علیگ)
اطہر پرویز ایم۔اے (علیگ)

سالانہ چندہ چار روپے
فی پرچہ چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، دہلی

فہرست

بچوں سے باتیں



اس بار آپ کی چھٹیاں کیسی گذریں۔ کہیں سیر سپاٹے بھی گئے یا گھر ہی پر رہے۔ جامعہ میں تو بالکل سناٹا تھا آٹھ دس لڑکے جو رہ گئے تھے وہ مسوری کی سیر کرنے چلے گئے۔ بھائی محسن حامد نے مسوری کی سیر کرائی ہے۔ آپ بھی لطف اٹھائیے۔

اب یہ تو بتائیے کہ آپ میں سے کتنوں نے کہانیوں کے مقابلے کے لئے اپنی کہانی نہیں بھیجی۔ اب تو بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ ۱۵ر جولائی تک دفتر پہنچ جانی چاہئیں۔ جن پیامیوں نے ابھی تک کہانی نہ بھیجی ہو وہ فوراً اپنی کہانی بھیج دیں۔

پیامیوں کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ پیام تعلیم کا سال نامہ ستمبر میں نکل رہا ہے ہم اس میں مقابلے کے نتیجے کا اعلان کریں گے اور مقابلے میں آنے والی اچھی اچھی کہانیوں کو شائع بھی کریں گے۔ اس طرح یہ آپ ہی کی تحریر کردہ کہانیوں کا خوب صورت سا سال نامہ ہوگا۔

اگر آپ ابھی تک خریدار نہیں بنے تو چار روپیہ بھیج کر سالانہ خریدار بن جائیے تاکہ آپ کو سال نامہ مفت مل سکے۔





تتلی

تنویر ہاشمی

تتلی وہ آ رہی ہے آنکھوں کو بھا رہی ہے
بیٹھی تھی اُڑ گئی پھر آ آ کے مُڑ گئی پھر
باغوں کی رہنے والی ہے لال پیلی کالی
پھولوں کی اس میں رنگت پھولوں کی اس کو چاہت
کلیوں پہ گا رہی ہے جلوے دکھا رہی ہے
سبزے میں جا کے چمکی پھلواڑیوں میں دمکی
آزادی خوش نمائی اس نے خدا سے پائی



عمیق ملک

چھتری کی کہانی

انگریزی میں چھتری کو "امبریلا" کہتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ اطالوی اور لاطینی زبان کے لفظ "امبرا" سے بنا ہے۔ جس طرح ہم باغ سے باغیچہ۔ ڈھول سے ڈھولک۔ پلنگ سے پلنگڑی بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح لفظ "امبرا" سے "امبریلا" بنایا گیا ہے۔ "امبرا" کے معنی ہیں سایہ اور "امبریلا" کے معنی ہیں چھوٹا سایہ۔ جسے ہم چھتری، چھاتا یا چتر کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل چھتری کا استعمال صرف چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لئے کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے مشرق کے سخت گرم علاقوں میں اس کا رواج ہوا لیکن ان دنوں سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کا یہ سامان اتنا بھدّا اور بھاری بھرکم ہوتا تھا کہ اس کا کھولنا اور بند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے بادشاہ اور بڑے بڑے امیر اسے استعمال کرتے تھے۔ یہ چھاتے یا تو ان کے رتھوں پر جڑے ہوتے تھے۔ یا غلام پیچھے پیچھے ان پر تان کر چلتے تھے۔

ایشیا میں یہ چھتریاں حکومت اور امیری کی نشانی بھی جاتی تھیں۔ تخت پر بیٹھے

ہوئے بادشاہ کے سر پر ایک چھاتا تنا ہوتا تھا۔ یہ چھاتا نہایت خوبصورت اور قیمتی ہیروں سے جگ مگ جگ مگ کرتا تھا۔ نینوا اور بابل کے بادشاہ اور مصر کے فرعون ان چھتریوں کو بڑائی کی نشانی سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں برما کے بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ہندوستان کے گورنر جنرل کو خط لکھا۔ تو اس میں اپنا نام یوں درج کیا۔ "برما کا وہ بادشاہ جو مشرقی ملکوں کے چھتری استعمال کرنے والے بادشاہوں کا سردار اور بادشاہ ہے۔" برما ان دنوں انگریزوں کے ماتحت نہ تھا۔ یہ ملک انگریزوں نے ۱۸۸۶ء میں فتح کیا اسی طرح مرہٹہ شہزادوں کا ایک سرکاری خطاب "چھتری والے آقا" تھا۔

یورپ میں سب سے پہلے رومن اور یونانی عورتیں چھتریاں استعمال کرنے لگیں۔ تاکہ ان کے سرخ اور سفید خوبصورت چہرے دھوپ سے کملا نہ جائیں۔ اس کے بعد سر منڈے پادری اپنی ننگی کھوپڑیوں کو سورج کی تیز دھوپ سے بچانے کے لئے چھتریاں تاننے لگے۔ بارش میں قہوہ خانوں کے ملازم معزز مہمانوں کو گھوڑا گاڑی سے اتار کر قہوہ خانے تک لے جانے کے لئے چھتری تانتے تھے اس طرح ملازموں کے چھتری تان کر آنے میں مہمان اپنی بڑی عزت سمجھتے تھے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف میں چھتری کا عام استعمال جونہنز میں دے نے کیا۔ یہ ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۸۶ء میں مرا۔ یہ ایک مشہور سیاح تھا۔ اور اسے لوگوں سے بہت ہمدردی تھی۔ اس کا ایران اور روس کے سفر کا حال بہت دلچسپ ہے۔ اس نے لندن میں بچوں کے فائدے کے لئے بہت کام کئے۔

اس شخص نے بڑی کوشش اور محنت سے انگلستان میں چھتری کا استعمال عام کیا کیے اور تانگے والے جن کو چھتری کے رواج سے نقصان کا ڈر تھا۔ اس محبت بھرے انسان پر پتھر پھینکتے اور اسے برا بھلا کہتے۔ لیکن وہ کامیاب ہو کر ہی رہا۔ اور اس نے جیتے جی دیکھ لیا۔ کہ انگلستان کے عام لوگ چھتری کو ہر روز پہلے سے زیادہ

استعمال کر رہے ہیں۔ چھتری بنانے اور مرمت کرنے کے کئی کارخانے اور انھیں بیچنے کے لئے سینکڑوں دکانیں کھل گئیں۔ اور ہزاروں آدمیوں نے معمولی خرچ کرکے دھوپ اور بارش سے اپنا بچاؤ کیا۔ اور ہزاروں نے اس کی بدولت اپنی روزی کمائی۔

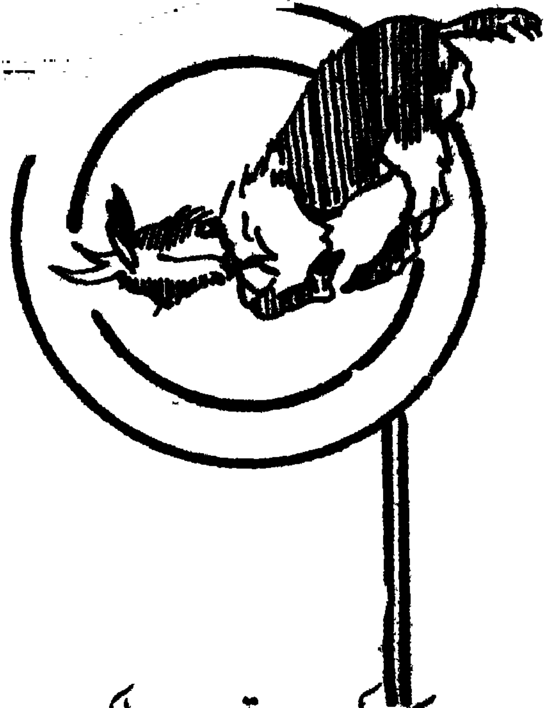
ہوتے ہوتے اس کا استعمال اتنا زور پکڑ گیا۔ کہ لڑائی کے میدان میں فوج کے بڑے بڑے افسر اپنی سنہری چمکیلی وردیوں کی چمک دمک قائم رکھنے کے لئے چھتری تانا کرتے تھے۔ اور ۱۸۱۵ء میں واٹرلو کی لڑائی میں ان کا رواج جاری تھا۔ لیکن بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن نے چھتری کے استعمال کو روک دیا۔ اس نے کہا کہ "دیکھنے والے کی نظروں میں فوجیوں کی چستی اور بہادری کی کوئی قدر نہیں رہتی اور ساتھ ہی جنگ میں شامل ہونے والا افسر چھتری اوڑھ کر بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔" لیکن ۱۹۱۴ء کی "بڑی لڑائی" میں کئی بڑے فوجی افسر خاکی وردی اور خود پہنے اور چھاتا اوڑھے ہوئے دیکھے گئے۔

پہاڑی علاقوں میں جہاں "مون سون" کے موسم میں صبح شام وقت بے وقت بارش ہوتی رہتی ہے۔ عام لوگ رنگ رنگ کی چھتریاں بغل میں دابے پھرتے ہیں۔ کہ بارش ہو اور جھٹ تان لیں۔ لیکن بے چارے دیہاتی لوگ ٹاٹ کی گھون سر پر رکھ کر موسلا دھار بارش یا جھم جھم بھیگتے ادھر ادھر کام کرتے پھرتے ہیں۔

ہندوستان میں چھتریاں جاپان۔ جرمنی اور انگلستان سے بن کر آتی ہیں۔ مگر کچھ عرصے سے اب ناگ پور (سی۔پی) احمد آباد۔ کلکتہ۔ بمبئی اور دہلی میں بھی ان کے کپڑے اور ڈنڈیاں بنانے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔

انور عظیم

میری کہانی



میں ایک بکری ہی تو ہوں۔ لیکن میری زندگی کی کہانی کسی انسان کی کہانی سے کم دلچسپ نہیں۔ اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ میرا رنگ اب بہت دھندلا اور میلا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بھی کیا دن تھے جب میرا رنگ اُجلی چمکیلی دھوپ میں ریشم کی طرح چمکتا تھا۔ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور کوئی مجھے پوچھتا نہیں۔ اب اس گھر کی مرغیاں بھی آکر میرے سینگ پر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور کبھی وہ دن بھی تھے جب میں ذرا سینگ چمکاتی تھی تو کُتے بھی دم دبا کر بھاگتے تھے۔

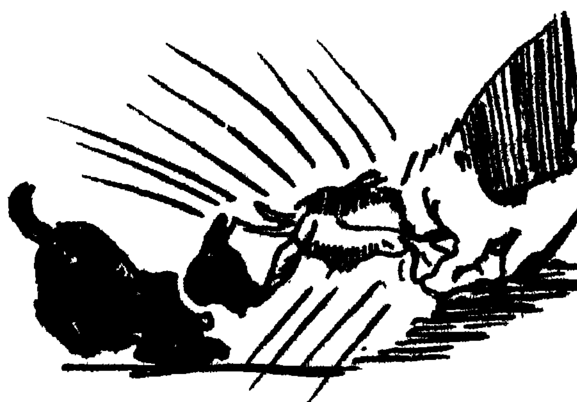
ایک دن کا واقعہ یاد آرہا ہے۔ شام کا جھٹپٹا تھا۔ میں تازہ ہری ہری گھاس چر کر آئی تھی۔ میرے تین بچے جن کی عمر ابھی دس دن کی ہی تھی، آس پاس، ننھی خوبصورت پتلی پتلی ٹانگوں پر اُچھل کود رہے تھے۔ ادھر ایک نگوڑا پاگل کتا نکل آیا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ پیٹ بھر جائے تو نیند آنے لگتی ہے۔ اس وقت میرا [illegible]

وہی حال تھا۔ میں ذرا اونگھ گئی۔ اتنے میں میرے بچوں کے چیخنے کی آواز آئی۔ آنکھیں جو کھلیں تو دیکھتی ہوں کہ میرے دونوں گورے بچے میری طرف دوڑے چلے آرہے ہیں۔ اور میرا سانولا بچہ چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا لرز رہا ہے اور زبان نکال کر چیخ رہا ہے میں ممتا کے مارے تڑپ اٹھی۔ کتا اس کے کان کھینچ کر بھاگنے والا ہی تھا کہ میں نے اپنے دونوں سینگ اس کے پیٹ میں اتار دیئے۔ کتا مجھے گالیاں دیتا ہوا بھاگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اور پیٹ سے خون نکل رہا تھا۔ کتے کی گالیوں پر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن یہ سوچ کر میں چپ ہو گئی کہ کمزور گالیاں بکتے ہی ہیں۔

بچو، میں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہوں۔ تمہیں کھیلتے ہوئے دیکھتی ہوں تو مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ میرے دودھ سے نہ صرف میرے اپنے بچے پلے اور جوان ہوئے بلکہ تمہارے جیسے نوجوانوں کو بھی میں نے اپنا خون پلایا ہے۔ آج میں اکیلی ہوں۔ میرے سب بچے مجھ سے چھوٹ گئے ہیں۔ میں تمہیں ہی دیکھ کر خوش ہو لیتی ہوں۔ میری آنکھوں میں اپنے گورے کالے بچوں کی خوبصورت مسکراہٹیں، شرارتیں، معصوم حماقتیں، سب ناچ اٹھتی ہیں۔ لیکن میرے پیارے بچو! اس گھر میں جہاں کبھی میری بڑی آؤ بھگت تھی۔ آج کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ کوئی کیوں نہیں پوچھتا؟ بتاؤں؟ اس لئے کہ اب میں دودھ نہیں دیتی اور اس گھر کے لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس گھر کے لوگ یہ بھول گئے ہیں کہ میرے ہی بچوں سے کتنے پیسے اس گھر میں حاصل کئے؟ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن بچو تم ابھی بچے ہو اور تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے۔ میرے تو مرنے کا وقت آیا۔ پکا ہوا آم کب ٹپک جائے گا کون جانتا ہے۔ لیکن تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ میری زندگی کی کہانی سے سیکھو۔ تم آتے ہو اور مجھ سے کھیلتے ہو لیکن تم یہ بھی بھول جاتے ہو کہ یہ بوڑھی بکری جس نے تمہاری ماں کو بھی دودھ پلایا ہے آج

بھوکی ہے۔ میرے لال، مجھ سے اپنی کہانی بھی نہیں کہی جاتی۔

اہا دیکھو وہ منا کتنا اچھا ہے۔ میری باتیں سن کر اسے مجھ پر رحم آگیا ہے۔ اور وہ مجھے اپنا سنگترہ دے رہا ہے۔ میرے منُنّے تو نہیں جانتا رحم سے جو کھانا ملتا ہے اسے بھیک کہتے ہیں۔ میں بھیک پر زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ انسان اپنی عزت کھو کر جانور ہو جاتا ہے۔ میں جانور ہوں لیکن یہ چیز میں نے انسانوں سے سیکھی ہے۔ میں اپنی زندگی میں اسی پر عمل کرتی ہوں۔ میری جیسی کھوسٹ بڑھیا کے منہ سے یہ باتیں سن کر تم ہنستے ہو لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں گی۔



کل ایک قصاب مجھے خریدنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے میری ٹانگیں، گردن اور سینہ ٹٹول کر میرے گوشت کا اندازہ لگایا۔ پھر ناپسند کر کے چلا گیا۔ تمہاری نانی نے میرے ایک لات ماری۔ اس میں میرا کیا قصور تھا۔ چپ ہو رہی۔ ایسا ہی انسانوں کے یہاں بھی ہوتا ہے پھر میرا کیا پوچھنا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ماں جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو خود اس کا بیٹا اسے ستاتا ہے اور بھوکا رکھتا ہے۔ اس سے مجھے شرم آتی ہے۔ ایسی زندگی کس کام کی۔ بچے آنکھوں سے اوجھل، گھر میں سب مزے کریں اور مجھ پر فاقے کے دن گذریں۔ یہ سن کر تمہیں تعجب ہوگا کہ اب وہی کتا آتا ہے اور مجھے کان پکڑ کر کھینچتا ہے۔

پیارے بچو، یہ چیزیں دیکھو اور سیکھو۔ تمہیں ایک ایسی زندگی بنانی چاہیئے جس میں کمزور کو ستایا نہ جاتا ہو اور سب کو اس کا حق ملتا ہو۔ میں جب تم

لوگوں کو آپس میں لڑتے ہوئے اور ایک دوسرے کی روٹی نوچتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میرا دل کانپ جاتا ہے۔ یہ لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ تم ایک دوسرے کے کان اور ٹانگیں کھینچتے رہ جاتے ہو اور کوّا تمہاری روٹی لے کر اڑ جاتا ہے۔ میں بھی اگر اور دوسری بکریوں، دوسرے کمزور جانوروں سے مل کر زندگی گزارتی تو آج وہ میری مدد کرتے۔ تم اگر مل کر زندگی گذارو تو تمہیں بڑے ہو کر بڑھاپے میں یہ تباہی نہ دیکھنی ہوگی۔

اچھا بچو! میں آج تم سب کو چھوڑ کر اپنے بچوں کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ اب وہی میری حفاظت کر سکتے اور میری خدمت کر سکتے ہیں ——

(بقیہ مضمون روپے پیسے کی کہانی صفحہ ۴۲ سے)

ایک مقررہ حساب سے چاندی رکھ لی جاتی ہے تاکہ اگر کبھی لوگ چاندی مانگیں تو اُن کو اس جمع میں سے دی جا سکے۔

مگر بڑی بات یہ ہے کہ اب کوئی آدمی بینک جاکر چاندی یا روپیہ نہیں لاتا کیونکہ لوگوں کو اس پر اختیار ہے کہ جس وقت وہ چاہیں کے بینک سے تقاضا کر سکتے ہیں اور بینک اُن کو دے دے گا۔ اسی وجہ سے خود نوٹ ہی بغیر کسی شک شبہ کے ہاتھوں ہاتھ گھومتا رہتا ہے۔ اور بچی ہمیں تو اپنی ضرورت کی چیزوں سے مطلب ہے چاہے وہ دھات کے سکوں کے بدلے ملیں اور چاہے کاغذ کے نوٹوں کے بدلے۔ ہمیں تو آم کھانے سے مطلب ہے گٹھلی گننے سے کیا فائدہ؟

(بقیہ مضمون عقل مند بھائی صفحہ ۱۹)

ان کی بیویوں کو انکی قابلیت کا اندازہ ہوا۔ اور وہ اپنے بڑے بھائیوں کے پیر پر گر پڑے باقاعدہ کے بٹوارے کا خیال چھوڑ دیا۔ سب لوگ ہنسی خوشی گھر واپس آئے اور امن چین سے رہنے لگے

مسوری کی سیر

مستحسن حامد

چھٹیاں آئیں۔ اس بار دہلی میں بڑی زور دار گرمی پڑ رہی تھی۔ اس گرمی سے بچنے کے لئے ہم دہلی سے مسوری چلے گئے۔ دہلی کا درجہ حرارت ۱۱۲° F تک پہنچ چکا تھا۔ مگر مسوری کا یہ عالم کہ وہاں کا درجہ حرارت ۷۰° F اور کبھی کبھی تو ۶۸° F اور ۶۵° F تک پہنچ گیا تھا۔ دہلی سطح سمندر سے ۶۷۳ فٹ اونچا ہے مگر مسوری تو ۵ ہزار فٹ اونچا ہے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ مسوری دہلی کے مقابلے میں بہت زیادہ سرد ہوگا۔

دہلی سے مسوری ۹۷۱ میل ہے شمال مشرق میں واقع ہے۔ میں میرے والد جناب حامد علی خاں صاحب اور ان کے دوست پروفیسر محمد عاقل صاحب احسن بھائی اور تحسین بھائی مسوری گئے۔ مسوری جاتے ہوتے ہم رڑکی، ہردوار، دہرادون دیکھتے ہوئے گئے۔ دہرادون سے مسوری جانے کے لئے سڑک سے ۲۲ میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن پیدل جانے کے لئے صرف سات میل کا فاصلہ ہے۔ مگر بھائی راستہ کچا ہے۔ سب نے مل کر

یہ طے پایا کہ ابّا تو موٹر سے مسوری پہنچ جائیں اور رہنے کا انتظام کر لیں۔ اور دوسرے سب لوگ راج پور کے راستے سے ہوتے ہوئے مسوری جائیں۔ دہرادون سطح سمندر سے دو ہزار فٹ اونچا ہے۔ اور ہم کو تین ہزار فٹ اور اوپر چڑھنا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ مسوری کی جانب چل رہے تھے۔ کیونکہ ہمیں بہت کافی اوپر چڑھنا تھا۔

ہم لوگ خراماں خراماں پیدل چلے جارہے تھے۔ جب ہم اوپر سے نیچے کی طرف دیکھتے تو مناظر بہت دل کش اور بھلے معلوم ہوتے، ایک طرف دریا بہہ رہا ہے، چشمے گر رہے ہیں۔ چاروں طرف گھنے جنگل ہیں اور نیچے بہت نیچے دہرادون نظر آرہا ہے ذرا ذرا سی سڑکیں ذرا ذرا سے گھر اور ہم ہیں کہ چلے جارہے ہیں۔ راج پور سے مسوری ہم ساڑھے دس بجے روانہ ہوئے تھے۔ اور شام کو ۵ بجے بروک لینڈ پہنچ گئے تھے۔ بروک لینڈ میں مجاہد صاحب، اصلاحی صاحب اور اندر پال صاحب پہلے ہی سے موجود تھے اور وہیں جامعہ کے ۹ لڑکے بھی موجود تھے۔ جب ہم بروک لینڈ پہنچے تو انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا، اور ہماری ہمّت پر آفریں کہتے ہوئے ہمیں گرم گرم چائے پلائی۔ جس سے ہماری ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ اور ہم پھر تازہ دم ہو گئے۔ اب ہم نے یہاں سے جناب اصغر حسن اصلاحی صاحب اور مجاہد حسین زیدی صاحب کو ساتھ لیا۔ اور ابّا کو تلاش کرنے کے لئے چل پڑے۔

ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل تلاش سے ہم نے ابّا کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ وہ امپیریل ہوٹل کے نیچے گھوم رہے تھے۔ ہم جلدی سے ان کے پاس گئے۔ اور وہ ہم کو امپیریل ہوٹل میں لے آئے۔ جہاں انھوں نے پہلے ہی سے دو کمرے لے رکھے تھے۔ سب نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا چائے پی اور پھر ٹہلنے کے لئے نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد آکر ہم نے کھانا کھایا اور پھر ساڑھے گیارہ بجے سو گئے۔ صبح ہم ۶ بجے اٹھے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور ناشتہ کیا اور پھر صبح ۸ بجے لنڈھور بازار دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

یہ امپیریل ہوٹل سے تین میل دور ہے۔ اور یہ بازار مسوری کا بڑا بازار ہے۔ اور بہت خوب صورت ہے۔ ہر قسم کی چیزیں اس بازار میں مل جاتی ہیں۔ پھر ہم ڈیڑھ بجے کے قریب قیام گاہ پر آگئے۔ کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر شام کو چار بجے چاء پی اور مسوری کے اسکیٹنگ روم گئے۔ وہاں ایک عجیب چہل پہل تھی۔ وہاں سے ہم ۷ بجے واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومے اور پھر امپیریل ہوٹل واپس آ گئے۔ وہاں کھانا کھایا اور سو گئے۔ دوسرے دن ہم صبح ساڑھے آٹھ بجے مُوسی فال دیکھنے گئے۔ موُسی فال جاتے ہوئے بروک لینڈ راستے میں پڑتا ہے۔ اس لئے ہم نے مجاہد حسین زیدی صاحب سے کہا کہ آپ بھی چلئے۔ وہ راضی ہو گئے۔ انھوں نے اور لڑکوں سے بھی مُوسی فال چلنے کے لئے کہا۔ لڑکے جلدی تیار ہو گئے۔ پھر تو ہم سب مُوسی فال دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ مُوسی فال دو ہزار فٹ نیچے تھا۔ ہم دو گھنٹے میں مُوسی فال پہنچ گئے۔ وہاں جاکر ہم تھوڑی دیر آرام کیا اور ناشتہ کیا جو کہ ہم ساتھ ہی لے گئے تھے۔ ہم لوگوں نے موسی فال دیکھا۔ مُوسی فال ۱۲ فٹ کی بلندی سے نیچے گرتا ہے۔ اس آبشار کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا اور ذائقہ میں اچھا ہوتا ہے۔ اور سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا بہتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم نے واپس لوٹنا شروع کیا۔ اب بہت سخت اور سیدھی چڑھائی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم تھک جاتے آخر ۱۲ بجے کے چلے ہوئے ہم ساڑھے چار بجے امپیریل ہوٹل پہنچے۔ چائے پی اور تھوڑی دیر لیٹے پھر اٹھ کر اِدھر اُدھر گھومے ۹ بجے ہم نے آکر رات کا کھانا کھایا اور جلد ہی سو گئے۔ صبح ہم ۷ بجے اٹھے کوئی پروگرام نہیں بنا تھا۔ لیکن میں اور میرے بڑے بھائی احسن حامد چشمہ دیکھنے گئے۔ یہ چشمہ امپیریل ہوٹل سے ۶ فرلانگ نیچے ہے ہم نے نیچے جاکر اس چشمے کا پانی پیا۔ بہت اچھا اور ٹھنڈا تھا۔ دق کے مریضوں کے لئے یہ پانی بہت مفید ہے۔ واپسی پر ہم نے رنگ برنگ کے پتھر جمع کئے۔ ۱۲ بجے واپس آ گئے اور پھر کھانا کھایا سو گئے پھر چار بجے سو کر اٹھے چائے پی

بقیہ صفحہ ۲۶ پر دیکھئے

ترجمہ: اطہر [illegible]

تحریر: [illegible]

عقل مند بھائی

شنکرز ویکلی میں دوسرا انعام پانے والی قدیم کہانی

ایک سوداگر تھا، بڑا دولت مند.... اس کے چار لڑکے تھے۔ جب سوداگر مرنے لگا تو اس نے اپنے چاروں لڑکوں کو بلایا۔ سوداگر بیماری کی وجہ سے بڑا کمزور ہو گیا تھا اس سے ٹھیک سے بولا بھی تو نہ جاتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "میرے پیارے بیٹو! جب کبھی تم چاروں بھائی الگ ہونا چاہو اور سارا مال دولت بانٹنا چاہو تو اپنے چچا کی رائے ضرور لینا اور اسی کی رائے پر عمل کرنا....." ابھی سوداگر کا یہ جملہ لڑکوں کے کان ہی میں گونج رہا تھا کہ سوداگر نے ایک ہچکی لی اور ختم ہو گیا۔

سوداگر کا سب سے بڑا لڑکا پڑھنے لکھنے کا بڑا شوقین تھا۔ وہ ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ دوسرا لڑکا بات چیت میں بہت تیز تھا۔ یہ دونوں لڑکے اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے ہی میں زیادہ وقت گزارتے..... یا پھر گھر ہی میں پڑے رہتے۔

ان دونوں لڑکوں کی بیویاں بھی اپنے شوہروں کی طرح زندگی گزارتی تھیں۔ گھر بار کی ساری ذمہ داری چھوٹے دونوں لڑکوں پر تھی جو کھیتی باڑی کرتے تھے۔ وہ دن بھر

ھوپ میں محنت مشقت کرتے۔ پسینہ بہاتے
ور گھر بھر کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے
ن کی دونوں بیویاں بھی سارا دن گھریلو کام
اج میں لگی رہتی تھیں۔ یہ دونوں بیویاں
ہ دیکھ کر بہت جھنجلاتی تھیں کہ یہ دونوں
بھائی اور ان کی بیویاں سارا دن آرام کرتے
ہیں اور کسی کام میں ہات بھی نہیں لگاتے
یک دن انھوں نے اپنے شوہروں سے کہہ
ی تو دیا: "ہم کو اپنی جائداد بانٹ لینی
چاہیئے اور الگ ہو جانا چاہیئے پھر دیکھیں
ہ یہ دونوں بھائی اور ان کی بیویاں کیسے
کام نہیں کرتے"

دونوں بھائیوں نے جو یہ سنا تو ان کے سمجھ میں بات آگئی اور اگلے دن ہی انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے سامنے یہ تجویز رکھ دی۔

اب چاروں لڑکے اور ان کی بیویاں ۔۔۔۔ سب مل کر چچا کے گھر گئے۔ ان کا چچا بڑا سمجھ دار تھا۔ اس نے بھتیجوں کو سبق سکھانے کے لئے کہا "کل رات میں نے تمھارے باپ کو خواب میں دیکھا۔۔۔۔ خواب میں انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں تم سب کو پوری لے جاؤں، جگن ناتھ دکھانے کے لئے۔"

اپنے باپ کا حکم سن کر سب بھائی تیار ہو گئے اور وہ اپنی بیویوں سمیت پوری روانہ ہو گئے۔

جب سب لوگ پوری سے واپس آرہے تھے تو ان کے چچا کے ہات سے روپیہ کی تھیلی کہیں گر گئی۔ جس میں ان کا سارا روپیہ تھا۔ اب تو ان کے پاس کھانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ ان کے چچا نے کہا "بھئی تم سب کو کھانے کی کچھ فکر کرنی چاہیئے تم سب الگ الگ راستے پر جاؤ جس کو جو کچھ ملے لے کر آؤ۔"

سب سے چھوٹے لڑکے کی ملاقات ایک کسان سے ہوئی جو اپنی زمین جوت رہا تھا مگر جتائی اچھی نہیں ہو رہی تھی اور کیسے اچھی ہوتی جب بیلوں کی جوڑی نئی نئی ہو۔ وہ بیل جو کبھی ہل میں نہ چلے ہوں، وہ کیسے ٹھیک طرح چل سکتے۔ چنانچہ یہ فوراً مدد کے لئے تیار ہو گیا۔ جس کے بدلے میں کسان نے اُسے چاول دینے کا وعدہ

کیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس نے یہ کام کر دیا۔ اور اس کے بدلے میں کسان نے اُسے کچھ چاول دے دیا۔ جسے لے کر وہ اپنے چچا کے پاس پہنچا۔

تیسرا لڑکا ادھر ادھر گھوم رہا تھا اس کی نظر کچھ کاشتکاروں پر پڑی جو بڑی گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ اس نے اُن سے پوچھا بھئی کیا قصہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک زمیندار کے یہاں کام کرتے ہیں۔ ان کو زمین کے ایک ایسے ٹکڑے پر کاشت کرنی ہے جہاں بدقسمتی سے ایک جگہ پانی اکٹھا ہو گیا ہے۔ ہم لوگ یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے مگر کسی کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

سوداگر کا لڑکا تھا سمجھ دار۔۔۔ اس نے فوراً کہا بھلا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کھاد اور مٹی کو ملا کر اس کے کچھ گولے بناؤ اور ہر گولے میں چاول کے دو دو دانے رکھ کر انھیں اس جگہ پھینک دو۔ یہ گولے پانی میں ڈوب جائیں گے اور کچھ دنوں کے بعد اس سے دھان کی اچھی فصل تیار ہو جائے گی۔ کاشتکار اس مشورے سے بے حد خوش ہوئے اور اس خوشی میں انھوں نے سوداگر کے لڑکے کو دو روپیہ انعام میں دئے۔

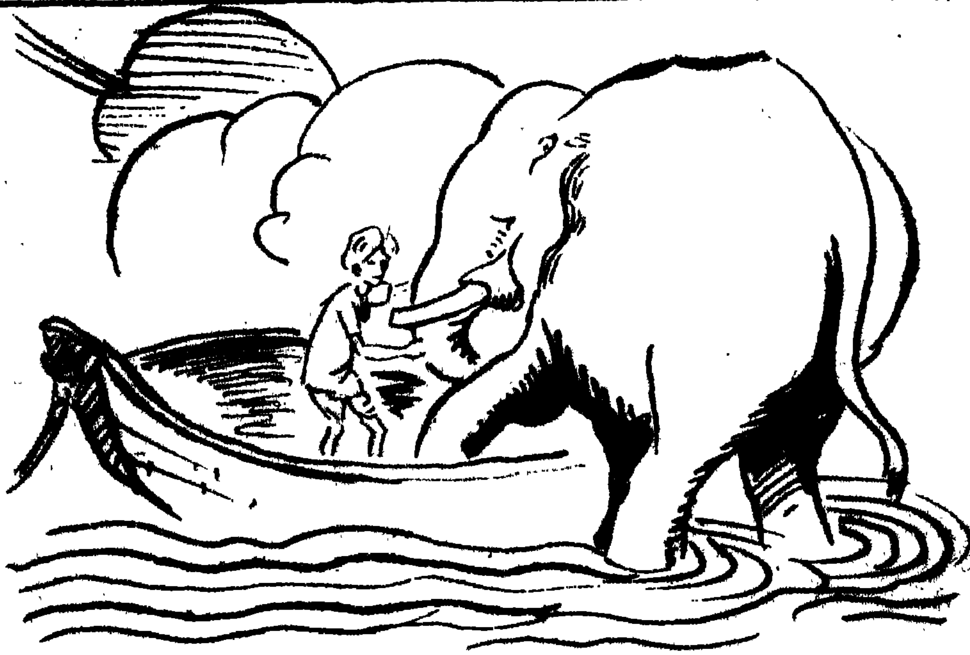
دوسرے بھائی کی ملاقات ایک دولت مند لڑکے سے ہوئی۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا جیسے کسی مصیبت میں پھنسے ہوں سوداگر کے لڑکے نے ان سے پوچھا "بھائی ایسی کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ شاید میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں" اس نے کہا "بھائی میرا باپ بڑا دولت مند تھا جب وہ مرا تو ہمارے چاروں بھائیوں کے حصے میں ایک ایک لاکھ روپیہ آیا۔ ہمارے گھر میں ایک کالی بلی بھی پلی ہوتی تھی۔ ہر ایک اس کو لینا چاہتا تھا۔ اب کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آخر ہمارے ایک پڑوسی نے فیصلہ کرا دیا اور وہ ایسے کہ بلی کی ایک ایک ٹانگ چاروں بھائیوں کی ملکیت ہو گئی۔ اس پر سب راضی ہو گئے۔ ایک دن جو بلی اوپر سے کودی تو اس کی وہی ٹانگ ٹوٹی جو میرے حصے میں آئی تھی۔ میں نے

ایک کپڑا تیل میں تر کر کے اس کی ٹانگ میں لپیٹ دیا۔ اتفاق سے بلّی آگ کے پاس اُچھل کود رہی تھی۔ اس کی پٹّی میں آگ لگ گئی۔ بس اب کیا تھا، بلّی نے سارے گھر میں دوڑنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے گھر میں آگ لگ گئی۔ اب میرے سب بھائیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ گھر تمھاری ہی ٹانگ کی وجہ سے جلا ہے۔ اس لئے تم ہی گھر کو دوبارہ بنواؤ۔"

سوداگر کے دوسرے لڑکے نے یہ سن کر کہا کہ تم پریشان نہ ہو۔ چنانچہ اس نے پاس پڑوس کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا: "آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ بلّی اِدھر اُدھر کیوں دوڑی۔ وہ اسی لئے دوڑی کیونکہ اس کے ایک پاؤں میں آگ لگ گئی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ بلّی کے اس پیر میں جس میں چوٹ تھی، اس کی وجہ سے بلّی سے ٹھیک سے دوڑا بھی نہ جاتا ہوگا۔ مگر بلّی اپنے تندرست پیروں کی بدولت اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھی۔ اس لئے گھر کے جلنے کی ذمہ داری بلّی کے تندرست پیروں پر ہے۔"

جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے وہ یہ دلیل سُن کر حیران ہو کر رہ گئے اور سب لوگ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ ذمہ داری ان ہی پیروں پر ہے جو بالکل ٹھیک تھے، بس پھر کیا تھا سب لوگوں نے ان تین بھائیوں سے کہا کہ اب تم ہی مکان بنواؤ۔ اب تو وہ لڑکا جو کچھ دیر پہلے پریشان تھا بڑا خوش ہوا اس نے سوداگر کے لڑکے کو بڑا انعام و اکرام دیا۔ اور پانچسو روپے نذرانہ کے طور پر پیش کئے۔

اب رہ گیا سب سے بڑا لڑکا۔ وہ ایک ایسے شہر میں آیا جہاں اُس نے سنا کہ بادشاہ کے وزیر کی جان کے لالے پڑے ہوتے تھے۔ وہاں کے بادشاہ نے اسے حکم دیا تھا کہ "ہاتھی کا وزن معلوم کرو ورنہ سر تن سے الگ کر دیا جائے گا۔ سب لوگ پریشان تھے کہ ہاتھی کا وزن کیسے معلوم کریں۔ وزیر نا امید ہو چکا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے عین وقت پر سوداگر کا لڑکا وہاں آ پہنچا۔ اس نے کہا ہاتھی کا وزن معلوم کرنا کیا مشکل ہے"



چنانچہ سب لوگ اُسے وزیر کے پاس لے گئے۔ وزیر یہ سُن کر بہت خوش ہوا اُس نے کہا کہ ایک کشتی دریا کے کنارے لگا دی جائے۔ جب کشتی وہاں لگا دی گئی تو اس نے ہاتھی کو کشتی پر چڑھانے کے لئے کہا جب ہاتھی کشتی پر چڑھا دیا گیا تو کشتی کچھ انچ پانی کے اندر چلی گئی۔ جہاں تک پانی پہنچا، وہاں کا نشان سوداگر کے لڑکے نے لگایا۔ اس نے کہا کہ ہاتھی کو اتار دو اور کشتی میں ریت بھرو جب تک کشتی اس نشان تک پانی میں نہ پہنچ جائے۔ اب اتنا ریت کشتی میں بھر دیا گیا اور پھر اس ریت کو تولا گیا تو ہاتھی کا وزن معلوم ہو گیا۔

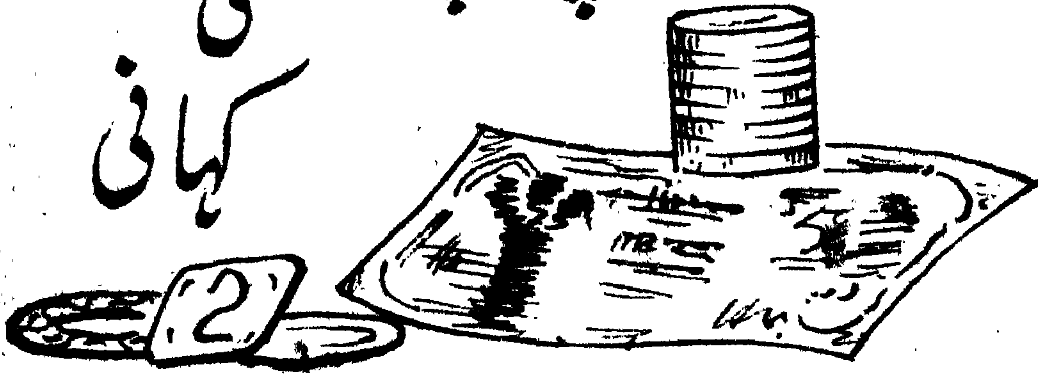
وزیر سوداگر کے لڑکے سے بہت خوش ہوا اور اُسے ایک ہزار روپے کے علاوہ اور بہت انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ یہ انعام لے کر وہ اپنے چچا کے پاس پہنچا۔

اپنے دو بڑے بھائیوں کی اتنی شاندار کامیابی دیکھ کر دونوں چھوٹے بھائیوں اور

(بقیہ مضمون صفحہ

احسن حامد

روپے پیسے کی کہانی



آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ پہلے روپے پیسے کا رواج تو تھا نہیں لوگ چیز کے بدلے چیز لیتے تھے۔ چیز کے بدلے چیز کا طریقہ تھا بڑا سیدھا سادا اور کیوں نہ ہوتا۔

جب رامو موچی کو ضرورت ہوئی کپڑے کی، تو پہنچ گئے شیخ جمن کے یہاں اور بولے" شیخ جی سنا ہے کہ تمہاری لڑکی کا بیاہ ہونے والا ہے"۔ شیخ جی نے جواب دیا" ہاں بھائی سنا تو ٹھیک ہے اصل میں لڑکا اچھا مل گیا ہے۔ کام کاج سے لگا ہوا ہے، میں نے سوچا کر دو اسی وقت منی کا بیاہ"

رامو موچی یہ سن کر دل ہی دل میں خوش ہوگئے کہ چلو کام بن گیا فوراً بولے "ہاں شیخ جی۔ اچھا کیا، ہماری خوشی تو اسی میں ہے کہ اپنی بٹیا منی بھی گھر بار کی ہو جائے ہاں مگر تم کو جوتوں کی ضرورت تو نہیں"

یہ سن کر شیخ جمن بڑے خوش ہوئے فوراً بولے" ارے بھیا! خوب یاد دلایا۔ تم سے تو کئی ایک جوتے بنوانے ہیں۔ تم مجھ سے کپڑا لے لو اور اس کے بدلے میں مجھے

جوتے بنا دو۔ اور بھیا میں کپڑا اچھا دوں گا مگر تم بھی جوتے ذرا دھیان سے بنانا!!

بس پھر کیا تھا دونوں کا کام ہوگیا۔

جب تک لین دین کی ضرورت کم رہی اس نئے طریقے سے کافی آسانی رہی مگر جب ضرورتیں کافی بڑھ گئیں اور ساتھ ہی ساتھ لین دین بھی۔ تو اس میں بڑی مشکلیں پیدا ہو گئیں۔

یوں سمجھئے کہ شیخ جمن کو شادی کے لئے اناج کی ضرورت پڑی تو وہ پلٹو کاشتکار کے پاس گئے اور ان سے بولے "بھائی تم مجھ سے کپڑا لے لو اور مجھے ۱۰ من اناج دیدو۔ مگر یہ بات صاف ہوکہ پلٹو مہاراج تو شیخ جمن سے جب ہی کپڑا لیں گے جب کہ اُن کو ضرورت بھی ہو۔ اور بھئی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پلٹو کے پاس شیخ جمن جائیں مگر اُن کو کپڑے کی ضرورت نہ ہو بلکہ کسی اور چیز کی ضرورت ہو۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا؟ یا تو شیخ جی اناج لینے کا خیال چھوڑ دیں یا پھر جس چیز کی پلٹو کاشتکار کو ضرورت ہے وہ پلٹو کو لاکر دیں اور پھر کہیں جا کر اُن سے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے غلہ لیں۔

اچھا اگر یہی مان لیں کہ پلٹو کو کپڑے کی ضرورت ہے تو پھر یہ مشکل ہے کہ شیخ جمن دس من غلہ کے بدلے پلٹو کو کتنا کپڑا دیں؟ ۲ گز، دس گز، بیس گز، بھئی چونکہ شیخ جی کی تو غرض اٹکی ہے اس لئے پلٹو تو اس سے زیادہ کپڑا اینٹھنے کی فکر کرے گا۔

خیر یہاں تو اناج تھا۔ جو بانٹا جا سکتا ہے اور جس کے بدلے کئی چیزیں لے سکتے ہیں۔ اناج کے بجائے اگر کسی کے پاس ایک گھوڑا ہو اور وہ اس کے بدلے کچھ اناج، تھوڑا سا کپڑا، دو جوڑ جوتے۔ اسی طرح کی کتنی چیزیں لینا چاہتا ہے۔ اس زمانے میں یہ چیزیں کسی ایک شخص کے پاس تو مل نہیں سکتی تھیں اور نہ ہی گھوڑا والا اپنے گھوڑے کے ٹکڑے کرکے سب چیزیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ ٹکڑے لینے کو کوئی تیار نہیں ہوگا۔ جب کبھی ایسا اتفاق آپڑتا تھا تو تبادلہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ

نا ممکن ہو جاتا تھا۔

"چیز کے بدلے چیز" میں جو دقتیں تھیں اُن کو دور کرنے کے لئے مختلف ملکوں میں مختلف طریقے رائج ہوئے۔ "چیز کے بدلے چیز" کی جگہ یہ اچھا سمجھا کہ صرف ایک خاص چیز مقرر کری جائے جس کے بدلے سب چیزیں مل جایا کریں۔ مثلاً کہیں اناج، کہیں بکریاں اور بھیڑیں اور کہیں جانوروں کی کھالوں کو لوگوں نے چن لیا۔ اور پھر ان کے بدلے سب چیز ملنے لگیں۔ اس نئے طریقے سے پہلے کی نسبت کافی آسانی ہو گئی مگر پھر بھی چند ایک خرابیاں باقی رہیں مثلاً لوگ اِن کو بہت زیادہ دنوں کے لئے جمع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جانوروں کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اگر مر گئے تو ساری پونجی ختم۔ اور اناج زیادہ عرصے تک رکھے رہنے سے خراب بھی تو ہو جاتا تھا۔

بہت سوچ بچار اور تجربے کے بعد لوگوں نے سونے، چاندی کے زیادہ اور لوہے تانبے کے کم قیمت والے سکے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ دھاتوں کے استعمال سے لین دین میں بڑی آسانی ہو گئی کیونکہ ایک طرف تو اِن کے ذرا سے وزن میں کافی مول ہوتا تھا دوسرے گلنے، سڑنے اور خراب ہونے کا کوئی اندیشہ بھی باقی نہ رہا۔ شروع شروع میں اِن سکوں کا نہ کوئی مقرر وزن تھا اور نہ ہی کوئی خاص شکل۔ بس دھاتوں کے بھدے بھدے ٹکڑے ہوتے تھے جن کو کسی قسم کا لین دین کرتے وقت لوگوں کو بجائے گننے کے تولنا پڑتا تھا۔ اور کھرے کھوٹے کی پہچان کے لئے دھات کے ہر ٹکڑے کو کسوٹی پر گھسنا پڑتا تھا۔ جہاں انسان نے اپنی کوشش اور محنت سے اور خرابیوں کے حل نکال لئے وہاں ان دونوں برائیوں کو بھی دور کرنے کا ڈھنگ نکال لیا اور وہ اس طرح کہ پہلے تو ہر شخص کو سکے بنانے کا حق تھا مگر بعد میں لوگوں نے بے ایمانی شروع کر دی تو سکے ڈھالنے کا کام سرکار نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ سرکاری آدمی دھات کو اچھی طرح دیکھ بھال

اور پرکھ کر ان پر سرکاری مہر لگا دیتے تھے اور پھر کسی طرح کے شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

شروع شروع میں یہ سکّے گول ہونے کے بجائے چوکور، لمبوترے تکونے غرض کہ عجیب و غریب شکلوں کے ہوتے تھے۔ اپنے ہندوستان ہی میں اورنگ زیب کے عہد تک چاندی کا چوکور روپیہ چلا کرتا تھا ان چوکور سکوں میں یہ خرابی ہوتی تھی کہ ایک تو یہ جلدی گھس جاتے تھے دوسرے دھوکے باز قسم کے لوگ اِن کے کناروں کو کھرچ کر سونا، چاندی چرا لیتے تھے۔ اِن خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ایک تو حکومت نے گول سکّے بنانا شروع کر دیئے دوسرے اِن کے کناروں پر کھڑی لکیریں بنا دی جاتی تھیں تاکہ اگر کوئی شخص کنارے کھرچنے کی کوشش کرے تو پتہ چل جائے۔

بس یہی سکّوں کی اصلی شکل ہے جو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ آج تک چلی آرہی ہے۔

دھاتوں کے سکّوں کے علاوہ آج ساری دنیا میں کاغذ کے نوٹ بھی چلتے ہیں۔ اِن کا رواج اس وقت ہوا جب آمد و رفت اور دوسری آسانیوں کی وجہ سے تجارت بہت بڑھ گئی اور ہزاروں کا لین دین ہونے لگا تو پھر لوگوں کے لئے دھات کے اِن بھاری سکّوں کو لادے لادے گھومنا وبالِ جان بن گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو بیس ہزار روپے کا کاروبار کرنا ہوتا تھا تو اس کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ چھ من سے بھی زیادہ بوجھ اپنے ساتھ لئے گھومے اور وہ بھی اگر ایک ایک پیسے والے سکے ہوں۔

نوٹوں کے چھپنے کی وجہ سے ایک تو بھاری وزن کی علت سے بچ گئے دوسرے کھرے کھوٹے کا چکر غائب۔

یہ نوٹ ہوتے کیا ہیں؟ بس کاغذ کا ایک پرزہ۔ جس پر سرکار کا وعدہ چھپا ہوتا ہے کہ جو آدمی چاہے اور جب چاہے ان کے بدلے سرکاری خزانے یا بینک سے روپیہ یا چاندی لے سکتا ہے بینک سے جتنے نوٹ جاری ہوتے ہیں ان کے بدلے

سید منیر الحسن

پریوں کا دیس



برسوں پہلے کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک شہزادہ رہتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بڑے لاڈ پیار سے اس کی پرورش ہوئی۔ جب وہ بڑا ہوا تو کبھی کبھی جنگل کی سیر کرنے نکل جاتا۔ خوب گھومتا پھرتا اور شام ہوتے لوٹ آتا۔ وہ شکار کا بہت شوقین تھا ایک دن وہ شکاری کے بھیس میں کاندھے پر بندوق لٹکائے کمر سے پیٹی باندھے گھوڑے پر سوار نہایت آن بان شان سے جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک خوبصورت ہرن دکھائی دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ ہرن کو جونہی کسی کے آنے کی آہٹ ملی وہ بڑی تیزی سے چوکڑیاں بھرنے لگا اور آناً فاناً کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ مگر اتفاق کیا ہوا کہ ایک جھاڑی میں اس کے سینگ اٹک گئے۔ وہ بہت پریشان ہوا اور گھبرایا۔ اس جھاڑی سے چھٹکارا پانے کی اپنی سی بڑی کوشش کی مگر سینگ جھاڑی میں کچھ ایسے الجھے تھے کہ سلجھنا مشکل ہو گیا۔ لاچار ہو کر وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ آج پکڑے گئے۔

اتنے میں شہزادہ بھی وہاں آ پہنچا۔ اور بڑے پیار سے وہ ہرن کے جسم پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ۔ ۔ "کہ اسے ہرن ڈرو مت! میری بندوق تم جیسے خوبصورت ہرن کو اپنی گولی کا نشانہ بنا کر تمھیں تکلیف نہیں پہنچائے گی۔ اور ہاں میں تو تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا وہاں تمھیں اچھی طرح رکھوں گا اور خوب ہری ہری گھاس کھلاؤں گا۔ پھر وہاں تم آرام سے رہنا۔"

شہزادے کی یہ باتیں سن کر ہرن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔ شہزادہ بھی ہرن کی پیٹھ سہلانے لگا۔ اتنے میں ہرن کے گلے میں اُسے ایک سرخ تاگا نظر آیا۔ شہزادہ نے اُسے دیکھتے ہی فوراً توڑ ڈالا تاگے کے توڑتے ہی اس ہرن کی کایا پلٹ ہوگئی اور وہ جھٹ پٹ ایک پری بن گیا۔ یہ دیکھ کر شہزادہ کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے فوراً سوال کیا کہ تم کون ہو؟

پری نے جواب دیا "میں ایک پری ہوں اور مجھے پریوں کی رانی نے ناراض ہو کر ہرن بنا دیا تھا اور میرے گلے میں یہ سرخ ریشمی تاگہ باندھ کر کہہ دیا تھا کہ جب تک کوئی شہزادہ اپنے ہاتھوں سے اس تاگے کو نہیں توڑے گا اُس وقت تک تو ہرن ہی بنا رہے گی۔"

ابھی یہ کہانی سنانے کے بعد پری نے شہزادہ کا احسان مانتے ہوئے کہا کہ ۔۔۔ میں جب تک میں زندہ رہوں گی تمہاری شکر گذار رہوں گی اور اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گی کہ تم نے مجھے جادو سے پھر انسان بنا دیا۔"

اس کے بعد پری نے شہزادہ سے کہا کہ ..."میں آپ کو اپنے دیس کی سیر کرانا چاہتی ہوں۔ ہمارا دیس "پریوں کا دیس" کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دیس میں اور آپ کے ملک میں زمین آسمان کا فرق ہے میری خواہش ہے کہ آپ ضرور اس کی سیر کریں۔"

پری کے بہت زیادہ کہنے سننے پر شہزادہ تیار ہوگیا سیر سپاٹے اور میلوں ٹھیلوں کا تو وہ شوقین تھا ہی اس نے سوچا چلو پرستان یا پریوں کے دیس کی سیر بھی ہی جب موقع ہاتھ آیا ہے تو اسے کیوں چھوڑا جائے۔ یہ سب باتیں سوچ سمجھ کر شہزادہ پری کے ساتھ اس کا دیس دیکھنے چل دیا۔



تھوڑی ہی دیر میں وہ پری شہزادہ کو ساتھ لے کر اپنے دیس جا پہنچی۔ وہاں جا کر اُس نے کیا دیکھا کہ بسنت کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا ہے۔ ایک انوکھی بہار آ رہی ہے۔ پرستان خوب پھولوں سے مہک رہا ہے۔ جدھر نظر اٹھا کر دیکھو پھول ہی پھول نظر آ رہے ہیں۔ پریاں بھی ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر لباس پہنے نظر آ رہی تھیں۔ ہر طرف چہل پہل ہے۔ پرندے خوشی کے مارے چہک رہے ہیں، ایک سہانا

بندھا ہوا ہے۔ پری کی سہیلیوں کی نظر جب اُس پر پڑی تو وہ بچھڑی ہوئی سہیلی کے اس طرح اچانک آجانے پر خوشی سے پھولی نہ سمائیں اور لپک کر اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پری نے اپنی سب سہیلیوں سے شہزادہ کی جان پہچان کرائی اور تمام قصہ سنایا۔ پری کی سہیلیوں نے شہزادہ کی اس طرح بھلائی کرنے پر بڑی تعریف کی اور اُس کے اِس کارنامے پر اتنی خوش ہوئیں کہ مارے خوشی کے شہزادہ پر پھولوں کی بارش کی اور اپنے میٹھے میٹھے گانوں سے اُس کا دل بہلایا۔

اس کے بعد سب پریاں مل کر شہزادہ کو پرستان کی سیر کرانے لے گئیں۔ پرستان میں داخل ہوتے ہی شہزادہ نے ایک ایسا انوکھا باغ دیکھا جس میں سونے کے پھل لگے ہوئے تھے، خوبصورت خوبصورت سونے کے پروں والے مور ناچ رہے تھے۔ اور چڑیاں بسنت کی خوشی میں مگن ہو کر خوب چہچہا رہی تھیں اور بسنت کی آمد آمد کے گیت گا رہی تھیں۔

اس سے آگے جو بڑھے تو ایک جنگل نظر آیا جس میں شیروں کے دہاڑنے اور ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس سے شہزادہ کو کچھ ڈر سا معلوم ہونے لگا مگر پریوں کے ہمت بندھانے پر وہ آگے بڑھا کیے [illegible] یہ لوگ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں جنگلی



جانور اپنے اپنے رنگ میں مست تھے۔ شہزادہ کو یہ بات دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ جہاں ایک طرف ہاتھیوں کے غول کے غول بدمست ہو کر گھوم رہے ہیں وہیں دوسری طرف شیر اور شیرنی اپنے بچوں کے ساتھ گھوم پھر رہے ہیں اور اسی جگہ نیل گائے، ہرن اور خرگوش کے جھنڈ کے جھنڈ آپس میں مل مل کر اچھل کود کر رہے ہیں۔

شہزادہ چپ چاپ خاموش دل ہی دل میں اپنے ملک اور پریوں کے دیس کا مقابلہ کرنے لگا اُس نے سوچا۔۔۔" میں ایک ایسے ملک کا رہنے والا ہوں جہاں سب لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں ایک آدمی

دوسرے آدمی کے خون کا پیاسا ہے۔ امیر غریب کو لوٹ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں زندگی کی سچی خوشی کہاں مل سکتی ہے؟ یہ سوچ کر اُس نے طے کیا کہ میں کیوں نہ پریوں کے دیس میں رہنے لگوں اور یہاں اپنی زندگی خوب ہنسی خوشی گذاروں۔"

مگر تھوڑی ہی دیر بعد اُسے خیال آیا کہ یہ میرا دیس نہیں ہے۔ پریوں کے دیس پر میرا کیا حق؟ میں تو انسان ہوں بڑا ہو کر اپنی رعایا کی خدمت کروں گا اور میں بھی اپنے دیس کو پریوں کے دیس کی طرح بناؤں گا۔ جہاں سب کے حقوق برابر ہوں گے اور کسی کا کسی پر بے جا دباؤ نہ ہوگا سب مل جل کر رہیں گے اور ہنسی خوشی سے دن گزاریں گے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے دل کی بات پری سے کہہ دی۔ پری نے اس کی بڑی تعریف کی اور بہت سے ہیرے اور موتیوں سے بھرے ہوئے تھال شہزادے کو تحفے کے طور پر دے کر رخصت کیا۔

(بقیہ مضمون مسوری کی سیر صفحہ ۱۴)

دیکھنے گئے۔ یہ مسوری کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ یہ ہوٹل کافی اونچائی پر ہے یہاں سے تبت کے پہاڑ صاف نظر آتے ہیں۔ اور ان پر برف نظر آتی ہے

میں ۶ بجے امپیریل ہوٹل میں پہنچا امپیریل ہوٹل گاندھی چوک میں ہے اور گاندھی چوک میں ہر ہفتہ شام کو ۶½ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک مسوری میونسپلٹی کی طرف سے بینڈ بجتا ہے۔ شام کو ہم نے بینڈ سنا۔ اور پھر کھانا کھانے کے بعد سو گئے۔ کیونکہ دوسرے دن صبح ساڑھے چھ بجے دہلی واپس آنا تھا۔ صبح اٹھ کر جلدی جلدی ناشتہ کیا اور سارا سامان ٹھیک کیا پھر مسوری کو خیر باد کہتے ہوئے واپس موٹر سے دہلی آگئے۔ اور پھر وہی گرمی، وہی لو، وہی دھوپ اور پسینہ ہے کہ بہے چلا جا رہا ہے۔

بچوں کی کوششیں

دانا وزیر

ایک دن ایک راجہ نے اپنے وزیروں سے کہا" میں بڑا راجہ ہوں۔ سب کو میری مدد کی ضرورت ہے" راجہ کے ایک وزیر نے کہا" سب لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں" راجہ نے گرج کر کہا" یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ ممکن ہے تو آج ہی اس بات کا عملی ثبوت دو"

اس وقت ایک کمزور فقیر دروازے پر آیا۔ وزیر نے اپنی لکڑی اٹھائی اور اس فقیر کو کچھ دینے کے لئے آگے بڑھا۔ معاً وزیر کے ہاتھ سے لکڑی چھوٹ کر گر پڑی وزیر نے کہا" ارے میں گرا" راجہ نے جلدی سے لکڑی اٹھاکر وزیر کے ہاتھ میں دے دی۔ وزیر ہنسا اور راجہ سے کہنے لگا" اب تو آپ کو عملی ثبوت بھی مل گیا۔ میں اس فقیر کی مدد کر رہا تھا آپ نے میری مدد کی۔

(محمد اسمٰعیل ابراہیم جی)
(شیوگنج)

ایک کہانی

ایک دھوبی کے پاس ایک گدھا تھا۔ وہ اسکو روزانہ ایک باغ میں چرنے کے لئے چھوڑ آتا تھا۔ اور باغ کے مالی وغیرہ اس کو روزانہ مار پیٹ کر باغ سے نکال دیتے تھے۔ ایک دن اس دھوبی نے ایک ترکیب سوچی اور اس نے گدھے کو شیر کی کھال پہنا دی اور رات کے وقت باغ میں چھوڑ آیا۔ جب باغ کے مالی نے اسے دیکھا تو خوف کی وجہ سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اسی درمیان میں ایک گدھا اور وہاں آپہنچا۔ اس گدھے کو دیکھ کر اس نے چلّانا شروع کیا۔ تو مالی سمجھ گیا کہ یہ گدھا ہے اور شیر کی کھال پہنے ہے۔ پھر تو وہ درخت سے اترا۔ اور گدھے کو خوب پیٹا۔ اور اسے پیٹ کر باہر نکال دیا۔

(محمد احمد عبداللہ۔ الہ آباد)

تبت کے حالات

ہمارے ملک میں کئی مذہبوں کے لوگ بستے ہیں۔ مسلمان، ہندو، چینی اور انگریز بھی بستے ہیں۔ یہاں کا بادشاہ بدھ مذہب کا پیرو ہے اس لئے کہ بدھ زیادہ ہیں۔ لیکن اسلام کا بھی بہت چرچا ہے۔ مسلمان نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور جو شریعت کا حکم ہو اسے پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ ہماری زبان بالکل الگ ہے۔ ہندو مسلمان سب ایک ہی زبان بولتے ہیں وہاں کی لکھائی بھی الگ ہے لیکن مسلمان زیادہ تر اردو میں لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں پہاڑ بہت ہوتے ہیں۔ اور دریا بھی بہت ہیں ہر جگہ پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ وہاں کا موسم ہندوستان سے زیادہ سرد ہوتا ہے۔ لیکن بارہ مہینے سردی نہیں رہتی گرمیوں میں موسم بہت اچھا ہوتا ہے۔ جاڑوں میں جاڑا بہت پڑتا ہے۔ وہاں کا لباس ہندوستان سے بالکل الگ ہے۔ سردیوں میں اونی کپڑے پہنتے ہیں اور گرمیوں میں ہلکے۔ نیچے ایک پاجامہ اور قمیص پہنتے ہیں۔ مرد سردیوں میں اپنا لباس پہنتے ہیں۔ اور گرمیوں میں زیادہ تر کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔

ہمارے یہاں مکان کچے بناتے ہیں۔ پتھر اور اینٹ سے بناتے ہیں۔ کئی کئی منزل کے مکان ہوتے ہیں۔ جو آدمی جتنا امیر ہو اس کا مکان اتنا ہی اونچا ہوتا ہے۔ اپنا ذاتی مکان ہو تو اوپر کی منزل میں تو خود رہتے ہیں اور نیچے کا مکان کرایہ پر دیتے ہیں۔ وہاں پر چائے بہت کثرت سے پی جاتی ہے۔ چاول زیادہ کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد چائے پینا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ہمارے یہاں نمکین چائے بھی پی جاتی ہے۔

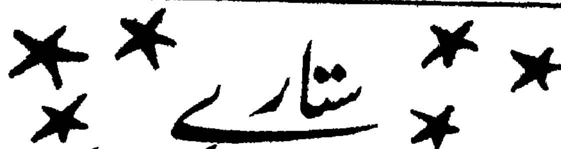
زیب النساء (تبتی)

خان بہادر کلو میاں

ہمارے کالج کے ملازمین میں میاں کلو ایک عجیب و غریب آدمی ہیں۔ ان کا کام بچوں کو پانی پلانا ہے۔ اس فرض کے ادا کرنے سے طوفان، آندھی، دھوپ، سردی غرض کوئی چیز بھی ان کو نہیں روک سکتی۔ جاڑا ہو یا گرمی کلو میاں کے سر پر ایک ٹوپی اور اس کے اوپر ایک ہیٹ جو [illegible] کے بھاگے ہوئے انگریز کا ہوگا، ان کے سر پر اس شان کے ساتھ منڈھا رہتا ہے کہ اس کے پیچھے کا حصہ آگے اور آگے کا حصہ پیچھے۔

کلو میاں ہیٹ ضرورت کی وجہ سے استعمال کرتے ہیں نہ کہ فیشن کے لئے۔ اس لئے ان کا قول یہ ہے کہ ہیٹ کا بڑا چھجا سامنے رہنا چاہئے تاکہ دھوپ اور بارش سے بچا رہے۔

کلو میاں کسی کی بات سنتے نہیں اپنی کہتے ہیں۔ جس وقت ان کا جی چاہا بے دھڑک پرنسپل کے کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کوئی سنتری ان کو روک نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ اپنی ضرورت اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ سنتری کچھ بھی کہے



ستارے

یہ آسماں کے تارے — لگتے ہیں کتنے پیارے
جیسے یہ ننھے جگنو — ہوں خوب جگمگاتے
گر ہوتا میں ستارا — تو دیکھتا نظارے
میں آسمان پہ آتا — اور خوب جگمگاتا
گر صبح لوٹ جاتا — کرتے ہیں جیسے سارے
بیٹھا میں آسماں پہ — گاتا یہ گیت پیارے
"ہم آسماں کے بچے — ہیں آسماں کو پیارے"
اختر بس اب تو سو جا — بجھنے لگے ستارے

جمیل اختر گوجرانوالہ

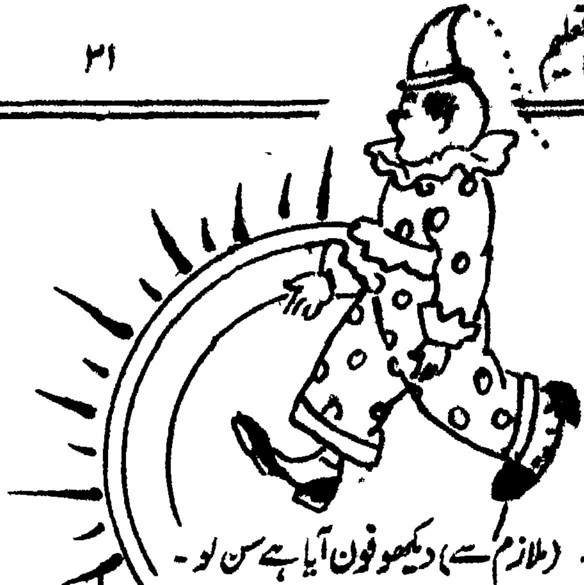
وہ ان کے کانوں تک پہنچتا ہی نہیں۔ دفتر کے اندر پہنچ کر چاہے وہاں وزیر تعلیم ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں وہ بلا تکلف اور بغیر اپنا ہیٹ اتارے ہوئے اپنی عرض داشت پیش کر دیتے ہیں اور بلا جواب کا انتظار کئے ہوئے باہر نکل آتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں ان کی خصوصی خدمات کے عوض میں طلبا کی طرف سے ان کو خان بہادری کا خطاب عطا کیا گیا جس کو انھوں نے بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ان کو یہ احساس ہوا کہ خطاب بہشتی خدمت کا عوض نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انھوں نے ایک دن اپنے خطاب کو بالاعلان واپس کر دیا۔ اور ہر ایسے طالب علم کو پانی پلانے سے انکار کر دیا جو ان کو خان بہادر کے خطاب سے یاد کرتا ہوا پایا گیا۔

غرض کہ کلو میاں عجیب و غریب انسان ہیں۔ ان کو دیکھ کر آپ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مگر ان سے باتیں کرنے کے لئے ایک مائکروفون کی شدید ضرورت پڑتی ہے جو کہ وقت ضرورت ملنا دشوار ہے۔ بچوں کو پانی پلانے کے لئے ایک درجن گلاس جس کے وہ امین ہیں ہمیشہ ان کی کوٹھڑی میں بحفاظت بند رہتے ہیں۔ پانی ہم لوگ خود ہی کھینچ لیتے ہیں مگر کیا مجال کہ حرف شکایت پرنسپل صاحب تک پہنچا سکیں مگر جہاں رسی یا بالٹی کنوئیں میں گری۔ کلو میاں سیدھے پرنسپل کے کمرے میں نظر آتے ہیں۔ خیریت ہے کہ ہم بچوں میں سے کسی کا نام بھی کلو میاں کو یاد نہیں ورنہ ہم لوگ ہر وقت مصیبت میں گرفتار رہیں۔ پھر بھی ہم لوگ کلو میاں کے مداحوں میں ہونا اپنا فخر سمجھتے ہیں اور اُن سے بے حد محبت کرتے ہیں نہ جانے کیا بات ہے۔

اسد کمال الدین

عمر ۱۰ سال



لطیفے

آقا - (ملازم سے) دیکھو فون آیا ہے سن لو -
(ملازم فون کان سے لگا کر زور زور سے ہلتا ہے ہا)
آقا - سنتے کیوں نہیں - بل کیا رہے ہو ؟
ملازم - حضور وہ تو خود ہی کہہ رہا ہے کہ ہلو ہلو -

آقا - (نئے نوکر سے) تمھارا نام کیا ہے ؟
نوکر - نام تو تھا چراغ علی - مگر نئے فیشن کی وجہ سے لیمپ خاں رکھ لیا ہے -

---

بچہ - (ماں سے) امی، ابا جان کا سر گنجا کیوں ہے ؟
امی - بیٹا عقلمند آدمیوں کے سر گنجے ہوتے ہیں -
بچہ - جب ہی تو اپنا ستا بھیا بہت عقلمند ہو گا -
انعام علیخاں فرخ آباد

صالحہ - (کتاب پڑھتے ہوئے) - راشدہ - خارِ مغیلاں کسے کہتے ہیں -
راشدہ - مذاق اڑاتے ہوئے - واہ نویں کلاس میں آگئیں اور اتنا بھی نہیں جانتیں کہ مغلوں کے زمانے کے کانٹوں کو خارِ مغیلاں کہتے ہیں -

---

گاؤں کی نوکرانی بچوں کو کھانا دے کر اسکول سے آئی - اور بیگم صاحبہ سے بولی -
نوکرانی - بیگم صاحبہ مجھے بھی اسکول میں داخل کرا دیجئے -
بیگم صاحبہ - اری احمق - اسکول میں چھوٹے چھوٹے بچے پڑھتے ہیں - تیرے سفید بالوں کو کون پوچھے گا -
نوکرانی - (اپنی عقلمندی جتاتے ہوئے) واہ بیگم صاحبہ میں نے تو ایک میم کو دیکھا جس کے بال سفید تھے اور کمر جھکی ہوئی تھی - کیا مزے میں پڑھ رہی تھی -

باپ - بیٹے سے - ابوالہول کسے کہتے ہیں؟
بیٹا - ابّا! اگر آپ دل لگا کر "پیام تعلیم" پڑھتے تو مجھ سے یہ سوال نہ کرتے۔

ادریس احمد خاں، فرخ آباد

ماسٹر صاحب - ڈانٹتے ہوئے - احمد۔ تم نے ریحانہ کو کیوں مارا -
احمد - جناب اسی نے تو کہا تھا۔ کہ مجھے مارو۔ میں نے صرف اس سے مذاق کیا تھا -
ماسٹر صاحب - کیا کہا تھا -
احمد - اس نے کہا ۔ ذرا مار کے دیکھو تو تمھیں اس بڈھے گنجے اور داڑھی والے ماسٹر کے پاس لے جاؤں گی -

(مستحسن حامد - جامعہ نگر، دہلی)

بچہ - اماں! شام کے وقت سورج ڈوبتے دیکھ کر میرے منہ میں پانی پانی آگیا۔
ماں - (حیرت سے) کیوں اس میں ایسی کیا بات ہے۔
بچہ - اماں! یہ تو بالکل انڈے کی ٹکیہ معلوم ہوتا ہے۔

ایک میاں بڑے کنجوس تھے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ انھوں زیادہ کھا گئے اور بیمار پڑے۔ ان کے بیٹے نے کہا کہ ابّا جان ڈاکٹر صاحب کو دکھائیے۔ پہلی دفعہ دیکھنے کے دس روپیہ لیتے ہیں۔ پھر پانچ روپیہ۔
بڑے میاں کو چالاکی سوجھی۔ .... ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور پانچ روپے جیب سے نکال کر بولے لیجئے ڈاکٹر صاحب میں دوبارہ آگیا ہوں۔ اب کوئی دوا دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے روپے تو رکھے جیب میں اور بولے پہلی ہی دوا جاری رکھیئے۔
بڑے میاں نے کنجوسی میں مفت میں پانچ روپے کھوئے۔

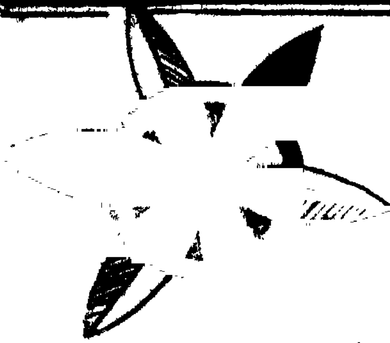
شکیل احمد - ہمایوں باغ، کانپور

ایک بہرا ملازم پیاز لینے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک بچے نے کہا۔ بڑے میاں - بڑے میاں السلام علیکم۔
بڑے میاں چلا کر بولے۔ پیاز لینے جا رہا ہوں۔ بکرے صاحب کا گوشت پکاؤں گا۔

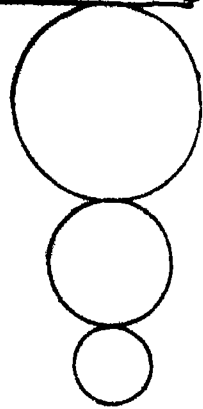
ماں - (بچے سے) بیٹا جوتے پیر فرش پر نہیں رکھتے۔
بچہ - بہت اچھا امی اب جوتے پہن کر رکھوں گا۔

اسداللہ - دہلی

محمد امین ایم، اے (علیگ)



مصنوعی بارش



سائنس ہمیں بڑے بڑے گر بتا رہی ہے۔ دن بدن قدرت کے نئے نئے بھید ہم پر کھلتے جا رہے ہیں۔ ایک دن وہ تھا جب کہ ہمارے باپ دادا موسموں کے غلام تھے آب و ہوا، موسم، بارش، آندھی اور طوفان، پہاڑ، جنگلات، گھاس کے میدان اور جنگلی جانوروں کے خلاف لڑتے رہتے تھے۔ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے دن رات کوشش کرتے تھے۔ لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ قدرت ہماری محکوم ہے اور ہم اس کے حاکم۔ قدرت کی ہر چیز کو اپنی ضرورت اور آسانی کے مطابق ڈھالتے جا رہے ہیں۔ اسی لئے بہت سے سائنس داں بلا کسی تامل کے اب اس نظریے کے قائل ہو گئے ہیں کہ موجودہ دور میں ہم فطری ماحول سے آزاد اور خود مختار ہو چکے ہیں اور جو چاہیں دنیا میں کر سکتے ہیں۔

لاکھوں برس سے اب تک ہماری زندگی کی خوش حالی کا دار و مدار قدرتی بارش پر رہا ہے۔ خود ہمارے دیش ہندوستان میں اب بھی زراعت کی کامیابی اور ناکامی بارش کے ٹھیک وقت اور صحیح مقدار میں ہونے پر منحصر ہے۔ جس سال بارش ٹھیک وقت پر اور صحیح مقدار میں ہوتی ہے فصلوں کی پیداوار اچھی ہو جاتی ہے۔ کسان خوشحال

ہو جاتے ہیں۔ اور گورنمنٹ کی آمدنی حسب منشا ہوتی ہے لیکن جس سال بارش وقت پر نہیں ہوتی یا زیادہ اور کم مقدار میں ہوتی ہے اس سال ہمارا ملک سیلاب یا قحط کا شکار ہو جاتا ہے جیسے پچھلے سال بہار سیلاب کی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا یا اس سال مدراس، سوراشٹرا، اور پنجاب میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ گورنمنٹ پر خرچ کا اور بار پڑ رہا ہے اور اس کی آمدنی ان علاقوں میں گھٹ گئی ہے۔ اسی لئے مالی معاملات میں دلچسپی لینے والے کہتے ہیں کہ ہماری حکومت کا بجٹ "بارش کا جوا ہے"۔ لیکن سائنس کے اس دور میں یہ بات مناسب نہیں ہے۔ ہم کوشش کریں تو بارش کی کمی بیشی اور اس کے اثرات دور کر سکتے ہیں۔

امریکہ، روس اور دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں زراعت، موسم اور آب و ہوا کا انحصار قدرتی بارش پر نہیں ہے۔ سائنس دانوں نے تحقیق اور تجربے سے ایک مصنوعی بارش کا بھی طریقہ معلوم کر لیا ہے۔ امریکہ میں یہ طریقہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا ہے کہ مصنوعی بارش نے نہ صرف فصلوں کی دنیا میں انقلاب کیا بلکہ موسم، آب و ہوا اور ماحول کی بھی کایا پلٹ کر دی ہے۔ ہمارے دیش کے سائنس داں بھی اس سلسلے میں تجربے کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ فضا کے ماہرین کا خیال ہے کہ دہلی کے آس پاس بادلوں کی تہ اتنی پتلی ہوتی ہے اور رطوبت کی اتنی کمی رہتی ہے کہ مصنوعی بارش کا تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا۔ جولائی اور اگست میں جب کہ ہوائیں نمی سے بھرپور سمندر کی طرف سے آتی ہیں۔ طوفانوں کے آتے ہی بادلوں کی بہت موٹی چادر فضا میں پھیل جاتی ہے اور تجربہ کامیاب ثابت ہو سکتا ہے لیکن برسات کے موسم میں قدرتی بارش کا پانی اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ مصنوعی بارش کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ مئی جون میں پانی کی قلت رہتی ہے، لو کے گرم گرم جھونکے انسانوں جانوروں اور پودوں سبھی کو

جھلسا دیتے ہیں۔ ان مہینوں میں اگر ہمارے سائنس داں مصنوعی بارش کر سکیں تو شمالی ہند کے موسم پر خوش گوار اثر پڑے گا۔ ابھی چند دن ہوئے فضا کی سائنس کے ماہرین نے اعلان کیا ہے کہ وہ لوگ جون کے مہینے میں کلکتہ کے قریب مصنوعی بارش کا تجربہ کریں گے۔

باوجود اس کے کہ فضا کے ماہرین کے لئے ابھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہمیں موسم کی پیشین گوئی کا حال ٹھیک ٹھیک بتا سکیں لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ ہم موسم پر قابو حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے اثرات کو بدل سکتے ہیں۔ اسی لئے اب موسم پر کنٹرول کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ امریکہ میں ایک سینٹ کمیٹی ایسے تین مختلف بلوں پر غور کر رہی ہے جس سے کہ موسم پر قابو پا جانے کے بعد اس پر کنٹرول قائم کیا جا سکے۔

حال میں نوبل پرائز جیتنے والے ڈاکٹر اروِنگ لینگ موئر (Dr. Irving Langmuir) نے بہت سے تجربے کئے ہیں ان کی شہرت اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ وہ اب بارش برسانے والے کے نام سے خطاب کئے جاتے ہیں۔ آسمان سے کم نہیں بلکہ ۳،۳۲۰،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰ گیلن بارش وہ برسا چکے ہیں۔ اس جادو سے انھوں نے سارے امریکہ کا موسم یک بیک بدل دیا تھا۔

ڈاکٹر لینگ موئر اور ان کے ایک نوجوان ساتھی ونسنٹ شے فر (Vincent Schaefer) پچھلی جنگ عظیم کے زمانے میں موسم کے متعلق معلوم کرنے کے لئے تحقیقات کر رہے تھے سب سے پہلے انھوں نے تجربہ کیا کہ ہوائی جہاز میں برف بھر کر کیوں کر اوپر بھیجی جا سکتی ہے۔ جب وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اس کے بعد برف کے بے شمار چھوٹے بڑے ٹکڑے جہاز میں بھر کر اوپر لیجائے گئے اور وہاں سے بادلوں کے اوپر پھینک دئے گئے۔ پھر کیا تھا مٹول میں بارش شروع ہوگئی۔ تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔ مزید تجربہ کے بعد ڈاکٹر موئر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہوا میں ہر وقت اتنی نمی رہتی ہے اور جب چاہیں ہم بارش

برسا سکتے ہیں۔ بعض بچے پوچھیں گے کہ فضا میں جب نمی ہر وقت رہتی ہے تو بارش اپنے آپ کیوں نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فضا موافق اور ٹھنڈی ہر وقت نہیں رہتی چھوٹے بڑے ذرات کی حرکت درجۂ حرارت میں فرق پیدا کرتی رہتی ہے۔ یہ ذرات مل کر بھاپ کے ذرات میں شامل اور تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ٹھنڈی فضا پاکر بادلوں کی گرمی ختم ہونے لگتی ہے اور اس کے اندر کا پانی بارش کی شکل میں تیزی سے زمین پر گرنے لگتا ہے۔

دونوں سائنس والوں نے بادلوں کے اوپر کاربن ڈائی آکسائڈ کے ذرات بھی لیجاکر چھڑکے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ چند منٹوں کے اندر اندر اپنے آپ بہت سارے برف کے ذرات بادلوں کے اندر بن گئے۔ اسی دوران میں ایک اور سائنسداں برنارڈ وانی گٹ (BERNARD VONNEGUT) بارش کے مصنوعی ذرات پیدا کرنے کے لئے اور طریقوں سے چھان بین کر رہے تھے۔ وہ بھی اپنے تجربے میں کامیاب ثابت ہوئے انھوں نے سلور آیوڈائٹ (SILVER IODIDE) کے ذرات لئے اور اس کی بہت تھوڑی مقدار لیجا کر بادلوں کے اوپر چھڑک دی بادلوں کی شکل فوراً بدل گئی اور اچھی خاصی بارش ہوگئی۔ اندازہ ہے کہ ایک گرام سلور آیوڈائٹ ایک ہزار ملین بارش کے قطرے برسا سکتا ہے۔

مصنوعی بارش کا تجربہ کرتے دیکھ کر بعض لوگ کہنے لگے کہ پانی تو بہرحال کسی نہ کسی وقت برسے ہی گا اور ایسے تجربے سے فائدہ کیا۔ اپنی بات کو ثابت کرنے اور اس کا فائدہ ظاہر کرنے کے لئے مصنوعی بارش برسانے والے سائنس والوں نے منظم طریقہ سے ایک لمبا پروجکٹ چلایا اس کی ابتدا اس طرح ہوئی۔

امریکہ میں ایک ریاست ہے جس کا نام ہے نیا مکسیکو۔ وہاں بہت بڑا علاقہ ایسا ہے جو بالکل خشک اور ریگستان ہے نئے پروجکٹ کے لئے اسی علاقے کو منتخب کیا گیا۔ یہاں سلور آیوڈائڈ (SILVER IODIDE) کے ذرات سات دن تک

فضا میں بوئے گئے اور اس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا کہ بادل ہیں یا نہیں ڈاکٹر لینگ موئر نے اس کے بعد ایک سال تک موسم کے اعداد و شمار اکٹھا کئے اور یہ رپورٹ دی کہ جس وقت سے آئیو ڈائڈ کے ذرات فضا میں بکھرے گئے تھے ہفتہ وار موسم کے حساب سے نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی ہوا کے دباؤ، رطوبت، بادل، ہوا کی رفتار اور درجۂ حرارت ہر ایک میں ظاہر ہوئی۔

مصنوعی بارش کا تجربہ کامیاب تو ثابت ہوگیا لیکن اس سلسلے میں ابھی بہت سے کام باقی ہیں جن کا اثر وقت کے ساتھ عملی طور سے ہمارے سماج پر ظاہر ہوگا۔ سلور آئیو ڈائڈ سستا مرکب ہے اور ۴۰ ہزار مربع میل کے احاطے میں اس کی جتنی مقدار موسم بدلنے کے لئے چاہیئے۔ اس کی قیمت محض ایک ڈالر ہوگی اس طرح سارے امریکہ میں ایک دن کے اندر اندر دوگنی بارش برسانا بہت آسان ہے اور اس کا کل خرچ صرف چند سو ڈالر ہوگا۔

امریکہ کے ایک خطّہ میں گیہوں کی کاشت کرنے والے کسانوں کا بیان ہے کہ ۱۹۵۰ء میں مقامی بارش برسانے والوں کی مدد سے گیہوں کی فصل اتنی اچھی ہوئی کہ ہر سال سے ان کو ۷,۵۰,۰۰۰ ڈالر زیادہ منافع ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں امریکہ کی ریاست آریگن کے مٹر بونے والوں نے بتایا کہ بادلوں میں ذرات چھڑکنے کی وجہ سے ان کی فصل بہت اچھی ہوئی اور اس سال کوئی طوفان اور غیر معمولی موسمی حالات بھی پیش نہیں آئے۔ کیلی فورنیا کی بجلی پیدا کرنے والی کمپنی نے بھی بتایا کہ تین سال تک مسلسل مصنوعی طور سے بارش برسانے والوں کی امداد سے اس نے ۱,۴۳,۰۰,۰۰۰ کیلو واٹ بجلی زیادہ پیدا کی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کمپنی کا یہ بھی بیان ہے کہ اسی وجہ سے اس نے لاس انجلز کے شہر کے لئے ۱,۶۵,۰۰۰ ایکڑ آب پاشی کے لئے زیادہ پانی مہیا کیا۔ اور اسی کی مدد سے ایک جنگل کی آگ جو سارے درختوں کو جلا

کر راکھ کر دیتی بجھا دی گئی تھی ۔

پہاڑی خطوں میں اگر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق پانی برسانے میں ہم کامیاب ہو جائیں تو بجلی پیدا کرنے کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے۔ اور اگر چھوٹے بڑے ریگستانوں میں بارش برسانے کا انتظام ہو جائے تو بنجر اور ویران زمین کو ہم اپنے کام میں لا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ جہاں بارش اکثر اور زیادہ ہوتی ہے اس کی مقدار اور اس کا وقت بدل دیا جائے اور مختلف فصلوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔

کچھ دنوں کے بعد اب یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ اپنے ملک میں ایک جگہ ہم ایک ہیو ریو یا اسٹیشن قائم کریں جہاں سے کہ موسم کو قابو میں رکھا جا سکے اور وہیں سے یہ بھی معلوم کیا جا سکے کہ موسم میں کس کس قسم کی تبدیلی ہونے والی ہے تاکہ اسی کے مطابق کارروائی کی جا سکے اور کسی چیز کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر ہم یہ دیکھیں کہ سمندر میں فضا ایسی پیدا ہو رہی ہے کہ بادل اب پانی برسائیں گے تو فضا کے ماہرین یہ طے کریں گے کہ آیا ہم کو پانی کی ضرورت ہے یا نہیں اور راڈر نام کے ہوائی جہاز کی مدد سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ بادل ابھی ابھی پانی برسائیں گے یا نہیں ۔ اس لئے کہ بادل راڈر (Radar) میں صدائے بازگشت پیدا کر کے اپنی خصوصیات بتلا دیتے ہیں ۔ اگر زمین پر بارش کی ضرورت نہیں تو سمندر کے اوپر ہوائی جہاز آئیوڈائڈ کے ذرات فضا میں پھیلا دیں گے اور سارا پانی سمندر میں گر جائے گا ۔ اس کے برخلاف اگر زمین پر پانی کی ضرورت ہے تو یا تو پھر ہوائی جہاز یا زمین ہی سے پھٹنے والے چھوٹے چھوٹے بم سے بارش برسانے والے ذرات فضا میں پھیلا دیئے جائیں گے۔

مصنوعی طور پر بارش برسانے میں خاص دقت یہ ہے کہ ہم یقینی طور سے یہ نہیں بتا سکتے کہ فضا میں ذرات چھڑکنے سے کتنے حصے میں بارش ہوگی اور کتنے میں نہیں ۔ اسی لئے امریکہ میں سینٹ

ی ایک کمیٹی ایسے بلوں پر غور کر رہی ہے جس کی رو سے بارش برسانے کے سلسلہ میں جتنی تحقیقات ہوگی وہ سب اور اس کا کنٹرول براہ راست گورنمنٹ کے ہاتھ میں آجائے گا۔ امریکن سائنس داں ڈاکٹر وانی گٹ نے کہا ہے کہ کسی شخص کو بھی بادلوں میں پرائیویٹ طور سے آئیو ڈائڈ کے ذرات بکھیرنے کی اجازت نہ دی جائے جب تک کہ اس پر پبلک کا کنٹرول نہ ہو۔

انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ اگر مرکزی طور سے اس کو منظم کر لیا جائے تو اس سے تین فائدے پہنچیں گے پہلی بات یہ کہ موسم پر کنٹرول ہو جائے گا اور ضرورت اور جگہ کے مطابق ہم بارش کو بڑھا گھٹا سکیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ طوفان، آندھی، سیلاب اور غیر معمولی موسمی تبدیلی پر قابو پایا جا سکے گا اور ان کا زور کم کیا جا سکے گا — تیسرا فائدہ یہ کہ اڑان کے سلسلہ میں ہم ٹھنڈی فضا اور موسم کی خرابیوں پر فوقیت حاصل کریں گے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ موسم کو پبلک کے تحت لایا جائے ورنہ مصنوعی بارش کے اثرات انفرادی طور پر استعمال کرنے کی آزادی سے بہت بُرے نتیجے ہوں گے۔ اس لئے کہ دو طرح کے لوگوں کے لئے بیک وقت مختلف قسم کے موسم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے کہ ایک ہوٹل کا مالک اور ایک پھلوں کا کاشت کار۔

کیا آپ

جامعہ میں داخلہ لیں گے؟

مدرسہ ابتدائی میں اگلے سال کے لئے داخلے شروع ہو گئے ہیں۔ ۱۵ر جولائی سے مدرسہ کھل جائے گا۔ لہٰذا آپ اس سے پہلے اپنی درخواستیں نیچے لکھے ہوئے پتے پر بھیج دیں۔

نگراں مدرسہ ابتدائی
جامعہ نگر۔ دہلی



سیف احمد خاں

بادشاہ کون ؟

ایک دن جنگل میں تمام پرندے جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم کسی کو اپنا بادشاہ بنا لیں تو کتنا اچھا ہو۔ بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں۔ اور دکھ درد میں سب ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ پرندے تین گروہ میں بٹ گئے۔ ایک گروہ میں شکرا، عقاب، باز تھے جو دوسرے چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شکار کرتے اور اپنا پیٹ پالتے تھے۔ دوسرے گروہ میں وہ چھوٹے پرندے تھے جو ان شکاری چڑیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ تیسرے گروہ میں وہ تمام پرندے تھے جو ہوا کے رُخ پر اڑتے تھے۔ جس کا پلہ بھاری دیکھا اس کے ساتھ ہو گئے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ کوئی بادشاہ ضرور ہونا چاہیئے تو اُلّو بولا "بھائیو میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے"

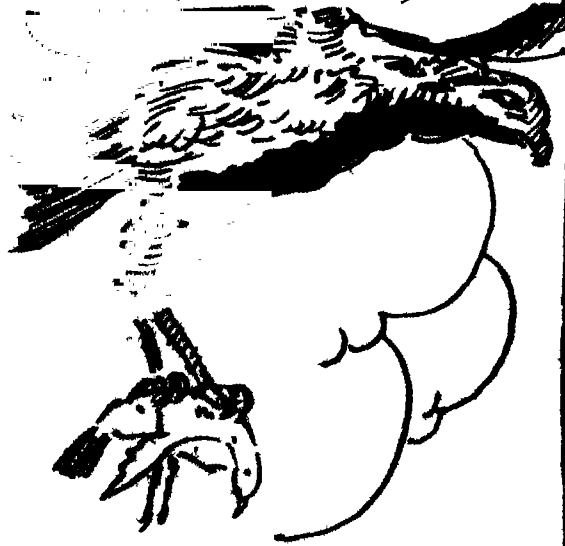
"ہاں ہاں کہیئے" سب پرندوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ اُلّو بولا "جو سب سے اونچا اڑے گا۔ وہ ہمارا سب کا بادشاہ ہوگا۔ اور ہم اس کا حکم مانیں گے" عقاب، باز اپنے مضبوط بازوؤں کو دیکھنے لگے اور بہت خوش ہوئے ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ گوریا بولی "ہم اس بات کو نہیں مانتے" فاختہ بولی "یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے" باز

نے اپنی تیز تیز آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا "کیوں۔ کیوں نہیں مانیں گے" اور وہ للچائی للچائی نظروں سے ان کو دیکھنے لگا۔ چھوٹے پرندے مایوس ہو گئے۔ سب نے تمام جنگل میں اعلان کر دیا: "ہفتہ کے دن بادشاہ کا چناؤ ہوگا۔"

اس روز جنگل میں پرندے اکٹھا ہوتے رہے اور ابھی تمام پرندے جمع بھی نہیں ہوئے تھے کہ مقابلہ شروع ہوگیا۔ تمام پرندے اڑتے رہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے پرندے تھک گئے۔ ان کے بازوؤں نے جواب دے دیا۔ وہ تھک کر زمین پر اتر آئے۔ فاختہ بولی "یہ تجویز غلط تھی۔" کبوتر بولا "انتخاب کا طریقہ ہی غلط تھا۔" گوریا بولی "اب کیا ہوگا۔" مگر اب تو عقاب کو ایک سال کیلئے بادشاہ بنانا ہی پڑا۔ اور باز وزیر بنا۔ ان کے گروہ نے خوشی کے گیت گائے۔ جنگل طرح طرح کی بولیوں سے گونج اٹھا۔ شکرا بولا "میں چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا خوب شکار کروں گا۔" اُلّو بھی بڑا خوش تھا کیونکہ اُسے بھی من مانی کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ عقاب بولا "اُلّو صاحب! آپ کے جو جی میں آئے کیجئے،

ڈر کی بات نہیں ہم آپ کی مدد کریں گے آہا ہا"۔ سب چیخ اٹھے۔ "عقاب زندہ باد"۔۔ تمام جنگل طرح طرح کے ترانوں۔۔۔ سے گونج اٹھا۔ چھوٹے پرندوں کی جان پر بن آئی۔ کبوتر، فاختائیں۔ پریشان ہو گئیں۔

عقاب کے سب ساتھی خوش تھے۔ کبوتروں کو پکڑتے، چڑیوں کو پکڑتے۔ کھاتے مزے لے کر۔ بس جھپٹا مارا اور شکار قابو میں۔ چڑیاں شکایت کرتے کرتے تھک گئیں۔ کبوتر مایوس ہو گئے۔ فاختائیں سر چھپا کر اپنے گھونسلوں میں بیٹھ گئیں۔ اور آخر کار کسی نہ کسی طرح ایک سال گذر ہی گیا۔



اور ایک دن تمام پرندے اکٹھا ہو گئے جس طرف نظر جاتی، پرندوں کے غول کے غول اڑتے چلے آ رہے تھے۔ اور دیکھتے دیکھتے تمام پرندوں سے جنگل بھر گیا۔ اس روز کسی شکاری پرندے نے شکار نہ کیا۔ شام تک پرندے جمع ہوتے رہے۔ جب شام ہو گئی تو مقابلہ شروع ہوا سب پرندے آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑنے لگے۔ چاند آسمان میں چمک رہا تھا۔ اور تمام پرندے



اڑ رہے تھے۔ اڑتے اڑتے اب چکور اور عقاب رہ گئے۔ عقاب تھک گیا۔ اس کے بازو شل ہو گئے۔ چکور چاند کی طرف ٹکٹکی باندھے اڑتی رہی۔ یہاں تک کہ سب نے اُس کو اپنا بادشاہ بنانا طے کر لیا۔ عقاب بولا "ہم نہیں مانتے" باز بولا "ہم نہیں مانتے" اور معاملہ دوسرے دن پر ملتوی ہو گیا۔

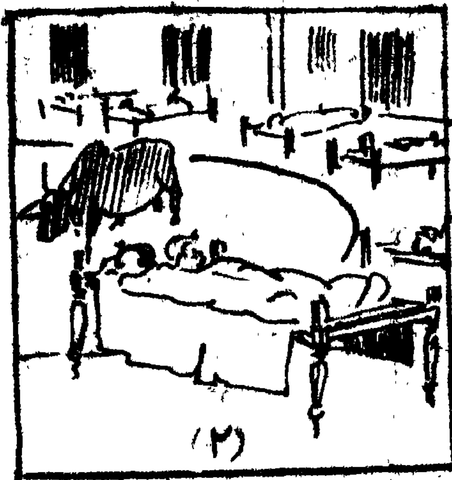
دوسرے دن پھر پرندے اکٹھا ہوئے عقاب بولا مقابلہ پھر ہوگا۔ باز بولا "مقابلہ پھر ہوگا"۔ الو بولا "اچھا جو پرندا سب سے نیچے زمین میں گھس جائے گا۔ وہ بادشاہ" "منظور ہے۔ منظور ہے" چڑیا بولی مقابلہ شروع ہو گیا۔ باز درخت کے کھوکھلے حصے میں گھس گیا۔ بطخ نے پانی میں غوطہ لگایا۔ چڑیا ایک چوہے کے سوراخ میں گھس گئی۔ چھوٹے پرندے خوشی سے چلا اٹھے! "چڑیا بادشاہ ہے" چڑیا بولی "چیں چیں چیں چیں میں بادشاہ ہوں میں بادشاہ ہوں" عقاب اپنی اس ہار پر چیخ اٹھا۔ اس نے باز سے

کہا" اس چڑیا کو اس بل میں سے نکلنے نہ دو" یہ نہ نکلے گی نہ بادشاہ بنے گی"

اس بل پر تمام دن پہرا رہا۔ جب رات ہوئی تو پہرے کی باری الّو کی تھی۔ اس نے پہرہ دینا شروع کیا۔ جب دو تہائی رات گذر گئی تو اُلّو کو نیند آنے لگی اس نے دل میں سوچا" لاؤ ایک آنکھ بند کر کے ذرا آرام کر لوں" اور اس نے ایک آنکھ بند کر لی۔ تھوڑے دیر بعد اس نے سوچا سونا تو ہے ہی نہیں۔ ذرا دونوں آنکھوں کو بند کر کے آرام کر لوں" اور تھوڑی دیر بعد اس کو گہری نیند آگئی۔ چڑیا انتظار میں تھی۔ پھر سے اڑ گئی۔ جب صبح اُلّو کی آنکھ کھلی تو چڑیا ندارد۔ بہت پریشان ہوا۔ تمام دن شرم کے مارے چھپا رہا۔ ہفتوں چھپا رہا۔ عقاب غصہ سے بیتاب اس کی تلاش میں پھرتا رہا۔ اُلّو ڈر کے مارے دن بھر منہ چھپائے پھرتا رہا۔ چڑیوں۔ کبوتروں اور فاختاؤں نے شہروں میں رہنا شروع کر دیا ہے۔ عقاب۔ باز اُلّو۔ ابھی تک چھوٹے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ اُلّو چڑیا کا جانی دشمن ہے۔ اور یہ اس وقت تک رہے گا۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے بادشاہ کون ہے۔۔۔۔۔ صبح صبح۔۔۔ سامنے کی دیوار پر چڑیا بیٹھ کر روزانہ گھر کے رہنے والوں سے پوچھتی ہے۔ بتائیے میں اس کو کیا جواب دوں؟

کالو مینا کی کہانی

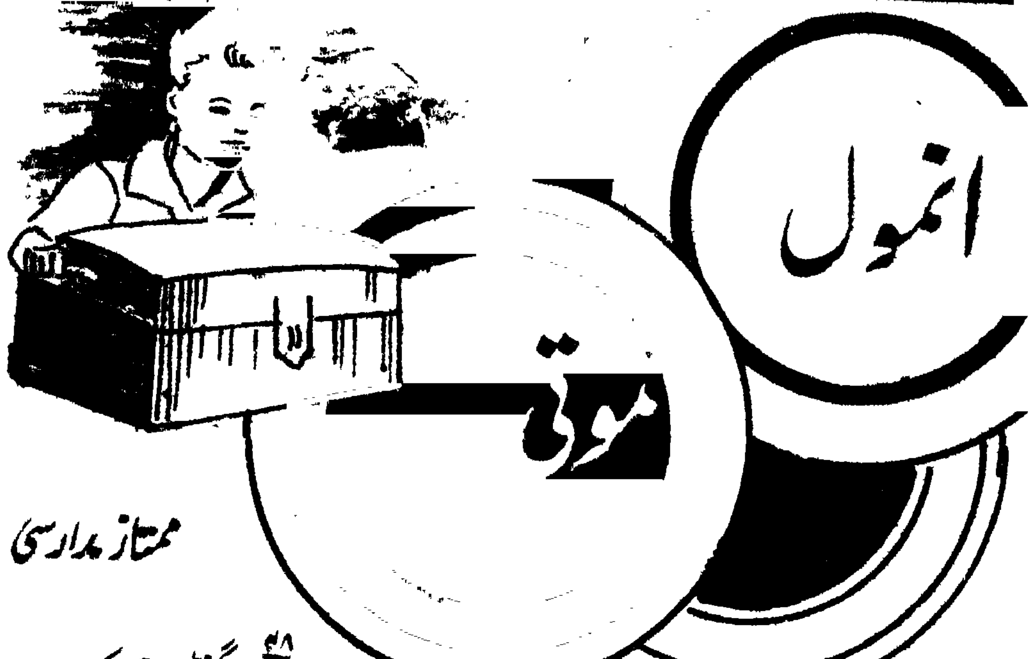

(۱)


(۲)


(۳)


(۴)

بشکریہ شنکرز ویکلی



انمول موتی

ممتاز مدارسی

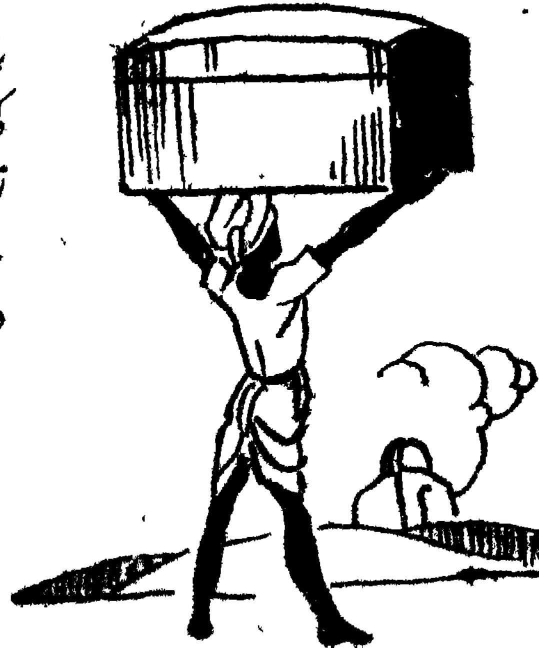
سومناتھ سخت بیمار ہوگیا۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اڑتالیس (۴۸) گھنٹے اور جی سکتا ہے۔ سومناتھ نے اپنے دونوں لڑکوں سیوا ناتھ اور مہادیو کو بُلا کر اُن سے کہا "جاؤ" وہ بند صندوق لے آؤ، جو الماری میں رکھا ہوا ہے۔ پھر اُس نے وہ بند صندوق سیوا ناتھ کو دے کر کہا "میرے بچو! اس صندوق میں بیس زیور ہیں۔ ان میں سے ہر ایک زیور کی قیمت کم سے کم ایک ہزار روپے ہے۔ جب تمھیں دنیا سے واسطہ پڑے گا، تو معلوم ہوگا کہ یہ کس قدر مفید ہیں۔ مگر میرے مرنے کے تیس دن تک اس صندوق کو ہرگز نہ کھولنا۔ میرے یہ الفاظ ضرور یاد رکھو۔ خدا تمھیں خوش اور تندرست رکھے۔"

سیوا ناتھ نے اپنے باپ سے صندوق لے لیا۔ اور اُسے حفاظت سے کسی جگہ رکھ دیا۔ وہ باپ کے بستر کے پاس واپس آیا، تو بوڑھا سومناتھ دم توڑ چکا تھا۔ دونوں بھائیوں نے مل کر تمام ضروری رسمیں پوری کیں، اور اپنے فرائض ادا کر دئے۔ اُس کا ایک پڑوسی بیر بھدرا نامی تھا۔ وہ اس صندوق کی کہانی سُن چکا تھا۔ اس کی نیّت خراب ہوگئی۔ اُس نے ایک دن دونوں بھائیوں کو بُلایا۔ باپ کی موت پر اظہارِ افسوس کرنے کے بعد، اُن کے ساتھ ہر قسم کی ہمدردی ظاہر کی۔ پھر دریافت کیا کہ اس صندوق کی کہانی صحیح ہے، یا غلط؟ دونوں لڑکوں نے کسی جھجک کے بغیر اُسے تمام باتیں سُنا

دیں۔ جو مرتے وقت اس کے باپ نے اُن سے کہی تھیں۔

"یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ تمھارے باپ نے بھکاری بنا کر نہیں چھوڑا"

بیر بھدرا کہنے لگا "مگر تم دونوں بہت چھوٹے ہو۔ ابھی دنیا کی چالوں سے واقف نہیں۔ اس صندوق کی کہانی تمام شہر میں مشہور ہو گئی ہے۔ کچھ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ تمھارا وہ صندوق چُرا لیں۔ اس لئے تمھیں بہت ہوشیار رہنا چاہیے"



دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا، پھر سیوا ناتھ نے کہا "آپ جو فرما رہے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔ ہم صندوق کی حفاظت کی انتہائی کوشش کرینگے"

"یہ سب ٹھیک ہے" بیر بھدرا نے کہا "مگر بہتر یہ ہے کہ تم اس صندوق کو اپنے کسی رشتہ دار یا بہترین دوست کی حفاظت میں دے دو"

"ہمارا بھی خیال یہی ہے" سیوا ناتھ کہنے لگا "ہمارے باپ نے جو مدت بتائی ہے اس کے بعد صندوق کھولیں اور زیور بیچ کر زمینیں خرید لیں۔ تاکہ کچھ کمایا جا سکے"

"یہ تو بہت ہی اچھا ارادہ ہے" بیر بھدرا نے جواب دیا "مگر صندوق کھولنے میں اور کتنے دن رہ گئے ہیں؟"

"صرف چار دن" دونوں بھائیوں نے جواب دیا۔

"میں سمجھ گیا۔ غالباً تمھارے باپ نے یہ کہا ہے کہ ہر زیور کی قیمت ایک ہزار روپے سے زیادہ ہے۔ اگر میں تمھارے باپ کی بتائی ہوئی قیمت دے دوں تو کیا تم وہ زیور مجھے دے دو گے"

کچھ دیر مشورہ کرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے جواب دیا: "ہم نقد قیمت پر زیور بیچنے کے لئے تیار ہیں"

بیر بھدرا گھر گیا، اور دس ہزار روپے لا کر اُس نے دونوں بھائیوں کو ادا کر دئے، جو دس زیوروں کی قیمت تھی اور صندوق لے گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر وہ صندوق واپس لے آیا اور دونوں بھائیوں کے سر پر دے مارا۔ پھر گالیاں بکنے لگا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ "تم نے مجھے دھوکا دیا" وہ چلایا

زیور کہاں ہیں؟ معلوم ہوتا ہے مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔"

"جناب! اس قدر غصے کی ضرورت نہیں! سیوا ناتھ نے کہا" ہم نے آج تک کسی کو دھوکا نہیں دیا"

"تم جھوٹے ہو" بیر بھدرا نے کہا "میری رقم واپس کردو۔"

"آخر ہوا کیا؟" سیوا ناتھ نے دریافت کیا "آپ اس قدر تیز کیوں ہوتے ہیں؟"

"دھوکا!" بیر بھدرا چلایا "جب میں گھر گیا، اور صندوق کھول کر دیکھا، تو اس میں کاغذ کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ زیور کہاں ہیں؟"

"اس آدمی کو ہو کیا گیا ہے؟" سیوا ناتھ نے کہا "زیور آخر کہاں گئے؟" اُس نے بھائی کی طرف دیکھا۔

مہادیو نے اس غصے میں بھرے ہوئے شخص سے پوچھا "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جب صندوق تمھارے حوالے کیا گیا تھا تو زیور اسی طرح بند تھا۔"

"کہاں؟" بیر بھدرا نے جواب دیا۔"

"تمھیں یاد ہوگا کہ ہمارا باپ بہت نیک آدمی تھا!"

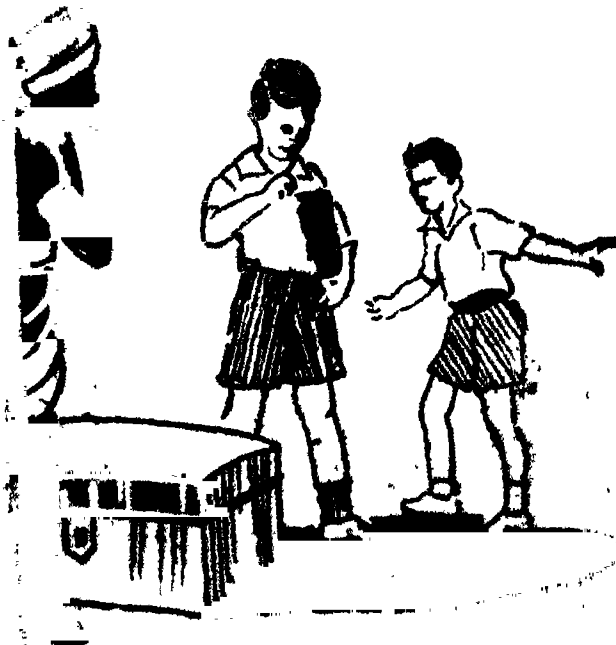
"بے شک!"

"اور وہ ہمیشہ سچ کہتا تھا۔ اس نے زندگی بھر کسی کو دھوکا نہیں دیا۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے، وہ بے شک اچھا آدمی تھا۔"

"پھر اُس نے مرتے وقت جو الفاظ کہے تھے، انھیں ہم جھوٹ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ صندوق میں میں انمول زیور نہیں ہیں۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ کسی نے صندوق سے زیور چُرا لئے ہیں۔"



"یہ کیونکر ممکن ہے؟ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس بات کی کسی کو بالکل خبر نہ تھی کہ صندوق کہاں رکھا ہے۔"

"میں تمھیں سمجھا نہیں سکتا! اور اتنا وقت بھی نہیں یہ بتاؤ کہ تم میری رقم واپس کروگے، یا نہیں؟"

"سودا ہو چکا ہے۔ ہم اس وقت تک رقم واپس نہیں کریں گے، جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ صندوق خالی تھا۔" پھر اُن میں خوب تو تو میں میں ہونے لگی۔ بیر بھدرا نے دوبارہ دونوں بھائیوں کو گالیاں دیں اور مقدمے بازی کی دھمکی دے کر چلا گیا۔

اسی دن بیر بھدرا نے اُس شہر کے افسر سے دونوں بھائیوں کی شکایت کردی۔ اُس نے فوراً دونوں کو جواب دینے کے لئے طلب کیا۔

بیر بھدرا کے بیان کے بعد دونوں بھائیوں نے بھی اپنے بیانات دئے۔ دونوں کے بیانات سُن کر افسر خاموش ہو گیا، اور گہری فکر میں ڈوب گیا۔

اچانک اس نے بیر بھدرا سے پوچھا "کیا تم وہ کاغذ کا ٹکڑا لائے ہو، جو صندوق میں ملا تھا؟" وہ کہیں پھینک دیا گیا تھا۔ بیر بھدرا نے پھر ڈھونڈ کر افسر کے حوالے کیا۔ افسر نے تمام کاغذ کو غور سے پڑھا، پھر مسکرا کر کہنے لگا: "معمّا اب حل ہو گیا ہے۔ دونوں سچے ہیں۔ ایک دوسرے کو الزام دینا فضول ہے۔" افسر نے کاغذ کا ٹکڑا سیوا ناتھ کو دیتے ہوئے کہا "ذرا اسے زور سے پڑھنا، اس میں کیا لکھا ہے؟" سیوا ناتھ نے ذیل کی عبارت پڑھی،

میرے دونوں بچوں سیوا ناتھ اور دھادیو کے نام

میرے پیارے بچو! میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، اور میرے مرنے کے دن بہت قریب آگئے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ خدا کب بُلانے والا ہے۔ اس لئے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

میں سچ سچ کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس نہ کوئی جائداد ہے، اور نہ کوئی رقم باقی ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا، میں نے غریبوں اور حاجت مندوں میں بانٹ دیا۔ مگر میں تمھارے لئے بیں انمول زیور چھوڑ رہا ہوں۔ تم انھیں کسی قیمت پر نہ کھونا۔ اگر تم میری اس نصیحت پر عمل کروگے تو زندگی بھر خوش رہوگے، دنیا تمھاری عزت کرے گی۔

وہ زیور یہ ہیں

(۱) ہمیشہ سچ بولنا، یہی خوشی ہے، اور تمام نیکیوں کی جڑ ہے

(۲) آپس میں ہرگز نہ جھگڑنا اور اتفاق و اتحاد قائم

رکھنا۔

۳۔ بری باتیں زبان سے ہرگز نہ نکالنا۔
۴۔ بڑوں کی عزت کرنا، اور ان کا حکم بجا لانا۔
۵۔ کسی آدمی کو دُکھ نہ پہنچانا۔
۶۔ ہمیشہ صاف ستھرے رہنا۔
۷۔ کوئی نشہ کی چیز نہ پینا۔
۸۔ برے لوگوں سے دوستی نہ کرنا
۹۔ بُرے خیالات کو دل میں جگہ نہ دینا
۱۰۔ غریبوں کی مدد کرنا
۱۱۔ مذہب کا راستہ ہرگز نہ چھوڑنا۔
۱۲۔ اپنی صحت سے غفلت نہ کرنا۔
۱۳۔ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ملن ساری سے پیش آنا، اور اچھا برتاؤ کرنا۔
۱۴۔ اپنا کام اپنے آپ کرنا۔
۱۵۔ اپنے راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔
۱۶۔ اپنے نوکروں کے ساتھ رحم کرنا۔
۱۷۔ عقلمندوں کی صحبت میں رہنا۔
۱۸۔ کبھی قرض نہ لینا۔
۱۹۔ کبھی غصّے کی حالت میں آپے سے باہر نہ ہوتا
۲۰۔ جو آج کر سکتے ہو اُسے کل پر نہ چھوڑنا۔

"آہا" دونوں بھائیوں نے چلا کر کہا "اب ہم سمجھ گئے۔ ہم خوشی کے ساتھ بیر بھدرا کو اس کی رقم واپس کر دیں گے۔ جب چاہے وہ لے جا سکتا ہے ہمیں افسوس ہے کہ بیوقوفی سے ہم نے ایسے بہترین زیور فروخت کر دئے، جن کی دنیا میں کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی۔ نہیں اگر آپ کروڑوں روپے بھی دے جائیں، تو ہم انھیں ہرگز نہ بیچیں گے"

وہ افسر اُن بھائیوں کے اخلاق سے اتنا خوش ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی لڑکیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں جب وہ مرنے لگا، تو اس نے اپنی ساری جائداد ان دونوں بھائیوں میں خوشی سے بانٹ دی۔

(انگریزی سے ترجمہ)

اعلان

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

منیجر



گردھاری لال منٹو

جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

گردھاری لال منٹو نے ہمیں یہ کہانی کشمیر سے بھیجی ہے یہ کشمیری بچوں کی کہانی ہے۔ انھوں نے اپنے والد شری رگھوناتھ منٹو سے اس قسم کی کہانیاں سنی ہیں۔ رگھوناتھ منٹو صاحب سوشل ایجوکیشن کشمیر کے سپروائزر ہیں انھوں نے یہ کہانیاں اپنے معائنوں کے دوران میں چھوٹے چھوٹے بچوں سے سنی تھیں۔ کشمیری بچے جب کسی ایک جگہ بیٹھتے ہیں تو اس طرح کی کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ اگر پیامی بچوں نے یہ کہانیاں پسند کیں تو بھائی گردھاری لال منٹو ہمیں اس طرح کی اور کہانیاں بھی بھیجیں گے۔

اڈیٹر

ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سات بیویاں تھیں۔ سب سے بڑی بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ دوسری بیوی سے ایک لڑکی۔ یہ لڑکی اصل میں منحوس خیال کی جاتی تھی۔ کیونکہ جس دن یہ لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اسی دن بادشاہ کے اصطبل کے تمام گھوڑے مر گئے تھے۔

بادشاہ کے پاس اب صرف ایک گھوڑا باقی رہ گیا تھا۔ بادشاہ کا لڑکا جس کو لوگ شہزادے کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک دن اسی گھوڑے پر سوار ہو کر باہر سیر کو گیا۔ راستے میں اس کی نظر ایک بلی پر پڑی جو ایک چوہے کی تاک میں تھی۔ شہزادے نے چلا کر کہا۔ "ارے چوہے میاں" بلی تمہاری تاک میں ہے۔" اس پر بلی بہت ناراض ہوئی اور بولی "شہزادے میاں تم نے میرے ہاتھ سے شکار نکال دیا۔ شہزادے نے کہا۔ آؤ فکر نہ کرو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو اس سے بھی اچھا شکار دلاؤں گا۔ آگے چل کر شہزادے نے ایک شیر کو دیکھا جو ایک گھوڑے کی تاک میں تھا۔ شہزادہ چلایا " خبردار! ارے گھوڑے میاں۔ کوئی تمھیں ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" شیر شہزادے سے ناراض ہو گیا۔ شہزادے نے کہا "شیر میاں فکر نہ کرو۔ میں تمھیں آگے چل کر ایک اچھا شکار دلاؤں گا۔" شہزادہ آگے چلا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ریچھ ایک بیل کی تاک میں ہے۔ شہزادے نے بیل سے کہا "ارے بیل میاں یہ ریچھ تمھاری تاک میں ہے۔ ریچھ شہزادے سے خفا ہو گیا۔ شہزادے نے کہا "فکر کرنے کی بات نہیں۔ میں تمھیں ایک اچھا شکار دلانے کا وعدہ کرتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔" غرض ریچھ بھی ساتھ ہو لیا۔ اب بلی شیر ریچھ شہزادے کے ساتھ ساتھ ہو لئے۔ راستے میں انھوں نے ایک گیدڑ اور ایک بھیڑ کو دیکھا۔ گیدڑ بھیڑ کی تاک میں تھا۔ شہزادے چلایا "خبردار! کوئی بھیڑ کی تاک میں ہے۔" گیدڑ غصہ ہوا۔ مگر شہزادے نے اس کو بھی اچھا شکار دلانے کا وعدہ کر کے راضی کر لیا۔ اب تو گیدڑ بھیا بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔

آگے چل کر ایک آدمی اور بندر کو دیکھا۔ بندر آدمی کی تاک میں تھا۔ شہزادہ زور سے چلایا۔ ارے میاں انسان! بندر تمھاری تاک میں ہے۔ بندر بھی شہزادے سے ناراض ہو گیا۔ خیر بندر کے ساتھ بھی شہزادے نے وہی وعدہ کیا۔ جو دوسروں کے ساتھ کیا تھا۔ اب یہ ساری کی ساری

پارٹی شہزادے کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک میدان میں پہنچے۔ میدان کے بیچوں بیچ ایک عورت جارہی تھی۔ شہزادے نے اس عورت کو روک لیا۔ اور اس سے کہا "تم میرے ساتھ شادی کرلو" عورت نے منع کر دیا۔ اور بھاگ کر اپنے گھر گئی۔ شہزادے نے اس کے پیچھے بلی کو بھیج دیا۔ اور کہا دیکھو یہ عورت کہاں گئی۔ اور کیا کر رہی ہے۔ عورت نے جب اس بلی کو دیکھا۔ تو اس نے اس کو تلوار سے دو ٹکڑے کر ڈالا۔ شہزادے نے جب یہ حال دیکھا۔ تو غصے سے اس کا منہ لال ہوگیا۔ وہ زور زور سے چلایا۔ کچھ آدمی جمع ہو گئے۔ شہزادے کو دیکھ کر شیر بھی چلایا تو کچھ اور شیر جمع ہو گئے۔ شیر کو دیکھ کر گیدڑ اور ریچھ بھی چلائے۔ تو سارے جنگل میں جتنے ریچھ اور گیدڑ رہتے تھے۔ وہ بھی آگئے۔ ان سب کو دیکھ کر بندر بھی چلایا۔ اور ان گنت بندر بھی جمع ہو گئے۔ یہ تمام جانور بادشاہ کے محل میں داخل ہو گئے۔ شہزادے کو معلوم نہ تھا۔ کہ یہ میرا ہی محل ہے۔ ان تمام جانوروں نے بادشاہ اور اس کی تمام بیویوں کو نیچے اتار کر گھسیٹ کر مار ڈالا۔ ریچھوں نے شہزادی عورت کا منہ ہی نوچ ڈالا۔ بندروں نے کپڑے۔ اور زیورات چرا لئے۔ غرض ان جانوروں نے تمام گھر کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں بیچاری شہزادی مر گئی۔ شہزادہ جب گھر میں داخل ہوا۔ تو اُسے ہوش آیا۔ اب وہ سمجھ گیا۔ کہ یہ میرا ہی گھر تھا۔ اور یہ عورت میری ہی بہن تھی۔ اور وہ میرے ہی ماں باپ تھے۔ بیچارا درندوں اور جانوروں کی دوستی پر بہت پچھتایا۔

مگر اب پچھتائے کیا ہوت۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

نوّے روپے کے نقد انعامات

کہانیوں کا انعامی مقابلہ

کہانی بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء ہے۔

گروپ ا۔ ۵ برس سے ۹ برس تک کے بچے
گروپ ب۔ ۹ برس سے ۱۲ برس تک کے بچے
گروپ ج۔ ۱۲ برس سے ۱۵ برس تک کے بچے
اس مقابلے میں شریک ہو سکتے ہیں

ہر گروپ میں تین انعام دئے جائیں گے
پہلا انعام ۱۵ روپیہ دوسرا انعام ۱۰ روپیہ
تیسرا انعام ۵ روپیہ۔
جو بچے انعام کے بجائے کتابیں لینا چاہیں ان کو ایک روپئے کی کتاب ۱۴ر آنے میں ملیں گی۔

شرائط مقابلہ

۱۔ پیام تعلیم پڑھنے والے تمام بچے اس مقابلے میں شرکت کر سکتے ہیں۔
۲۔ کہانی کہیں سے نقل نہ کی گئی ہو۔ بلکہ خود بچوں کی لکھی ہونی چاہیئے۔ ہر کہانی کے ساتھ آپ کا پورا نام، عمر اور پتہ ضرور ہونا چاہیئے۔ کہانی صاف اور خوشخط لکھی ہونی چاہیئے۔ کئی چھپی کہانیاں مقابلہ میں شریک نہ کی جائیں گی۔
۳۔ کہانی پر "انعامی مقابلے کے لئے" ضرور لکھئے
۴۔ گروپ الف کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۲ صفحے اسکول کاپی کے برابر ہونی چاہیئے۔
گروپ ب کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۴ صفحے اسکول کاپی کے برابر ہونی چاہیئے۔
گروپ ج کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ ۶ صفحے اسکول کاپی کے برابر ہونی چاہیئے۔

کہانی بھیجنے کا پتہ۔ اڈیٹر پیام تعلیم۔ جامعہ نگر دہلی۔

ہر حل کے ساتھ کوپن فیس داخلہ ۱؍ کے
بھیجنا ضروری ہے۔ ٹکٹ کی صورت میں

تیرہ ۱۳ روپے کے نقد انعامات

پیامی معمّہ نمبر ۱۳

دائیں سے بائیں :-

(۱) پاکستانی بچے "مکتبہ — کو مبلغ چار روپے کا منی آرڈر کرکے پیام تعلیم کے خریدار بن سکتے ہیں
(۲) سخت قسم کی — بہادروں کا بھی دل توڑ دیتی ہے
(۵) کچھ — ایسے ہوتے ہیں جن سے ڈاکٹر بھی تنگ آجاتے ہیں
(۶) اس کی زیادتی طبیعت کو بہت پریشان کر دیتی ہے۔
(۹) آجکل بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ہر کام — سے ہی نکالنا چاہتے ہیں۔

اوپر سے نیچے :-

(۲) انسان خود ہی اپنے لئے — کی راہیں پیدا کرتا ہے
(۳) — سے دیکھنے پر اکثر چیزیں اپنی ظاہری حالت سے مختلف نظر آتی ہے۔
(۴) وہ سپوت کب ہے جو باپ دادا کی عزت — دے !
(۸) بعض لوگ صرف — کے لئے کام کرنا پسند کرتے ہیں۔

حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۱؍ جولائی ۶۲ء

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۶ روپئے
دوسرا انعام ایک غلطی پر ۴ روپئے
تیسرا انعام دو غلطی پر ۳ روپئے

پیامی معمّا نمبر ۱۳

۴	۳ ا		د	ہ		۱ ش
و			ر		ا	۵
ر	ا		گ	و	۶	
	م		۵			۷ غ
			ا		ط	
	ر		۹ م			

کوپن پیامی معمّا نمبر ۱۳
نام ....
پتہ ....
....

شرائط پیامی معمّا

۱۔ ایک خاکہ کی فیس داخلہ اور ۶ خاکوں کی فیس ۵ر فیس ٹکٹوں کی صورت میں آنا چاہیئے۔
۲۔ سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو اسپیشل انعام بھی ملے گا۔
۳۔ ایک روپے انعام تک کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کی جائے گی
۴۔ حل روشنائی سے صاف ہونا چاہیئے۔مشکوک اور کٹے پھٹے حل مقابلے میں شریک نہ ہوں گے۔
۵۔ اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ لڑکے ہوں گے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔
۶۔ ایک لڑکے کو ایک ہی انعام یا انعام کا ایک ہی حصہ ملے گا۔
۷۔ معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام کا فیصلہ آخری ہوگا۔

اپنے حل آپ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیے۔
اڈیٹر پیامی معمّہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی

ضروری اعلان بابت معمّا نمبر ۱۳

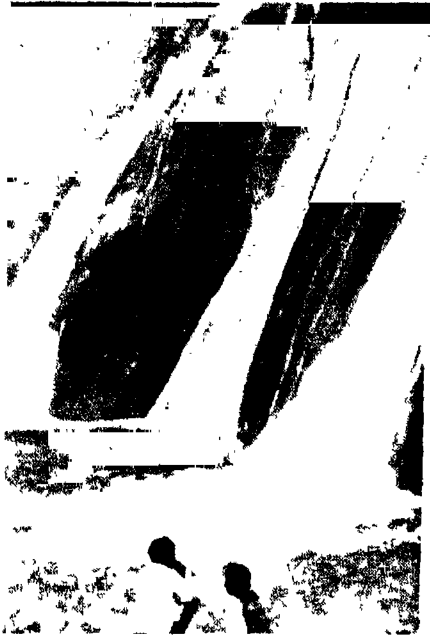
پیامی معمہ نمبر ۱۳ میں بھی غلطی رہ جانے کی وجہ سے اسے اصلاح کے بعد دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ معما نمبر ۱۳ کی تاریخ ۱۰ جون سے بڑھا کر ۳۱ جولائی کر دی گئی ہے۔

جو پیامی نمبر ۱۳ کا حل بھیج چکے ہیں۔ وہ بغیر فیس اور کوپن کے (اپنے خط کا حوالہ دیتے ہوئے) حل روانہ کر دیں۔ ان کے نام ہمارے یہاں رجسٹر میں درج ہیں۔ ہم اس سے ملا لیں گے۔

معمے میں غلطی رہ جانے اور تاریخ بدلنے کا ہمیں بے حد افسوس ہے امید ہے کہ پیامی معمّہ سے دلچسپی لینے والے حضرات ہماری مجبوری کا خیال کرتے ہوئے ہمیں معاف فرمائیں گے۔ معمہ نمبر ۱۲ کے نتیجے کا اعلان اگلے شمارے میں ہوگا۔

اڈیٹر پیامی معمّہ

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں — مطبوعہ ... پریس دہلی



آبشار موسی



موسی فال کے پاس جامعہ کے
طالب علم

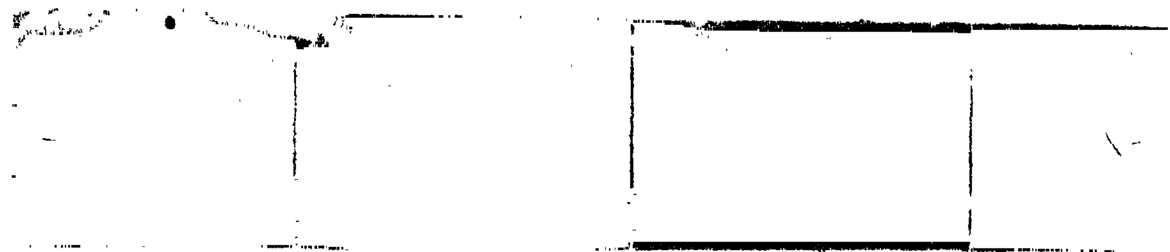


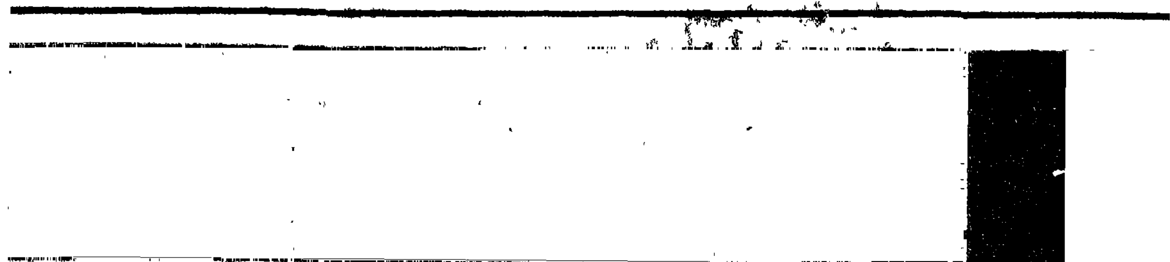
بروک لینڈ کے گ



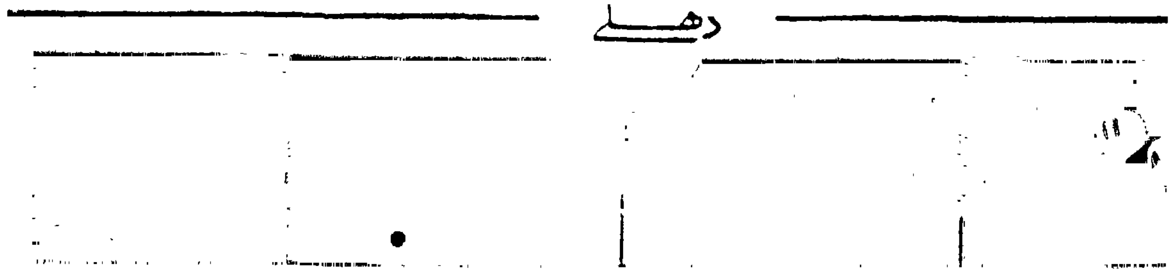
لنڈور بازار

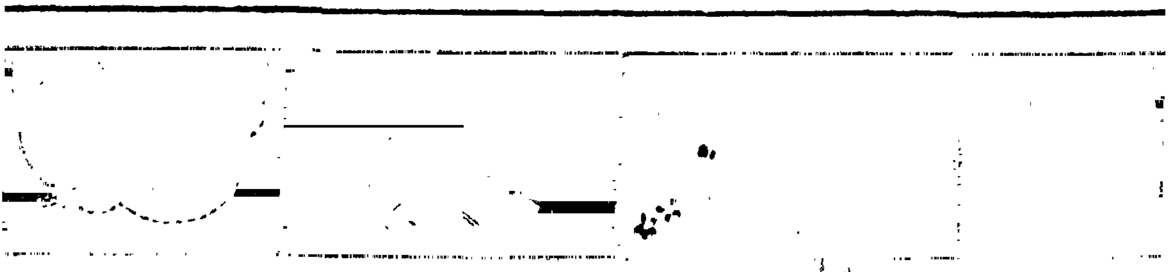
Regd. No. D[illegible]06.
JULY. 1952.

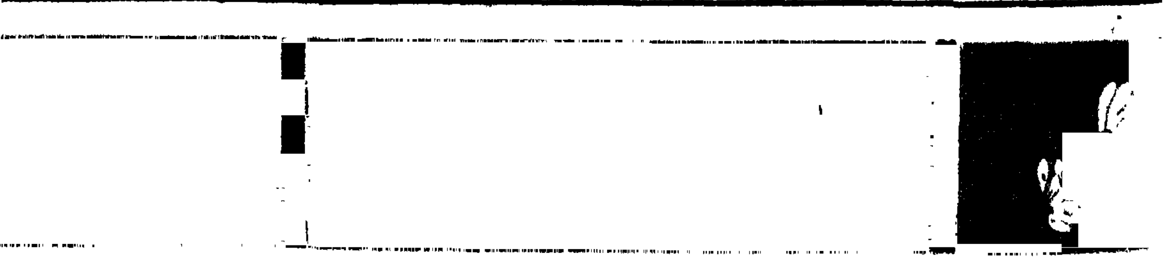


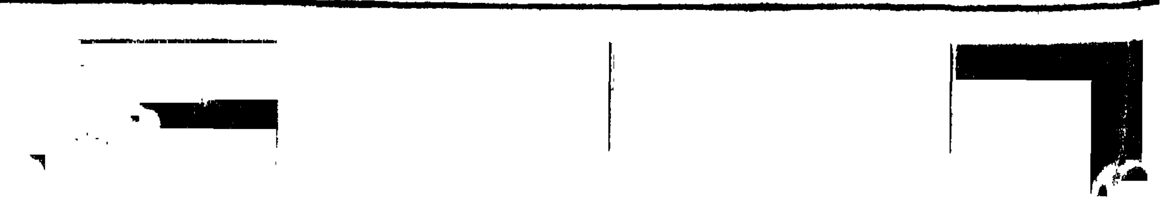


دھلے











ملکری کے بچے

With compliments from



فہرست

سالانہ چندہ
۴ روپے
فی پرچہ
۶ آنے

...خاں بی، اے (جامعہ)
...روز ایم، اے (علیگ)



بچوں سے باتیں

اگست کا رسالہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ستمبر میں پیام تعلیم کا سالنامہ شایع ہوگا۔ اس سالنامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں بچّوں کی اپنی لکھی ہوئی کہانیاں ہوں گی۔ یہ کہانیاں ہمارے پاس انعامی مقابلے کے لیے آئی تھیں۔ ان میں انعام پانے والی نَو کہانیاں سالنامے میں نمایاں طور پر شائع کی جائیں گی۔ مگر آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ اس میں صرف یہی نَو کہانیاں ہوں گی، بلکہ ان کے علاوہ اور اچھی اچھی کہانیاں بھی چھپیں گی۔ ہمیں خوشی ہے کہ پیامیوں نے اس مقابلے میں بڑی دلچسپی لی، نہ صرف خود کہانیاں لکھیں بلکہ اپنے دوستوں سے بھی لکھوائیں! اس طرح اس مقابلے کی کامیابی کا سہرا پیامیوں کے سر رہا۔ اگر آپ ایسی ہی دلچسپی لیتے رہے تو ہم اس طرح کا مقابلہ اگلے سال پھر کریں گے۔

سالنامے کی دوسری خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ اس میں انعام پانے والے بچّوں کی تصویریں بھی شائع کی جائیں گی۔

سالنامے سے ہم پیام تعلیم کا ٹائٹل بھی تبدیل کر رہے ہیں۔ سالنامے کا ٹائٹل دیکھ کر آ

پھڑک اُٹھیں گے۔ غرض یہ سالنامہ ہر حیثیت سے شاندار ہوگا۔ آپ کو اس سالنامہ کا انتظار تو بہت کرنا پڑا۔ لیکن سالنامہ دیکھ کر آپ خوش ہو جائیں گے۔

اب اس پرچہ کے بارے میں سُنئے۔ پیامی بچوّں کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ اس شمارے کی ترتیب میں مدرسہ ابتدائی، جامعہ کی اتالیق، نجمہ سلطان صاحبہ نے بڑی دلچسپی لی ہے اور آپ کے لئے اچھے اچھے مضامین اور کہانیاں اکٹھا کی ہیں۔

پیامِ تعلیم سے انھوں نے اتنی دلچسپی لی کہ اس بار اپنی چھٹیاں بھی یہیں گزاریں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی اتنی ہی دلچسپی سے اس پرچے کو پڑھیں گے۔

بقیہ ہماری مجبوریاں صفحہ ۵ سے آگے

طرح بھی تیار نہیں تھا۔ مگر اطمینان یہ تھا کہ چائے پر پایا۔ مضمون کے بارے میں نہیں پوچھ پائیں گے۔ کیونکہ چائے کی دعوت تھی مگر اب جوں جوں شام نزدیک آتی جا رہی تھی بچّہ پارٹی کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ کھانے کی میز پر ہم آج بچ نہیں سکتے۔ اس لئے اب میں آپ لوگوں سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ ہاتھ جوڑ کر اور سچّے دل سے دعا مانگئے کہ ہم پر رات کا کھانا حرام نہ ہو جائے۔ آپ

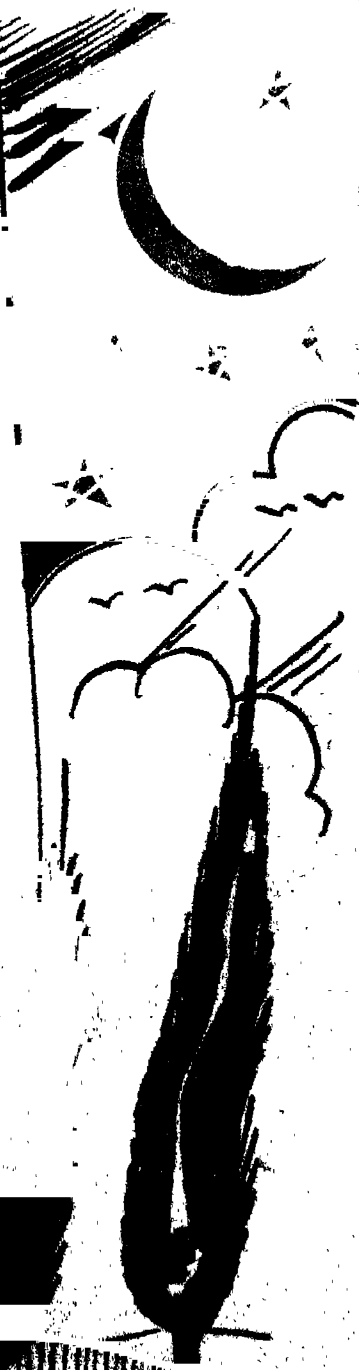
لوگ کہیں گے بچوں کی دعا اللہ جلدی قبول کرتا ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ بڑے بوڑھوں کا قول ہے کہ شریر بچوں کی دُعا خدا کی بارگاہ میں ذرا کم ہی منظور ہوتی ہے مگر ہم توبہ کرلیں گے شرارت سے، اگر ہم کو بیاض کے جھگڑے سے نجات مل گئی۔ اور جناب اگر ہم نے پھر شرارت کی تو ہم سے بُرا زمانے میں کوئی نہ ہوگا۔

چاند کی باتیں

چاند پیارا سب کا دُلارا
نکلا نکلا وہ مہ پارا
سُندر چھایا نور کا ٹکڑا
یا جیسے ہو حور کا ٹکڑا
جھلمل جھلمل کرتے تارے
پیار سے تم کو تکتے تارے
تارے ہیں یا نور کے پارے
یا ہیں پیت کے یہ انگارے
تاروں کے ہالے میں چاند
جس کے آگے سب ہیں ماند
چاند تمھیں کہتا ہے ہنس کر
پیارے بچو رہنا مل کر

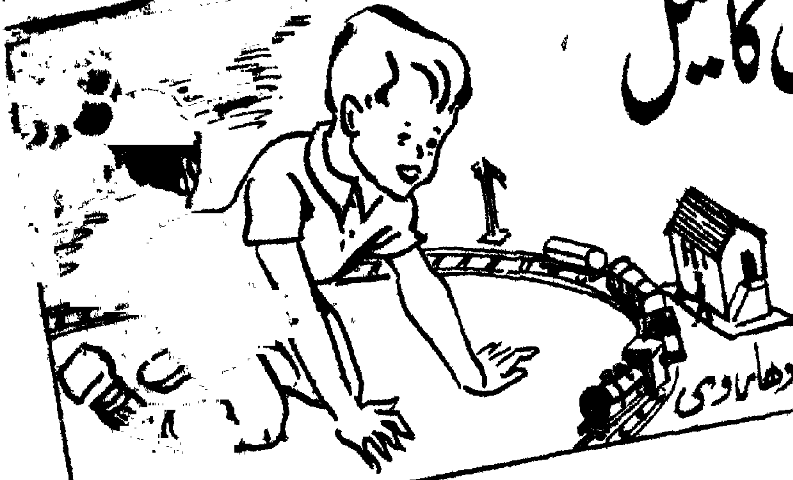
پریم کی بولی ہر دم بولو
ہر دم سکھ کے موتی رولو
دیش کی اپنے شان بڑھاؤ
جان لڑاؤ مان بڑھاؤ

وقار خلیل شاہ پوری



ریل کا کھیل

مقبول احمد سیوہاروی



آؤ کھیلیں کھیل،
ریل ریل کا کھیل،
چھوٹا سا انجن، چھوٹی سی ریل،
چھوٹے چھوٹے بابو،
چھوٹے بابو کا چھوٹا کوٹ،
چھوٹا پتلون،
چھوٹی سی ٹوپی کیسی بھلی لگتی ہے،
چھوٹے بابو ہاتھ میں پنچ لے رہے ہیں۔
لوہے کا پنچ جس سے ٹکٹ کا کونا دب کر
ٹ جاتا ہے۔
ریل میں بچے سوار ہیں۔

ریل کی پٹری دور تک چلی گئی ہے۔
پٹری ایک میدان میں بچھی ہوئی ہے۔
چاروں طرف باغ ہے۔
باغ میں پھول کھلے ہیں۔
رنگ برنگے پھول۔
اودے، نیلے، سُرخ، گلابی۔
پیلے پیلے اور عباسی۔
چھوٹی سی گاڑی چھوٹے بابو۔
چھوٹے چھوٹے ٹکٹ۔
سب بچے صاف ستھرے۔
سب بچے لکھے پڑھے۔

بستر صاف ستھرے۔
گرمی کے بستر ہلکے پھلکے۔
ایک تکیہ۔
ایک دری۔
ایک چادر۔
بچّے دوڑ دوڑ کر کود کود کر گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں۔
یہ بچوّں کی گاڑی ہے۔
ڈرائیور انجن چلانے والا۔
ڈرائیور بھی بچّہ ہے۔
چھوٹا سا گارڈ سفید اُجلا دُھلا کوٹ پہنے ہے۔
ہری اور لال جھنڈی ہاتھ میں ہے۔
بچّے سب بیٹھ گئے۔
ڈرائیور انجن میں بیٹھ گیا۔
گارڈ صاحب کھٹ پٹ کرتے پلیٹ فارم پر آگئے۔
دیکھو وہ جھنڈی ہلائی۔
ہری جھنڈی!!
لین صاف ہے، لائن کلیر۔
ڈرائیور نے انجن کی کل گھمائی۔
انجن کے کان مروڑے۔
انجن نے سیٹی دی، چیخ ماری۔
چھک چھک چھک چھک گاڑی چلی۔
گارڈ صاحب کی گاڑی سب گاڑیوں سے پیچھے ہے۔
گارڈ صاحب کھڑے ہیں۔
گارڈ صاحب نے جھانک کر دیکھا۔
دور تک لائن صاف ہے۔
گاڑی بھاگی چلی جارہی ہے۔
ایلو گاڑی رُکنے لگی۔
سب بچّے کھڑکیوں میں سے سر نکال کر جھانکنے لگے۔
کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہیں
کوئی بچّہ گر نہیں سکتا۔
لین پر بھینس کھڑی ہے۔
گارڈ صاحب نے لال جھنڈی دکھائی۔
گاڑی رُک گئی۔
ڈرائیور نے کل گھمائی۔
انجن چیخا "بھاں بھاں"
بھینس بھاگی۔
سب بچّے ہنسنے لگے۔

گارڈ صاحب بھی ہنسے۔
ڈرائیور بھی ہنسا۔
ٹکٹ چیکر بھی ہنسا۔
ٹکٹ چیکر خوب گورا چٹّا ہے۔
ڈرائیور کالا کالا ہے۔
ٹکٹ چیکر کود کر گاڑی میں آیا۔
پنج کو کھڑکی پر مارا کھٹ، کھٹ۔
ٹکٹ ٹکٹ۔
سب بچّوں نے جلدی جلدی ٹکٹ دکھلا۔
ٹکٹ چیکر ٹکٹ دیکھ رہے ہیں۔
ایک بچّہ پکڑا گیا۔
اس کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔
ٹکٹ چیکر نے سیٹی دی۔
پولس آگئی۔
سارے سپاہی بچّے۔
بچّوں نے بچّے کو پکڑ لیا۔
پولس افسر نے حکم دیا۔
سامان ٹٹولو۔
پولس افسر بھی بچّہ ہے۔
سامان میں بٹوا نکلا۔
بٹوے میں دو روپیہ۔
ٹکٹ چیکر نے کہا ایک روپیہ واپس کر دو۔
آٹھ آنہ ٹکٹ کے۔
آٹھ آنہ جرمانہ۔
ریل رُک گئی۔
اپنے اپنے گھر چلے گئے۔
گارڈ صاحب بھی چلے گئے۔
ٹکٹ چیکر صاحب بھی چلے گئے۔
سب ہنس پڑے۔
کھیل ختم ہوگیا۔ کام کا کام اور کھیل کا کھیل۔

اگر آج ...

اُستاد۔ اگر آج مرزا غالب زندہ ہوتے تو ـــــ
طالب علم۔ (بات کاٹ کر) تو آج اُن کی عمر ایک سو پچپن سال ہوتی۔



ہنگری کے بچے

اطہر پرویز

آپ نے "ریل کا کھیل" کی مزیدار کہانی پڑھی مگر یہ خالی خولی کہانی نہیں ہے۔ ایک جگہ ا… بھی ہے جہاں بچوں کی ریل چلتی ہے۔ یہ جگہ ہنگری کے دارالخلافہ بوڈاپسٹ میں ہے۔ مشر… یورپ کے نقشے میں آپ کو چھوٹا سا ملک ہنگری نظر آئے گا۔ بس یہیں ہے بوڈاپسٹ… ہٹلر کی ہار کے بعد جب ہنگری آزاد ہوا تو جہاں بڑوں کو فائدہ پہنچا وہاں بچوں کو بھ… ــــــــ۔ یہ ریل بڑی اچھی اچھی پہاڑیوں، خوب صورت گھاٹیوں، ہری بھ… چراگاہوں اور جنگلوں سے گزرتی ہے۔ اس ریل میں آپ کو کوئی بڑا آدمی نظر نہیں آئے… ہر طرف لڑکے ہی لڑکے دکھائی دیں گے۔ ہری لال جھنڈیاں دکھاتے ہوئے لڑ… انجن چلاتے ہوئے لڑکے، غرض لڑکے ہی یہ کام کرتے ہیں۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ لڑ… یوں ہی یہ کام کرنے لگتے ہیں۔ جی جناب اس کے لیے ان کو باقاعدہ ٹریننگ لینی پڑتا… ہوشیار اور سمجھ دار لڑکوں کو ہی یہ عزت دی جاتی ہے اب جہاں یہ گاڑی جاتی ہے… حال سنئے۔ یہ جگہ دیکھنے کے لائق ہے۔ یہاں آپ کو ہر طرف لڑکے ہی لڑکے نظر آ… جو یہاں چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔ کام بھی کرتے ہیں اور تفریح بھی بلکہ یوں… کام ہی ان کی تفریح ہے۔ اب آپ ہی بتایئے اگر آپ اس شہر میں پہنچ جائیں… آپ کو پوسٹ ماسٹر بنا دیا جائے، مٹھائیوں، کھلونوں اور طرح طرح کے پھلوں کی دکا…

سپرد کردی جائیں تو کتنا مزا آئے گا۔ تو بھئی یہ لڑکے کام بھی کرتے ہیں اور کھیل کود میں بھی حصّہ لیتے ہیں۔ بہت سے غیر ملکی لوگ بچوں کی یہ بستی دیکھنے آتے ہیں اور بچے ان مہمانوں کی نہ صرف خاطر کرتے ہیں بلکہ اُن سے دوستی بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن بچوں کی تفریح کی یہ تو ایک ہی جگہ ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑوں اور نہروں پر بھی اُن کی تفریح گاہیں ہیں۔ اس سال ۱۹۵۲ء میں اُن تفریح گاہوں میں تفریح کرنے کے لئے ۶۸ ہزار بچوں کے جانے کی تجویز ہے۔

بچے اگر خود دلچسپی لیں تو کیا نہیں کر سکتے۔ یہ تو ہنگری کی بات تھی۔ جہاں بچے کھیل کود، سیر و تفریح کے ساتھ یہ کام بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے جامعہ کے بچے بھی اپنے کاموں سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک دن کے مدرسے کا حال آپ پیام تعلیم میں پہلے پڑھ چکے ہیں۔ جب بچے استادوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ پورا مدرسہ خود ہی چلاتے ہیں۔

اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا

قیمت ۸ر

"نرگس"

از سید منیر الحسن





سعید نے پھلواری کیا لگائی کہ کام کا ایک وسیع میدان ہاتھ آ گیا۔ اس میں اس نے اپنا پورا ہنر اور کاریگری دکھائی اور بڑے جتن کئے۔ اس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلی دو کیاریوں میں گلاب، گیندا، چنبیلی، موتیا اور کئی اور طرح کے پھول لگائے ان کے پیچھے والی دو کیاریوں میں سبزیاں اور پھر اس کے بعد والی کیاریوں میں سنترا مالٹا، نیبو، انار اور پپیتے کے ایک ایک دو دو پودے لگائے۔

یہی نہیں بلکہ پھلواری کا دروازہ کیلے کے پودوں سے سجایا اور اس پر لال، کاسنی پیلے اور سفید پھولوں کی خوب صورت بیلیں چڑھائیں اور سڑکوں کے دونوں طرف رنگ برنگے پھول گملوں میں لگائے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ سعید نے ان سب کو اس طرح لگایا تھا کہ دیکھتے ہی جی خوش ہو جاتا۔

وہ گھنٹوں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر اپنی پھلواری میں کام کرتا اور کبھی نہ تھکتا۔ وہ پھلواری کی زمین تیار کرتا، اس میں کھاد ڈالتا، بیج لاکر بوتا اور پانی

دیتا اور خوب دیکھ بھال کرتا۔ جہاں کہیں فضول گھاس نظر آتی اُسے کھُرپی سے اکھاڑ کر پھینک دیتا۔

صبح سویرے پھول توڑ کر اپنا کمرہ سجاتا۔ ہر ایک کو اپنی پھلواری کی سیر کراتا۔ ایک ایک چیز دکھاتا اور ان کی تفصیل اس طرح بیان کرتا کہ جیسے اس نے کوئی بہت بڑی چیز دریافت یا ایجاد کی ہے۔ مثلاً وہ کہتا کہ یہ پیڑ پودے ہماری ہی طرح جان دار ہیں۔ انھیں خوراک چاہیئے، پانی چاہیئے اور کھلی ہوا چاہیئے۔ جس میں یہ سانس لے سکیں۔ ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے کے لئے کھلی ہوا سورج کی روشنی اور گرمی چاہیئے۔



لوگ سعید کی پھلواری کو دیکھ کر خوش ہوتے، اس کی معلومات کی تعریف کرتے، اس کو اچھی اچھی باتیں بتاتے، اس کے سوالوں کا جواب دیتے، جو بات سمجھ میں نہ آتی سمجھتے اور سمجھاتے، اس طرح سعید ہر روز بہت سی نئی باتیں جان جاتا، اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا اور وہ برابر رات دن اس ٹوہ اور کوشش میں لگا رہتا۔

ایک دن کیا ہوا کہ جب وہ اپنی پھلواری میں کام کر رہا تھا تو ایک صاحب جو اس کے ابّا کے دوست اور ملنے والے تھے اس کی طرف آ نکلے۔ سعید نے نہایت ادب سے انھیں سلام کیا اور مصافحہ بھی۔ پھر ان سے باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں سعید سے اس کے والد کے دوست نے ایک پھول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ اس سفید پھول کا کیا نام ہے؟ سعید نے جواب دیا۔ "نرگس"۔

سعید کے والد کے دوست نے اس سے پہلے یہ پھول کبھی نہ دیکھا تھا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے۔ بھئی! اس سے پہلے تو ہم نے یہ پھول کبھی نہ دیکھا تھا۔ بڑا اچھا

پھول ہے یہ! میں نے اس کی بڑی تعریف سنی تھی اور ایک میں ہی کیا شاعر اور ادیب تک اس پھول کی تعریف کرتے ہیں۔

"مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کا یہ نام کیوں اور کیسے پڑا؟" یہ سننا تھا کہ سعید کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی اور چہرہ کھل اُٹھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا صاحب اس کی ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ یہاں تشریف رکھئے۔ میں آپ کو وہ کہانی ابھی سناتا ہوں۔

مگر ایک بات ہے ہماری دادی اماں کہا کرتی ہیں کہ "دن میں کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں!" اس کے ابا کے دوست زور سے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ سعید بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔ پھر انہوں نے سعید سے کہا کہ تمھاری دادی اماں تو اس لئے ایسا کہتی ہوں گی کہ تم انھیں دن میں کہانی سنانے کے لئے پریشان کرتے ہوگے۔ اس سے بچنے کے لئے انھوں نے تم سے یہ بات کہی ہوگی۔ اس سے زیادہ اس بات کی کچھ اور حقیقت نہیں۔ سعید نے کہا یہی بات ہوگی۔ اچھا تو سنئے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا جو جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ اپنے دوستوں سے بچھڑ گیا۔ وہ اپنے دوستوں کی تلاش میں دن بھر جنگل میں پھرتا رہا لیکن کوئی پتہ نہ چلا۔ آخرکار اس نے ایک جگہ درختوں کے درمیاں ایک چشمہ چمکتے ہوئے دیکھا۔ اسے پیاس لگی ہوئی تھی وہ اس طرف مڑ گیا۔

جب پاس پہنچا تو گرتے ہوئے پانی کی آواز سنی اور صاف شفاف پانی کی ایک ندی بہتی ہوئی دیکھی۔ بہت خوش ہوا اور اپنی جلتی ہوئی پیشانی کو ٹھنڈا کرتے اور خشک ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے پانی پر جھک گیا۔

پانی پر جھکنے سے اسے اپنی شکل یا پرچھائیں ایسی نظر آئی جیسے شیشے یا آئینے میں نظر آتی ہے۔ اس نے سوچا کہ یہ پانی کی کوئی خوب صورت پری ہے جو کہ چشمہ میں رہتی ہے۔ وہ پانی پینا بھول گیا۔ گھنگریالے بال اور خوب صورت چہرہ کو جوں جوں قریب سے دیکھتا وہ اور خوب صورت نظر آتا۔ اس نے اپنے ہاتھ پانی میں ڈالے وہ خوب صورت چہرہ ایک دم گم ہو گیا۔

یہ حال دیکھ کر لڑکا بہت اداس ہو گیا۔

اسے فکر ہوئی کہ شاید اب میں یہ خوب صورت چہرہ دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔ یہ خیال کر کے وہ اِدھر اُدھر بھاگ کر اسے ڈھونڈنے لگا۔ لیکن تلاش بالکل بے فائدہ اور بے کار ثابت ہوئی اور اس کا نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار وہ دوبارہ پانی کی طرف جھکا۔ اب پانی پہلے کی طرح بالکل صاف بہہ رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ چہرہ اب دوبارہ نظر آرہا ہے خوش ہو کر ہنسا تو وہ شکل بھی ہنسی، وہ بولا تو اس کے ہونٹ بھی ہلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ گویا وہ بھی بول رہی ہے۔

لڑکے نے کہا میں چاہتا ہوں اگر تم چشمہ سے باہر نکل آؤ اور میرے ساتھ رہو تو جو کچھ میرے پاس ہے یہ سب تمھیں دے دوں گا۔ یہ کہہ کر لڑکے نے اپنے دونوں بازو پھیلا دئے تو اس نے بھی ویسے ہی بازو پھیلائے مگر جب لڑکے نے اپنی بات کا جواب مانگا تو اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس سے وہ نا امید ہو کر رونے لگا۔ اس کے رونے سے جب آنسو پانی کی سطح پہ گرے تو چشمہ کا پانی دھندلا دھندلا معلوم ہونے لگا۔ اس پر لڑکے نے یہ خیال کر کے کہ اب پری پھر غائب ہو رہی ہے اس نے فوراً کہا۔ "اے خوب صورت پری ٹھہر جاؤ، جاؤ مت! میں اب تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف مجھے اپنی صورت دکھا دو!" اتنا کہہ کر وہ پانی کے کنارے جھک گیا اور سوائے اس خوب صورت چہرے کے سب کچھ بھول گیا۔

سورج غروب ہو گیا اور چاند چمکنے لگا لیکن لڑکا چشمہ کے کنارے بیٹھا رہا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اسے کئی دن گذر گئے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل کمزور ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مر گیا۔ اس کے دوست اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں آ نکلے۔ جہاں اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ بہت اداس ہوئے اور اس کو دفنانے کی تیاریاں کرنے لگے تو انھوں نے کیا دیکھا کہ وہاں بجائے مردے کے ایک خوب صورت ننھا سا پودا لگا ہوا ہے جس میں ایک خوشنما زردی مائل سفید پھول بھی کھلا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر انھوں نے کہا ارے یہ تو پھول بن گیا۔ تو پھر اب وہ یہ سوچنے لگے کہ اس پھول کا نام کیا ہو؟ ان میں

سے ایک دوست نے کہا کہ کیوں نہ ہم اس کا نام اپنے مرے ہوئے دوست کے نام پر رکھیں۔ چنانچہ سب نے اس کی یادگار میں اس کا نام "نرگس" رکھ دیا۔ جس کے نام سے یہ پھول آج تک مشہور ہے۔"

جب سعید یہ کہانی ختم کر چکا تو سعید کے والد کے دوست کہنے لگے کہ بھئی میاں سعید واہ۔ کیا لا جواب کہانی سنائی ہے اور کیا بات پیدا کی ہے کہ جی پھڑک اٹھا یہ سن کر سعید اٹھا اور جھٹ سے دوڑ کر نرگس کے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر لایا اور اپنے والد کے دوست کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس وقت سعید کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا اور دل باغ باغ ہو رہا تھا۔

(بقیہ مضمون چمپا تری کی دوستی صفحہ ۲۵ سے آگے)

وہاں سے کھڑے ہو گئے، ان کے ساتھ چمپا تری بھی کھڑا ہوا۔ جب کٹھرے کے دروازے پر پہنچے تو انھوں نے اس کو رخصتی سلام کیا اس نے بھی سلام کے جواب میں اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اور دونوں دوست ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

بقیہ دنیا کے سات عجائبات

صفحہ ۱۳ سے آگے

یادگاریں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے اس نے بھی سنگ مرمر کا ایک مینارہ بنوایا۔ جس کی چوٹی پر رات دن روشنی ہوا کرتی تھی۔ اور یہ روشنی تیس میل کی دوری سے بھی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ یادگار ایک کھنڈر کی شکل میں رہ گئی۔ مگر اب بھی اس کے قریب نیا روشنی کا مینارہ کھڑا ہے جو پچھلے مینارہ کی طرح بھٹکے ہوئے جہازوں اور کشتیوں کو راستہ بتاتا رہتا ہے۔

بس اب بھاگ جاؤ۔ بھیا نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ اب کل پھر سنائیں گے

اور میں سوچ رہی تھی کہ پہلے زمانے کے لوگ عجیب چیزیں ہی بنایا کرتے تھے۔

جنگل کا بھوت

سفیر احمد خاں



ایک سرسبز جنگل تھا۔ جس میں مختلف قسم کے جانور رہتے تھے۔ یہ جانور آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اس جنگل میں ایک شیر آنکلا۔ اس کو یہ ہرا بھرا جنگل اتنا پسند آیا کہ وہ اسی میں رہنے لگا۔ یہ شیر بوڑھا اور کمزور تھا اس لئے تمام دن دریا کے کنارے چپ چاپ پڑا رہتا جانوروں نے اس کو بھگت کہنا شروع کردیا۔ ہوتے ہوتے یہ بات مشہور ہوگئی۔ جانوروں کا اس کے یہاں مجمع رہتا۔ ہرایک اپنے دکھ درد کی کہانی شیر کو سناتا۔

جب دھیرے دھیرے جنگل میں جانور کم ہونے لگے تو ایک دن تمام جانور جمع ہوکر شیر کے پاس گئے۔ اور اپنی مصیبت کی داستان سنانے لگے۔ بوڑھا شیر کہنے لگا "ایک بڑی مصیبت آئی ہوئی ہے۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں ورنہ اس کا پتہ ضرور لگا لیتا۔" آخر یہ طے کیا گیا کہ پانچ چھ بیل شیر کے ساتھ مل کر اسکا پتہ چلائیں۔ ادھر شیر دوسرے تیسرے روز ان بیلوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ غار میں لے جاتا اور واپس آکر کہتا۔ "ایک بڑا خطرناک بھوت ہے اس نے بیل کو میرے پہنچنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔" اسی طرح اس نے سب بیلوں کو ایک ایک کرکے ختم کرلیا۔ جب وہ بیل اپنے گاؤں میں واپس نہیں پہنچے تو جانور بہت پریشان ہوئے انھوں نے ایک جلسہ کیا اور طے کیا کہ کچھ بیل جائیں اور پتہ چلائیں کہ دن بدن بیل کم کیوں ہوتے جاتے ہیں آخر کچھ منچلے بیلوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور وہ اس شیر کے پاس آئے۔ جب کئی دن ہوگئے اور شیر کو شکار کرنے کا موقع نہ ملا تو اس نے اپنے دل میں سوچا کیوں نہ

ان پانچ چھ بیلوں کو ایک ساتھ ختم کردوں۔ تاکہ میرے کام میں رکاوٹ نہ پڑے اور بھید نہ کھل پائے۔ آخر کار ایک دن شیر بولا۔ "بھائی! میرے ایک استاد ہیں بہت پہنچے ہوئے بھگت ہیں۔ اگر تم بھی ملاقات کرنا چاہو تو میرے ساتھ چلو" بیل تیار ہو گئے۔ وہ تو کچھ معلوم کرنے کے لئے اپنے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ چلتے چلتے شیر اور بیل غار کے منہ پر پہنچے۔ شیر کہنے لگا "بھائیو جگہ تنگ ہے۔ ایک ایک کرکے آؤ۔" ایک بیل اور شیر اس غار میں گھس گئے۔ دوسرے بیل سوچنے لگے ہمارے ساتھی کا شیر کے ساتھ جانا اور پھر اکیلے تو اور بھی برا ہے۔ سوچتے ہی وہ سب غار میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ بیل اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ اور شیر اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اب تو جھوٹے بھگت کی پول کھل چکی تھی۔ اور بیل فوراً سمجھ گئے، وہ اپنے ساتھی کو بچانے کے لئے دوڑے۔ شیر نے جب ان بیلوں



کو آتے دیکھا تو بہت گھبرایا۔ جان بچا کر بھاگنا چاہتا تھا کہ بیلوں نے چاروں طرف سے گھیر کر اپنی سینگوں سے مار ڈالا۔ سچ ہے مل جل کر کام کرنے سے بڑی سے بڑی مصیبت ٹل جاتی ہے۔ اب تو تمام جانور ہنسی خوشی رہنے لگے اور آئندہ کسی غیر کو انھوں نے اپنے جنگل میں گھسنے نہ دیا۔



یہ بونا ہے کھلونا ہے

بڑا موٹا
بہت چھوٹا
ہے اس کے ہاتھ میں سونٹا
یہ بونا ہے کھلونا ہے

یہ جب ہوٹل میں ہے جاتا
تو کھانا خوب ہے کھاتا
اسے جب دیکھتا بچّہ
تو جھٹ پٹ دوڑتا آتا
پر اٹھے سینک کر لاتا
اُچھلتا کودتا گاتا
یہ بونا ہے کھلونا ہے

یہ نیکر پہن کر چلتا
پجامہ اس کو ہے کھلتا



کسی سے جب ہے یہ مِلتا
تو اس کا ہاتھ ہے ہِلتا
یہ بونا ہے کھلونا ہے
یہ بونا ہے بڑا نٹ کھٹ
کہ چل سکتا نہیں جھٹ جھٹ

یہ جب کرسی پہ ہے چڑھتا
تو بن جاتا ہے جیسے نٹ
ہمیشہ اپنی جوروسے
کیا کرتا ہے یہ کھٹ پٹ
لگا یا کرتا ہے سونٹے
یہ سونٹا بجتا ہے کھٹ کھٹ
کبھی تھپڑ کبھی گھونسے
کبھی چٹ چٹ کبھی پٹ پٹ
یہ بونا ہے کھلونا ہے

یہ اس کا سر ہے یا مٹکا
جسے لگتا نہیں جھٹکا
بندھا رہتا ہے اِک پٹکا
تو پھر کس بات کا کھٹکا
یہ بونا ہے کھلونا ہے

مقبول احمد سیوہاروی



چمپانزی سے دوستی

عبدالحلیم ندوی

دوستوں اور یاروں سے تو آپ کئی بار گلے مل چکے ہوں گے۔ چھٹیوں میں گھر جاتے ہوئے اور گھر سے واپس آکر بورڈنگ میں پہونچنے کے بعد۔ اور جو لڑکے بورڈنگوں میں نہیں رہتے وہ بھی سال کے سال ہر عید میں ضرور اپنے ساتھیوں سے گلے ملتے ہوں گے۔ پر آپ کبھی کسی بن مانس چمپانزی سے بھی ملے ہیں؟ میں جانتا ہوں کہ کبھی نہ ملے ہوں گے۔ مگر میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو صرف بن مانس یا چمپانزی ہی سے گلے نہیں ملا بلکہ شیروں اور چیتوں سے بھی اس نے دوستی گانٹھی ہے۔ اور عمر بھر یہی کرتا رہا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس کے پاس کوئی جادو کا ڈنڈا تھا جسے ہلا کر وہ ان جانوروں کو اپنے قابو میں کر لیتا تھا اور نہ کوئی منتر کہ پڑھا اور جانور خود ہی دوست ہو گئے۔ البتہ اس کے پاس دوسرا منتر ضرور تھا۔ اور وہ آپ کے پاس بھی ہے۔ آپ میں اور میرے دوست میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس منتر کو استعمال کرتے تھے اور آپ شاید نہ کر پائیں۔ پر مجھے یقین ہے کہ آپ بھی وہ منتر استعمال کریں تو بہت سے

جانوروں کو دوست بنالیں ۔ پھر تو خوب گلے ملیں اور ان سے دوستی کرلیں ۔ ہاں تو وہ منتر کیا تھا ؟ وہ تھی صرف "ہمت" اور کچھ نہیں، لیجئے اب میں آپ کو اپنے دوست کا قصہ سناتا ہوں ۔ کہ کس طرح انھوں نے ہمت سے کام لے کر ایک چمپانزی سے دوستی گانٹھ لی ۔ سنئے ، اور اس کے بعد آپ کو بھی اگر کبھی موقع ملے تو آزما لیجئے ۔

میرے ان دوست کا نام تھا چارلس واٹرٹن ۔ اور رہنے والے تھے یارک شایر کے ایک گاؤں کے ۔ بچپن ہی سے ان کو جانوروں کا ، ان سے ملنے کا ، ان سے دوستی کرنے کا ، اور پھر ان کی ۔ ۔ ۔ ۔ اور باتیں معلوم کرنے کا بہت شوق تھا چنانچہ یہ ہمیشہ اپنے گھر سے غائب رہتے آج امریکہ کے جنگلوں میں گھوم رہے ہیں تو کل معلوم ہوا کہ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں ڈیرا جمائے پڑے کسی بن مانس یا چمپانزی سے دوستی کرنے کی ترکیبیں کر رہے ہیں ۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے کئی دفعہ مرتے مرتے بچے ، تم جانو جنگلی جانور تو پھر جانور، وہ کیا جانے کہ آپ دوستی کرنے آئے ہیں یا اسے مارنے ، اس نے تو آدمی دیکھا اور بھوکا ہوا تو پڑ گیا پیچھے ، اب آپ لاکھ کہئے کہ بھیا میں تو دوستی کرنے آیا ہوں ، تمھیں مارنے یا پکڑنے نہیں آیا وہ بھلا کیا سمجھے ، مگر بھئی یہ تھے بڑی ہمت کے آدمی اور پکے اپنی دھن کے ، کبھی یہ کام نہ چھوڑا ، جبھی تو آج دنیا ان کو جانوروں کے معاملے میں سب سے بڑا آدمی سمجھتی ہے ۔ اے لو میں تو آپ کو ان کا قصہ سنانے جا رہا تھا کہ انھوں نے کس طرح ایک بہت خطرناک چمپانزی سے بھی دوستی کی ۔ اور لے بیٹھا کیا بکھیڑا ۔ اچھا یہ قصہ سنئے ۔

چارلس واٹرٹن جب چڑیوں اور چھوٹے موٹے جنگلی جانوروں کو دیکھ کر ان سے مل کر پوری معلومات جمع کر چکے تو ان کا جی چاہا کہ اب کسی چمپانزی بن مانس سے دوستی کر کے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہئیں ۔ اسی فکر میں وہ کئی برس تک افریقہ کے جنگلوں میں

مارے مارے پھرے، پر کوئی چمپا نزی ایسا نہ ملا جس سے یہ دوستی کر سکتے آخر مجبور ہو کر گھر واپس آ گئے۔ گھر آئے ابھی کچھ ہی دن گذرے تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ لندن کے چڑیا گھر میں ایک بن مانس ابھی آیا ہے، اب کیا تھا بہت خوش ہوئے، دوسرے ہی دن لندن روانہ ہو گئے۔ اور سیدھے چڑیا گھر پہنچ گئے، وہاں جا کر معلوم ہوا کہ چڑیا گھر کے نگراں اتفاق سے ان کے ایک دوست مسٹر میشال ہیں، اب تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، اندھا کیا چاہئے دو آنکھیں۔ جب ان کے پاس پہنچے، وہ دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئے، اور لگے گلے ملنے، واٹر ٹن نے کہا کہ بھائی دیکھو میں اصل میں تم سے گلے ملنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس چمپا نزی سے جو ابھی کچھ دن ہوئے تمھارے چڑیا گھر میں آیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ ان کے دوست بولے کہ میاں ہوش نا لو۔ چمپا نزی سے گلے ملنا تو رہا دور! تم بھی اس کے پاس بھی نہ پھٹک جانا۔ جا ہو بڑا خطرناک جانور ہے۔ اب تو واٹر ٹن صاحب کی ساری خوشی خاک میں مل گئی، کیا سوچ رہے تھے، اور کیا ہو گیا۔ پر اس وقت مصلحت سمجھ کر چپ ہو گئے، دوسرے دن چمپا نزی کو کٹھرے کے اندر خوب جی بھر کے دیکھا، واقعی بڑا خطرناک جانور تھا۔ جہاں کسی لڑکے نے اس کی طرف مونگ پھلی یا کوئی چیز پھینکی جھٹ اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا یا اگر کسی نے بھولے سے بھی ایک کنکر اس کی طرف پھینک دیا تب نہ پوچھو اس کے غصہ کی حالت، فوراً منہ کھول، بڑے بڑے دانت نکال شیر کی طرح اسکی طرف جھپٹتا، وہ تو کہو کہ سامنے کٹہرا آ جاتا ورنہ اس کا بس چلتا تو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔ واٹر ٹن جوں جوں چمپا نزی کو دیکھتے اس سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے کا شوق اتنا ہی بڑھ جاتا، آخر ان سے نہ رہا گیا! یہ اپنے دوست کے پاس آئے اور ان کی بڑی منت سماجت کی کہ خدا کے لئے تم مجھے کٹھرے میں پہنچا دو، ان کے دوست یہ سن کر

بگڑ گئے" کہ کیا مطلب ہے تمہارا کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ میں بھی اپنی جان دوں، تمہیں تو چمپا تری چیر پھاڑ دے گا اور مجھے حکومت پھانسی دے دے گی کہ کیوں میں نے تمہیں اس کے پاس جانے دیا، تا بابا میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوں کہ تمہیں کٹھرے کے اندر جانے دوں، تمہیں جو کچھ اسکے متعلق معلومات جمع کرنی ہیں کٹھرے کے باہر ہی سے دیکھ کر جمع کر لو۔ میں اس کے اندر تو تمہیں نہ جانے دوں گا۔ نہیں بھائی۔ والٹرٹن بولے" تم میری فکر بالکل نہ کرو، مجھے چمپا تری کوئی دکھ نہ دے گا، تم دیکھ لینا میں اس سے دوستی کر لوں گا، یہی تو میرا کام ہے میں تو اس سے بھی زیادہ خطرناک جانوروں سے مل چکا ہوں، شیر چیتا، لکڑبگھا، بھلا ان سے بھی زیادہ وہ چمپا تری خطرناک ہو سکتا ہے، تم خدا کے لئے مجھے اندر جانے دو "اچھا لو سنو۔ ان کے دوست نے کہا" ایک شرط ہے"۔ "ہاں ہاں میں ہر شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بس تم مجھے کٹھرے کے اندر جانے کی اجازت دے دو، والٹرٹن نے جواب دیا" شرط یہ ہے کہ۔ ان کے دوست بولے" کہ تم مجھے یہ لکھ کر دے دو کہ اگر مجھ کو اس جانور نے کوئی نقصان پہنچایا تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں" "میں اس کے لئے بالکل تیار ہوں اس نے خوش ہو کر کہا" یہ لو پرچہ میں سب کچھ لکھے دیتا ہوں، اب تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ یہ کہہ کر جھٹ ایک پرچہ لکھ کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اب دونوں دوست چمپا تری کے کٹھرے کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ پانچ چھ لڑکے اسے گھیرے ہیں اور ستا رہے ہیں، چمپا تری غصہ میں چیخ رہا ہے، اپنے بڑے بڑے، ڈراؤنے دانت نکال کر ان کے اوپر جھپٹ رہا ہے۔ بے بیچارہ کرے تو کیا کرے کٹھرے میں بند تھا۔ جب والٹرٹن کے دوست نے چمپا تری کو اس طرح غصہ میں دیکھا تو کہا کہ بھئی اس وقت کٹھرے کے اندر جانا مناسب نہیں ہے۔ دیکھو چمپا تری کتنے غصہ میں ہے، جب ذرا اس کا غصہ کم ہو، اور کھانا دانا

کھالے تب جانا، مگر واٹرٹن صاحب کو کہاں تاب، فوراً بول اٹھے نہیں دیکھو تم نے وعدہ کیا تھا کہ پرچہ لکھ کر دے دوں تب تم مجھے ضرور اندر جانے دوگے، میں نے اپنی بات پوری کر دی اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو اور خدا کے لئے تالا کھول کر مجھے کٹھرے کے اندر جانے دو، آگے میری قسمت تم کیوں ڈر رہے ہو۔ مجبور ہو کر انھوں نے کٹھرے کا دروازہ کھول دیا اور کہا کہ جاؤ خدا تمھاری حفاظت کرے تم جان کر اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ دروازہ کھلتے ہی واٹرٹن دندناتے اندر گھس گئے اور بڑے مزے سے ٹہلتے ٹہلتے ادھر ادھر دیکھتے چمپانزی کی طرف چل دیئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اتنے خطرناک جانور کٹھرے میں نہیں ہیں بلکہ اپنے باغ میں صبح کے وقت تفریح کر رہے ہیں۔ اتنی دیر میں چمپانزی لڑکوں سے لڑ جھگڑ کر ایک کونے میں لکڑی کی ایک پٹری پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ جب اس نے ایک آدمی کو اپنے پاس بغیر ڈرے بڑی لاپروائی سے آتے دیکھا تو کچھ چونکا، اور ذرا اپنی گردن اٹھا کر غور سے دیکھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ آدمی چلا ہی آرہا ہے تو ذرا اپنے دانت نکالے، پر واٹرٹن بالکل نہ ڈرے اور برابر اس کی طرف بہادری سے بڑھتے گئے، جب چمپانزی نے دیکھا کہ آدمی بالکل نہیں ڈر رہا ہے اور چلا ہی آرہا ہے تو سنبھل کے بیٹھ گیا۔ اتنے میں یہ اس کے بالکل پاس آگئے، اور ایک منٹ کے بعد اس کے سامنے کھڑے ہوگئے اور بغیر ڈرے انھوں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، چمپانزی نے بھی ہاتھ اٹھا کر ان کو سلام کا جواب دیا، اب کیا تھا، واٹرٹن نے کہا پالہ مار لیا۔ جھٹ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیئے اور چمپانزی نے بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیئے۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگ گئے۔ اور بڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے رہے جیسے بہت دنوں کے بچھڑے ساتھی آج اتفاق سے مل گئے ہوں۔ جب گلے مل چکے تو واٹرٹن صاحب بڑے اطمینان سے اس کے پاس بیٹھ



گئے، اور بڑی محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی ہتھیلی کی لکیروں کو پڑھنے لگے۔ جیسے کوئی نجومی کسی کا ہاتھ دیکھ رہا ہو جب ہاتھ دیکھ چکے تو اس کی پیشانی دیکھی، اس پر جتنے بل پڑتے تھے انھیں گنا پھر اس کے کان چھو کر دیکھے، اور چمپاتزی بغیر کچھ کہے سنے سب کچھ کراتا رہا۔ اور سب سے زیادہ مزہ تو اس وقت آیا۔ جب واٹر ٹن صاحب نے چمپاتزی کا منہ پکڑا تھوڑی دیر تک ہلاتے رہے پھر اس کا منہ کھول دیا

اور اس کے دانت گننے لگے، اندر واقعہ ذرا صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی تو چمپاتزی سے اشارہ سے کہا کہ ذرا اپنا منہ روشنی کی طرف کرے اور اس نے بغیر چوں چرا کئے اپنا منہ دھوپ کی طرف کر دیا، اور انھوں نے اندر ہاتھ ڈال کر ڈاڑھ ٹٹول کر دیکھی، پھر اس کی زبان چھوئی، مسوڑھے دیکھے جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس کا منہ بند کر کے چپکے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے لمبے لمبے بالوں سے کھیلنے لگے۔ واٹر ٹن صاحب جیسے

تھے کہ انہیں کو جانوروں کی چیزیں دیکھنے کا شوق ہے، انھیں کیا خبر تھی کہ ان کا دوست چمپانزی بھی بہت شوقین ہے۔ چمپانزی نے جب دیکھا کہ واٹرشن صاحب سب دیکھ داکھ کر بیٹھ گئے تو اس نے ان کا ہاتھ لیا اور ان کی ہتھیلی بڑے غور سے دیکھنے لگا جب ہتھیلی دیکھ چکا تو ان کے کان چھوئے اِدھر اُدھر دیکھا کان کے سوراخ میں جھانک کر دیکھا، پھر ان کی ناک چھوئی، پیشانی دیکھی، غرض ہر ہر حصہ دیکھ ڈالا، پھر ان کے منہ کے پاس انگلی لے جا کر اشارہ کیا کہ یہ کھولو انھوں نے جھٹ منہ کھول دیا، اور اس نے منہ کے اندر جھانک کر ادھر ادھر خوب غور سے دیکھا، اسے شاید اب شبہ ہوا کہ میرے منہ میں ان کے منہ میں کچھ فرق ہے چنانچہ اس نے ایک دفعہ ان کے منہ پر اپنا ہاتھ پھیرا پھر کچھ تعجب کے انداز میں اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا، خدا معلوم کیا سمجھا کیا نہیں، بہر حال نطف تو اسی وقت آیا جب اس نے ان کے سر کے بال دیکھے اور ہاتھ سے چھوئے اسے ان کے بال نرم اور مانگ نکلی ہوئی دکھائی دی، پھر اپنے سر کے بال جو چھوئے تو کچھ سخت اور بے ترتیب معلوم ہوئے، اب تو اس کو الجھن ہو گئی، بار بار ان کے سر کے بال چھوتا، پھر اپنے بال پکڑتا، پھر ان کے سر کو ادھر ادھر سے دیکھتا پھر اپنے سر کے بالوں کو نوچنے لگا، اب ذرا واٹرشن صاحب گھبرائے کہ کہیں اپنے بال نوچتے نوچتے میرے بالوں کی نوبت نہ آجائے! آدمی تھے بہت چالاک، جھٹ انھوں نے اپنی جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور لگے دھکا دھک دھوئیں کے گولے نکالنے۔ چمپانزی نے اپنی عمر میں اتنے قریب سے یہ اچنبھا کاہے کو دیکھا تھا، لگا بڑے غور سے اُسے دیکھنے، واٹرشن اس کے دل کی بات سمجھ گئے فوراً انھوں نے دوسری سگریٹ نکال اس کے منہ میں لگا کر سلگا دی۔ اب وہ بھی دھوئیں کے بادل اڑانے لگا، اور خوشی میں بار بار اپنے دانت نکال کر ان کی طرف دیکھتا۔ اب دیر کافی ہو چکی تھی اور واٹرشن صاحب اپنا کام پورا کر چکے تھے اس لئے

بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے


یہ تحفہ اس چور کو دیجیئے گا جس نے میرے
پڑوسی کا ریڈیو سٹ چرایا ہے۔

نجمہ سلطان

پرانی دنیا کے سات عجائبات

بھیا روز ہی کہتے کہ تم تو پرانی دنیا کی سات عجائبات میں سے ایک ہو۔ اور میں روز ہی سوچ کر چپ ہو جاتی کہ آخر یہ کیا عجیب چیزیں ہیں جن کا بھیا روز ذکر کرتے ہیں

لیکن آخر کہاں تک۔ ایک دن میں بھیا سے لپٹ ہی تو گئی۔ بھیا قسم ہے آپ کو (بھی) آج ضرور بتائیے"

اب بھیا ڈانٹ رہے ہیں مگر میں بھی تو آج کچھ بھی ہو پوچھ کر ہی دم لوں گی۔ آخر بھیا بھی مجبور ہو گئے اور "بولے خاموش بیٹھو۔ زیادہ بک بک کروگی تو سناؤں گا بھی نہیں"

بھیا نے ایک خوب صورت رنگ برنگی تصویروں والی کتاب نکالی۔ اور ایک تصویر رکھ دی......"

بھیا۔ اچھا بتاؤ یہ کیا چیز ہے۔

میں۔ واہ مجھے کیا خبر یہ تکونے تکونے سے پہاڑ ہیں۔ آپ کیا کرنے لگے کام کی باتیں بتائیے۔

بھیا۔ جب ہی تو کہتا ہوں کہ عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل ہو۔ ارے یہی تو سات عجائبات میں سے ایک ہے۔

میں۔ واہ یہ تو پہاڑ ہیں۔

بھیا۔ (بات کاٹتے ہوئے) سنتی ہو کہ نہیں۔ یہ در اصل پرانے مصری بادشاہوں کے مقبرے ہیں......"

میں۔ تو بھیا مصری اتنے بڑے ہوتے ہیں۔

بھیا۔ نہیں بھئی۔ یہ مقبرہ کیا اچھے خاصے گھر ہیں۔ پرانے زمانے میں مصر میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی بادشاہ مر جاتا تھا تو اس کی تمام ضرورت کی چیزیں مثلاً قیمتی کپڑے زیورات گاڑیاں مسہریاں۔ اور حتیٰ کے نوکروں کی مورتیاں دیوی دیوتاؤں کی سونے کی بنی ہوئی مورتیاں سب رکھتے تھے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد یہ سب چیزیں اس کے کام آئیں گی۔

ایک خاص بات اور تھی وہ یہ کہ وہ مردے کو ایک خاص قسم کا مصالحہ لگا کر رکھتے تھے۔ تاکہ وہ خراب نہ ہو۔ ایسے مردے کو انگریزی میں ممی کہتے ہیں۔

میں۔ کیا مصالحہ لگا ہوا مردہ خراب نہیں ہوتا۔

بھیا۔ نہیں ان کے خاص طریقے تھے اس کام کے لیے کچھ خاص لوگ ہوتے تھے جو مہینوں محنت کرکے بادشاہ کے جسم کو تیار کرتے تھے۔

اس زمانے میں بھی یہ لاشیں اچھی خاصی شکلوں میں نکلی ہیں۔

یہ دیکھو بھیا نے ایک خوب صورت ڈبے کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ کس طرح جواہرات اور سونے کے پتروں سے مردے کو سجایا ہے۔ اس کا تاج اس کو پہنایا ہے۔ تاج کیا ہے دو سونے کے سانپ ہیں۔

میں۔ بھیا۔ کیا بالکل اصلی حالت میں ہے اس کی لاش۔

بھیا۔ نہیں سوکھ گئی ہے۔ دیکھو اس کے مقبرے میں اس کا سونے کا بنا ہوا سر نکلا ہے

بھیا نے ایک سر کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ جس کے سر پر بھی دو سانپ بنے ہوئے تھے۔

میں۔ بھیا اس بادشاہ کا کیا نام تھا۔

بھیا۔ اس کا نام تھا۔ توت تخ امون۔

میں۔ اچھا یہ مقبرہ اندازاً کتنے لمبے اور بڑے ہوتے تھے۔

بھیا۔ ان میں سب سے بڑا مقبرہ ۴۸۱ فٹ اونچا۔ اور چوڑائی میں اس کا ایک چوتھائی حصہ ۷۵۵ فیٹ چوڑا ہے۔ یہ تقریباً پندرہ ایکڑ زمین پر بنا ہوا ہے اس کو سو ہزار لوگوں نے مل کر ۲۰ سال میں بنایا تھا۔

میں - اچھا تو اب جو یہ چیزیں تھی ہیں تو کہاں ہیں۔

بھیا - کچھ تو مصر کے عجائب خانہ میں ہیں اور کچھ لندن میں ہیں - دیکھنے کے قابل ہیں۔

میں - اچھا اب دوسری عجائبات کیا ہیں۔

بھیا نے جلدی سے کئی صفحے پلٹے۔ اور خوب صورت سی رنگین تصویر دکھائی یہ ایک باغ کی تصویر تھی - جو ستونوں پر بنا ہوا تھا۔

میں - یہ کیا ہے

بھیا - یہ ہیں HANGING GARDENS یعنی جھولنے والے باغ - یہ بابل میں تھے۔ تم نے بابل شہر کا نام تو سنا ہوگا - پرانے زمانے کا ایک خوب صورت اور تہذیب یافتہ شہر تھا۔

ایک زمانہ میں وہاں نیبو چد نزار نام کا بادشاہ حکومت کرتا تھا - جس نے شہر کے چاروں طرف ایک دیوار بنوائی تھی اور شہر کو طرح طرح سے سجایا تھا۔ اس نے یہ باغ اپنی بیوی امیٹس کیلئے بنوایا تھا۔ اس کی بیوی پہاڑی علاقہ کی رہنے والی تھی - اور بابل تھا میدانی علاقہ۔ اب جب وہ محل پر سے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی میدان ہی میدان نظر آتے - تو اس کا دل اداس ہو جاتا اور اپنے وطن کو یاد کرنے لگتی - جب بادشاہ اس کو اداس دیکھتا تو اس کو بھی افسوس ہوتا - اس لئے اس نے یہ ترکیب سوچی

پھر ان کو HANGING GARDENS کیوں کہتے ہیں۔

بھیا - بادشاہ نے کھوکلے ستون کھڑے کروائے جن کی اونچائی تقریباً تین فیٹ تھی ان پہ بالا خانہ بنواکر ان پر طرح طرح کے حسین پھول پودے جھاڑیاں لگوائے - باغ میں جگہ جگہ بارہ دریاں بنوائیں - اس طرح اس سے بہت بڑی جگہ میں یہ باغ لگوائے - جو دیکھنے میں پہاڑی علاقہ لگتے تھا۔

اس طرح بادشاہ کی عقلمندی سے اس کی بیوی خوش ہو گئی۔

میں - اب تیسری عجیب چیز۔

بھیا - یہ ڈائنا کا مندر ہے

میں - بھیا کون ڈائن۔

بھیا - عجیب احمق ہو - ارے بھئی ڈائنا - یہ یونانیوں کی ایک بہت ہی اچھی دیوی تھی - یہ اپنی اچھائی اور نیکی کی وجہ سے بہت مشہور تھی - اس کو روم والے بھی پوجتے تھے یہ اس کو ارٹمیس کہتے تھے - بعض لوگ اس کو چاند

کی دیوی کہتے تھے۔

بھیا نے ایک حسین عورت کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ دیکھو اسے ہمیشہ تیر و کمان لئے گاڑی پر سوار دکھایا جاتا ہے۔ یہ لمبی عباء پہنے ہوئے ہے اور اس کی پیشانی چاند کی کرنوں سے جگمگاتی ہے۔

یونانی اس دیوی کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے اس لئے انہوں نے اس کی یاد میں ایک لاجواب مندر بنوایا۔ جس کی نقش نگاری اور خوبصورتی کی وجہ سے یہ دنیا کی سات عجائبات میں سے ایک مانی جاتی ہے

بھیا۔ (ذرا دم لے کر بولے) جلدی سے چوتھی چیز کے بارے میں سن لو۔ باقی پھر۔

میں۔ نہیں بھیا۔ میں تو ابھی سب سنوں گی۔

بھیا۔ اچھا اچھا سنو۔ ہاں تو چوتھی چیز ایک بہت بڑا مجسمہ ہے

تم نے سمرنا کا نام تو سنا ہوگا۔ ترکی کا بندرگاہ۔ اس سے بارہ میل دور ایک جزیرہ ہے۔ جسے رہوڈس کہتے ہیں۔ یہ پہاڑی جگہ ہے اور لمبائی چوڑائی تقریباً ایک ہزار میل ہوگی۔

اب تو خبر نہیں مگر سکندر اعظم کے زمانہ میں یہ بہت شاندار مانا جاتا تھا۔ اس کے بندرگاہ کے دروازہ پر ایک بہت بڑی پیتل کی بنی ہوئی مورت کھڑی تھی۔ جو کہ ۱۰۰ فیٹ اونچی تھی۔ اس کے بنانے میں بارہ سال لگے تھے۔ اس کو اسطرح کھڑا کیا تھا کہ اس کا ایک پیر ایک کنارے پر دوسرا دوسرے پر۔ کشتیاں اس کے نیچے سے ہو کر گذرتی تھیں۔

میں۔ اب کیا ہوا۔

بھیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی ۲۰۰ برس پہلے۔ ایک زلزلہ آیا جس نے اس مورت کو گرا دیا۔ اور بہت مدت تک یہ وہاں پڑی رہی آخر کار ۶۷۲ء میں اسے ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ جس نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر لئے۔ اور ان ٹکڑوں کو ۹۰۰ اونٹوں پر لاد کر لے گیا۔

بھیا۔ پانچویں چیز بھی ایک مورت ہے

میں۔ یہ کس کی مورت ہے۔

بھیا۔ یہ بھی ایک یونانی دیوتا کی مورت ہے جس کو یہ لوگ زیس کہتے تھے۔ یونان میں ایک جگہ تھی اولمپیا یہاں پرانے زمانے میں ہر

چوتھے سال میں ایک میلہ لگتا تھا۔ اور مختلف قسم کے کھیل ہوا کرتے تھے۔ اسی میدان میں ایک مندر ہے اور زلیس کی قبر ہے۔ زلیس کا درجہ تمام یونانی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ بلند تھا۔ رومی اسی دیوتا کو جیوپیٹر بھی کہتے ہیں۔

اس دیوتا کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اسی لئے اسی کی ایک مورتی بنائی گئی۔ یہ سونے اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مورت کی اونچائی ۴۰ فیٹ ہے۔ یہ پوری ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا سر کٹے ہوئے سونے کا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں فتح کا نشان اور الٹے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ جس کے سرے پر ایک عقاب بنا ہوا تھا۔

میں۔ اب دو چیزیں رہ گئیں۔

بھیا۔ میرا شکریہ ادا کرو۔ خوب اچھی اچھی چیزیں کھلاؤ تو روز ہی اتنی عمدہ باتیں سنایا کروں۔

بھیا۔ ہاں بھئی تو چھٹی چیز ایک مقبرہ ہے۔ جس کو میسولیم کہتے ہیں۔ یہ اتنا مشہور ہے کہ اب تو انگریزی میں ہر بڑے مقبرے کو موسولیم کہنے لگے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے کیریا کا دار سلطنت تھا۔ یہاں کا بادشاہ تھا میسولس اور اس کی بیوی تھی آرتی میسیا۔ جو کہتے ہیں کہ اس کی اپنی بہن بھی تھی۔ کیونکہ پہلے زمانے میں یہ بات بری نہیں سمجھی جاتی تھی اور پھر بادشاہوں میں تو اور بھی اچھا سمجھتے تھے۔ آرتی میسیا اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھی اس لئے جب بادشاہ مرگیا تو اس نے اس کے لئے ایک بہت ہی اچھا مقبرہ بنوایا۔ جس کی چوٹی پر چار گھوڑے کھڑے تھے۔ جن پر بادشاہ اور ملکہ کی مورتیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔

اب تو شاید اس کے کھنڈر بھی نہ ہوں۔ ہاں سنا ہے کہ لندن کے عجائب گھر میں اس کا چھوٹا سا ماڈل بنا ہوا ہے۔

میں دیکھ رہی تھی کہ بھیا کا دل گھبرا رہا ہے۔

جلدی سے بولے بس ایک چیز اور رہی۔ تم نے مصر کی بندرگاہ سکندریہ کا نام تو سنا ہوگا۔ یہاں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے ایک بادشاہ پتولیمی حکومت کرتا تھا۔ اس کا بھی دل چاہا کہ کوئی یاد چھوڑ جاؤں۔ تاکہ لوگ یاد رکھیں۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کو اپنے

بقیہ صفحہ ۲۲ پر دیکھئے

ریحان احمد عباسی

سیّد کا مزار



شیخ رمضانی کی دوستی دلاور خاں سے ہو گئی۔ دونوں پڑوسی تھے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا جب دلاور خاں اپنے وطن افغانستان جانے لگے تو شیخ رمضانی کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ راستہ ہی میں دلاور خاں نے کہا کہ بھئی شیخ جی ہمارے ملک میں سیّدوں کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اگر تم ہمارے یہاں اپنی خاطر کرانا چاہتے ہو تو بس شیخ سے سید بن جاؤ۔

ابھی یہ دونوں دوست افغانستان پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ راستے میں دس بارہ ڈاکوؤں کی جماعت مل گئی اور انھوں نے ان دونوں پر حملہ کر دیا۔ شیخ جی موقع پاکر کھسک گئے ڈاکوؤں نے دلاور خاں کو جان سے مار ڈالا۔ اب شیخ جی نے اکیلے ہی افغانستان جانے کی ٹھانی۔ انھوں نے سورج غروب ہو جانے کی وجہ سے رات اسی گھاٹی میں گذاری۔ صبح اٹھ کر وہ بستی کی طرف چل پڑے پٹھانوں کی بستی سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے بڑے قدآور پٹھان سامنے منظر آرہے تھے۔ انھیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ ٹھکے ہارے پہنچ تو گئے۔ اب وہ ان مکانوں کی طرف بڑھے۔ ابھی اپنی دھن میں چلے ہی جا رہے تھے کہ اکدم سے جیسے کسی نے ڈانٹا۔

"السلام علیکم"

انھوں نے گھبرا کر جواب دیا وعلیکم السلام، اور ایسی صورت بنالی جیسے کہہ رہے ہوں، بھائی غلطی ہوئی مجھے معاف کرنا۔ اب پٹھان شیخ جی کی طرف بڑھا۔ "خو تم کون ہے؟" شیخ جی پہلے تو سٹ پٹائے کہ کیا جواب دیں پھر دلاور خاں کی بات یاد آگئی بولے" خان۔ "میں سید ہوں۔ آلِ رسول؟" خان یہ سُن کر بے حد خوش ہوا اس کی باچھیں کھل گیئں۔ خان نے فوراً انھیں بڑھ کر گلے لگا لیا اور بولے" خو، تم امارا مہمان ہے؟" خان نے انھیں مسجد میں ٹھہرایا اور گھر سے کھانا لینے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کوئی دوسرا خان آیا اس نے بھی پہلے والے خان کی طرح ویسے ہی زور دار سلام کیا اور وہی سوال کیا "خو، تم کون اے؟"

اب شیخ جی کو نسخہ معلوم ہو گیا تھا وہ کیوں گھبرانے لگے۔ فوراً بولے "خان ام سید ہے آلِ رسول؟"

خان بولا" خو، تم سیدّ ہے، الحمد اللہ۔ تم آج امارا مہمان ہے۔ ام ابھی آتا ہے؟"

اسی طرح کئی خان آئے اور شیخ جی سے کہہ کہہ کر چلے گئے۔ اب ذرا سی دیر بعد سب اپنا اپنا کھانا لے کر آگئے۔ اب جو انھوں نے دیکھا کہ سید صاحب سب پٹھانوں کے مہمان ہیں تو وہ سب ناراض ہو گئے۔ اور بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ کر بولے۔

"پیر صاحب! یہ کیسے او سکتا ہے، خو، تم سب کا میہان اہے، ام تم کو مار ڈالے گا؟" یہ سُن کر وہ سناٹے میں آگئے۔ مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئے اور بولے" خان بھائی۔ ہم تم کو ایک بات بتائیں گے مانو گے؟ ایک خان نے کہا" ام ضرور مانے گا۔ تم کہو کیا کہتے ہو، مگر پھر تم کو امارا کھانا کھانا پڑے گا۔

شیخ جی نے کہا۔" اس کھانے کو ایک دیگ میں ڈال دو؟ سب نے ڈال دیا۔ اب شیخ جی نے کہا۔ ایک دستر خوان بچھایئے۔ سب بھائی مل کر ایک ساتھ کھائیں گے۔ آلِ رسول اکیلے نہیں کھاتے؟

اب تو پٹھان بہت خوش ہوئے اور کھانا کھا کر ہنسی خوشی اپنے اپنے گھر چلے گئے اور اب تو شیخ جی کا دن عید اور رات شب برات کی طرح گذرنے لگی۔ سب پٹھان ان کی عزت کرتے تھے۔

ایک بار رات کے وقت پیروں کی آہٹ جو ہوئی تو نقلی سید صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ چار پانچ آدمی ہاتھ میں چاقو لئے کھڑے ہیں۔ اب تو سید صاحب کا حال کچھ نہ پوچھو۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ سید صاحب گھبرا کر بولے:

"ارے۔ خان بھائی کیا قصہ ہے، یہ چاقو کیسا؟"

خان بڑی نرمی سے بولا۔

"خو، تم نہیں جانتا امارا بڑا بے عزتی ہوا ہے۔ امارا گاؤں کے پاس دوسرا گاؤں ہے۔ خو، اس گاؤں میں ایک سید کا مزار اے۔ امارے یہاں کوئی مزار نہیں۔ وہ گاؤں کا لوگ امارا بہت مذاق اڑاتا ہے اور اپنے مزار پر خوب پھول چڑھاتا ہے۔ خوب عرس کرتا ہے اور ام ان کا منہ دیکھتا ہے۔ وہ ام کو طعنہ دیتا ہے اور ام کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب ہم نے سوچا ہے کہ تم کو ام شہادت کا درجہ دے کر تمہارا مزار بنائے، اور خوب زوروں پر عرس کرائے گا، پھول چڑھائے گا۔ اور ایسا مزار کہ پھر وہ گاؤں والا آپ شرمندہ



ہو جائے گا ایسا مزار دنیا میں کہیں نہ ہوگا۔ خو تم خوش اے؟"

پہلے تو شیخ جی سٹ پٹائے مگر پھر سنبھل کر بولے "خان مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم ہماری اتنی عزت کرتا ہے۔ مگر آج منگل کا دن ہے شہادت کے لئے جمعرات کا دن ہوتا ہے" خان یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور جمعرات کی بات سمجھ کر اپنے گھروں کو خوشی خوشی واپس چلے گئے۔ آپ جانتے ہیں پھر کیا ہوا؟ شیخ جی نے اپنے کان پکڑے اور رات ہی رات وہاں

لطیفے



ماسٹر:- کیا تمھارا لڑکا آج بیمار ہے۔

باپ:- ہاں آپ کی مہربانی سے بیمار ہے۔

ماسٹر:- (حیرت سے) میری مہربانی سے؟

باپ:- جی ہاں، آپ ہی نے تو اس سے پوچھا تھا کہ اگر ڈیڑھ منٹ میں ایک سیب کھایا جائے تو بیس سیب کتنی دیر میں کھائے جائیں گے۔ چنانچہ وہ گھڑی سامنے رکھ کر سیب کھاتے بیٹھا۔ اور پندرہ سیب کھا کر بیمار پڑ گیا۔

موہن:- آج تمھیں ماسٹر صاحب کے مارنے سے کچھ تکلیف ہوئی تھی۔

سوہن:- (فخر سے) بالکل نہیں

موہن:- پھر تم دھاڑ مار کر رو کیوں رہے تھے۔

سوہن:- اس لئے کہ ماسٹر صاحب مارنا بند کر دیں۔

صاحب:- سات دن سے میرا کتا کھو گیا ہے

دوست:- آپ اس کے لئے اخباروں میں اشتہار کیوں نہیں دیتے۔

صاحب:- کیا فائدہ؟ کتا تو پڑھ ہی نہیں سکتا۔

رضا حسین زیدی - جامعہ نگر - دہلی

اجنبی:- (محمود سے) کیوں بھائی صاحب احمد صاحب کا کیا نام ہے مجھے ان کو کچھ تحائف دینے ہیں۔

محمود:- جی ان کا نام محمود ہے۔

طوفان میل کے سکینڈ کلاس میں صرف دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک نے

کہا۔ کہ میرا خیال ہے کہ شاید کل میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

دوسرا: کل دن بھر تو میں گھر سے نہیں نکلا۔ ہاں رات کو چوری کرنے ضرور نکلا تھا۔

فاروق علی ۔ دریاآباد

استاد (موہن سے) بتاؤ بحری فوج کسے کہتے ہیں۔

موہن ۔ جس فوج کو سنائی نہ دیتا ہو۔

استاد: سونا کہاں پایا جاتا ہے۔

ایک لڑکا: جناب کان میں۔

دوسرا لڑکا: تب تو کان پر ڈھکن لگا کر رکھنا چاہیے۔ کہیں گر نہ جائے۔

جے پال سنگھ بھاٹیہ ۔ جمشید پوری

نثار ۔ امی! ماسٹر صاحب نے مجھے آج بہت مارا۔

ماں: کیوں؟

نثار: (منہ بنا کر) معلوم نہیں کیوں ۔ پہلے تو خود ہی کہا کہ تم ناکامیاب لڑکوں میں اول رہے ۔ دن بہ دن ہوشیار ہوتے جا رہے ہو ۔ اور پھر خود مجھے مارنے لگے۔

بچہ: اماں جی ۔ جب میں مروں تو مجھے اپنے پیروں کے نیچے دفن کیجئے گا۔

ماں: (تعجب سے) کیوں بیٹا۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو۔

بچہ: کیوں کہ ہمارے استاد آج ہم لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ ماں باپ کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔

نثار احمد بازید پوری

استاد: (شاگرد سے) درختوں سے ہمیں کیا فائدہ ہے۔

شاگرد: فائدہ تو نہیں ہے نقصان ہی ہے کیوں کہ اس کی چھڑیوں سے آپ ہمیں سزا دیتے ہیں۔

سید انور حسین ناظر ۔ شرد

زہرہ جمال

بڑائی کے شہزادے



شہر گمنام پور میں . . . . ایک ننھا بچہ رہتا تھا۔ اس کا نام تھا مجاہد۔ اس کے والدین بہت غریب تھے۔ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ انھوں نے شروع ہی سے مجاہد کو سچائی نیکی محبت اور رحمدلی کی تعلیم دی تھی۔ اس کے دل میں بڑا آدمی بن کر سارے انسانوں کی بھلائی کے کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک نہ ایک دن بڑا آدمی ضرور بن جائے گا۔ ایک دن مجاہد اپنے دوستوں کے ساتھ کسی راستہ سے گزرا۔ یکا یک وہ ٹھٹک گیا۔ کہیں سے کسی بوڑھی عورت کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجاہد نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ وہ بیمار تھی اور کئی دن کے فاقہ سے بھی، شہر کے بڑے بڑے آدمیوں کے دروازہ پر گئی مگر سب نے دھتکار دیا۔ لاچار یہاں آنکلی کہ کسی موٹر سے کچل کچلا کر اس دکھ بھری زندگی سے پیچھا چھڑا لے۔ بڑھیا کی دکھ بھری کہانی سن کر مجاہد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مجاہد بڑھیا کو اپنے گھر لے آیا۔ چند دنوں کی دوا دارو کے بعد بڑھیا تندرست ہو گئی۔ ایک دن مجاہد سے بڑھیا کہنے لگی "بیٹا مجھے بتاؤ تمھاری سب سے بڑی آرزو کیا ہے؟" مجاہد بولا "ہاں تو میرے دل میں بے شمار آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر ایک آرزو پر ان تمام آرزوؤں کا

دارومدار ہے" بڑھیا بولی "وہ کونسی آرزو ہے بیٹا؟"

مجاہد بولا "کاش! میں ایک بڑا آدمی بن سکوں اور تمام انسانوں کی بہتری اور بھلائی کا کچھ کام کرسکوں۔"

بڑھیا بولی "آہا ہا۔ کتنی پیاری آرزو ہے۔ اچھا بیٹا میں تمھیں بڑا آدمی بننے کا راستہ بتاتی ہوں۔ یقین اور حوصلہ سے اس پر چلو گے تو ضرور کامیابی ہوگی۔ اچھا تو سنو۔ اس شہر سے مشرق کی طرف جانا۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک کنواں ہے۔ جس کا نام "علم" ہے۔ وہ اتنا گہرا ہے کہ اس کی سطح نظر نہ آئے گی سیڑھیوں سے تم اس میں اتر جانا۔ کنویں کی سطح پر ایک دروازہ ہے۔ اس میں داخل ہونے پر ایک میدان نظر آئے گا اس کا نام ہے "میدان عمل" اس میدان کے پار ایک پہاڑ ہے اس کا نام ہے "عزم" اس پہاڑ پر ایک قلعہ ہے اس کا نام آزمائش ہے۔ اس قلعہ میں ایک محل ہے۔ اس کی آخری منزل پر بڑائی کی شہزادی رہتی ہے۔ عقل کی رہنمائی میں تم اس محل پہنچو گے تو وہ تمہیں بڑائی کا پتہ بتا دے گی۔"

مجاہد خوش ہو کر بولا "میں ضرور جاؤں گا لیکن پھر تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ بڑھیا غائب ہوگئی۔

مجاہد نے فوراً تمام واقعہ اپنے والدین کو سنایا، اور ان سے بڑائی کی تلاش میں جانے کی اجازت مانگی۔ ماں باپ یہی تو چاہتے ہیں کہ ان کے بچے بڑے آدمی بنیں۔ موت اور زندگی تو خدا کے اختیار میں ہے۔ اچھے مقصد کے لئے جدو جہد میں بچوں کا حوصلہ بڑھانا ہی ماں باپ کا فرض ہوتا ہے۔ مجاہد کے ماں باپ نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔

ایک دن مجاہد اپنے ساتھیوں کو لے کر علم نامی کنویں کی طرف روانہ ہوا۔ کئی دن کے سفر کے بعد کنواں نظر آیا۔ مجاہد بڑی ہمت سے نیچے اترتا ہی چلا گیا۔ اس کے ساتھی پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ کنواں دیکھنے میں جتنا تاریک تھا اندر بڑھتے جانے پر روشن ہوتا گیا۔ اور نیچے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ساری بستی میں اجالا ہی اجالا ہے۔ مجاہد نے خوشی خوشی شہزادی کے محل میں قدم رکھنا شروع کر دیا۔

لیکن کچھ دور جا کر اس کے دوسرے ساتھی تھک سے گئے اور کہنے لگے "یہ سب وہم معلوم ہوتا ہے۔ یہاں منزل کہاں ہے"! مجاہد بولا "یقین رکھو۔ یقین سے ہی منزل سامنے آتی ہے"! وہ انھیں سمجھاتا حوصلہ دلاتا رہا۔ چلتے چلتے اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ کھانے کا سامان ختم ہو گیا تو جنگلی پھلوں سے پیٹ بھر لیا۔

ایک دن عزم نام کا پہاڑ نظر آیا۔ سب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اور نئے حوصلے کے ساتھ پہاڑ تک پہونچے۔ پہاڑ پر چڑھتے ہوتے اچانک مجاہد کا پیر پھسلا اور نیچے آگرا۔ مجاہد اٹھا اور پھر چڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر اس نے ساتھیوں کو بلایا مگر ان کے چڑھنے سے پہلے وہ پھر پھسل گیا۔ اب کے وہ کافی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی نا امید ہونے لگے۔ لیکن مجاہد نے ہمت سے کام لیا اور پھر چڑھنے لگا۔ اب کی وہ چوٹی پر پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے ساتھیوں کی ہمت بندھی۔ سب کے سب چڑھتے چڑھتے چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں آشتی نامی قلعہ تھا۔ قلعہ [illegible] تھا۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دیواروں کے سوا کچھ نہ [illegible] چاروں طرف کے چکر کاٹنے مگر دروازہ تو دروازہ سوراخ بھی نظر نہیں آیا۔ مجاہد کے دوست منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔ مجاہد بولا "دوستو! اتنی مصیبتوں کا مقابلہ کر لینے کے بعد مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ آؤ ہم پتھر جمع کر کے سیڑھی بنائیں"

سب نے پتھر جمع کرنا شروع کئے۔ اتنے میں ایک زور دار آواز ہوئی اور قلعہ کی دیوار میں ایک بڑا دروازہ نمودار ہوا۔ مجاہد جلدی سے اپنے ساتھیوں کو لے کر اندر داخل ہو گیا اور ایک خوفناک آندھی آئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایک گرج دار آواز آئی۔ مجاہد کے ساتھی خوف کے مارے بیہوش ہو کر گر گئے لیکن وہ نہ ڈرا۔ پھر سارے قلعہ میں روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ مجاہد کی نظر ایک عالیشان محل پر پڑی۔ کئی دروازوں سے گذر کر مجاہد دربار میں پہنچا۔ دربار آراستہ تھا۔ اور ملکہ سنہری تخت پہ بیٹھی تھی۔ ملکہ بولی "لڑکو! میں ملکہ دولت ہوں۔ طلب کرو۔ کیا طلب کرتے ہو؟"

مجاہد بولا "ملکہ عالی مجھے بڑائی چاہیئے۔ تاکہ نوعِ انسان کی کچھ خدمت کر سکوں"

ملکہ قہر آلود ہو کر بولی "جا دفعہ ہو جا۔

آتا ہے بادشاہت سے نفرت برائی کی تلاش میں۔ ملکہ کو سلام کر کے مجاہد آخری منزل پر پہنچا۔ مجاہد کی دستک پر ایک کنیز آئی اور دروازہ کھولا۔ مجاہد کو دیکھ کر وہ حیران ہوکر بولی" اے خوش نصیب تو کون ہے۔

مجاہد نے کہا۔ میرا نام مجاہد ہے"



کنیز نے اس کو ایک تخت کے پاس لے جاکر کھڑا کر دیا۔ مجاہد ششدر رہ گیا۔ وہی ضعیف عورت تخت پر بیٹھی تھی۔ مجاہد اُسے لپٹ گیا"

اندر محل میں دربار لگا ہوا تھا۔ اردگرد اپنی اپنی جگہ پر پیغمبر، عالم، ادیب اور رہنما بیٹھے تھے۔ دربار میں ایک طرح کا نور چھایا ہوا تھا۔ اور سب کے چہرے اس نور سے دمک رہے تھے۔

مجاہد نے ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کی۔ اور بڑھیا نے جس کا چہرہ نور سے دمک رہا تھا۔ مجاہد کو بزرگی کا تاج پہنایا۔ بقیہ عمر کے آخری لمحہ تک مجاہد لوگوں کی خدمت کرتا رہا۔ اور آخری دم تک لوگ اس کی عزت کرتے رہے۔ آج وہ دنیا میں نہیں ہے لیکن اس کا نام اس کی اپنی خدمات کی وجہ سے روشن ہے۔

ضروری اعلان

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ منیجر



بچوّں کی کوششیں

جادو کی پڑیا

شیخ نیازو پہنچنے کو تو پہنچ گئے دہلی۔ مگر اب کریں تو کیا؟ نہ کوئی دوست، نہ کوئی رشتہ دار ملازمت کے لئے شہر چھان مارا، ہر جگہ سے یہی جواب "جگہ نہیں ہے"، ساتھ لائے ہوئے روپے بھی ختم ہو گئے۔ گھر واپس جائیں تو کیسے؟ کھائیں تو کہاں سے۔ بہت پریشان ہوئے سوچنے لگے بیکار اتنا دور کا سفر اختیار کیا مگر تھے ذرا چالاک ـــــ گھنٹوں غور کرنے کے بعد ایک ترکیب ان کے ذہن میں آگئی۔

"انوکھی ترکیب" "بے خطا علاج" کے نعرے لگاتے شہر کے گنجان حصہ میں پہنچ گئے تھوڑی دیر کے بعد ان کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہونے لگے "مکھی بھگانے کا جادو" صرف ــــ آنے میں، اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں کی تعداد میں وہ لفافے جن میں مکھی بھگانے کا جادو تحریر تھا۔ بک گئے اور جب خرچ کے لئے کافی پیسے جمع ہو گئے تو شیخ نیازو اپنے وطن چلدیے۔

اپنے اپنے گھر پہنچ کر جب لوگوں نے شرط کے مطابق ترکیب کو پڑھا تو کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ کچھ غصہ میں پیچ و تاب کھانے لگے مگر یہ سب بیکار تھا۔ شیخ نیازو اپنے گھر آرام سے بیٹھے گپیں مار رہے تھے کہ دہلی میں ہم نے یہ کیا ــــ وہ کیا ــــ وہ جادو کیا تھا۔

"کھاتے وقت اگر مکھیاں تنگ کریں تو ایک ہاتھ سے کھائیے دوسرے ہاتھ سے اڑائیے۔"

عبدالرؤف قمر
(جمشید پوری)

بھولنے والا شوقی

میرے مکان کے قریب ہی شوقی نامی میرا ہم جماعت لڑکا رہتا تھا اسے کام کرنے کا بہت شوق تھا مگر وہ ہر کام میں کچھ نہ کچھ بھولا کرتا تھا اگر آپ اس کے بھولنے والے واقعات سنیں تو مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

حسب معمول شوقی اسکول دیر سے جایا کرتا تھا۔ اس لئے استاد کی باتوں سے اُسے شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی۔

ایک روز شوقی نے ارادہ کیا کہ وہ اسکول جلد چلا جائے گا۔ چنانچہ وہ جلد اسکول روانہ ہوا۔ اسکول پہنچا تو کیا دیکھا کہ اسکول کے تمام دروازے کھڑکیاں بند ہیں۔ اسکول میں کوئی نہیں تھا۔ شوقی نے سوچا کہ آج میں اسکول جلد آیا ہوں۔ شوقی بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ شوقی کو یاد آیا کہ آج تو چھٹی ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ شوقی کی ماں نے اسے بازار سے مٹی کا تیل لانے کے لئے کہا۔ شوقی تو کام کا بڑا شوقین تھا۔ فوراً پیسے لے کر بازار کی طرف سرپٹ دوڑا۔ دوکان پر پہنچ کر دوکان دار سے کہا "بھائی صاحب چار آنے کا مٹی کا تیل تو دے دیجئے" دوکاندار نے کہا "کیا تیل جیب میں لے جاؤ گے۔ برتن تو لے کر آؤ" شوقی یہ سن کر بہت شرمندہ ہوا اور برتن لینے کے لئے گھر گیا۔ گھر پہنچتے ہی ماں نے کہا "تمہاری قمیض بہت گندی ہو گئی ہے اس لئے دھوبی کو دے دو۔" ماں کا حکم سنتے ہی شوقی نے قمیض اتاری اور جیب کے پیسے میز پر رکھ دیئے اور جلدی جلدی دوسری قمیض پہن کر اور برتن اٹھا کر بازار کی طرف ہو لیا۔ اور جا کر دوکاندار سے بولا "تیل دیجئے" دوکاندار نے تیل تو دے دیا اور پیسے کی فرمائش کی۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ دوکاندار کی فرمائش سنتے ہی شوقی نے اپنی جیب ٹٹولی۔ لیکن جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ شوقی کو یاد آیا کہ اس نے پیسے میز پر ہی رکھ دیئے۔ دوکاندار نے ہنس کر کہا کہ پیسے ہیں تو برتن نہیں اور برتن ہے پیسے نہیں" غرض شوقی کو دوبارہ گھر جانا پڑا۔

برسات کے دنوں میں بارش [illegible] تھا اس لئے ہر ایک کو ایک ایک [illegible] کی۔ استاد

صاحب نے کہا کہ زمین کھود کر کیاری بنانا۔ مٹی کے بیج بو کر روزانہ پانی دینا۔ دیکھنا کہ کس کی کیاری میں اچھی سبزی آتی ہے۔ سب کے ساتھ ساتھ شوقی نے بھی کیاری تیار کی اور روزانہ دل لگا کر پانی دینے لگا۔ آٹھ دن بعد سب کی کیاری میں سبزی اُگ آئی۔ لیکن شوقی کی کیاری میں کچھ بھی نہ اگا۔ ایسا کس طرح ہوا؟ شوقی بیج بونا ہی بھول گیا۔ بیج بویا ہی نہیں تو اُگے گا کیا۔

تم بھی کبھی اسکول میں کوئی چیز لے جانا بھول جاتے ہو۔ مثلاً کاپی وغیرہ تو تمھارے استاد صاحب کہتے ہیں "اب بھول کو بھول جایا کرو۔"

(مرہٹی سے ترجمہ)

(فاروقی رفیع الدین نقیبہ بھیونڈوی)

وہی مرغے کی ایک ٹانگ

"وہی مرغے کی ایک ٹانگ" یہ آپ نے سُنا ہے۔ یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب کہ کوئی اپنی بات پر اڑ جائے چاہے وہ بات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔

ایک خاں صاحب تھے ان کا ایک باورچی تھا۔ انھوں نے ایک دن اس سے کہا کہ میں بازار جاتا ہوں اور تم ایک مرغ مسلم پکا کر میرے لئے رکھنا۔ باورچی نے مرغا پکایا۔ لیکن جب تیار کر چکا تو اس کی خوشبو سونگھ کر بے تاب ہو گیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کی ایک ٹانگ نکال کر کھا گیا جب خان صاحب دسترخوان پر بیٹھے تو انھوں نے دیکھ کر کہا کہ ارے مرغ کی ایک ٹانگ کہاں ہے تو باورچی نے جواب دیا کہ صاحب یہ مرغا ایک ہی ٹانگ کا تھا۔ لاکھ خان صاحب نے کہا کہ مرغ ایک ٹانگ کا نہیں ہوتا۔ لیکن باورچی اپنی بات سے ذرا بھی پیچھے نہ ہٹا اور یہی کہتا رہا کہ صاحب یہ مُرغا ایک ہی ٹانگ کا تھا۔ کسی طرح نہ مانا اور اپنی بات پر اڑا رہا۔ مجبوراً خان صاحب کو چپ ہو جانا پڑا۔ ایک دن خاں صاحب اور باورچی دونوں بازار گئے۔ وہاں سامنے ہی ایک مرغ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور دوسری ٹانگ اپنے پروں میں چھپائے ہوئے تھا۔ یہ مرغوں کی عادت ہوتی ہے کہ ایک ٹانگ چھپا کر کھڑے ہو جاتے ہیں باورچی نے دیکھ کر خاں صاحب سے کہا: "دیکھئے یہ مرغ بھی ایک ہی ٹانگ کا ہے" یہ دیکھ کر خاں صاحب نے ہاتھ بڑھا کر ہش ہش جو کی تو مرغ اپنی دوسری ٹانگ

نکال کر بھاگا۔ یہ حال دیکھ کر باورچی نے خان صاحب سے کہا خوب صاحب۔ آپ نے اس روز دسترخوان پر کیوں نہیں ہش ہش کی ورنہ اسی وقت دوسری ٹانگ بھی نکل آتی۔

مسرت جہاں

محنت کا پھل

ٹن۔ ٹن۔ ٹن گھنٹہ بجا۔ انگریزی کا گھنٹہ ختم ہوتے ہی حساب کا شروع ہوگیا۔ لڑکے حساب کے ماسٹر صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ حساب کے ماسٹر صاحب کے کلاس میں قدم رکھتے ہی تمام لڑکے تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اپنی اپنی کاپی نکال کر سامنے رکھ لو۔"

سب لڑکوں نے اپنی اپنی کاپی نکال کر سامنے میز پر رکھ لی اور ماسٹر صاحب ہر لڑکے کی کاپی دیکھنے کے بعد انور کے پاس گئے اور کہنے لگے۔

"اور تم"

"جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ میں سوالات حل نہ کرسکا" انور نے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ماسٹر صاحب سے کہا۔ ماسٹر صاحب نے دو تین چ[ا]نٹے رسید کئے۔ انور کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تم سلیم سے کیوں نہیں پوچھ لیا کرتے۔ اگر یہی رفتار رہی تو جماعت کا ساتھ کس طرح دے سکتے ہو —" یہ کہہ کر ماسٹر صاحب نے پڑھانا شروع کردیا۔

سلیم اپنی جماعت میں کافی ہوشیار سمجھا جاتا تھا۔ ماسٹر بھی اس کو ہوشیار سمجھتے تھے۔

ماسٹر صاحب بورڈ پر سوال حل کررہے تھے کہ ایک چپراسی نوٹس لیکر آیا۔ ماسٹر صاحب نے نوٹس پر دستخط کرکے کہا۔

"اس گھنٹے کے بعد چھٹی ہوجائے گی۔"

گھنٹہ بجا۔ ماسٹر صاحب کے کلاس سے باہر قدم رکھتے ہی۔ لڑکے بے تحاشا بھاگنے لگے۔

انور "سلیم بھیّا حساب سمجھا دیجئے نا!"

"اب میں گھر جارہا ہوں۔ سمجھا دیجئے نا جیسے ان کے باپ کا نوکر ہی تو ہوں۔" سلیم نے بے رخی سے انور کو جواب دیا۔

سلیم کے یہ الفاظ انور کے دل پر چوٹ کر رہ گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ مجھ کو ہر ایک حقارت سے دیکھتا ہے۔ ایسی بات کیوں ہے؟ کیا میں سچ مچ

کند ذہن ہوں؟ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں آج سے محنت کروں گا۔ ضرور پڑھوں گا اور وقت پر کھیلنے بھی جاؤں گا۔ یہ سوچتا ہوا انور اپنے گھر پہنچ گیا۔

انور اب بہت محنت کرنے لگا تھا۔ وقت پر کھیلنے بھی جایا کرتا تھا

سالانہ امتحان شروع ہوا اور ختم بھی ہو گیا انور بہت خوش تھا اس کے سب پرچے اچھے ہوئے تھے اور اپنی کامیابی کی اسکو پوری امید تھی۔ مگر لڑکے اب بھی اس کو پہلا سا انور سمجھتے رہے حالانکہ وہ بہت بدل چکا تھا۔

آخر نتیجہ سننے کا بھی دن آ گیا۔ تمام لڑکے اسکول میں جمع تھے۔ ہر ایک انور کو دیکھ کر ہنس رہا تھا جیسے کہ وہ فیل ہو جائے گا ہیڈ ماسٹر صاحب کے آتے ہی لڑکے خاموش ہو گئے۔ ہر ایک اپنا نتیجہ سننے کے لئے بے چین تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نتیجہ سنانے لگے۔

" انور فرسٹ " جونہی انھوں نے کہا۔ تمام لڑکے حیرت سے انور کو دیکھنے لگے۔ انور کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

تہمین ظہیر گیا۔

کنجوسی کا نتیجہ

ایک کنجوس کے پاس بہت روپیہ تھا۔ مگر وہ کبھی خرچ نہ کرتا تھا۔ کنجوس جو تھا۔ جس جگہ روپیہ رکھتا روز وہاں جاتا اس کو دیکھتا اور پھر گن کر اسی تھیلی میں بند کر کے رکھ دیتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اس کے سب دوست اس سے یہی کہتے کہ جو کماؤ اسے خرچ کرو۔ اس طرح بچا بچا کر رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مگر کنجوس کب ان کی بات مانتا۔ وہ تو ہر وقت یہی سوچا رہتا تھا کہ کہیں میرا روپیہ چوری نہ جائے۔ آخر ایک دن وہ یہ سب روپیہ لے کر جنگل کی طرف چل دیا۔ وہاں اس نے ایک درخت کے پاس گڈھا کیا اور اپنی ساری دولت اس میں دفن کر دی۔ ایک شخص ایک درخت کی آڑ سے یہ واقعہ دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اتنی دولت کا مالک ہو جائے گا۔ کنجوس روپیہ دفن کرنے کے بعد اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ کنجوس کے جاتے ہی وہ چھپا ہوا شخص آیا اور زمین کھود کر کنجوس کی دفن کی ہوئی دولت نکال

کر چل دیا۔

کنجوس رات بھر بے چین رہا۔ اس کو ہر وقت یہی خیال تھا کہ دولت چوری نہ ہو جائے۔ جیسے تیسے رات کاٹی اور صبح ہوتے ہی جنگل کی راہ لی۔ اور زمین کو کھود کر اپنی دفن کی ہوئی دولت کو تلاش کیا۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ کنجوس ہاتھ ملتا رہ گیا۔ روتا پیٹتا گھر آیا تو اس کے دوستوں میں سے ایک نے کہا: "وہ روپیہ کس کام کا تھا۔ صرف دیکھنے کا تھا۔ اب روپیہ نہ سہی کوئی دوسری چیز سہی۔ پتھر ہی سہی۔ اب روزانہ اس کو دیکھا کرنا۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

فاروق احمد صابری

(جماعت ہفتم)

نمازی کلن

ہمارے محلے میں ایک بڑا اچھا آدمی رہتا ہے اس کی صورت تو کالی کالی ہے۔ داڑھی کچھ کالی کچھ سفید مل کر کھچڑی بنی رہتی ہے۔ اگر کبھی کپڑا پھٹ جاتا تو پیوند بھی لگا لیتا ہے۔ کلن میاں کو محلے کے سب لوگوں کا خیال ہے اور کسی کے کام کو منع نہیں کرتا اس کا نام کلن ہے۔ محلے والے کے سب اسے نمازی کلن کہتے ہیں۔

محلے میں جن گھروں کے مرد پردیس میں ہیں میاں کلن روزانہ صبح سویرے ان گھروں میں کر آواز دیتے ہیں۔ اگر کسی کو کچھ منگانا ہوتا ہے تو لا دے دیتے ہیں۔ یا اگر کوئی بیمار ہو تو حکیم صاحب کو بلا کر دکھا دیتے ہیں۔ دوا بھی لا دیتے ہیں۔

میاں کلن جب کسی سے کوئی وعدہ کرتے تو چاہے مینھ آئے یا آندھی چلے وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ میاں کلن نے ایک امیر آدمی کے یہاں ملازمت کر لی۔ میاں کلن کو نماز پڑھتے دیکھ کر ان کا آقا خوش نہ ہوتا تھا۔ اور ناک بھوں چڑھایا کرتا تھا۔ ایک دن جاڑوں کے موسم میں امیر آدمی صبح صبح ایک حمام میں غسل کرنے گیا۔ یہ حمام شاہی زمانے کا بنا ہوا ہے۔ کیسی ہی سردی کیوں نہ ہو۔ نہانے والا پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔ جب یہ امیر آدمی حمام میں گیا تو اپنے ساتھ میاں کلن کو بھی لیتا گیا تاکہ کپڑے لے کر چلیں۔

صبح کا وقت تھا۔ سردی خوب پڑ رہی تھی سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ امیر آدمی حمام سے نکل

کر گھر چلا۔ راستے میں ایک مسجد ملی تو میاں کلن نے اپنے آقا سے کہا ذرا کی ذرا میں نماز پڑھ لوں۔ آقا نے اجازت دے دی۔ اور خود مسجد کے دروازے کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ میاں کلن نماز پڑھ کر بیٹھ گئے اور اللہ اللہ کرنے لگے۔ جیسے جیسے دیر ہوتی جاتی تھی۔ امیر آدمی غصے سے بے قابو ہوتا جاتا تھا آخر آواز دی "کلن کلن جلدی آؤ سورج نکل رہا ہے" کلن نے جواب دیا ذرا ٹھہرئے۔ کئی دفعہ بلانے پر کلن نہ آیا تو امیر آدمی نے جھنجھلا کر کہا۔ کیا تجھے کسی نے پکڑ لیا ہے۔ کلن نے کہا بے شک مجھے پکڑ لیا ہے۔ امیر آدمی نے پوچھا کس نے، کلن نے جواب دیا جس نے آپ کو مسجد کے اندر آنے سے روک دیا ہے۔ اس ہی نے مجھے مسجد کے باہر جانے سے روک دیا ہے۔ اور اب میں کسی طرح نہیں آسکتا۔ امیر آدمی غصہ سے بکتا جھکتا چلا گیا۔ اسی دن سے کلن نے ملازمت چھوڑ دی اور اسی روز سے ان کا نام نمازی کلن پڑ گیا ہے اب یا تو کلن میاں صبح شام خدا کی عبادت کرتے رہتے ہیں یا محلے والوں کا کام کرتے ہیں۔

بجنہ سلطانہ فاروقی متعلم جماعت پنجم (حیدرآباد۔ دکن)

شرائط پیامی معمّا

(۱) ایک خاکہ کی فیس داخلہ ایک آنہ۔ ۶ خاکوں کی فیس ۵ ر فیس ٹکٹوں کی صورت میں آنا چاہیئے۔

(۲) بغیر فیس والے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جائیں گے۔

(۳) ایک روپے انعام تک کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کی جائیگی

(۴) حل روشنائی سے لکھے ہوئے ہونا چاہیئے مشکوک اور کٹے پھٹے حل مقابلہ میں شریک نہیں کئے جائیں گے۔

(۵) ایک معمے میں ایک ہی نام سے جتنے حل بھیجے جائیں ان کے ساتھ ایک ہی کوپن کافی ہوگا۔ ہر حل کے نیچے اپنا نام اور پورا پتہ خوشخط لکھئے۔

(۶) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ لڑکے ہوں گے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ ایک لڑکے کو ایک معمے میں ایک ہی انعام یا انعام کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔

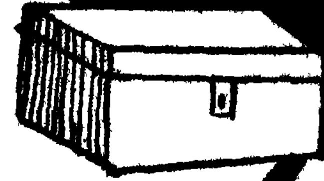
(۷) ٹکٹ کسی کاغذ یا لفافہ میں چپکا دینا درست نہیں صرف لفافہ میں رکھ دینا کافی ہے۔

(۸) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں ایڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری ہوگا۔ اپنے حل آپ اس پتہ پر بھیجیں۔

ایڈیٹر پیامی معمّا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔

دو مزیدار کہانیاں



صندوق کا نیلام

حاکم عدالت نے لکھا ہوا حکم دیا۔

"سندوق نیلام کر دو"

پیشکار۔ سرکار نے بھولے سے صاد کی جگہ سین سے سندوق لکھا ہے۔

حاکم۔ تم اُلّو ہو یہ ساگوانی صندوق ہے سین سے لکھا جاتا ہے۔ صندل کا ہوتا تو صاد سے لکھا جاتا۔

رام پور کے مشہور بونے

رام پور ضلع مراد آباد میں ایک بہت مشہور شخص بونے تھے ان کی شہرت سُن کر ایک صاحب رام پور گئے اور اپنے ایک دوست کے ہاں پہنچے۔

اتفاق سے بونے صاحب بھی ان کے دوست سے ملنے آئے تھے۔

جو صاحب ملنے گئے تھے انھوں نے بونے کو دیکھا تو اپنے دوست کا بچہ سمجھ کر گود میں اُٹھا لیا پھر جب معلوم ہوا کہ وہی مشہور شخص ہیں جن سے ملنے کے لئے رام پور آئے ہیں تو بڑے شرمائے، اور جب کسی نے یہ واقعہ سُنا تو ب قہقہے لگائے۔

محمود رشید

سلمیٰ کاظمی

ہماری مجبوریاں

ہم نے اپنے گھر میں "بچہ پارٹی" بنائی ہے۔ اگر آپ لوگ بچہ پارٹی سے دوستی کرنا چاہیں تو ایک بڑھیا سی مزے دار شرارت لکھ کر پیام تعلیم میں چھپوادیں۔ سلمیٰ کاظمی

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنی مجبوریوں کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ میں بڑوں سے معافی مانگوں گی۔ اگر کچھ گستاخی ہوجائے تو معاف فرمائیں۔ کیونکہ جب میں نے اددوں پر اپنی رائے ظاہر کی کہ میں بچوں کی مجبوری پر مضمون لکھوں گی تو اپیا نے پوچھا کیوں"۔ میں نے کہا۔ "کہ آپ نے اکیلے اکیلے مٹھائی کھائی اور ہم کو نہیں دی"۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے"، تو صاحب جیسے ایٹم بم پھٹتا ہے۔ ایسے ہی وہ بھی ہمارے اوپر پھٹ پڑیں۔ اور مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ایک سیکنڈ کے لئے میرے ہوش وحواس غائب ہوگئے۔ کیونکہ غصہ میں۔ اپیا اتنی تیزی اور زور سے بولتی ہیں کہ اچھے سے اچھے انسان کے ہوش وحواس غائب ہوجائیں۔ اسی لئے ڈر ہے کہ آپ بھی ہم پر برس نہ پڑیں۔

اچھا صاحب اب اصلی بات سنئے۔ مگر ذرا سنبھل کر بیٹھنا پڑے گا۔ اور کان کھول کر سننا پڑے گا۔ ہمارے امتحان ختم ہوچکے تھے۔ ہم کو ایک ہفتے کی چھٹیاں ملیں۔ گھر پر پہنچ کر ہم نے اپنی شرارتیں کرنی شروع کردیں۔ خیر صاحب کچھ دنوں تک تو بڑوں نے دیکھا نہیں کس

طرح) بڑے صبر سے ہم لوگوں کی شرارتیں دیکھیں۔ مگر اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ دوسرے ہی دن سے انھوں نے وہ وہ احکامات جاری کئے جو کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔

ان سب چیزوں کے خلاف لڑنے کے لئے ہم نے ایک "بچہ پارٹی" کی میٹنگ کی جس میں طے پایا کہ بھوک ہڑتال کر دی جائے۔ مگر صاحب جیسے ہی کھانے کے کمرے میں پلیٹوں کی کھڑبڑ سنائی دی تو ہمارے پیٹ کے چوہوں کی کود پھاند اور بھی تیز ہو گئی۔ بہت روکنے پر بھی ساری بچہ پارٹی سب لوگوں سے پہلے کھانے کے کمرے میں پہنچ گئی۔

مگر پھر بھی امتحانوں کی آہنی سخت محنت کے بعد ہم بالکل تیار نہیں تھے کہ ہم پر اتنا سخت کام ڈالا جائے۔ چنانچہ ہم کئی دن تک ٹالا کئے۔ مگر صاحب بڑے بھی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ غضب ہو گیا جب ہم ٹھیکیدار کو تنگ کرکے اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تو شرارت میں کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے سب کی باچھیں کھلیں ہوئیں تھیں۔ عین اس وقت اپا کی گرجتی گونجتی آواز نے ہماری ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا اور جیسے کہ ان کی عادت ہے۔ انھوں نے ایک لمبا چوڑا لکچر پلایا اور پھر ظلم یہ کہ اس کی بھی دھمکی دی کہ پاپا خفا ہو جائیں گے۔ یہ خبر ہمارے لئے معمولی نہیں تھی۔ میری تو یہ حالت تھی کہ فوراً مجھکو ٹھنڈا بخار چڑھنا شروع ہو گیا اور دل چاہا کہ کٹورا بھر پانی میں ڈوب مروں۔ (کیونکہ چلو بھر پانی میں تو میرا ایک بال بھی نہیں بھیگ سکتا تھا۔)

خیر بادلِ نخواستہ وہاں سے اپنے کمرے میں واپس آئے اور اپنی قسمت پر افسوس کرنے لگے۔ مگر اس سے تو کام نہیں چل سکتا تھا۔ ابھی تو مضمون لکھنا تھا۔ بیاض تیار کرنی تھی اور ہزاروں کام جو کہ بڑوں کی طرف سے بلا کی طرح نازل ہوئے تھے۔ کرنے تھے۔ مجھ سے تو کچھ ہوا نہیں۔ البتہ چھجن۔ چھبو اور امین صاحب نے بڑے زوروں میں لکھنا شروع کیا۔ مگر ہر بار چار لائین لکھ لینے کے بعد کاغذ پھاڑنا پڑتا تھا۔

اب چار دن چھٹے تھے اور مضمون کسی [illegible] دیکھیے



ڈانٹ یا پٹائی

محمد امین

ہم بچوں کا کام بڑوں کے ہاتھوں کی کھجلی دور کرنا ہے۔ ہمارے بڑے بھائی بہن ہوں یا ماں باپ، ان کے ہاتھوں میں جب بھی کھجلی ہوتی ہے تو وہ بغیر کسی الزام کے ہمیں پیٹتے ہیں۔ ماں تو بہت کم لیکن باپ تو فوراً پیٹنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

مثلاً میرا ہی ایک واقعہ لیجئے۔ ایک دن مجھے سرجری کا شوق چرآیا۔ میاں کے ایک سگار کی شامت آئی اس کو پرکار سے اس طرح چھیدا کہ اس کا دھواں بجائے منہ میں جانے کے سوراخ سے نکل جائے۔ یہ شرارت کرکے میں تو چلتا بنا۔ اور کوئی دوسری شرارت کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں میاں کے جوتوں کی آواز کے ساتھ میاں کی ڈانٹ سنائی دی "اِبن یہ کس کی حرکت ہے" اور ساتھ ہی ایک زور کا طمانچہ پڑا ایسا کہ سر چکرا گیا۔ اور اس کے ساتھ ایک اچھے باپ ہونے کی حیثیت سے میاں نے ایک قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی مجھ سے لپٹ گئے۔

اس قسم کے واقعات تو روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کچھ بڑے ہو کر گھر سے

بچوں کے جیل یعنی اسکول جانا پڑتا ہے تو رونا
ہی آتا ہے۔ اس وقت بھی اس کو جو
پڑھے یا سنے گا اپنا حال یا ماضی یاد کرنے پہ
مجبور ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی گھر سے پٹ کر یا ڈانٹ
کھا کر اسکول کو جائے گا اور وہ بھی دیر سے جو
کہ عام طور پر ہو ہی جاتی ہے۔ چھپتے چھپاتے
اسکول پہنچے۔ اور وہاں کسی استاد نے دیکھ لیا
اور پھر اپنا فرض بتا کر یا یہ سمجھا کر کہ اس میں
تمھارا ہی فائدہ ہے وہ زوردار ڈانٹ پلائی کہ
چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ اس کے بعد حکم ملا کہ چھٹی
کے بعد رکنا۔ تیسرے صاحب کلاس میں پہنچے تو ہر استاد
کا تکیہ کلام ہوا کہ کام کیوں نہیں کیا۔ اس کے علاوہ
اور بھی جملے استادوں کو رٹے ہوتے ہیں۔
"نامعقول! تم ایسے لڑکوں کو تو بھنگڑ خانے
میں بھیج دینا چاہیئے۔" "ماں باپ کا روپیہ برباد
کرتے ہو۔ تمہاری اصلاح مولا بخش کر سکتا ہے۔"
اس قسم کے ہزاروں جملے ہر گھنٹے میں
دہرائے جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ جن۔۔
مضمونوں کا کام نہ کیا ہو تو پھر کیا پوچھنا۔ پہلے
تو تکیہ کلام دہرایا جاتا ہے۔ اور پھر جب یہ معلوم
ہو جائے کہ کام نہیں ہوا تو فوراً ایک مولا بخش
آتا ہے اور اس کے بعد ہماری تواضع کام کے
لحاظ سے چھوٹے یا بڑے پیمانے پہ کی جاتی ہے
اور پھر کلاس سے نکل جاؤ کا حکم اور ساتھ ہی
ایک زور کا دھکا جو گدی کے ذریعہ دیا جاتا ہے
اس کے بعد ہم کسی کونے میں بدن چرا کر۔۔
کھڑے ہو گئے۔

پھر چھٹی کے بعد نگراں مدرسہ کا ایک کڑوا
میٹھا، کھٹا سا لیکچر ملا۔ اور جب ہم گھر پہنچے تو کسی
نے پوچھا کہ "ابن میاں آج منہ کیوں پھولا
ہوا ہے۔ تو بس پھر تو رونا آ ہی جاتا ہے۔"
یہ ہوئی ڈانٹ یا پٹائی کی داستان۔
اور میرے خیال میں کسی باپ کے بیٹے نے
اپنے باپ کو یہ مضمون سنا دیا تو باپ صاحب
ایک ڈانٹ ضرور پلا دیں گے۔

دفتر سے خط و کتابت کرتے
وقت اپنا خریداری
نمبر ضرور لکھیں۔

سالنامہ ۱۹۵۲ء

(با تصویر)

پیامِ تعلیم کا اگلا شمارہ سالنامہ ہوگا

- جس میں انعامی مقابلے کی اچھی اچھی کہانیاں شائع ہوں گی۔
- جس میں مقابلے میں انعام پانے والے بچوں کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔

اگر آپ یہ سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی چار روپیہ بھیج کر سالانہ خریدار بن جائیے۔

اگست میں چندہ بھیجنے والوں کی خدمت میں یہ سالنامہ مفت پیش کیا جائے گا۔

قیمت ایک روپیہ

مینیجر پیامِ تعلیم
جامعہ نگر دہلی



۳۰ روپے کے نقد انعامات

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے

فیس داخلہ ار کے ٹکٹ کی صورت میں

آخری تاریخ داخلہ :- ۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۲۰ روپے

دوسرا انعام ایک غلطی پر ۴ 〃

تیسرا انعام دو غلطی پر ۳ 〃

پیامی معمّا نمبر ۱۴

دائیں سے بائیں

۱- اردو کا سب سے بڑا شاعر ــــ

۲- غصہ کی حالت میں بعض آدمی بے ادبی کی باتیں بھی ــــ جاتے ہیں۔

۳- اچھے آدمی کبھی اپنے ــــ کی برائی نہیں کرتے۔

۶- کبھی کبھی گھٹیا ــــ بھی انسان کی ترقی میں رکاوٹ ڈال دیتی ہے۔

۸- ــــ لوگ قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔

۹- کچھ لوگ ــــ سے بھی فصل کی حفاظت کرتے ہیں۔

اوپر سے نیچے

۱- اچھے بچے ــــ نہیں مچایا کرتے۔

۴- ــــ مفید ہے تو خطرناک بھی ہے۔

۵- بزرگوں کے بتائے ہوئے کام کی ــــ کرنا چھوٹوں کا فرض ہے۔

۷- کسی کے کہہ دینے سے آدمی ــــ نہیں بن جاتا۔

پیامی معمّا نمبر ۱۴

۱۳ر	۲ک		ب	ل	ا	۱ع
۴ب			ل	ا	۳ر	
		ت	ا	۶	۵ت	
		ل		ا	۸	۷ب
د		ر	ا	۹	م	
					ی	ا
					ل	

کوپن پیامی معمّا نمبر ۱۴

نام ....

پتہ ....

....

شرائط معمّا صفحہ ۷۴ پر دیکھئے۔

(نوٹ) معمہ ۱۳ میں دو اور تین غلطیوں کے انعامات پانے والے پیامی اپنا انعام معمہ ۱۳ یا ۱۴ کے لیے صرف کرا سکتے ہیں۔

صحیح حل معمہ ۱۲
دائیں سے بائیں
(۱) گنبد (۴) رائے
(۴) اسیر (۷) نار
(۸) سماج (۹) تعظیم

معمّا نمبر بارہ ۱۲ کا شاندار نتیجہ

۱۰ روپئے کے بجائے ۱۷ روپئے کی تقسیم

صحیح حل کوئی برآمد نہیں ہوا۔

صحیح حل معمہ ۱۲
اوپر سے نیچے
(۱) گرانڈ (۲) جبر
(۳) تصدیق (۵) نرم

پانچ روپئے کے بجائے چھ روپئے کا پہلا انعام ایک غلطی والے چھ بچوں کو بحساب ایک روپیہ فی کس دیا گیا۔

(۱) سوتنتر سنگھ جگسلائی ٹاٹانگر (۲) شریفہ بیگم عثمانی جودھپور (۳) مامونہ بیگم عثمانی جودھپور۔ (۴) شکیل احمد کانپور (۵) محمد عثمان اندکھرڈ (۶) رام کمار پٹنہ۔

تین روپئے کا دوسرا انعام دو غلطی والے ۲۴ بچوں کو بحساب ۲ر فی کس دیا گیا۔

(۱) سعید الدین احمد رامپور (۲) محمد عباس بمبئی (۳) انور کمال الہ آباد (۴) اشرف علی لکھنؤ (۵) ذیشان احمد صدیقی سیوہرہ کلاں۔ (۶) بدری پرشاد سیتاپور (۷) حسین محمد قاسم سائی (۸) محمد جلال زیدی امروہہ (۹) حسن عربی سیتاپور (۱۰) بلقیس ناظرہ ساگر (۱۱) آصف علی برہانپور (۱۲) رضا حسن زیدی جامعہ نگر (۱۳) تمیزہ بیگم عثمانی جودھپور (۱۴) امینہ بیگم عثمانی جودھپور (۱۵) صبیحہ سلطانہ بیگم سلطان پور (۱۶) ایس۔ دی ابوالبرکات۔ بسیٹ (۱۷) سراج احمد حیدرآباد (۱۸) ثروت جہاں الہ آباد (۱۹) محمد احمد بریلی (۲۰) سرش کلکتہ (۲۱) محمودہ بیگم کاسگنج (۲۲) آفتاب حسین حیدرآباد (۲۳) رشید احمد آگرہ (۲۴) محمد اخلاق محمد آباد۔

دو روپئے کے بجائے ڈھائی روپئے کا تیسرا انعام تین غلطی والے چالیس بچوں کو بحساب ار فی کس دیا گیا۔

(۱) گوردیال سنگھ جگسلائی (۲) صابرہ بیگم جودھپور (۳) عثمان غنی بھروچ (۴) امین احمد دھان آباد (۵) عصمت نواز احمد علی گڈھ (۶) بدر فاطمہ جامعہ نگر (۷) محمد مختار سہپورہ (۸) عبدالعلیم نظام پور (۹) صغری سلطانہ سہور (۱۰) نورالنساء گیا (۱۱) عبدالسلام بھوپال (۱۲) محبوب احمد جامعہ نگر (۱۳) عبدالجبار دھنباد (۱۴) سید یوسف اختر کوروائی (۱۵) معین الدین گورکھپور (۱۶) جلیل احمد بریلی (۱۷) شریف احمد بریلی (۱۸) محمد میاں امروہہ (۱۹) محمد ابراہیم کانپور (۲۰) امداد اللہ بارہ بنکی (۲۱) یمن گیا (۲۲) محمد سلیم حیدرآباد (۲۳) احمد اللہ آگرہ (۲۴) اسرار میاں رامپور (۲۵) محمد شفیع لکھنؤ (۲۶) جمیل احمد راتاگھاٹ (۲۷) مسعود علی سہارنپور (۲۸) تارہ سنگھ مدراس (۲۹) محمد اصغر جونپور (۳۰) عزیز احمد جونپور (۳۱) چھوٹے خاں شاہجہانپور (۳۲) محمد امیر فیروزآباد (۳۳) محمد اسماعیل کلکتہ (۳۴) محمد طاہر پٹنہ (۳۵) فیاض محمد تال (۳۶) [illegible] شیوپور (۳۷) انیس الرحمان آگرہ (۳۸) کاظم علی ٹونڈلہ (۳۹) رمضان علی الہ آباد (۴۰) شمیم احمد سہارنپور۔

چوتھا انعام سب سے زیادہ حل بھیجنے پر محمد عرفان نجیب آباد کے لئے ایک سال پیامِ تعلیم مفت جاری کر دیا گیا۔ انھوں نے بائیس حل بھیجے تھے۔ پانچواں انعام ڈیڑھ روپئے۔ تین سے زیادہ غلطی پر بذریعہ قرعہ اندازی چار بچوں کو (۱) سلیمان احمد کانپور (۲) محمد اسحاق سیتا (۳) عبد المجید کرولا (۴) انیس احمد گورکھپور۔

تاریخ ہند کی کہانیاں

تاریخ بچوں کے لئے ایک روکھا پھیکا موضوع ہے اور یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اسے کہانیوں کے انداز میں لکھا ہے بڑی بات ہے کہ تاریخ کا مقصد اپنی جگہ پر رہتا ہے۔

حصہ اوّل

اس حصے میں پرانے زمانے کے حالات درج ہیں
قیمت ۱۰ر آنے

حصہ دوم

اس حصے میں مسلمان بادشاہوں کے عروج و زوال کی کہانی ہے
قیمت ۱۰ر آنے

حصہ سوم

اس حصے میں اورنگ زیب کے بعد غدر تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں، ہماری تجارت، صنعت و حرفت علم اور دولت کو آہستہ آہستہ کیسے ختم کر ڈالا گیا۔
قیمت ۱۰ر آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی

پرنٹر و پبلشر حامد علی خاں بی اے۔ مطبوعہ اشوک پریس۔ دہلی

شنکرز ویکلی میں انعام پانے والی تصویریں۔

گاؤں کا مکھیا



ی بقدہ حم - مقام ترچی (عمر ۱۴ سال)

ہمارے ماسٹر صاحب



ایس۔اندرانی۔مدراس (عمرسات سال)

Regd. No. D. 96.
AUGUST. 1952.


دہلی
حامد علی



بڑی آئیں میری گڑیا کو مارنے والی!



امی نے روٹی نہیں دی

سالنامہ ۱۹۵۲ء

پیام تعلیم

ادارہ

حامد علی خاں
اطہر پرویز

آرٹسٹ
گلیڈون میسی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

ستمبر ۱۹۵۲

قیمت سالنامہ ایک روپیہ
سالانہ چندہ ۴؍ روپیہ



فہرست



سالنامہ۔ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کو سچ مچ بڑا انتظار کرنا پڑا، مگر سالنامہ دیکھ کر آپ خوش ہی تو ہو جائیں گے، خاص طور پر اس لئے کہ اس سالنامے میں کتنی ہی کہانیاں بچوں کی لکھی ہوئی چھپ رہی ہیں اور ہر کہانی کے ساتھ تصویریں ہیں۔ آپ میں سے بہت سے بچوں نے مقابلے میں حصّہ لیا اور اس کے لئے اپنی اپنی کہانیاں بھیجیں۔ ہم ان ہی مقابلے کی کہانیوں میں سے کچھ کہانیاں چھاپ رہے ہیں۔ دس کہانیاں تو وہ ہیں جن کو مقابلے میں انعامات ملے، باقی اور کہانیاں وہ ہیں جو ہمیں مقابلے کی کہانیوں میں زیادہ پسند آئیں۔

سالنامہ میں صرف بچوں کی یہ کہانیاں ہی نہیں ہیں، بلکہ بڑوں کے لکھے ہوئے مضامین نظمیں اور کہانیاں بھی ہیں جو سالنامے کی قدر کو اور بڑھا رہے ہیں۔

آپ کو یہ سالنامہ بقرعید کی چھٹیوں میں ملے گا۔ ہماری طرف سے آپ کے لئے یہ عید کا تحفہ ہے، اب یہ تو آپ ہی بتائیے کہ کیسی رہی یہ عیدی۔ مگر بھئی یہ عیدی ایسی ہے کہ اس سے آپ خود بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور آپ کے دوست بھی۔ لیکن اپنے دوستوں سے کہئے کہ [illegible] آپ کی طرح پیام تعلیم پڑھا کریں اور مضمون لکھا کریں۔



فہرست



سالنامہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کو سچ مچ بڑا انتظار کرنا پڑا، مگر سالنامہ دیکھ کر آپ خوش ہی تو ہو جائیں گے، خاص طور پر اس لئے کہ اس سالنامے میں کتنی ہی کہانیاں بچوں کی لکھی ہوئی چھپ رہی ہیں اور ہر کہانی کے ساتھ تصویریں ہیں۔ آپ میں سے بہت سے بچوں نے مقابلے میں حصّہ لیا اور اس کے لئے اپنی اپنی کہانیاں بھیجیں۔ ہم ان ہی مقابلے کی کہانیوں میں سے کچھ کہانیاں چھاپ رہے ہیں۔ دس کہانیاں تو وہ ہیں جن کو مقابلے میں انعامات ملے، باقی اور کہانیاں وہ ہیں جو ہمیں مقابلے کی کہانیوں میں زیادہ پسند آئیں۔

سالنامہ میں صرف بچوں کی یہ کہانیاں ہی نہیں ہیں، بلکہ بڑوں کے لکھے ہوئے مضامین نظمیں اور کہانیاں بھی ہیں جو سالنامے کی قدر کو اور بڑھا رہے ہیں۔

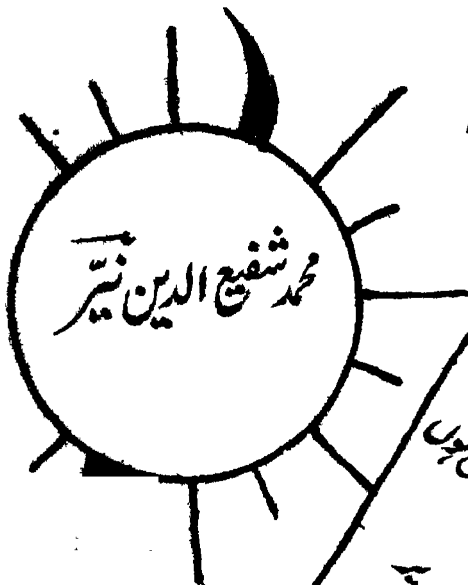
آپ کو یہ سالنامہ بقرعید کی چھٹیوں میں ملے گا۔ ہماری طرف سے آپ کے لئے یہ عید کا تحفہ ہے، اب یہ تو آپ ہی بتائیے کہ کیسی رہی یہ عیدی۔ مگر بھئی یہ عیدی ایسی ہے کہ اس سے آپ خود بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور آپ کے دوست بھی۔ لیکن اپنے دوستوں سے کہئے کہ وہ بھی آپ کی طرح پیام تعلیم پڑھا کریں اور مضمون لکھا کریں۔

دیس پریمی کی دُعا

خدایا ہم ترے دربار میں اک عرض لائے ہیں
یہ اپنے سر تری سرکار میں ہم نے جھکائے ہیں
گزارے زندگی اب قوم اپنی ان فضاؤں میں
مسرت ناچتی ہو رات دن جن کی ہواؤں میں
جہاں خوددار اور بے خوف ہوں بچے بڑے سارے
سدا حق اور اخوت کے چمکتے ہوں جہاں تارے
جہاں ہر شخص ہو ہمدرد اور غمخوار دنیا کا
جہاں پھیلا ہوا ہو علم و فن کا ہر طرف چرچا

یہ دعا شری رابندر ناتھ ٹیگور مرحوم کی شہرۂ آفاق کتاب گیتانجلی کے ایک دعائیہ گیت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔





جہاں ہر کام میں تکمیل ہو پیش نظر سب کے
جہاں بندے نہ ہوں افراد نفرت اور تعصب کے

جہاں کے لوگ دور از کار رسموں کے نہ قائل ہوں
جہاں پہ لوگ دل سے خدمت انساں پہ مائل ہوں

عمل میں راستی ہو صدق ہو اُن کی زبانوں پہ
توانا ہوں مگر آفت نہ ڈھائیں ناتوانوں پہ

برابر ہو جہاں ہر ایک ادنیٰ ہو کہ اعلےٰ ہو
جہاں انصاف کا اور عدل ہی کا بول بالا ہو



مقابلے کی کہانی

ایک کہانی تو وہ ہے جو آپ نے لکھی، آیئے ہم آپ کو ان کہانیوں کی ایک کہانی سنائیں۔

مقابلے کا اعلان ہوتے ہی بچوں نے کہانیاں بھیجنی شروع کر دیں۔ پھر جب انعام پانے والی کہانیاں سالنامے میں چھپنے والی ہوں تو کیا کہنا۔ ہر ایک اسی فکر میں تھا کہ اس کی کہانی کو انعام ضرور مل جائے۔ مگر مزے کی بات تو یہ کہ جلدی میں اکثر بچے ایسے گھبرائے کہ انھوں نے مقابلے کی شرطیں بھی نہیں پڑھیں۔ آپ کو یہ سن کر ہنسی آئے گی کہ بعض بچوں نے تو اپنے نام تک نہیں لکھے۔ بس یوں ہی کہانی لکھ کر بھیج دی۔ پھر اکثر بچے لکھتے وقت صفائی کا خیال نہیں رکھتے۔ بعض کہانیاں اتنی کٹی پھٹی تھیں کہ ان کا پڑھنا مشکل ہو گیا۔ لیکن ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے ججوں نے جہاں یہ شکایت کی کہ اکثر کہانیوں کے پڑھنے میں دقت پیش آئی، وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تعریف کی کہ پیامی بڑی اچھی اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ اگر اسی طرح لکھتے رہے تو ایک دن بڑے ہو کر ملک میں شہرت حاصل کریں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ آیندہ جب آپ پیام تعلیم کے لئے کہانیاں بھیجیں گے تو صاف اور خوشخط لکھیں گے۔ بلکہ جب آپ کوئی مضمون بھیجیں تو اسکولی کاپی سائز کے رولدار کاغذ پر لکھئے اور ہمیشہ ایک سطر چھوڑ کر لکھئے۔ اس مقابلے کی کامیابی کا سہرا جہاں آپ بچوں کے سر ہے وہیں اس سلسلہ میں دو بزرگوں نے بھی بڑی مدد فرما کر مقابلے کو آخری منزل تک پہنچایا ہے یہ ہیں ہمارے دو [illegible] جناب رشید نعمانی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ اور جناب سعید الدین بی اے [illegible] کے [illegible] ممنون ہیں۔

مقابلے کی کہانیوں کا نتیجہ

گروپ ا (۵ برس سے ۸ برس تک کے بچے)

پہلا انعام

بن پیسے کی تجارت ——— میر حسین علی ہاشمی

دوسرا انعام

چرچ کی زیارت ——— طاہر رافع

تیسرا انعام

راجہ کا نمک ——— رخسانہ بیگم

گروپ ب (۹ برس سے ۱۲ برس تک کے بچے)

پہلا انعام

چوہے بلی کی لڑائی ——— اسمٰعیل اطہر عادی

دوسرا انعام

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے ——— سیدہ سیدین

تیسرا انعام

مریخ کی سیر ——— سید اقبال حسین

گروپ ج (۱۳ برس سے ۱۵ برس تک کے بچے)

پہلا انعام

بد مزاج لڑکا ——— جلیل حسین اختر

دوسرا انعام

گیہوں کے کانٹے ——— عبدالعزیز

تیسرا انعام

[illegible] ——— شکیلہ بیگم

[illegible]

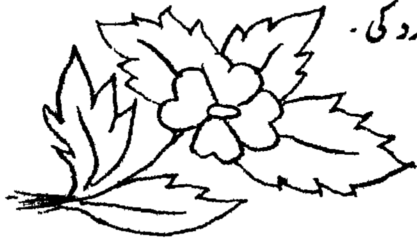
گروپ (الف) پہلا انعام

بن پیسے کی تجارت

میر حسین علی ہاشمی
عمر ۸ سال
حیدرآباد (دکن)

یورپ کے کسی ملک میں ایک غریب آدمی رہا کرتا تھا۔ اس کے ایک لڑکا تھا۔ بچپن سے ہی یہ لڑکا بڑا ہوشیار تھا۔ جب وہ آٹھ سال کا ہوا تو باپ سے بولا "ابا میں اب بڑا ہو چکا ہوں، مجھے کچھ کام سکھا دیجئے"۔ باپ نے کہا "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ اس کم سنی میں کیا کروگے۔ دو چار سال بعد سیکھنا۔ تب کچھ روپیہ کماؤگے"۔ لیکن کچھ سال بعد اس کا باپ مرگیا۔ اب تو وہ بے حد پریشان ہوگیا، چند روز کے رنج کے بعد وہ ایک صبح ایک بہت بڑے ساہوکار کے پاس گیا۔ اور کہا "جناب، مجھے کچھ روپے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔ میں آپ کے پیسے چند ہفتوں میں واپس کر دوں گا"۔ ساہوکار نے جب دیکھا کہ لڑکا بہت ہوشیار ہے تو جواب دیا "بیوقوف لڑکے، بھلا پیسوں سے تجارت کی جاتی ہے۔ بغیر پیسے کی تجارت کرو"۔ لڑکا گھر واپس آیا اور چند روز سوچ میں پڑ گیا کہ کس طرح بن پیسے کی تجارت کی جائے۔ آخر تیسرے روز گھر سے کھانا کھا کر نکلا۔ ایک گلی سے گذر رہا تھا کہ ایک چوہا پڑا پایا۔ جو ذرا دیر پہلے مرا تھا۔ اس نے جھٹ کاغذ میں لپیٹ لیا اور ایک سڑک پر بیٹھ گیا۔ ادھر سے ایک لیڈی گذر رہی تھی، اس کی بلی نے جھٹ چوہے پر حملہ کر دیا۔ لیکن لڑکے نے اسے روکا۔ لیڈی نے

کہا" کھاتے کیوں نہیں دیتے ؟" تو لڑکے نے جواب دیا" یہ چوہا بکنے کا ہے" لیڈی نے ہنس کر کہا۔ "اس کی قیمت کیا ہے ؟" اس نے کہا" چھ آنے" لیڈی نے چھ آنہ لڑکے کے حوالے کیا۔ اور بلی چوہا چٹ کر گئی۔ اس نے چھ آنے لے کر دوسرے روز کچھ آم لے لئے۔ اور اسے فروخت کیا۔ اس میں اسے چھ آنے کا فائدہ ہوا۔ وہ اسی طرح ہر روز آم فروخت کرتا رہا۔ اور اس نے کافی روپیہ کما لیا۔ چند روز بعد اس نے ارادہ کیا کہ دوسرا کوئی کام کرنا چاہئے۔ اس لئے اس نے ایک بڑی سی کیتلی میں چائے بنائی۔ اور سڑک پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ لوگ اس کی چائے کے بہت دلدادہ ہو گئے۔ پھر اس نے سڑک کے کنارے ایک دکان کھول دی۔ اب تو وہ بڑا دوکان دار بن گیا تھا۔ اس نے اپنی دکان کو وسیع کرنا شروع کیا۔ تب اس نے ارادہ کیا کہ ایک چائے کی کمپنی کھولنی چاہئے۔ بہت سے صرفہ کے بعد چائے کی کمپنی کھولی۔ اور اس کی وجہ سے اسے اتنا منافع ہوا کہ وہ اپنے ملک کے بڑے دولت مندوں میں شمار ہونے لگا۔ جب وہ دولت مند ہو گیا، تو اس نے غریبوں کی طرف سے مُنہ نہ موڑا۔ اور ہزاروں غریبوں کی مدد کی۔



سالنامہ پڑھ کر ہمیں اپنی رائے ضرور لکھیئے۔

گروپ (الف) دوسرا انعام

چرچ کی زیارت



طاہر رافع
عمر ۱۲ سال
پوسا

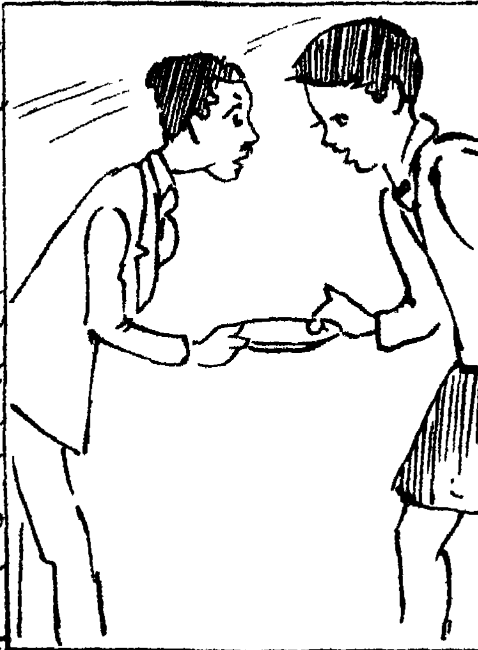
حسب معمول جان آج بھی کیلیش کے گرجا گھر کے سامنے صبح سے کھڑا تھا۔ کئی گھنٹے کھڑے کھڑے گزر گئے تھے۔ مگر اس کی جیب میں ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا گھر جائے یا نہ جائے۔ اس کی نظریں گرجا گھر کے دروازہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے آج بہت فکر تھی۔ وہ گھر لوٹے گا تو کیا کرے گا؟ کبھی کبھی وہ کہتا۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ گرجا گھر کے اندر جاؤں۔ خدا کی عبادت کروں۔ مگر میں تو غریب ہوں، مجھے کوئی اندر نہ جانے دے گا"

وہ ٹہل ہی رہا تھا کہ ایک خوبصورت بگھی اس کے سامنے آکر رکی۔ اس میں سے ایک رئیس اترا۔ اس کی ایک چھوٹی بچی بھی اتری اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹہلنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سے کھلونے تھے۔ جو اس کو آج اپنی برتھ ڈے (سالگرہ) کے موقعہ پر ملے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک دو روپے بھی تھے جو آج اس کے دادا نے دئے تھے۔ وہ ہنستی کھیلتی چرچ کے دروازہ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی نظر جان پر پڑی۔ وہ اپنی سہیلیوں سے کہنے لگی۔

"دیکھو، وہ چھوٹا بچہ کتنا غریب ہے۔ بے چارے کے پاس اچھی سی قمیض بھی نہیں" اس کی

سہیلیاں آگے بڑھ گئیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہو لی۔ گرجا گھر میں داخل ہوتے وقت اس نے ایک اٹھنّی جانؔ کے ہاتھ میں ڈال دی۔

جانؔ نے اس بچّی کو دیکھا اور پھر چاندی کے سکّے کو۔ وہ کتنا خوش تھا۔ آج تک اسے کسی نے اتنا قیمتی سکّہ نہیں دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ اٹھنّی کو کیا کرے؟ یکایک اس کو ایک خیال آیا۔ وہ چرچ کے دروازہ کی طرف بڑھا۔ اور چپکے سے اندر داخل ہوگیا آج وہ خدا کی عبادت گاہ میں تھا۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی مسرّت ہوئی۔ اس نے اپنے چاروں طرف قیمتی لباس پہنے ہوئے امیروں کو دیکھا۔ جو بڑے غور سے بائبل پڑھ رہے تھے۔ وہ چپ چاپ کونہ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد عبادت کا وقت ختم ہوگیا۔ دو تین پادری بڑی بڑی تھالیاں لئے آگے بڑھے۔ وہ امیروں کے سامنے سے گذرے۔ سب نے قیمتی قیمتی سکّے تھالیوں میں ڈالے۔ جانؔ اپنی اٹھنّی کو دیکھ رہا تھا۔ جب پادری آخری صف کی طرف بڑھے تو جان بھی اپنی جگہ سے ہلا۔ اور چُپ چاپ چمکدار سکّہ تھالی میں ڈال دیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ اس نے آج اپنی کمائی چرچ کی نذر کر دی تھی۔

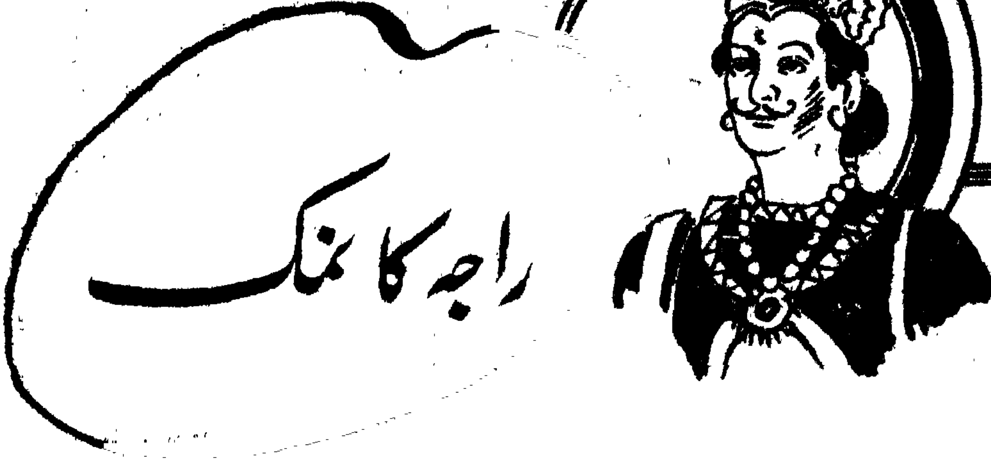


تھالیاں ایک میز پر رکھ دی گئیں۔ تمام لوگ کھڑے ہوکر دعائیں مانگنے لگے۔ یکایک لوگوں نے دیکھا کہ تھالی میں ایک سُنہری چیز بڑی آب و تاب سے چمک رہی ہے لوگ میز کے قریب گئے۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ جان کی دی ہوئی اٹھنّی تھی جو سونا کی طرح چمک رہی تھی۔ لوگ حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

خدا کی نظروں میں جانؔ کی دی ہوئی اٹھنّی تمام قیمتی سکّوں سے زیادہ عزیز تھی۔

گروپ (الف)
تیسرا انعام

رخسانہ خاتون۔ عمرہ سال۔ پٹنہ



راجہ کا نمک

ایک تھا راجہ۔ کچھ درباریوں کو لے کر جنگل میں شکار کو نکلا۔ دن بھر وہ سارے جنگل میں مارا مارا پھرا۔ لیکن ایک شکار بھی اسے نہ ملا۔ لاچار تھک کر اپنے خیمے میں واپس آگیا۔ اور کچھ دیر آرام کرلینے کے بعد اس نے اپنے درباریوں سے کہا۔

ایک دفعہ پانی میں آگ لگی۔ سارے کا سارا تالاب ایک بارگی سُلگ پڑا۔ یہ دیکھ کر پاس پڑوس کے لوگ آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے دوڑے۔ اور آگ بجھانے کے لئے بہت کچھ کیا۔ لیکن آگ تھی کہ سلگتی ہی جاتی تھی۔ لاچار ان لوگوں نے ایک سوداگر کے گھر جا کر دمکل والوں کو آگ لگنے کی خبر ٹیلیفون سے دی اور پھر سب کے سب وہاں سے واپس آکر آگ بجھانے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ اتنے میں دمکل کے آنے کی خوفناک آواز سُنائی دی۔ جب دمکل آگ بجھانے کے لئے چلتا ہے تب مکروہ سا باجا بجاتا ہے۔ جسے سُن کر دل دہل جاتا ہے۔ اور چھوٹے بچے ڈر سے رونے لگتے ہیں۔

کچھ ہی دیر کے بعد دمکل والے دمکل لے کر آگئے۔ اور بڑے بڑے ربڑ کے نلوں سے

تالاب میں پانی بارش کی طرح گرانے لگے لیکن پھر بھی آگ نہ بجھی۔ سلگتی ہی رہی۔ آخر تنگ آکر دمکل والے واپس چلے گئے۔ تالاب کی تمام مچھلیاں بڑی تیزی سے بھاگیں۔"

راجہ کے پاس بیٹھا ہوا ایک درباری بولا "حضور عالی! وہ بھاگتی ہوئی تالاب کے کنارے والے درخت پر چڑھ گئیں۔ اس وقت میں بھی وہیں تھا۔ میں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

یہ سُن کر راجہ کچھ دیر چُپ رہا۔ پھر بولا۔" اُن بھاگی ہوئی مچھلیوں میں سے کچھ تو پھر واپس آگئیں۔ اور اس سلگتی ہوئی آگ میں مزے سے تیرنے لگیں۔"

وہ درباری پھر بولا" وہ کافی بھوکی تھیں، اس لئے چنگاریوں کو کھا کھا کر اپنا پیٹ بھرنے لگیں۔"

راجہ نے اس کو غصّہ بھری نظروں سے دیکھا۔ اور پھر بولا "کیوں جی، تم میرے ساتھ جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ میں تو جھوٹی کہانی کہہ رہا تھا۔ دل بہلانے کے لئے۔"

"مجھے آپ کا نمک جو کھاتا ہوں۔"

پیامِ تعلیم

کتنا اچھا ہے پیامِ تعلیم
کتنا زیبا ہے پیامِ تعلیم

سارے بچوں کا بہل جاتا ہے دل
اک کھلونا ہے پیامِ تعلیم

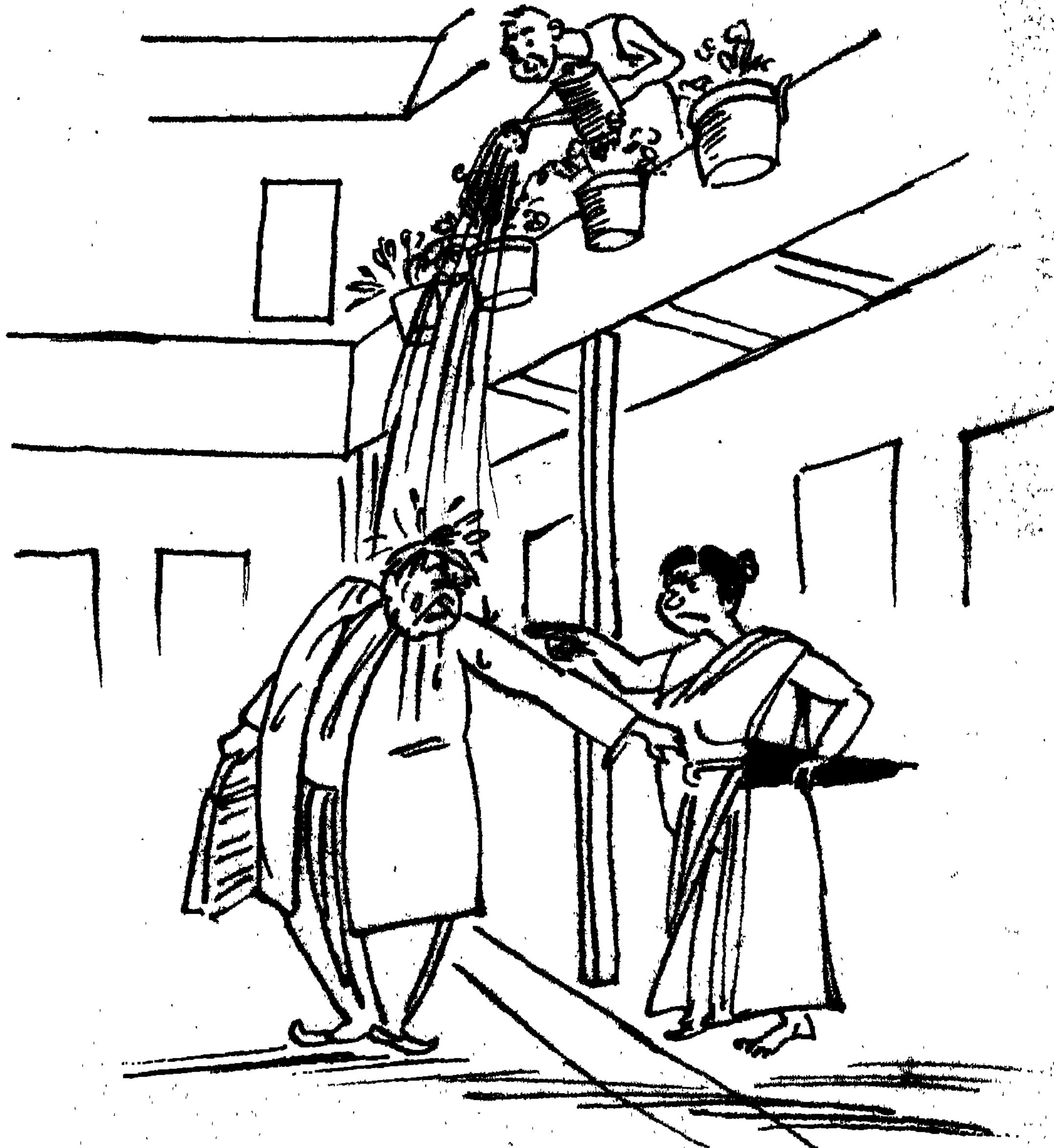
جس سے ہو جاتی ہے دولت حاصل
وہ خزانہ ہے پیامِ تعلیم

کیوں نہ ہم پیار کریں دل سے اسے
پیارا پرچہ ہے پیامِ تعلیم

اس سے کھل جاتی ہیں پھول کی کلیاں
چمن آرا ہے پیامِ تعلیم

کیا ایڈیٹر کا کرم ہے مجھ پہ
مجھکو بھیجا ہے پیامِ تعلیم

نجمہ خاتون



"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بارش ضرور ہوگی، چھتری لیتے جاؤ"

اسمٰعیل اطہر عمادی
عمر ۱۱ سال
بمبئی ۲

گروپ (ب) پہلا انعام

چوہے بلّی کی لڑائی



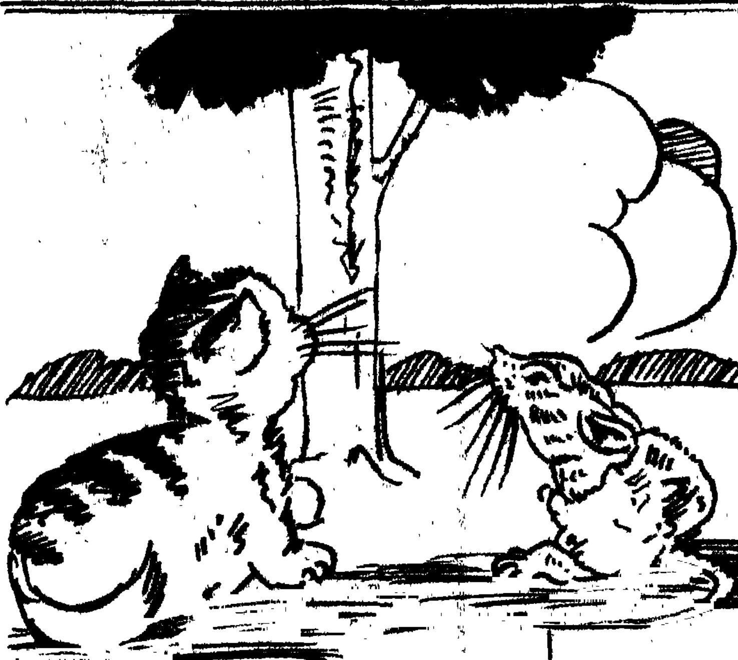
ایک تھی بلّی اس کا نام تھا بی میاؤں۔ بی میاؤں گھر گھر گھوما کرتی تھیں۔ کبھی انور کے گھر کبھی راما کے گھر، کبھی بوڑھی نانی کے گھر، بوڑھی نانی۔ اپنا چرخا چلاتی تھیں اور بی میاؤں سامنے بیٹھ کر دیکھتی رہتیں، اور میاؤں میاؤں کرتی رہتیں۔ بوڑھی نانی اس کے سامنے روٹی کا ٹکڑا پھینک دیتیں۔

ایک دن بوڑھی نانی کا انتقال ہو گیا۔ اب بی میاؤں کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ اُس کو کھانا کہیں سے نہ ملتا تھا۔ بی میاؤں انور کے گھر جاتیں وہاں کھانا نہ ملتا۔ راما کے یہاں جاتیں وہاں چائے نہ ملتی۔

ایک دن بی میاؤں راما کے گھر گئیں، راما نے اس کو چائے پلائی۔ اب وہ انور کے گھر گئیں، انور نے اُسے ایک پنیر کا ٹکڑا دیا۔ بی میاؤں نے اسے سونگھا۔ بہت اچھا لگا۔ اُس نے سوچا پنیر اس وقت نہ کھاؤں۔ کل کھاؤں گی۔ پنیر کو کہیں چھپا کر رکھ دوں بی میاؤں پنیر لے جنگل میں گئیں وہاں ایک اچھا درخت تلاش کرنے لگیں۔ [illegible]

پہنچ کر انھیں ایک چوہا ملا۔ چوہے نے کہا" خالہ بلّی سلام کہاں جانے کی جلدی ہے۔ آؤ ہم تم کھیلیں"۔

بلّی نے کہا" نہیں جا رہی ہوں، یہ پنیر مجھے انور نے دی ہے۔ میں اسے چھپانے کے لئے جا رہی ہوں۔



چوہا بڑا چالاک تھا اُس نے کہا" خالہ بلّی یہ سامنے کا جو درخت ہے اس کی جڑ میں چھپا دو۔ تب کوئی پنیر نہ کھا سکے گا۔ بلّی یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اور کہا ہاں ہاں ٹھیک ہے۔

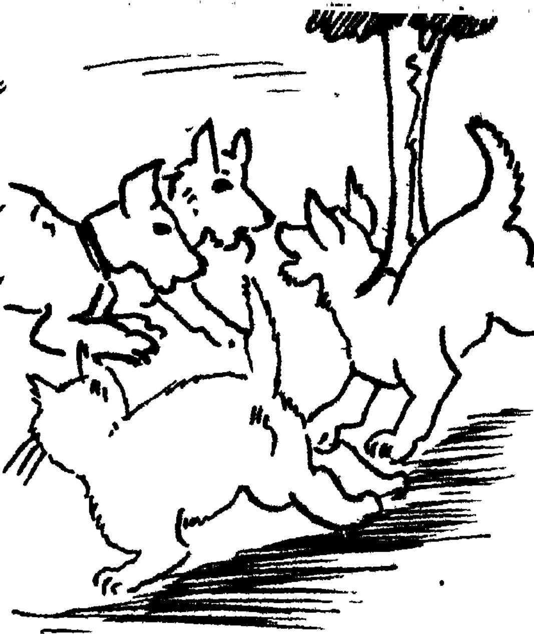
بلّی نے چوہے کو پنیر دیا۔ چوہے نے پنیر کو درخت کی جڑ میں چھپا دیا۔ بلّی خوش خوش رانا کے گھر چلی گئی۔

ادھر چوہے نے اندر ہی اندر پنیر تک راستہ بنا لیا۔ اور روزانہ کھایا کرتا۔ کچھ دنوں کے بعد پنیر ختم ہو گیا۔

ایک دن بلّی کو اپنا پنیر یاد آیا۔ وہ درخت کے پاس پہنچی درخت کی جڑ میں جہاں پنیر رکھا تھا۔ درخت کی جڑ کو کھودا۔ لیکن پنیر نہ ملا۔ بی میاؤں اِدھر اُدھر پنیر تلاش کرنے لگیں۔ اتنے میں اُن کی نظر چوہے کے بل پر پڑی۔ بلی سمجھ گئی کہ یہ شرارت چوہے کی ہے۔ بی میاؤں وہیں چھپ کر بیٹھ گئیں۔

چوہا کہیں سیر کرنے جا رہا تھا۔ بی میاں چپ بیٹھی رہیں۔ جب چوہا بل سے کچھ دور نکل گیا تو بلی نے جھپٹ کر

چوہے کو پکڑ لیا۔ چوہے نے کہا کہ خالہ بلی آپ کا پنیر میں نے کھایا ہے۔ اگر آپ کو پنیر کی ضرورت ہو تو چلئے میں آپ کو بہت سا پنیر لا دوں گا بی میاؤں بہت خوش ہوئیں اور خوش ہو کر



یا نہیں چوہا فوراً گاؤں میں گیا اور جا کر بہت سے کتوں سے کہہ دیا کہ میں تمہارے لئے ایک شکار لاتا ہوں۔ چوہا واپس آیا اور کہا کہ ہاں ہاں وہاں پنیر بہت سا ہے۔ بلی میاؤں میاؤں کرتی چوہے کے ساتھ

میاؤں میاؤں کرتی گئیں اور کہا کہ ہاں ہاں پہلے تم دیکھ آؤ کہ پنیر ہے ہولی ادھر کتے تیار تھے فوراً ہی بلی پر حملہ کر دیا اور مار ڈالا۔

—— اسی لئے چوہے اور بلی میں لڑائی ہے ——

بقیہ:- "بدمزاج لڑکا" صفحہ ۲۰ سے آگے

کا خیال تک نہ کیا۔ اپنے باپ کے ساتھ اُٹھا کر اُسے اندر لے گئی۔ اور بستر پر لٹا دیا۔ گرم دودھ پلایا اور سر پر پٹی باندھی۔ حامد اپنے دل میں بہت پچھتایا۔ اور شرمندہ ہوا۔ اس وقت اس نے اپنے دل میں عہد کیا، کہ آئندہ کبھی بدی نہیں کروں گا۔ بلکہ جہاں تک بن پڑے گا سب کے ساتھ نیکی سے پیش آؤں گا اور خدمت کروں گا۔

گروپ (ب) دوسرا انعام

سیّدہ سیّدین

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے



نیرا - مینا آج تمھاری کلاس میں کیا ہوا؟

مینا - ارے آج تو ہمارے ہاں بہت اچھے اچھے کھیل ہوئے... مگر دل تم میں پڑا رہا۔ کاش تم میرے کلاس میں ہوتیں۔

نیرا - کیا بتاؤں میری کلاس ٹیچر اتنی بد مزاج ہیں کہ لڑکیوں کو خوب مارتی رہتی ہیں۔

مینا - ہائیں کیا انھوں نے تمھیں بھی مارا؟

نیرا - بھئی میں تو جب کلاس ہوتی ہے، چپ چاپ بیٹھ جاتی ہوں مگر اور لڑکیاں ذرا کسی سے باتیں کریں تو ٹیچر ان پہ برس پڑتی ہیں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ بڑے چھوٹوں کے بولنے یا باتیں کرنے سے کیوں خفا ہوتے ہیں جیسے اماں ابا یا ٹیچر۔

مینا - نیرا کل اسکول میں جلسہ ہے ہم دونوں اکٹھے چلیں گے۔

یہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے
کہ یہ دو سہیلیاں ہیں۔ نیرا کی
عمر سات سال کی ہے اور مینا
کی آٹھ۔ دونوں ایک جان دو
قالب ہیں۔ دونوں کے گھر پاس
پاس ہیں اس لئے کبھی نیرا مینا
کے اور مینا نیرا کے گھر چلی جاتی
ہیں۔

مگر آپ جانتے ہیں کہ دوستوں میں
اکثر لڑائی بھی ہو جاتی ہے چنانچہ
ایک دفعہ دونوں میں
لڑائی ہو ہی گئی

نیرا۔ آؤ مینا اپنے
گڈے گڑیا کا
بیاہ کریں۔

مینا۔ ہاں ہاں ضرور
تمھاری گڑیا میرا
گڈا۔

نیرا۔ نہیں بھئی میرا
گڈا تمھاری گڑیا

مینا۔ واہ بی نیرا خوب



نیرا۔ ہاں ہاں ضرور،

مینا۔ اچھا بھئی، اب میں جاتی ہوں،

نیرا۔ کچھ دیر تو اور بیٹھو۔

مینا۔ بیٹھ تو جاتی، لیکن آج زبیدہ
بہن آرہی ہیں ان کو اسٹیشن لینے
جانا ہے۔

نیرا۔ تو کل پکا ارادہ ہے جلسہ میں
جانے کا

مینا۔ ہاں ہاں ضرور۔ اچھا ٹاٹا

نیرا۔ ٹا ٹا۔

سوچی اس لئے تا کہ دونوں تمہارے پاس آ جائیں نہیں بھئی یہ نہیں ہو سکتا۔

نیرا۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟

مینا۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہماری مرضی یوں نہیں ہو سکتا۔

نیرا۔ بڑی آئیں مرضی والی میں کوئی تمہاری نوکر ہوں کہ تمہاری مرضی پر چلوں۔

مینا۔ مت چلو کہتا کون ہے لیکن پھر میرے ہاں شادی کی درخواست کی تھی۔



نیرا۔ میں کیوں درخواست کرتی میرا گڈا تمہاری گڑیا کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا۔

مینا۔ میرا گڈا تمہاری گڑیا سے اپنے جوتے بھی صاف نہ کرائے گا۔

نیرا۔ اور میرا گڈا تمہاری گڑیا کو چھٹے سے بھی نہ چھوئے گا۔

مینا۔ اور میرا گڈا تمہاری گڑیا پر تھوکے بھی نہیں۔

نیرا۔ چپ رہو میں تم سے ساری عمر بات نہیں کروں گی۔

مینا۔ اور میں، میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔

یہ کہہ کر وہ باغ کی بنچ سے اٹھ کر غصے میں بڑبڑاتی اپنے گھر چلی گئی۔

دوسرے دن جب نیرا کھیلنے نہیں گئی تو اس کی ماں نے کہا "نیرا بیٹی جاؤ کھیلو اندر بیٹھی کیا کر رہی ہو۔

نیرا۔ نہیں ماں میں نہیں جاتی۔

ماں۔ کیوں کیا مینا کہیں باہر گئی ہے؟

نیرا - امی اس کا نام میرے سامنے نہ لیجئے۔ وہ بہت بری لڑکی ہے۔

پھر اس نے سارا واقعہ ماں کو سنایا۔ ماں مسکرائی اور بولی بیٹی اس میں تمہارا بھی تو قصور ہے تمہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اچھا اس دفعہ تمہارا گڈا ہو جائے پھر ہم ایک اور دفعہ گڈے گڑیا کی شادی کریں گے اس میں میرا گڈا ہوگا۔

نیرا نے ماں کی باتوں کو غور سے سنا اور بولی۔ امی میں تو اس سے نہیں بولوں گی ہاں اگر وہ پہلے مجھ سے بولنا شروع کرے تو اور بات ہے

ماں - وہ بھی یہی سوچتی ہو گی۔ ادھر مینا کی ماں نے بھی تقریباً یہی باتیں کہیں اور مینا نے بھی اس قسم کا جواب دیا۔ در اصل دونوں کے دل



ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بیقرار تھے مگر جھوٹی شرم ان کو روکتی تھی۔

ایک دن مینا کے گھر کا ایک آدمی گھبرایا ہوا نیرا کے گھر آیا

اور اس کی ماں سے کہا "بی بی جی مینا سیڑھیوں سے گر پڑی ہے اور سر میں بہت سخت چوٹ آئی ہے اس کی ماں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے مگر وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اگر آپ کے پاس کوئی خون روکنے کی دوا ہو تو دے



دیجیے"۔ نیرا کی ماں نے جلدی سے تین دوائیں ساتھ لیں اور مینا کے گھر چلی گئیں۔ پیچھے پیچھے نیرا آنکھوں میں آنسو بھرے وہاں پہنچ گئی اور چپ چاپ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ مینا بیہوشی میں پکار رہی ہے نیرا ---- نیرا ---- میری اچھی نیرا ---- مجھ سے کیوں خفا ---- ہو ---- اچھا ---- تمھارا گڈا ---- میری گڑیا ---- نیرا یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور جا کر بے ہوش مینا سے لپٹ گئی

اور پھر اپنے گھر واپس آ گئی۔ اسے پھر مینا کے گھر جانے کی ہمت نہیں ہوئی مگر وہ روز اس کی خیریت معلوم کرتی رہی۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک شام نیرا اپنے باغ میں اسی بنچ پر چپ چاپ اور اداس بیٹھی تھی جہاں اس کی اور مینا کی لڑائی ہوئی تھی۔ ایک دم سے اس نے اوپر دیکھا اور اسے یاد آیا کہ جب اس کی اور مینا کی لڑائی ہوئی تھی تو چاند نیا نیا [illegible] تھا بالکل ناخن کا

طرح - اور اب چودھویں رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا - تو اس کی اور بینا کی بات چیت پندرہ روز سے بند تھی ؟ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ سامنے سے بینا آتی ہوئی نظر آئی اور بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے سے معافی مانگی اور تھوڑے دنوں میں ان دونوں نے دو گڈے گڑیا کی شادیاں کیں ایک میں نیرا کا گڈا تھا اور ایک میں بینا کا۔ اس موقع پر سب نے ان چاروں گڈے گڑیوں کو بہت اچھے اچھے تحفے دئے۔

اور پھر نیرا اور بینا میں ہمیشہ ہمیشہ پکی دوستی رہی -





مریخ کی سیر

سید اقبال حسن
عمر ۱۲ سال
گیا۔ بہار

گروپ (ب) تیسرا انعام

جاڑے کا موسم تھا۔ رات کے نو بج چکے تھے اور میں اپنے کمرے میں "پیام تعلیم" پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب مجھے نیند آگئی اور میں نے دیکھا کہ میں اور میرے چند ساتھیوں کا پروگرام مریخ پر جانے کا ہوا ہے۔ اور ہم لوگ ایک راکٹ کے ذریعے مریخ پر چلے۔ چونکہ ہم لوگ پہلی دفعہ مریخ پر جا رہے تھے اس لئے جس جگہ سے ہمارا راکٹ مریخ پر جانے والا تھا وہاں پر بہت بھیڑ تھی۔ ہم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مریخ پر پہنچتے پہنچتے ہم بندوق کے سات فائر کریں گے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ لوگ بندوق کے سات فائروں کی آواز سن لیں گے تو آپ لوگ سمجھئے گا کہ ہم لوگ مریخ پر پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ جب کہ ہمارا راکٹ زمین سے ڈیڑھ ہزار میل اوپر پہنچ گیا تو ہم نے بندوق کا ایک فائر کیا۔ اسی طرح ہم نے چھ فائر کئے۔ اور ساتویں فائر کے بعد ہم لوگ مریخ پر پہنچ گئے۔ اور ہم وہاں کے لوگوں سے اشارہ کے ذریعہ باتیں کر رہے



اماں چھوڑو بھی کیا روتے ہو!

فوٹو سراج الدین



طاہر رافع
آپ نے گروپ 'الف' کی کہانیوں میں
دوسرا انعام حاصل کیا



اسماعیل اطہر عمادی
آپ نے گروپ 'ب' کی کہانیوں میں
پہلا انعام حاصل کیا



جلیل حسن اختر
آپ نے گروپ 'ج' کی کہانیوں میں
پہلا انعام حاصل کیا



عبدالعزیز
آپ نے گروپ 'ج' کی کہانیوں میں
دوسرا انعام حاصل کیا

تھے۔ وہ لوگ ہمیں دیکھ کر بیحد خوش ہوئے۔ آئیے اب میں آپ کو اُن کے جسم وغیرہ کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ اُن کا سر بہت بڑا اور ہاتھ پیر بیحد چھوٹے ہوتے ہیں۔ اُن کا دماغ بہت تیز ہوتا ہے۔

جب ہم لوگوں کو وہاں پہنچے ہوئے آٹھ، تو گھنٹے ہو گئے تو ہمیں بھوک نے پریشان کیا تو ہم لوگ اپنے ساتھ ایک انجکشن لے گئے تھے۔ جب ہمیں بھوک لگی تو ہم نے وہ انجکشن لے لیا جس سے تین روز تک بھوک نہیں لگی۔ کھانے کے بعد ہمیں پیاس بھی لگی تو پیاس بجھانے کے لئے ہمیں ایک گولی ملی جس سے دو روز تک پیاس نہیں لگی۔ پھر ہمارے میز بانوں نے ہمیں اپنے



کرے وغیرہ دکھائے۔ چونکہ اُن کا سر بڑا اور دھڑ چھوٹا ہوتا ہے اس لئے وہ چلنے پھرنے سے بالکل مجبور تھے، چلنے کے لئے وہ لوگ ایک میز پر بیٹھتے تھے اور ایک بٹن دبا کر وہ جہاں جانا چاہتے تھے وہیں میز کو روک لیا کرتے تھے۔

ہم لوگ اپنے ساتھ تصویر کھینچنے کا سب سامان بھی لے گئے تھے۔ اور جب ہم لوگوں نے انکی تصو
کھینچی تو ان
نے جب
کو ایک
تو وہ لوگ بہت خوش
ہم لوگوں کو وہا
دو ہفتے ہو گئے تھ
ان کی زبان بھی سیکھ
دن ہم لوگ سب

ایک ایسی ٹکر ماری کہ موتی چت گر پڑا۔ اور روتا ہوا دُم دبا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

اب حامد نے سیٹی کے اشارے سے کتے کو پھر بلانا شروع کیا۔ جب گڈریے کے لڑکے نے دیکھا کہ حامد پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ تو اس نے ایک ڈھیلا ایسا گھما کر اس کی کنپٹی پر مارا کہ حامد وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب ڈھیلے کی چوٹ سے ذرا ہوش آیا، تو اٹھ کر آگے کو چل دیا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ اسے ایک چبوترے پر ایک گوالے کی لڑکی بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پاس دودھ بھری ہانڈی رکھی ہوئی تھی۔ حامد کو دیکھ کر اس نے بڑی عاجزی سے کہا: "بھائی میاں! ذرا سہارا دے کر یہ ہانڈی میرے سر پر رکھا دیجئے۔ دودھ کوس سے چل آئی ہوں۔ تھک گئی تھی۔ اس لئے سستانے کو یہاں ہانڈی اُتار دی۔ اب رکھی نہیں جاتی۔ سہارا دے کر رکھ دیں۔ مگر ہاں جلدی گھر نہ پہنچی، تو اماں جان خفا ہوں گی کیونکہ ہمارے گھر کل سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اس دودھ سے اُن کے لئے کھیر پکے گی۔" حامد نے کہا۔ "تو آج تمہارے گھر کھیر پکے گی۔ پھر تو تمہیں بہت جلد گھر جانا چاہئے۔" یہ کہہ کر حامد نے ہانڈی اُٹھائی۔ اور لڑکی کے سر پر رکھنے کی بجائے اوندھی کر دی۔ بے چاری دودھ سے بھیگ گئی۔ اور ڈھاڑیں مار مار رونے لگی۔



حامد خوب ہنسا اور کہنے لگا۔ "بی بی صاحبہ، کھیر پکے، تو تھوڑی سی مجھے بھی بھیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔ ان دونوں جگہوں سے حامد بغیر سزا پائے بچ گیا۔ تو دل میں اور بھی شیر ہوا۔ اور سمجھا کہ میں جس شخص کو چاہوں چھیڑ سکتا ہوں۔ یہ تو خوب تماشا ہے۔ تھوڑی دور ایک میدان میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ حامد بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو گیا۔ جب اس کی گیند پھینکنے کی باری آئی تو اس نے

جان بوجھ کر ایک کیچڑ بھرے نالے میں پھینکدی۔ تمام لڑکے دوڑتے دوڑتے نالے پر گئے۔ اور جھک جھک کر دیکھنے لگے۔ اب حامد کو شرارت سوجھی اس نے ایک لڑکے کو اس ترکیب سے دھکا دیا، کہ اس کا دھکا دوسرے کو اور دوسرے کا تیسرے کو لگا۔ اس طرح سب لڑکے نالے میں گر پڑے۔ اور کیچڑ میں لت پت ہوگئے۔ باہر نکل انہوں نے حامد کو سزا دینی چاہی۔ لیکن حامد نے اپنے کتے کو جھسکار دیا۔ کتا بھونکنے لگا۔ لڑکے ڈر گئے اور حامد اُن کے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا۔ حامد آگے گیا۔ تو اسے ایک اندھا ملا۔ جو لاٹھی ٹیکتا چلا آرہا تھا۔ حامد نے پوچھا "کیوں میاں، آپ نے کوئی لڑکی دیکھی، اس نے سبز کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اور سر پر ایک ٹوکری اُٹھائے ہوئے تھی۔" اندھے نے جواب دیا "بیٹا میں تو اندھا ہوں مجھے کیا معلوم کون آ جا رہا ہے" حامد نے کہا۔ "بڑے میاں، مجھے آپ کی آنکھوں کے کھو جانے کا بڑا افسوس ہوا ہے" یہ کہہ کر اسے ایک گوبر کے بڑے ڈھیر پر گرا دیا۔ وہ بے چارہ اندھا کمر تک گوبر میں دھنس گیا۔ اور شور مچانے لگا۔ اور حامد کو پکڑنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑا۔



جس طرف سے حامد کے دوڑنے کی آواز آئی اندھے نے اپنی لاٹھی دے ماری۔ اور وہ آن کر اس کے منہ پر لگی۔ اور اس کے بہت سے دانت ٹوٹ گئے۔ اتنے میں اندھے کے بھائی نے حامد کو آن پکڑا۔ تو حامد نے وہاں سے چھٹکارا پانے کے لئے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی مظلوموں پر ظلم نہیں کریگا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ حامد نے پھر کبھی چھیڑ چھاڑ نہ کی ہوگی۔ لیکن یہ یاد رہے، جو عادت پڑ جائے وہ چھوٹتی مشکل سے ہے۔ حامد تھوڑی دور آگے گیا تھا کہ ایک لنگڑے فقیر سے ملاقات ہوئی۔ فقیر نے سوال کیا۔ حامد نے ایک پیسہ جیب سے

نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ لنگڑا پیسہ اُٹھانے کو جُھکا تو حامد نے اس کی لاٹھی اس زور سے کھینچی کہ وہ دھڑام سے منہ کے بل گر پڑا۔ اور زور زور سے چلانے لگا۔ اس کی آواز سُن کر وہی پہلا آدمی جس نے حامد کو پکڑا تھا۔ دوڑ کر آیا۔ اور حامد کی شرارت سُن کر اس کے پیچھے بھاگا۔ حامد نے بھی اسے دیکھ لیا اور حامد نے کھیتوں کی طرف منہ کیا۔ اتفاق سے ایک زمیندار کا گھر بیچ میں آ گیا۔ ایک چھوٹی سی دیوار تھی۔ حامد نے اُسے پھاندنا چاہا۔ مگر ایک کتے نے لپک کر اس کا دامن پکڑ لیا۔ حامد رونے لگا۔ اتنے میں زمیندار اور اس کا لڑکا گھر سے نکل آئے۔ لڑکے نے حامد کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور اپنے باپ سے کہا۔ "ابّا یہی وہ لڑکا ہے جس نے میری بھیڑیں تتر بتر کر دی تھیں۔ زمیندار نے یہ سنتے ہی اسے مارنا شروع کر دیا۔ اتنے میں وہ آدمی بھی آ پہنچا۔ جو اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اور اس نے بھی اُسے خوب پیٹا۔



جب انہوں نے دیکھا کہ اب حامد کافی مار کھا چکا ہے۔ تو اسے چھوڑ دیا۔ لیکن چھوڑنے سے پہلے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ ایسی شرارتیں نہیں کرے گا۔ جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔ حامد مار کھا کر روتا ہوا گھر چل دیا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ ان لڑکوں نے بھی اسے گھیر لیا۔ جن کو اس نے گرایا تھا۔ اور اس کی خوب پٹائی کی۔ اتفاق سے حامد کو ایک گدھا چرتا ہوا دِکھائی دیا۔ وہ کود کر گدھے کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ اور ایڑ لگائی۔ ایڑ کھاتے ہی گدھا ایسا بھاگا کہ قابو سے باہر ہو گیا۔ وہ گدھا ایک گوالے کے دروازے پر جا کر رُک گیا۔ اور دو لتّیاں پھینکنے لگا۔ حامد گر پڑا۔ اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ گوالا اس کے رونے اور کراہنے کی آواز سُن کر باہر نکلا۔ اس کے ساتھ وہ لڑکی تھی جس کا دودھ حامد نے گرایا تھا۔ وہ لڑکی بڑی نیک تھی۔ اس نے حامد کو پہچان لیا۔ لیکن بدلہ لینے

کیوں کے کارنامے

گروپ (ج) دوسرا انعام

عبدالعزیز
عمر ۱۵ سال
دیماس

پیامیو! تسلیم

اپنی آپ بیتی سنانے سے پہلے میں اپنا تعارف کرانا ٹھیک سمجھتا ہوں۔ خادم کا نام کیوںؔ ہے۔ اسکول کے استاد اور سائنسداں اکثر مجھے یاد کرتے رہتے ہیں۔ اسکول کے بچوں کا تو میرے مارے ناک میں دم ہے۔

میں 'استفہام' خاندان کا ایک نوجوان ہوں۔ اپنی پیدائش کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب حضرتِ انسان نے اپنی عقل پر زور دیا تب ہی میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والدین کے پوچھنے پر نجومیوں نے بتایا تھا کہ لڑکے کا مستقبل بہت روشن ہے یہ دنیا میں طرح طرح کی ایجادیں کرے گا۔ آدم کی اولاد کو طرح طرح کے عیش و آرام دے گا اور دنیا میں حیرت انگیز انقلابات پیدا کرے گا۔

اور حقیقتاً ہوا بھی ایسا ہی۔۔۔۔ دنیا کو جنت نظیر بنانے میں زیادہ تر

میرا ہی ہاتھ ہے۔

ایک میں ہوں اور ایک میرا جواب ہم دونوں ہی تو ہیں جنھوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی۔

جب جارج اسٹیفن سن بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ہانڈی کا ڈھکن ہل رہا ہے۔ فوراً میں نے اس کی مدد کی۔ اس نے سوچا "کیوں ہل رہا ہے" میرے جواب نے کہا "بھاپ کی طاقت" سے۔ بس پھر کیا تھا، بھاپ کا انجن ایجاد ہوا، ریل چلنے لگی، ہوائی جہاز اڑنے لگے اور وہ سب کچھ ہونے لگا جو کبھی انسان کے گمان میں بھی نہ تھا۔

کشش کا راز کس نے ظاہر کیا؟ آپ کہیں گے اسحٰق نیوٹن نے۔ واہ جناب محنت کرے کون اور نام ہو کس کا۔۔۔ نیوٹن تو اپنے کھیت میں بیٹھا تھا۔ سیب زمین پر گرا۔ میں نے نیوٹن کو سوچنے کا موقع دیا۔ اس نے دماغ پر زور دیا کہنے لگا "کیوں گرا؟ اڑ کر کیوں نہ چلا گیا؟" میرے جواب نے کہا، زمین میں کشش کی طاقت ہے"

ایڈیسن صاحب اپنے کمرے میں کنگھا کر رہے تھے بالوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اڈیسن نے میری پناہ لی خیال کرنے لگے چنگاریاں کیوں نکل رہی ہیں میرا جواب بول اٹھا "بالوں میں کنگھی کرنے سے بجلی پیدا ہو گئی"۔ لو صاحب ہم نے بجلی ایجاد کر دی۔ محلوں میں قمقمے روشن ہونے لگے۔ روشنی کے میناروں کو بجلی سے سجایا جانے لگا۔ کارخانے چلنے لگے۔ سینما ہونے لگے اور نہ معلوم کیا کیا ہونے لگا۔

یہ موٹر گاڑیاں یہ ریلیں یہ ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلیفون اور ٹیلیویژن وغیرہ سب انسانوں کو میں نے دئے ہیں۔

جو شخص میری مدد لیتا ہے اور میرے جواب کو تلاش کرتا ہے اس کو کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے۔ جب آپ کوئی عجیب چیز ہوتے ہوئے دیکھیں تو میری مدد لے کر ضرور سوچیں اور میرے جواب کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے

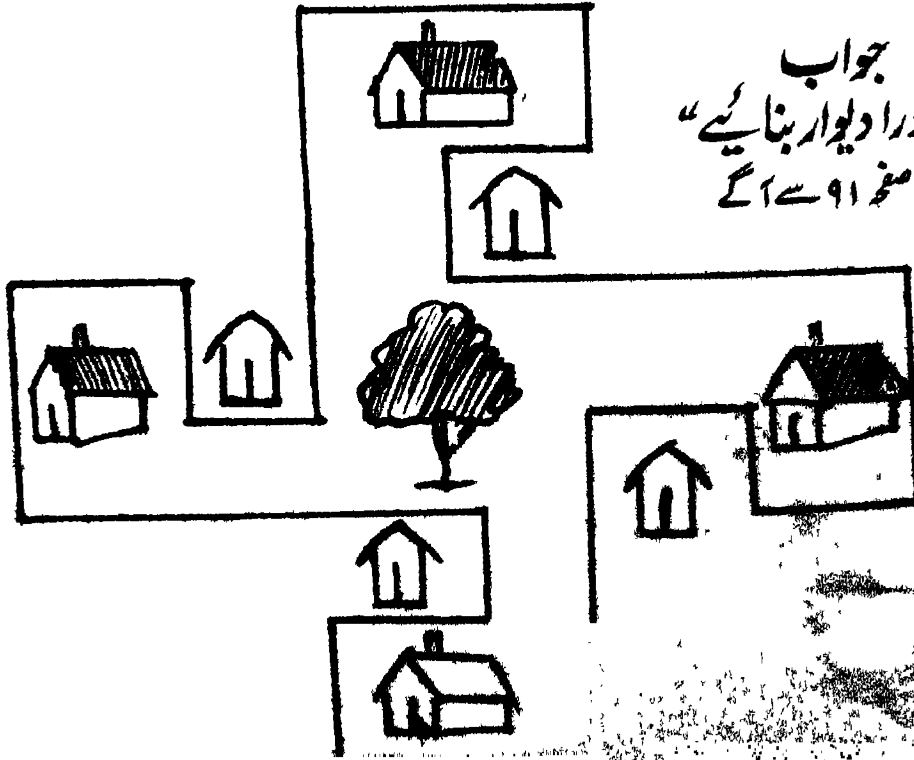
رہیں تو یقیناً آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔ بس کامیابی کا یہی گر ہے۔

اگر آپ اپنے ملک کو بلند تر لے جانا چاہتے ہیں اپنے ملک کی طرف سے سائنس کی دنیا میں نادر تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں، اسٹفن سن، نیوٹن، اڈیسن اور مار کونی بننا چاہتے ہیں، تو اپنی روزمرہ کی زندگی میں مجھے ضرور یاد کیا کیجیے۔

بقیہ جادو کا ڈنڈا صفحہ ۲۷ سے آگے

ایک منتر پڑھا جو سفید پوش نے اس کے کان میں کہا تھا۔ اور فوراً ہی رسّی ڈنڈا الگ ہو گئے اور بنئے نے جلدی سے اُسے اُس کی ہانڈی واپس دے دی۔ وہ ہانڈی اور ڈنڈا لے کر خوش خوش اپنے گھر لوٹ گیا۔ اور مزے سے اپنی زندگی گذارنے لگا۔

جواب
”ذرا دیوار بنائیے“
صفحہ ۹۱ سے آگے



شکیلہ بانو
عمر ۱۴ سال۔ بہار شریف

جادو کا ڈنڈا

گروپ (ج) تیسرا انعام

ایک دفعہ ایک بھکاری بھیک مانگنے کسی دوسرے شہر میں گیا۔ اور دن بھر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا لیکن اُسے کچھ بھی نہ مل سکا۔ وہ اپنے آپ پہ اور موجودہ مہنگائی پر دل ہی دل میں بہت غصہ ہوا۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے دو سال سے فصل ماری جا رہی تھی۔ اور ہر طرف بھوک اور غربت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے گھر کو واپس لوٹا۔ راہ میں اُسے ایک باغ ملا۔ گرمی کی وجہ سے وہ کافی تھک گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کچھ دیر درختوں کے سایہ میں آرام کر لوں، پھر گھر چلوں گا۔ اسی لئے وہ وہیں باغ میں ایک تنے دار درخت کے تلے بیٹھ گیا۔

اُسے بھوک بڑے زوروں کی لگی تھی۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ بچوں کی طرح چلّا چلّا کر رونے لگا۔ اتنے میں ایک سفید پوش نہ جانے کدھر سے اچانک آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا "تو کیوں روتا ہے؟ بتا

شاید میں تیرے کچھ کام آ سکوں"
وہ چپ چاپ ہو گیا اور اپنا سر اوپر اٹھا کر کہنے لگا۔ میں بھوکا ہوں اور میرے بچے بھی کل سے بے دانا پانی پڑے ہوئے ہیں۔ بھیک مانگنے نکلا تھا۔ لیکن افسوس کہ کچھ بھی آج نہ مل سکا۔ بچوں کے بارے میں سوچ کر میرا دل بھر آیا تھا اور میں رونے لگا تھا۔
سفید پوش نے اپنی جھولی سے ایک مٹی کی ہانڈی نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا
"اس ہانڈی سے جو کچھ مانگو گے وہ یہ اُگل دے گی۔ کھانے پینے کی جیسے بھات پوری، کھیر، پلاؤ اور اچھی اچھی مٹھائیاں"
بھکاری یہ سن کر بہت خوش ہوا اور خوشی خوشی ہانڈی لے کر اپنے گھر کی طرف تیزی سے بڑھا۔
راستہ میں ایک بنئے کی دوکان پڑتی تھی۔ بھکاری اکثر سودا اس کے ہاں سے خریدا کرتا تھا ____



وہ دوکان پر پہنچ کر بنئے سے بولا "دیکھو بھائی رام داس میری یہ ہنڈیا ذرا اپنے پاس رکھو میں سامنے والے تالاب سے ابھی نہاکر آتا ہوں۔ آج بہت گرمی ہے اور تھک بھی کافی گیا ہوں"
اور وہ نہانے تالاب کی طرف چلا۔ لیکن بیچ ہی راستہ سے وہ واپس آ گیا اور پھر اس نے ایک بار بنئے سے کہا۔
"بھائی میری ہانڈی کو حفاظت سے رکھنا"
اور پھر نہانے چلا گیا۔
بنئے کو کچھ شک ہوا اور اس نے

اس کی ہانڈی کو بدل دیا اور دوسری اسی طرح کی ہانڈی لا کر رکھ دی۔

بنئے کی بیوی بھکاری والی ہانڈی لے کر اندر جا رہی تھی کہ بنئے نے اُسے پکار کر کہا "بھوک لگی ہے کھانا لاؤ" اور خالی ہانڈی سے تازہ تازہ بھات گرنے لگا۔ بنئے کی بیوی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور ایک بڑے سے برتن میں اُسے رکھ کر دوڑی بنئے کے پاس آئی اور ہانڈی کی کرامت بیان کرنے لگی۔ بنیا۔ یہ سب کچھ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے کبھی بھر پیٹ کھانا نہیں کھایا تھا۔ چونکہ اس کے گھر لوگ زیادہ رہتے تھے اور آمدنی کم تھی۔ اُس دن اس نے خوب بھر پیٹ کھانا کھایا۔

بھکاری جب نہا کر واپس آیا تو اس نے بنئے سے اپنی ہانڈی مانگی۔ بنئے نے اس کو ہانڈی کے بجائے دوسری اسی طرح کی ہانڈی دے دی۔ وہ اپنی ہی سمجھ کر اسے لے کر گھر چلا گیا۔

اور گھر پہنچ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا "رکابیاں لاؤ ابھی پکا پکایا کھانا تمھیں کھلاتا ہوں"

اس کی بیوی یہ سن کر پہلے تو حیرت میں پڑ گئی پھر لمحہ بھر کے بعد رکابیاں لا کر سامنے رکھ دیں۔

بھکاری خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا "گرم گرم کھیر لاؤ" لیکن وہ ہانڈی کچھ بھی تو نہ دے سکی۔ وہ بالکل اُداس ہو گیا۔ اور وہ سمجھ گیا کہ یہ سب کارروائی بنئے کی ہے۔ وہ اسی وقت دوڑا ہوا اُسی باغ میں گیا۔ جہاں اس کی ملاقات سفید پوش سے ہوئی تھی اور اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا۔ جس کے نیچے وہ پہلے بیٹھا رویا تھا۔

ابھی وہ تھوڑی دیر روتے پایا تھا کہ وہی سفید پوش نمودار ہوا اور رونے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے تمام حال بیان کر دیا۔ یہ سن کر وہ بوڑھا بنئے



پر خفا ہوا اور پھر اس نے اپنی جھولی سے ایک جادو کا ڈنڈا اور رسّی اُسے دے کر کہنے لگا "اسے بھی بنئے ہی کی دکان پر رکھنا اور نہانے کیلئے چلے جانا۔ پھر اس نے بھکاری کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا۔

"بنیا جب اُسے چرانے کی ترکیب سوچے گا تو یہ رسّی خود بخود اس کے جسم میں لپٹ جائے گی اور یہ ڈنڈا اُسے زور زور سے پیٹنے لگے گا اور اس کے گھر کا جو کوئی بھی اُسے چھڑانے جائے گا تو یہ رسی اور ڈنڈا اس کی بھی اچھی خاصی مرمت کرے گا" اور یہ کہنے کے بعد سفید پوش پیر باغ کے باہر چلا گیا۔ اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ بھکاری خوش خوش وہاں سے چلا اور رسی ڈنڈے کو بنئے کی دوکان پر رکھ کر نہانے چلا گیا۔ اور جاتے جاتے بہت تاکید کر گیا۔

بنئے کو ہنڈیا تو ہاتھ لگ ہی گئی تھی وہ رسّی ڈنڈے کو پا کر بہت خوش ہوا اور چرانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ لیکن اتنے ہی میں رسّی نے اُسے خوب زور سے جکڑ دیا اور ڈنڈا لگا اُسے پیٹنے اور وہ زور زور سے چلانے لگا اور اُسے جو بھی بچانے آیا اس کی بھی اچھی خاصی مرمت ہو گئی۔ اور جب بھکاری نہا کر واپس آیا تو بنیا گڑ گڑا کر کہنے لگا بھائی تم اپنی ہانڈی لے لو جس کو ہم نے چرایا تھا۔ اور میری جان بچاؤ" تب بھکاری نے

بقیہ صفحہ ۱۲۲

سُندر اور سُندری

گروپ (ج) تیسرا انعام

ظفر علی معلّم
جنگل

بہت مدت گذری کسی ملک میں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ اس کے پاس سب کچھ تھا مگر کچھ نہ تھی تو اولاد۔ راجہ اسی غم میں بوڑھا ہو گیا۔ جب انسان غم گین ہوتا ہے تو اُسے سیر سپاٹے کی سوجھتی ہے کہ شاید اس طرح سے اس کا غم دور ہو جائے۔ راجہ نے اولاد سے مایوس ہو کر غم کو دور کرنے کے لئے اپنے ملک کا دورہ کرنے کی ٹھانی۔ جب بوڑھے وزیر نے یہ خبر سنی تو دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا "مہاراج! آپ کو راجدھانی چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہئے۔ راج پاٹ میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور ہمسایہ ممالک حملہ آور ہوتے ہیں۔ راجہ نے رنجیدہ لہجے میں کہا "منتری جی! اگر میرے دورے کو جانے سے راج پاٹ میں خلل آتا ہے۔ تو کیا میرے مرنے کے بعد اس میں خلل نہ آئے گا؟

دوسرے دن راجہ دورے پر چلا گیا۔ ہر شہر میں استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راجہ جہاں بھی جاتا وہاں شہر کے تمام عورت، مرد، بچے، بوڑھے، جوان سبھی جمع

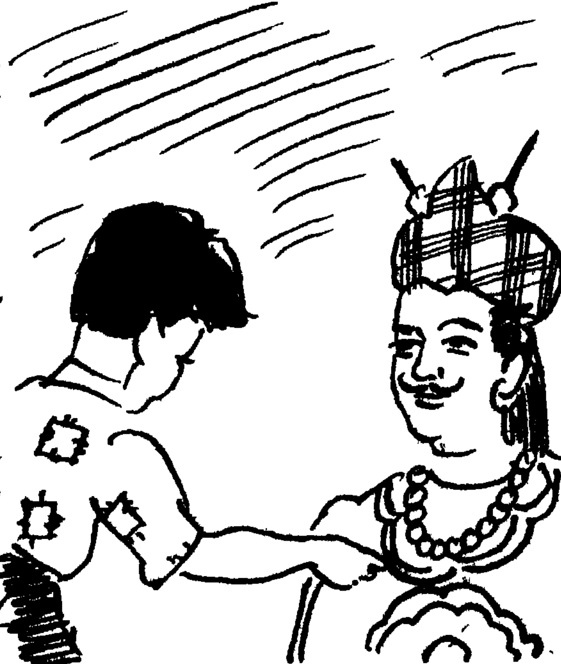
مذہب و ملت، جیکاروں سے اس کا استقبال کرتے۔ مگر راجہ کا دل ان چیزوں میں نہ لگا۔ راجہ نے پانچ سال تک سیر سپاٹا کیا۔ لیکن اس کا غم کم نہ ہوا۔ اس نے واپس راجدھانی جانے کی ٹھانی۔ ہر اس شہر سے جس سے وہ گذرتا لوگ اس کا استقبال نہایت شاندار طریقے سے کرتے۔ بالآخر وہ ایک شہر میں جا پہنچا جہاں کے قدرتی نظاروں نے اس کا دل موہ لیا۔ اور اس کو چند دن وہاں گزارنے پر مجبور کیا۔ وہاں کے لوگوں نے اس کا استقبال نہایت شاندار طریقے پر کیا۔ وہاں کے شاندار نظاروں نے اس کے غم کو ایک حد تک کم کر دیا۔ اس نے قانون جاری کر دیا کہ ہر وہ شخص جس نے راجہ کا استقبال نہیں کیا گرفتار کر لیا جائے۔ بہت سے اشخاص کو اس جرم میں پکڑا اور ان کو ایک سال قید بامشقت اور سو روپے جرمانہ کیا۔ اسی قانون کے تحت سپاہیوں نے ایک فقیر کو جا پکڑا اور اسے راجہ کے سامنے پیش کر دیا۔ راجہ نے پوچھا: "اے فقیر تو ہمارے استقبال کو کو کیوں نہیں آیا۔ فقیر نے کہا "عقل کے اندھے! کیا کوئی بانیاز کسی بے نیاز کے پاس بھی گیا ہے؟ جو تجھ جیسے حاجت مند کے استقبال کو میں آؤں" یہ سنتے ہی سپاہیوں نے میانوں سے تلواریں نکال لیں اور قریب تھا کہ فقیر کی بوٹی بوٹی اڑادیں۔ کہ راجہ نے تلواروں کو میانوں میں کرنے کا حکم دیا۔ اس کا بے اولاد ہونے کا غم تازہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

سپاہی حیران ہو گئے کہ راجہ رونے کیوں لگا۔ راجہ اپنی مسند سے اٹھا اور فقیر کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا۔

"اے فقیر میں نے بہت بڑا گناہ کیا مجھے معاف کر دو میں یہ قانون منسوخ کرتا ہوں۔ فقیر نے راجہ کے سر پر ٹھوکر لگائی اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "جا میں نے تجھے معاف کیا۔ اگر تو کچھ چاہتا ہے تو کہہ کہ تیری آس اور مراد پوری کردوں" راجہ اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "مجھے

راج پاٹ دھن دولت سبھی کچھ میسر ہے اگر کچھ نہیں ہے تو اولاد۔ اس لئے آپ مجھے بیٹی یا بیٹا دلائیے۔ فقیر نے کہا " راجہ تو نے پہلے بیٹی مانگی اس لئے میں تجھے بیٹی دیتا ہوں۔ تو نے پہلے میلے دل دکھایا ہے اس لئے تیری بیٹی مسکرائے گی نہیں۔ اس لئے اے راجہ! اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دینا جو اسے ہنسا دے۔" یہ کہہ کر فقیر نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک گیہوں کا دانہ نکال کر راجہ کو دیا اور پھر کہنے لگا۔" راجہ! اپنی بیوی کو یہ گیہوں کا دانہ کھلا دے۔" یہ کہہ کر فقیر غائب ہو گیا۔ راجہ اور اس کے سپاہی چپ چاپ کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد راجہ ہوش میں آیا اور فوراً کوچ کا حکم دیا۔ چند دنوں متواتر سفر کرنے کے بعد وہ راجدھانی پہنچ گیا۔ پھر اپنی تمام کہانی وزیر کو سنائی۔ راجہ نے اپنی بیوی کو گیہوں کو دانہ کھلا دیا۔ اور پھر راج پاٹ کے کاموں میں حصہ لینے لگا۔ بہت دنوں کے بعد ایک دن لونڈی نے خوش خبری دی" مہاراج کا اقبال بلند ہو۔ بھگوان نے آپ کو اپنی کرپا سے لڑکی دی۔" راجہ نے لونڈی کا منہ جواہرات سے بھر دیا۔ پھر بھاگ کر محل میں پہونچا۔ لڑکی کو دیکھا۔ اور اس کی خوب صورتی دیکھ کر اس کا نام سندری رکھا۔ راج کماری کی پیدائش کی خوشی میں سارے ملک میں گھر گھر گھی کے چراغ جلائے گئے۔ چالیس دن تک خوشیاں منائی گئیں۔ ہر ایک شہر سنوارا گیا۔ عدالتیں کئی دن تک بند رکھی گئیں۔ سندری کو پانچ سال کی عمر میں ایک قابل استاد کے سپرد کیا گیا۔ اس پانچ سال کی عمر میں وہ ہنستا تو کیا ایک مرتبہ مسکرائی تک نہ تھی۔ وہ ہنسنے کے وقت روتی تھی اور روتے وقت دھاڑیں مار مار کر اس طرح روتی تھی کہ دیکھنے والوں کے دل دہل جاتے تھے۔ دس سال کی چھوٹی عمر میں وہ اتنی عالم ہو گئی تھی کہ بڑی بڑی سنسکرت کی کتابیں اسے زبانی یاد ہو گئیں۔ جب راجکماری بڑی ہوئی تو بہت سے راجوں، مہاراجوں نے اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے راجہ کے پاس درخواستیں

مگر راجہ نے فقیر کی نصیحت کا خیال کرتے ہوئے سب کو کہلا بھیجا۔ کہ راج کماری کی شادی اس شخص سے کی جائے گی جو اس کو ہنسا دے۔ یہ عجیب و غریب شرط سن کر نہ صرف راجوں نے بلکہ امیروں نے بھی راج کماری کو ہنسانے کی کوشش کی۔ کسی نے ایسی قلابازی کھائی کہ راجہ ہنستے ہنستے بے دم ہو گیا مگر راجکماری کے منہ پر مسکراہٹ تک نہ آئی بلکہ بجائے ہنسنے کے وہ اور رونے لگی۔ کسی نے مداری کی بندریا کی طرح ناچنا شروع کیا کہ لوگ قہقہے لگانے لگے۔



غرض کہ راج کماری کو ہنسانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی مگر راج کماری کو ہنسنا نہ تھا اور وہ نہ ہنسی۔ آخر سب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک روز ایک غریب لڑکا دربار میں آیا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور ہر جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ مگر وہ اتنا خوب صورت تھا کہ چاند بھی شرما جائے۔ جب راجہ نے اسے دیکھا تو سمجھا کوئی فریادی ہے پوچھنے لگا کہ کس لئے آیا ہے اور کیا غرض ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ "حضور! میں نے سنا تھا کہ آپ کی بیٹی ہنستی نہیں ہے میں اسے ہنسانے کے لئے آیا ہوں" یہ سن کر درباری اور فریادی سب ٹھٹھہ مار کر ہنسنے لگے۔ کہ یہ کیا راج کماری کو ہنسائے گا۔ ہزاروں امیر راج کماری کو ہنسانے میں ناکام ہو گئے۔ اس کے پاس دھیلی دولت کچھ نہیں۔ اور آیا ہے راج کماری کو ہنسانے۔ مگر راجہ نے ان باتوں کی پروا نہ کی اور لڑکے کو قریب بلایا۔ اور پوچھا "لڑکے! تو کون ہے۔ کچھ اپنے خاندان کا نام بتا۔" لڑکے نے بتایا

سے انکار کر دیا اور کہا۔ مہاراج! اگر میں راج کماری کو ہنسانے میں کامیاب ہوا تو اپنے خاندان کا پورا حال آپ کو بتا دوں گا اور اگر ناکام ہو گیا تو جس طرح بے نام و نمود آیا ہوں اسی طرح واپس چلا جاؤں گا راجہ یہ سن کر تخت سے اٹھا اور لڑکے کو ساتھ لے کر محل میں گیا۔ محل میں جانے کے بعد راجہ نے پوچھا۔ "بیٹے تو کس طرح اسے ہنسائے گا" لڑکے نے جواب دیا۔ مہاراج! میں نے سنا ہے کہ راج کماری تعلیم یافتہ ہے میں اسے سنسکرت زبان کی ایک کتاب کی کہانی سناؤں گا۔" راجہ نے کہا "بیٹا! اب تک جتنے لوگوں نے راج کماری کو ہنسانے کی کوشش کی تھی وہ دولت اور فن کے ذریعہ تھی۔ مگر وہ ناکام ہوئے۔ آج تو نے اس کو علم سے ہنسانے کی کوشش کی ہے مجھے امید ہے کہ تو ضرور راج کماری کو ہنسانے میں کامیاب ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر راجہ تو محل میں چلا گیا اور لڑکا راج کماری کی راہ تکنے لگا۔ جب راج کماری آئی تو وہ اُسے کہانی سنانے لگا۔

"کسی شہر میں ایک برہمن رہتا تھا وہ تھا تو پہلے درجے کا بیوقوف مگر تپسیا کے معاملے میں پکاّ تھا۔ اس نے ایک دن گئو ماتا کو غصہ میں آکر چاقو سے زخمی کر دیا۔ جب وہ تپسیا کے وقت کرشنا کی مورتی کے سامنے پوجا کرنے بیٹھا تو مورتی سے آواز آئی "نشٹ پاپی تو نے گئو ماتا کو گھائل کر کے بڑا پاپ کیا ہے۔ اُٹھ اور اس کا بدلہ چکا" برہمن پہلے تو بہت ڈرا اور پھر کہنے لگا "دیوتا۔ میں نے گئو ماتا کو گھائل کر کے پاپ کیا ہے میں بڑا پاپی ہوں۔ میں اس کا بدلہ چکانے کو تیار ہوں۔ میں سورگ میں جانے کے لئے ہر قسم کی تپسیا کرنے کو تیار ہوں آپ مجھے اس کا طریقہ بتا دیں" مورتی سے اور آواز آئی "جا اور گنگا کے کنارے جا کر تپسیا کر اور ہر صبح اس میں اشنان کر" یہ سن کر برہمن اٹھا۔ گھر کی تمام چیزیں بیچ کر خیرات کر دیں اور ایک جھولا اور تھیلا لے کر گنگا کی طرف چل کھڑا ہوا۔ پانچ دن تک وہ برابر چلتا رہا۔ بارش



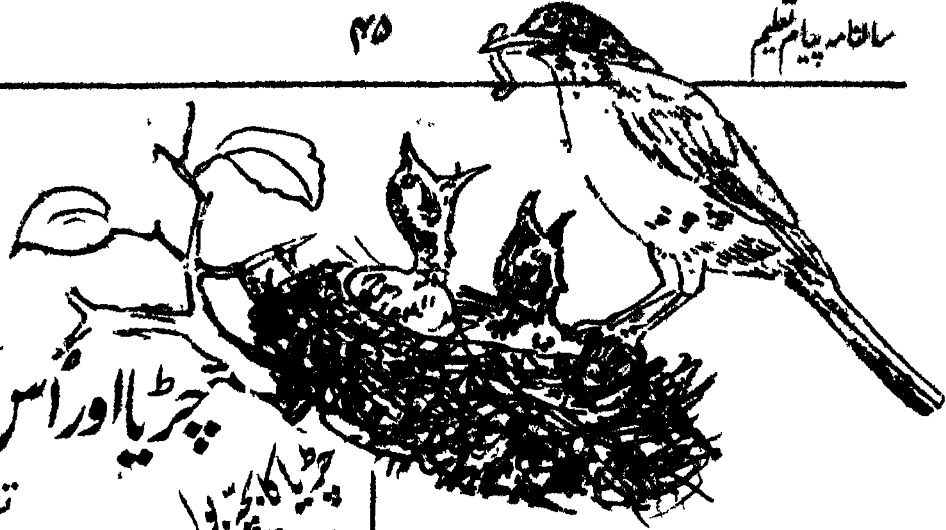
کا موسم تھا ایک گہرے گڈھے میں بارش کا پانی جمع تھا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا یہی گنگا ہے۔ ہنڈیا لٹھیا رکھ کر تپیا کرتے بیٹھ گیا۔ ہر روز صبح سویرے اٹھ کر گھڑے میں سے چلّو بھر پانی ہاتھ میں لے کر سر پر ڈالتا۔ پھر اسی طرح اشنان کرتا۔ اس طرح چار مہینے گزر گئے۔ ایک دن وہاں سے ایک پنڈت کا گزر ہوا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا تو اس نے پوچھا "بھائی یہاں گڈھے کے کنارے کیا کر رہے ہو؟" برہمن نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ یہ سن کر پنڈت نے کہا "گنگا تو میلوں دور ہے۔" برہمن نے پوچھا "تو کیا یہ گنگا جی نہیں ہیں۔ نہیں یہ کہہ کر پنڈت تو آگے بڑھ گیا۔ برہمن نے ہنڈیا لٹھیا سنبھالی اور چل کھڑا ہوا۔

پانچ دن چلنے کے بعد وہ ایک نہر کے پاس جا پہنچا۔ اس نے سوچا یہی گنگا جی ہے۔ ہنڈیا لٹھیا رکھ تپیا کرنے بیٹھ گیا۔ ہر روز صبح سویرے اٹھتا اور نہر میں لیٹ جاتا پھر اسی طرح اشنان کرتا۔ اس طرح پھر چار مہینے گزر گئے۔ ایک دن وہاں سے ایک شخص کا گزر ہوا۔ اسے برہمن کو نہر میں لیٹا ہوا دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور پوچھا "بھائی، یہاں نہر کے

کنارے کنارے کیا کر رہے ہو؟" برہمن نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ یہ سن کر پجاری نے کہا "گنگا یہاں سے بہت دور ہے۔" برہمن نے پوچھا "کیا یہ گنگا مائی نہیں ہے۔" "نہیں" یہ کہہ کر پجاری تو آگے بڑھ گیا۔ برہمن نے ہنڈیا لٹھیا سنبھالی اور چل کھڑا ہوا پانچ دن چلنے کے بعد وہ ایک جھیل کے پاس جا پہنچا۔ اس نے سوچا یہی گنگا مائی ہے۔ ہنڈیا لٹھیا رکھ کر تپسیا کرنے بیٹھ گیا۔ ہر روز صبح سویرے اٹھتا اور جھیل میں بیٹھ جاتا پھر اسی طرح اشنان کرتا۔ اسی طرح اسے چار مہینے گزر گئے۔

ایک دن وہاں سے ایک برہمن کا گزر ہوا۔ اس نے برہمن کو جھیل میں بیٹھا ہوا دیکھ کر تعجب سے پوچھا "بھائی! یہاں جھیل کے کنارے کنارے کیا کر رہے ہو؟" برہمن نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ یہ سن کر برہمن نے کہا "گنگا تو یہاں ابھی دور ہے"۔ برہمن نے پوچھا "تو کیا یہ گنگا نہیں ہے؟" "نہیں" یہ کہہ کر برہمن نے راہ سنبھالی۔ اس نے سوچا خدا جانے گنگا جی کتنی دور ہے کہ ایک سال چلنے کے باوجود میں پہنچ نہیں سکا۔ اس نے ہنڈیا لٹھیا سنبھالی اور واپس گاؤں کی طرف چل دیا۔

یہ کہانی کہنے کے بعد لڑکے نے دیکھا تو راجہ اس کے سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔ اور راج کماری ہنس ہنس کر کپا بنی ہوئی تھی۔ راجہ نے پوچھا "بیٹا! تو کون ہے اور تیرا نام کیا ہے؟" لڑکے نے جواب دیا کہ وہ ایک راجہ کا بیٹا ہے اور اس کا نام سُندر ہے۔ راجہ نے سندر اور سندری کی شادی کر دی اور راجدھانی میں کئی دن خوشیاں منائی گئیں۔



چڑیا اور اُس کا بچہ

تشہیر الاسلام
درجہ دوم۔ مدرسہ ابتدائی

چڑیا کا بچہ بول رہا ہے
چونچ کو اپنی کھول رہا ہے
اُڑنے کو پر تول رہا ہے
اور میرا من ڈول رہا ہے

چوں چوں کرتی چڑیا آئی
چونچ میں اپنی چگا لائی
بچے بولے ہم نا کھائیں
جبتک یاں سے اُڑنا جائیں

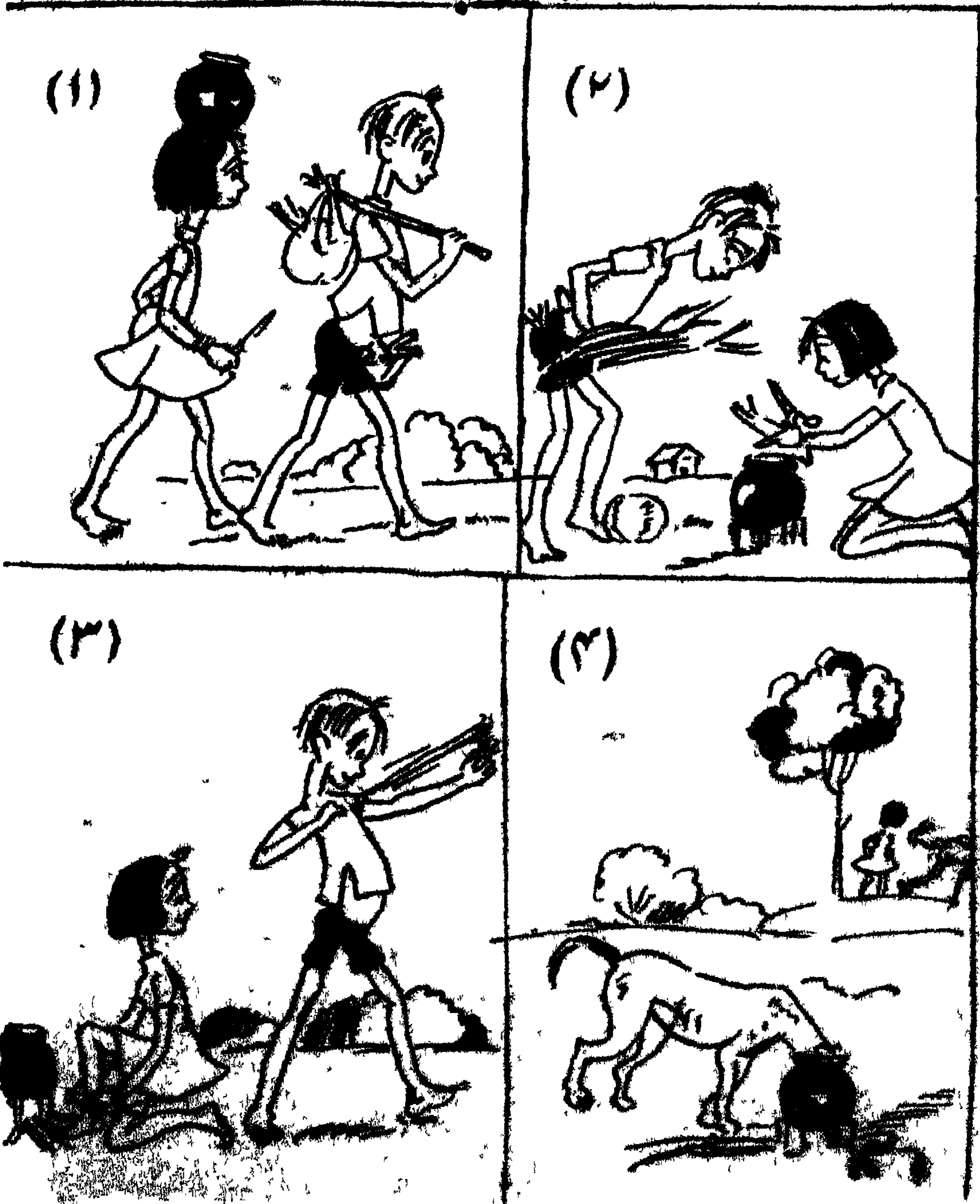
چڑیا بولی ٹھیرو ٹھیرو
بچے تھوڑا کھانا کھاؤ
پھر اُڑنے کی کوشش کرنا
چل چوں چوں چوں کرتے پھرنا

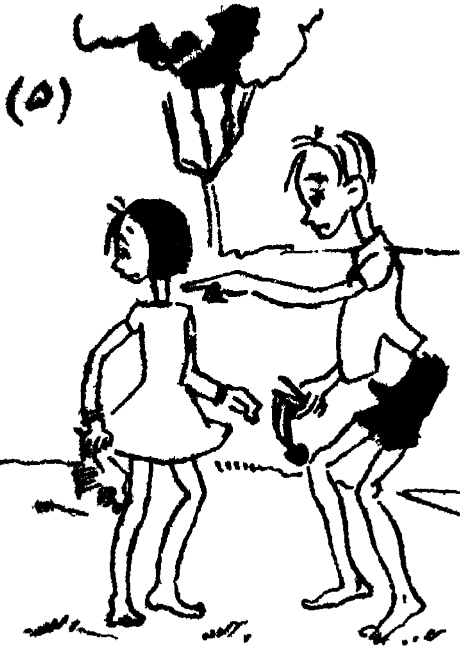
چڑیا

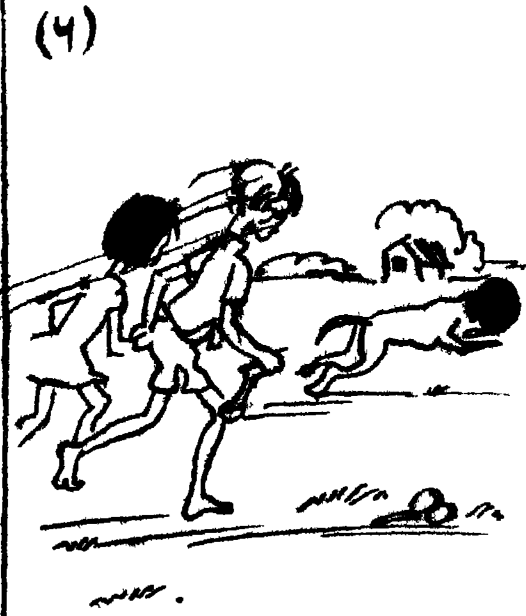
اُڑتی اُڑتی آئی چڑیا
چونچ میں دانہ لائی چڑیا
بچے اس کے گھر میں نکلے
جب اس نے گھر ایک بنایا
بچوں نے جب دانہ کھانا
چڑیا نے پھر پانی پلایا
بچوں نے اک گیت سنایا
ناصر کا بھی جی بہلایا

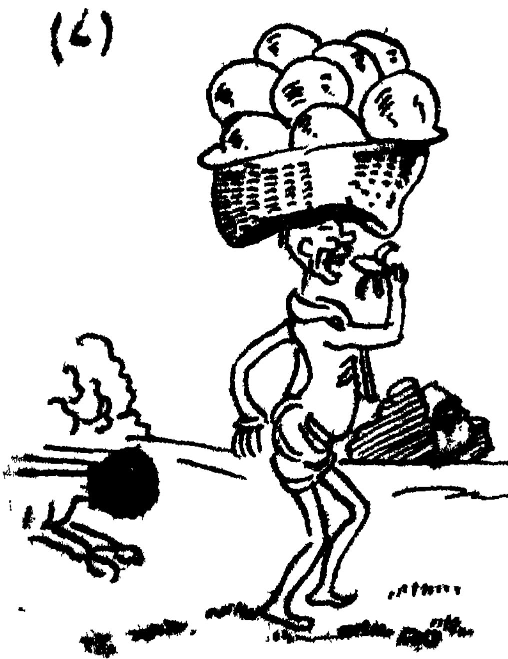
سید امیر شاہ ناصر درجہ چہارم جامعہ نگر دہلی

کالو مینا کی پک نک




(۵)


(۶)


(۷)


(۸)



انگر مشتاق

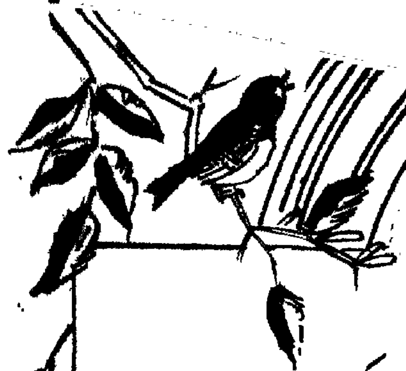
کھلونے

ننھا تھرمس ننھی گیس اور ننھا ناشتے دان
چھوٹے چھوٹے بوے اور یہ انکے بھائی جان
چینی کے دارو غہ جی اور دفتی کے دربان
لائی ہیں اپنے ساتھ ہمارے واسطے یہ سامان
آئیں ممانی جان ہماری آئیں ممانی جان
آئیں ممانی جان

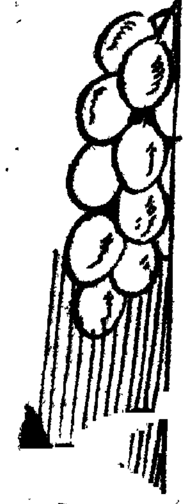
ٹین کا الو موم کا بونا لکڑی کی بندوق
کپڑے کے اک جکڑ خاں اور شیشے کے بیروق[1]
پیتل کے کچھ سارس بگلے
جادو کا صندوق



۱۔ ایک سیاہ رنگ کا پرندہ جو عجیب عجیب انداز سے آنکھیں مٹکا مٹکا کر
چلتا اور کبھی ہنستا ہے۔



کھیل کھلونوں سے ہیں سجے سب کمرے اور دالان
آئیں ممانی جان ہماری آئیں ممانی جان
آئیں ممانی جان



گاؤں کا مکھیا شہر کا بھشتی جنگل کا لنگور
لندن کا انگریز بہادر بھارت کا مزدور
مٹّی کے یہ سیب شریفے کاغذ کے انگور

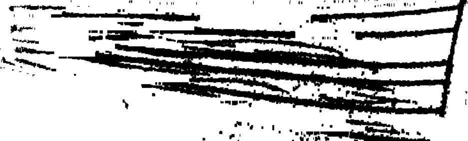


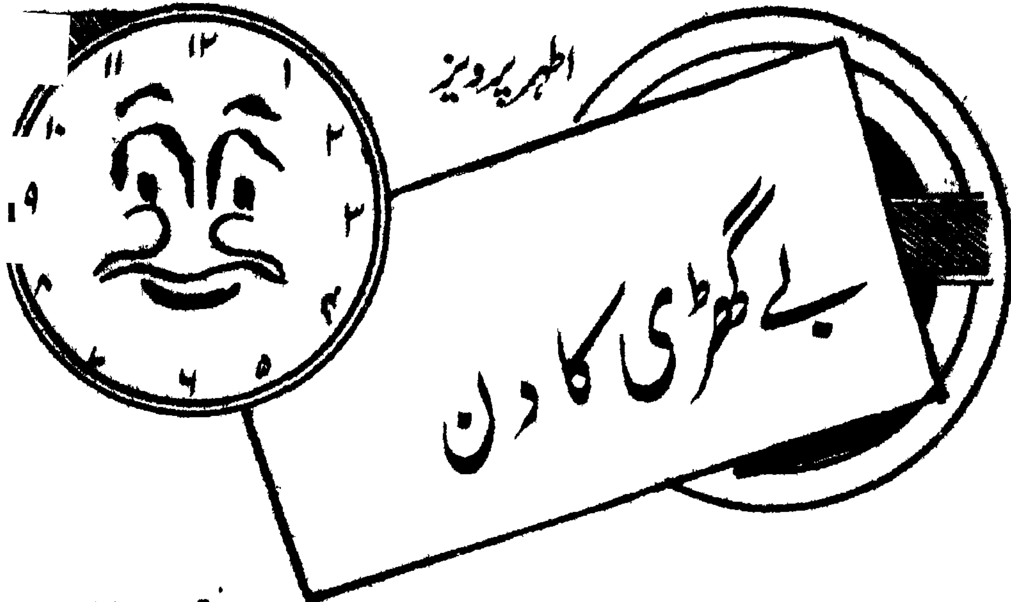
پا کر یہ رنگین کھلونے کیوں نہ ہو خوش عرفان
آئیں ممانی جان ہماری آئیں ممانی جان





آئیں ممانی جان





بے گھڑی کا دن

اطہر پرویز

شاہد میاں کروٹیں بدل رہے تھے اور ان کی باجی انھیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھا رہی تھیں۔۔"ارے بھیّا جلدی سے اُٹھ جا دیکھ تو کتنا دن چڑھ گیا ہے۔۔۔"

باہر سے بھائی جان آرہے تھے۔ اُنھوں نے جو سنا تو فوراً بولے" واہ سورج آدھی رات کو نکل آئے تو کیا سویرا ہو جائے گا۔ سوؤ بھیّا خوب سوؤ"

یہ سننا تھا کہ شاہد میاں گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اور اُن کو بھائی جان کی اس بات پہ بڑی ہنسی آئی۔ مگر پھر انھوں نے جو آنکھیں مل کر دیکھا تو سچ مچ سورج نکل آیا تھا اور وہ مرغ کی بانگ کا انتظار کرتے رہ گئے تھے۔ حالانکہ رات امّی نے ایک بار نہیں کئی بار کہا" گھڑی میں چار بجے کا الارم لگا دو!"

مگر شاہد میاں کیسے سنتے اُن کو تو اپنے دیسی مرغے پہ بڑا بھروسہ تھا جو چار بجے ضرور بولتا ہے۔ لیکن اتفاق کی بات دیکھئے کہ مرغے صاحب نے رات کے بارہ بجے ہی ککڑوں کوں! ککڑوں کوں! کا شور مچایا اور شاہد میاں اٹھ بیٹھے۔

مگر اب جو گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ ابھی تو بارہ ہی بجے ہیں۔ نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔ غرض پھر سو گئے اور اب جو آنکھ کھلی تو دن کے آٹھ بجے تھے۔

بس پھر کیا تھا بھائی جان اور اماں سب ہی نے مل کر شاہد میاں کا خوب ہی تو مذاق اڑایا اور اس مرغے کا نام ہی "شاہد میاں کی گھڑی" رکھ دیا۔

اسی لئے تو اگلے دن شاہد میاں زیادہ ہوشیار ہو گئے تھے اور الارم لگا کر سوتے۔ گھڑی پیچھے کھٹ کھٹ کرتی رہی اور شاہد میاں خر خر کرتے رہے۔

اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ عجیب و غریب دنیا میں پہنچ گئے۔ ویسے تو سب کچھ اسی دنیا کا نقشہ ہے۔ اسی طرح کے بازار، اسی طرح کے مکانات، بالکل سب کچھ ایسا ہی۔ مگر نرالی بات یہ ہے کہ یہاں وقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا، کسی کے پاس گھڑی نہیں ہے جو وقت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ شاہد کے کسی دوست نے شام کو ان کو کھانے کی دعوت دی۔ اب جو یہ ان کے یہاں پہنچے تو وہاں کسی کا پتہ بھی نہ تھا سارے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہ بڑے سٹ پٹائے کہ اچانک نوکر نکل کر آیا۔ اور بولا



"واہ بھیا، اتنی دیر لگا دی۔ یہاں تمھارا انتظار کرتے کرتے سب نے کھانا کھا لیا۔ ابھی تو سب سوتے ہیں" اب تو شاہد میاں اور بھی گھبرائے کہ مجھے بھوک تو اب لگی ہے یہ رات کیسے ہو گئی۔ جلے بھنے



وہاں سے واپس ہوئے تو سوچا کہ چلو سینما ہی دیکھیں۔ وہاں پہنچے تو حیرت کی اور بھی انتہا نہ رہی۔ سینما دیر ہوئے شروع ہو گیا تھا۔ شاہد میاں کی طرح اور کئی آدمی بھی دیر سے آئے تھے۔ وہ بھی ایسے ہی منہ بنائے کھڑے تھے

ابھی شاہد میاں وہیں کھڑے تھے کہ اُدھر سے بوجھ بجھکڑ کا گذر ہوا۔ بوجھ بجھکڑ شاہد میاں کے پڑوسی تھے، انھوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اُن سے ہی پوچھا۔۔۔ "ارے بھائی بوجھ بجھکڑ یہ تو بتاؤ آج کیا مصیبت ہے کہ ہم کو کھانا بھی نہیں ملا اور یہاں فلم بھی شروع ہو گیا۔"

یہ سُن کر بوجھ بجھکڑ پہلے تو روئے اور پھر ہنسے۔ وہاں جو لوگ کھڑے تھے وہ گھبرا گئے کہ یہ کیا قصہ ہے مگر پھر بوجھ بجھکڑ نے کہا کہ "بھائی میں رویا اس لئے کہ اگر میں مرجاؤں گا تو تم کو یہ سب باتیں کون بتانے آئے گا اور ہنسا اس لئے کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ کیا قصہ ہے۔ مجھے جانا تھا کلکتہ، پہلے اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی گاڑی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ چلوں ذرا بازار ہی سے گھوم آؤں جب بازار گھوم کر واپس آیا تو معلوم ہوا

کہ گاڑی چھوٹ گئی!"

"ارے بھائی وہ کیسے؟" شاہد سے چپ نہ رہا گیا "معلوم ہوتا ہے کہ ریلوے والوں نے تم کو دھوکا دیا!"

"اجی نہیں یہ بات نہیں ہے۔" بوجھ بجھکڑ بولے" قصہ یہ تھا کہ میں جو اسٹیشن سے باہر نکلا تو ذرا سی دیر میں بادل آگئے۔ اب وہاں اسٹیشن پر کسی نے بادل تو دیکھا نہیں مسافر ریلوے والوں سے لڑ پڑے کہ بس اب دن چھپ گیا گاڑی لے چلو۔"

"ارے بھائی یہ تو عجیب بات ہوئی!"

"کیوں نہیں ... وہاں کئی آدمی لہو لہان ہو گئے، تم کو عجیب معلوم ہوتی ہے" تو بھی بوجھ بجھکڑ یہ تو بتاؤ کہ پھر ہوا کیا؟"

"ریلوے والوں کو بھی یقین ہو گیا کہ شام ہو گئی اور انھوں نے گاڑی چلادی!"

"اچھا تو بھائی بوجھ بجھکڑ تو تم ایسے رہ گئے کلکتہ جاتے جاتے!"

"اجی اچھا ہی ہوا۔ ذرا سی دیر میں خبر آئی کہ گاڑی آگے چل کر لڑ گئی۔ ادھر سے دوسری گاڑی آرہی تھی۔ اس کے آنے کا بھی یہی وقت تھا۔ یہ گاڑی وقت سے پہلے ہی پہنچ گئی، بس ٹکرا ہی تو گئی۔ سینکڑوں آدمی مر گئے ہوں گے!"



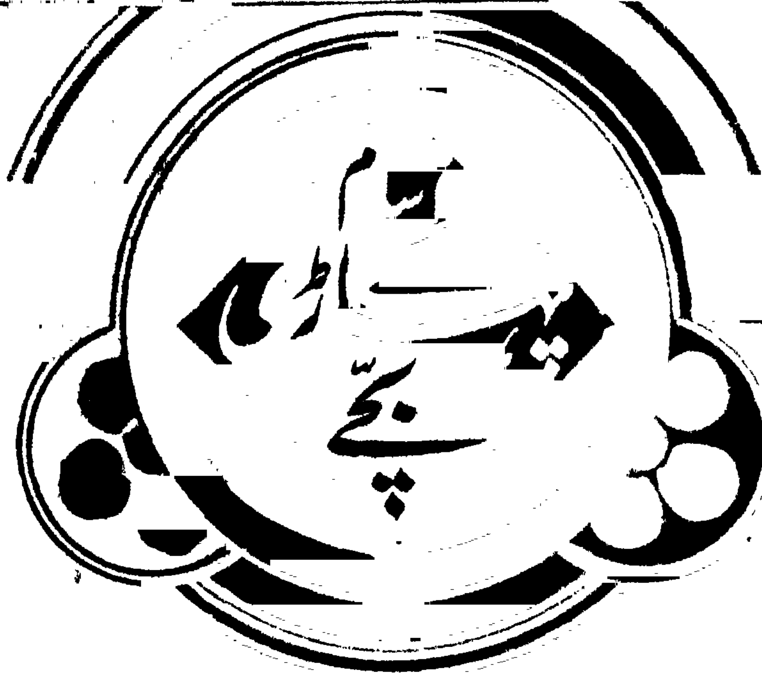
اب شاہد اور بوجھ بجھکڑ دونوں گھر کی طرف چل دئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کافی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی وہ گھر پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ شاہد کے ایک دوست رفیق مل گئے۔ انھوں نے شاہد کو دیکھتے ہی کہا۔

"ارے بھائی شاہد کہاں گھوم رہے ہو؟"

"میں تو ایسے ہی آرہا ہوں تم اپنی کہو کہ یہ بغل میں بستہ دبائے کیسے آرہے ہو"

"ارے بھائی کچھ مت پوچھو۔ ابھی ذرا سی دیر پہلے تو اسکول ختم ہوا۔ ایک تو آج کھلا ہی دیر سے، حساب کے ماسٹر صاحب نے جو پڑھانا شروع کیا تو نہ جانے کتنی دیر تک پڑھاتے رہے، ادھر جغرافیہ کے ماسٹر صاحب کا بھی یہی حال تھا، اب جا کر پیچھا چھوٹا ہے۔ وہ تو یوں کہئے کہ لڑکوں کو بھوک لگنے لگی اور انھوں نے چیخنا چلّانا شروع کردیا کتنی دیر اس ہؤ حق میں لگ گئی۔ اُدھر سے ہیڈ ماسٹر صاحب آئے تو انھوں نے کہا کہ "اب چھٹی ہو جانی چاہیئے اس لئے کہ معلوم ہوتا ہے کافی دیر ہو گئی۔ بس پھر اسکول کا گھنٹا ٹن ٹن ٹن بجا ہے ٹن ٹن ٹن کی آواز سے شاہد میاں کی آنکھ کھل گئی۔ بجلی جلا کر جو دیکھا تو ٹھیک چار بجے ہیں۔ بس پھر کیا تھا شاہد میاں کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ اور بڑے مزے میں بولے:۔ "میری اچھی سی گھڑی تو نہ ہو تو کتنی مصیبت آجائے۔"

شمیم ہزاروی
دہلی



جس دن بھائی جان آسام کی پہاڑیوں سے گھر واپس لوٹے، تو بچوں نے اودھم مچانا شروع کر دیا کہ بھائی جان، ہمیں آسام کی کہانیاں سنائیے۔ آسام کی کہانیاں بڑے مزے کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ آسام میں بڑے بڑے "جادوگر" ہوتے ہیں۔ چھو منتر سے آدمی کو بکرا بنا دیتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا بھائی جان، اور بھائی جان نے کہا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔ من گھڑت کہانیاں ہیں"

"تو پھر آسام کی کوئی کہانی سنائیے گا بھائی جان!" بچوں نے مایوسی کے لہجہ میں کہا۔

"سناؤں گا۔ لیکن آج نہیں... کل..."

لیکن بچے کب کل پر ٹلنے والے تھے۔ آخر بھائی جان مجبور ہو گئے۔ اور لگے کہانی سنانے۔ رضیہ، شہزادہ اور لطیف تینوں بھائی جان کے پاس بیٹھ گئے۔

"سنو میں تمہیں آسام کے پہاڑی بچوں کی کہانی سناتا ہوں" بھائی جان نے کہا: "آسام میں یوں تو یہاں کی طرح شہر اور گاؤں ہوتے ہیں۔ جن میں ہماری تمہاری طرح لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں کے پہاڑی علاقوں میں کچھ لوگ رہتے ہیں، جن کے بچے بڑے بہادر ہوتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے چھوٹے چھوٹے جانوروں کا شکار

کر لیتے ہیں۔ ان کا جسم مضبوط اور گٹھیلا ہوتا ہے۔ رنگ سیاہ، چہرا گول اور ناک چپٹی ہوتی ہے۔ یہ زیادہ تر نیپالی بچوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ننگے رہتے ہیں۔ ان کی زبان سخت ہوتی ہے۔ آسام کے پہاڑی بچے صرف ایک لنگوٹ ہی باندھتے ہیں۔ ان کے کندھے پر ہر وقت ایک کمان لٹکی رہتی ہے۔ اور پیٹھ پر ترکش! آسام کے پہاڑی علاقوں سے اتر کر نیچے گاؤں میں چلیے۔ تو آپ کو جو بچے دکھائی دیں گے وہ پہاڑی بچوں سے مختلف ہوں گے۔ ان کا رنگ سانولا، جسم لاغر اور زبان مختلف ہوگی۔ ان کی بول چال بنگالیوں سے ملتی جلتی ہے۔ ان کے کندھے پر تیر کمان نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے ہاتھوں میں غلیل ہوتی ہے۔ اور یہ اسی سے اڑتے ہوئے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ کیا مجال جو نشانہ چوک جائے۔ ہم جب ایکدن "[illegible] گاؤں" (آسام) کے سامنے والے گاؤں میں گئے تو ایک جگہ بچے ننگے بدن مٹی کھود رہے تھے۔ ہمیں دیکھنا تھا کہ بھاگ کھڑے ہوئے اور لگے چلانے۔ وہ دور کھڑے ہو کر ہاتھوں سے اشارے کرتے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم بھاگ جاؤ۔ ان کے شور و شر سے گاؤں والے اکٹھا ہو گئے۔ عورتیں اور مرد لاٹھیاں لے کر جمع ہو گئے۔ اور ہماری طرف دوڑے کم بختوں نے ہمارا خون پسینہ ایک کر دیا۔ وہ اپنی جگہ اکڑ رہے تھے اور ہم اپنی جگہ ڈٹے رہے تھے۔ آخر بڑی مشکل سے ایک بنگالی بابو ادھر سے آنکلے۔ ہم نے ان سے کہا "یہ مٹی کھود رہے تھے۔ ہم ان کی تصویر کھینچنا چاہتے تھے۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ انہیں سمجھا دیں۔ ہمیں تو ان بچوں کو دیکھنے کا شوق ہے"۔ بنگالی نے آسامی زبان میں ان سے بات چیت کی۔ وہ سب ہمارے پاس آگئے لیکن بچے ڈر کے مارے ہمارے نزدیک نہ آئے۔ دراصل ہماری طرح کے لوگ یہاں بہت ہی کم آتے ہیں۔ اس لئے بچے اور بڑے سبھی ہم سے ڈر رہے تھے۔ یہ پہاڑی بچے اکثر جاہل ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غریبی ہی ہے۔ البتہ یہ بچے کھیل کود میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ ناچنے میں انہیں کافی مشق ہوتی ہے۔ ان کا ناچ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا ہی ایک ناچ مجھے دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک شام کو بہت سے بچے ایک میدان میں اکٹھے ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں غلیل اور تیر کمان تھے۔ سر پر پھولوں کے تاج اور کمر سے بھی پتے لپٹے ہوئے تھے۔ یہ لڑکے ایک دائرے میں ناچتے چلے جاتے تھے۔ بیچ میں ایک ڈھول بجتا جاتا تھا۔ ناچتے ہوئے بچے تالیاں بھی

[illegible] پر دیکھئے



امیؔ کے نام خط —————— ہم نے خود لکھا ہے خود



بھاگے ہم پھر باجی!



سیدہ سیدین
آپ نے گروپ (ب) کے مقابلے میں دوسرا
انعام حاصل کیا۔



شہسوار



اپنی مدد آپ

ترجمہ

ا-ع. انصاری
اسلامپوری

یونان میں ایک گاڑیبان رہتا تھا۔ ایک بار وہ اپنی گاڑی لئے کئی دن کے بعد گھر واپس آ رہا تھا۔ گاؤں میں ایک دن پہلے خوب دھواں دھار بارش ہوئی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ راستے میں کیچڑ ہو گئی تھی۔ اس کی گاڑی میں سامان بہت زیادہ لدا ہوا تھا۔ اس لئے گھوڑوں کو گاڑی کھینچنے میں دقّت بھی ہو رہی تھی۔ لیکن گاڑی بان کو گھر پہنچنا ہی تھا۔ کیونکہ اب رات ہوتی جا رہی تھی۔

چلتے چلتے یکایک گاڑی کا ایک پہیہ گہری دلدل میں دھنس گیا۔ گھوڑوں کے لاکھ زور لگانے پر بھی پہیہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاڑیبان نے گھوڑوں کو چابک سے خوب خوب پیٹا۔ مگر پہیہ جہاں تھا وہاں سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

اس وقت راستے میں دور تک کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ گاڑی بان حیران تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ اگر اس وقت یہاں ہرکولیس کی طرح کوئی طاقتور انسان ہوتا تو وہ ضرور اس کی گاڑی کو ڈھکیل کر آگے بڑھا دیتا۔ اتفاق سے اس وقت طاقت کا دیوتا ہرکولیس آسمانی راستے سے کہیں جا رہا تھا۔ وہ زمین پر کھڑے اس گاڑی بان کے دل کی بات سمجھ گیا اور ہنستا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس نے گاڑیبان کے سامنے پہنچ کر اس سے

[illegible] جس کو یونانی طاقت کا دیوتا مانتے ہیں۔ یہ درجہ ہرکولیس نے اپنی بہادری کے کارناموں سے حاصل کیا تھا۔

پوچھا: "تم نے مجھے کس لئے یاد کیا؟"

ہرکولیس دیوتا کے لمبے چوڑے جسم کو دیکھ کر گاڑیبان سہم گیا۔ اس کے منہ سے آواز تک نکلنی مشکل ہو گئی۔

ہرکولیس نے پھر کہا: "اگر پہیہ پھنس گیا تھا تو مجھے کیوں یاد کیا؟ کیا دیوتا تمہارے نوکر ہیں؟"

بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن پہیہ صرف ہل کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ اسی طرح اور زور لگاؤ!" ہرکولیس نے گاڑیبان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

گاڑیبان نے پھر زور لگایا۔ اس بار پہیہ تھوڑا سا گھوما۔

"تھوڑا اور زور لگاؤ۔" ہرکولیس نے پھر ہمت



گاڑی بان اب اور ڈر کے مارے کچھ نہ کہہ سکا۔ آخر ہرکولیس نے اسے حکم دیا: "اچھا! گاڑی سے نیچے اترو!" گاڑیبان کے نیچے اتر آنے پر اس نے پھر کہا: "گاڑی کے پہیے میں کندھا لگا کر آگے دھکیلو!" گاڑیبان نے پہیے میں کندھا لگا کر اسے آگے

بڑھائی۔ گاڑیبان نے ایسا ہی کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پہیہ گھوم کر دلدل سے باہر نکل آیا۔ ہرکولیس زور سے ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا: "جو کام تم خود کر سکتے تھے۔ اس کے لئے تم نے مجھے خواہ مخواہ یاد کیا۔ دنیا کا کوئی کام صرف دیوتا کو یاد کرنے سے نہیں ہوتا۔ خود

[illegible] دیکھئے



سید منیر الحسن

ایک لڑکا

پُرانے زمانے کی بات ہے کہ دنیا کے ایک کنارے پر ایک لڑکا رہتا تھا۔ جو بڑا بہادر اور رحم دل تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا اور کوئی بھائی بہن نہ تھا۔ اس کا دیس سفید ڈراونے ریچھوں، جنگلی کتوں اور خونخوار بھیڑیوں کے لئے آج بھی مشہور ہے۔ جانتے ہو یہ کون سا دیس ہے؟ سائبیریا جو روس کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے تو اس لڑکے کو ان خونخوار جانوروں سے بچ بچا کر بہت ہوشیاری سے رہنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ماں باپ کبھی اسے اکیلا باہر نہ جانے دیتے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ اس لڑکے کے ماں باپ بیمار پڑ گئے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے اور دوا دارو لانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ گھر میں بس یہی ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ اور ڈاکٹر کا مکان گھر سے کوئی چار پانچ میل دور۔ مشکل یہ تھی کہ ماں باپ سے خود تو بیماری کے مارے اُٹھا نہ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا اکیلا اتنی دور دوا لینے جائے۔

اب کیا ہوا کہ جب لڑکے نے ماں باپ کی حالت زیادہ خراب دیکھی تو اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں دوا لینے ضرور جاؤں گا۔ نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ماں باپ مر جائیں۔ آخر کار یہ سوچ کر وہ اپنا موٹا گرم

کوٹ پہن کر اور گرم ٹوپا لگا کر گھر سے چپ چاپ نکل کھڑا ہوا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ برف پڑ رہی تھی۔ چاروں طرف طوفان کی سی کیفیت تھی۔ ہوا کی آواز کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہی تھی۔ مگر لڑکے نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بلکہ دھیرے دھیرے چلنے کے بجائے اپنی برچھی لئے سرپٹ دوڑنے لگا۔ اور اس بات کی کوشش کرنے لگا۔ کہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد ڈاکٹر کے پاس پہنچ کر دوا حاصل کرے۔ اور فوراً واپس آ کر اپنے ماں باپ کو پلائے۔ تاکہ وہ تن درست ہو جائیں۔



لڑکا اسی اُدھیڑ بُن میں بھاگا چلا جا رہا تھا کہ اچانک راستے میں اسے ایک ڈراؤنا جنگلی کتا نظر آیا۔ جو مُنہ پھاڑے کھڑا تھا۔ لڑکا یہ خوفناک منظر دیکھ کر پہلے تو بہت گھبرایا۔ مگر پھر سنبھل کر اس نے بھی اپنی برچھی کندھے کے اوپر اٹھائی۔ اور پھر دل ہی دل میں کہنے لگا کہ اگر اس کتے نے مجھ پر حملہ کیا، تو میں بھی اس کا مقابلہ کروں گا۔ لڑکے کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر کتا سمجھ گیا کہ اس لڑکے پر حملہ کرنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ کتا کترا کر آگے بڑھ گیا۔ اور لڑکا اپنے راستے پر چلتا دیا۔

جب لڑکا دوا لے کر گھر لوٹا تو اس کیا دیکھا کہ اس کے ماں باپ اس طرح اچانک جانے کی وجہ سے بہت گھبرا رہے تھے۔ ماں نے فوراً اس کو دیکھتے ہی کہا: بیٹا! ہے ادھر کوئی ایک ڈراونا اور خوفناک کتا ہے۔ جو بھیڑیئے کی طرح خونخوار ہے۔ اور بچے اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں نے کئی بار ادھر جانے کے لئے منع کیا میرے لال! مگر اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اور ڈاکٹر کے [illegible] باپ نے کہا: جو ہوا

مگر بیٹا! اب تم اُدھر نہ جانا۔"

اپنے والدین کی یہ باتیں سن کر لڑکے نے دل ہی دل میں غور کرنا شروع کیا کہ اچھا میرے ماں باپ اس کتے سے بچنے کے لئے کہہ رہے ہیں جو مجھے ابھی کچھ دیر پہلے راستے میں ملا تھا۔ اتنا سب کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد بھی لڑکے نے اپنے ماں باپ کو ڈراؤنے کتے کی اچانک ملاقات کا کوئی قصہ نہیں سنایا، بلکہ اس نے ماں باپ کو دوا پلائی۔ اور تھکا ہارا ہونے کی وجہ سے لیٹا ہی تھا کہ گہری نیند سو گیا۔ اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی اس نے کہہ سن کر ماں باپ سے ڈاکٹر کے یہاں جانے کی اجازت لی۔ اور تیار ہو کر دوا لینے چل کھڑا ہوا۔ لیکن وہ ڈر بھی رہا تھا۔ اور یہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں کہیں آج بھی وہ جنگلی کتا نہ مل جائے۔



اتفاق کی بات کہ جب لڑکا آدھا راستہ طے کر چکا تو اس نے کیا دیکھا کہ راستے میں وہی کتا لیٹا ہے۔ جوں ہی کتے کی نظر لڑکے پر پڑی وہ اسے دیکھ کر غرّانے لگا اور اُٹھنے کی بھی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ اُٹھ نہ سکا۔ لڑکے نے جب غور سے کتے کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے پیر میں چوٹ آگئی ہے۔ اسی وجہ سے کبھی کتا کراہنے لگتا تھا اور کبھی لڑکے کو دیکھ کر غرّانے لگتا تھا۔ لڑکے نے جب کتے کی یہ حالت دیکھی تو اس کو بہت رحم آیا۔ چنانچہ اس نے اپنی جیب سے روٹی نکال کر کتے کے سامنے پھینک دی۔ کتے نے روٹی کھالی اور للچائی نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکے نے اشارے سے کتے کو سمجھایا کہ اب میرے پاس روٹی نہیں ہے۔ میں نے اپنی روٹی تجھے کھلا دی مگر جب میں کل آؤں گا تو تیرے لئے اور روٹی لیتا آؤں گا۔ اس وقت تو مجھے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ جس کی دوا سے میرے ماں باپ کو

بہت آرام ہے۔ اور ان کے جلدی اچھے ہونے کی امید ہے۔" لڑکا اسی طرح کئی دن تک ڈاکٹر کے پاس جاتا رہا۔ وہ روز کتے کے لئے روٹی اپنے ساتھ لے جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد کتا بالکل ٹھیک ہو گیا۔ آخر ایک روز جب لڑکا کتے کے پاس روٹی لے کر پہنچا تو کتا لڑکے کے قریب آ گیا۔ لڑکا پہلے تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ کتا پیار سے دُم ہلا رہا ہے تو پھر اس کا ڈر جاتا رہا۔ اور کچھ ہی دیر میں لڑکے نے اپنا دایاں ہاتھ کتے کی پیٹھ پر رکھا۔ کتا بار بار زبان نکال کر لڑکے کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ اور اس طرح وہ خونخوار کتا لڑکے کا دوست بن گیا۔

اب تو لڑکے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ چھلانگ لگاتا کتے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر نے جوں ہی کتے کو دیکھا تو وہ ڈر کے مارے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے چلایا کہ "میاں لڑکے بھاگو! بھاگو! جنگلی کتا آ گیا ہے۔ جو تمہیں اور مجھے دونوں کو کھا جائے گا۔" مگر لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب! کتا تو ضرور جنگلی ہے۔ مگر اب وہ میرا دوست بن گیا ہے۔ آپ گھبرایئے نہیں، باہر آ جایئے۔ یہ کاٹے گا نہیں۔" لڑکے کے دلانے پر جب ڈاکٹر صاحب باہر نکل آ دیکھا کہ جنگلی کتا لڑکے کے پاس اطمینان بیٹھا ہوا ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر حیران رہ اتنے میں لڑکے نے انہیں سلام کیا اور ہی ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ آپ کی سے میرے والدین اچھے ہو گئے ہیں۔ اور میرے آنے کا مقصد یہی ہے کہ آپ کی م کا شکریہ ادا کروں۔

ڈاکٹر لڑکے کی اس بات سے بہت ہوا اور لڑکے سے کہنے لگا۔ "بھئی، آج تو تمہارے گھر چلوں گا۔ تمہارے والدین سے ملا کرنے۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "میرے والدین سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ آپ ضرور اتنی سی بات چیت کے بعد ڈاکٹر نے پھر سے یہ سوال کیا۔ "میاں لڑکے! ذرا یہ کہ یہ قصہ کیا ہے۔ تم نے اس جنگلی کتے کون سا جادو کر دیا ہے؟" ڈاکٹر صاحب بات سن کر لڑکے نے شروع سے آخر تک قصہ کہہ سنایا۔ ڈاکٹر لڑکے کی بہادری ا کی باتیں سن کر بہت خوش ہوا کہنے لگا کہ ا

لڑکا ضرور بڑا آدمی بنے گا۔ اور پھر لڑکے کی
ری تعریف کی۔

اب وقت کافی گذر چکا تھا۔ لڑکا واپس
نے گھر ڈاکٹر صاحب کو لے کر چل دیا۔ پیچھے پیچھے
ی کتا بھی تھا۔ جب یہ سب لوگ گھر پہنچے تو
کے کے والدین ان سب کو دیکھ کر بہت خوش
ے۔ البتہ جنگلی کتے کو دیکھ کر ضرور چونکے۔ مگر
ٹر صاحب کے سارا قصّہ سُنانے پر ان کا
ڈر دور ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لڑکے کی
ادری' رحمدلی اور اچھائی' کی بہت تعریف کی۔
ر پھر سب نے چائے پی۔ اور ڈاکٹر صاحب سب
رخصت ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔ لیکن کتا اس
کے گھر رہنے لگا۔ اب وہ گھر کے جانوروں
نگہبانی کرتا ہے۔ اور لڑکا مزے سے پڑھنے
تا ہے۔

شرائط پیامی معما

(۱) ایک خاکہ کی فیس داخلہ ایک آنہ ۲ خاکوں کی فیس مرتد۔ فیس ٹکٹوں کی صورت میں آنا چاہیئے۔

(۲) بغیر فیس والے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جائیں گے۔

(۳) ایک روپیہ انعام تک کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کی جائیگی

(۴) حل روشنائی سے لکھے ہوئے ہونا چاہیئے مشکوک اور کٹے پھٹے حل مقابلے میں شریک نہ کئے جائیں گے۔

(۵) ایک معمے میں ایک ہی نام سے جتنے حل بھیجے جائیں ان کے ساتھ ایک ہی کوپن کافی ہوگا۔ ہر حل کے نیچے اپنا نام اور پورا پتہ خوشخط لکھیئے۔

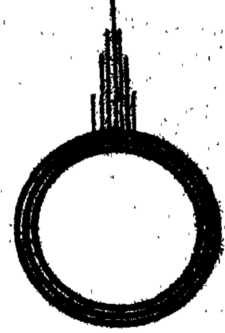
(۶) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ لڑکے ہوں گے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ ایک لڑکے کو ایک معمے میں ایک ہی انعام یا انعام کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔

(۷) ٹکٹ کسی کاغذ یا لفافے میں چپکا دینا درست نہیں صرف لفافے میں رکھ دینا کافی ہے۔

(۸) معمے کے متعلق تمام معاملات میں ایڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری ہوگا۔ اپنے حل آپ اس پتے پر بھیجیں۔

ایڈیٹر پیامی معما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی۔



لطیفے

استاد۔ (طالب علم سے) فریب کسے کہتے ہیں؟
طالب علم۔ جب کوئی لڑکا ہنستا ہوا اسکول آئے تو اس کی یہ ہنسی فریب کہلائے گی۔

چچا۔ (بھتیجے سے) نالائق تم کچھ نہیں کر سکتے۔ میں جب تمہاری عمر کا تھا تو ایک دوکان کی ملازمت میں مجھے ۲۰ روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ لیکن میں نے ایک سال میں اپنی ذاتی دکان کھول لی۔
بھتیجا۔ لیکن اب آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اب تو دکانوں میں باقاعدہ کیش تک رکھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر۔ تمہاری داہنی آنکھ خراب ہے۔ اس کے علاج میں کم از کم چھ مہینے لگیں گے۔
مریض۔ مگر میری آنکھ تو پتھر کی ہے۔

نوکر۔ حضور' یہ آپ کا روپیہ ہے جو میں جھاڑو دیتے وقت کمرے میں پا پایا ہے۔
آقا۔ (خوش ہوکر) اچھا' یہ روپیہ تم لے میں نے تمہاری ایمانداری کا انعام دمگر ایک بار مالک کی جیب سے دس ر کا نوٹ گر گیا۔ بہت ڈھونڈنے پر نہ ملا تو انہوں نے نوکر سے پوچھا۔ نے جواب دیا "حضور وہ تو میں نے زمین پر پڑا پایا تھا' آپ تو وہ انعام میں دیتے ہی۔ اس لئے میں خود ہی رکھ لیا۔

نوکر:۔ (مالک سے) حضور یہ ٹکٹ کے پیسے
واپس لے آیا۔
مالک:۔ کیوں ڈاک میں خط نہیں ڈالے؟
نوکر:۔ جی خط تو ڈال دیا۔ لیکن یہ پیسے
بچا لایا۔
مالک:۔ وہ کیسے؟
نوکر:۔ پوسٹ ماسٹر صاحب دوسری طرف دیکھ
رہے تھے۔ میں نے نظر بچا کر وہ سب
خط ڈال دئے۔

ماں:۔ بیٹا یہ روٹی کیوں تول رہے ہو؟
بیٹا:۔ ڈاکٹر نے ہلکی روٹی کھانے کو کہا ہے۔

ڈاکٹر:۔ آج تمہاری نبض تو ٹھیک ہے۔
مریض:۔ مگر آپ کا ہاتھ تو میری گھڑی پر ہے۔

ملاقاتی:۔ (نوکر سے) صاحب کہاں ہیں؟
ملازم:۔ نہیں ہیں۔
ملاقاتی:۔ کب واپس ہوں گے؟
ملازم:۔ معلوم نہیں۔
ملاقاتی:۔ کب سے باہر گئے ہوئے ہیں؟
ملازم:۔ پندرہ سال چھ مہینے اور کچھ دن ہوئے
ملاقاتی:۔ یہ کیا بک رہے ہو، آخر وہ گئے ہیں
کہاں؟
ملازم:۔ قبرستان!

عبدالامیر نخعی

استاد:۔ بتاؤ اکبر کب مرا؟
شاگرد:۔ جب قضا آئی۔

رضوان الرشید۔ جامعہ

ماں۔ (سوتے وقت) بیٹا ذرا چراغ تو بجھا دو۔
بیٹا۔ اماں! میں ابھی تو جاگ رہا ہوں جب سو جاؤں گا
تو ضرور بجھا دوں گا۔

سمیع اللہ انصاری

ماسٹر۔ راج پوت کسے کہتے ہیں؟
لڑکا۔ راجہ کے لڑکے کو۔

ماسٹر۔ عرفان! دنیا میں کس سے ڈرنا چاہئے؟
عرفان۔ آپ کے ڈنڈے سے۔

نسیم احمد بنارسی



خالہ بلی اور بی لومڑی میں یوں تو بڑی دوستی تھی، لیکن لومڑی اپنے آپ بڑا چالاک سمجھتی تھی۔ ایک دن دونوں بیٹھے ہوئے بات کر رہے تھے کہ بـ مزے میں بڑی بوڑھیوں کا سا سر ہلا کر بولیں "اجی بی مانو، اگر تم خطرے پڑ جاتی ہو تو اس وقت تمھارا دماغ کیسے کام کرتا ہے۔ تم میں تو میری جیسی چا بھی نہیں ہے۔"

بلی کہنے لگی کہ "ہاں بہن، تم ٹھیک کہتی ہو، مجھ میں چالاکی تو بہت دور، کے لائق عقل تک نہیں ہے۔ بس میں تو ایک ہی داؤں جانتی ہوں، جہاں کوئی د نظر آیا اور میں پیڑ پر چڑھ گئی۔ بس دشمن سے بچنے کا میرے پاس یہی ایک ہے۔ میرے پاس اتنی عقل کہاں جو اور طریقوں کو جاننے کی کوشش کروں۔"

بلی کی یہ بات سن کر بی لومڑی بہت ہنسیں اور بولیں "واہ خالہ بلی، بس ایک داؤں لئے پھرتی ہو، ارے مجھے دیکھو، میرے پاس ہزاروں داؤں ہیں۔



الگ استعمال کرتی ہوں،
وقت آتا ہے ویسی ہی
ترکیب سوچ لیتی ہوں۔
خدا نے اتنا بڑا سر جو
ہے۔ سوچنے کے لئے ہی تو
ہے"

بلی نے کہا "بی لومڑی
مجھے خالہ کہتی ہو، خالہ بننے
لئے تو تمہارا جیسا دماغ
ہیئے۔ اب یہی دیکھو کہ دشمن
سے بچنے کے لئے میرے پاس ایک
ترکیب ہے اور تمہارے پاس
ہزار ترکیبیں۔ اب اگر میری ایک
یب نہ چل پائے تو یہ سمجھو کہ جان
ے ہاتھ دھونا پڑے۔

بی لومڑی کو بلی پر بڑا رحم آیا
ر بولیں "کوئی بات نہیں بی مانو۔۔ اگر
خود نہیں سوچ سکتیں تو میں تم کو
ترکیب بتاتی ہوں۔ بتاتی کیا بلکہ
ائے دیتی ہوں۔ اس کے بعد پھر
کو اور ترکیبیں بتاؤں گی"

ابھی بی لومڑی اپنی پوری بات بھی نہ کہہ سکی تھیں کہ کتوں کا ایک جھنڈ لومڑی اور بلی کی طرف تیزی سے جھپٹا۔

بلی تو تیزی سے پیڑ پر چڑھ گئی۔ اس لئے کہ اس کے پاس یہی تو ایک ترکیب تھی۔ لیکن بی لومڑی دماغ پر زور ڈال کر داؤں سوچنے لگیں۔ مگر اس وقت ہزاروں میں سے ایک داؤں بھی تو کی سمجھ میں نہ آیا اور لومڑی بیچاری کتوں نے چیر پھاڑ کر پھینک دیا۔

بی مانو پیڑ پر بیٹھی لومڑی کا حشر دیکھتی رہیں۔ اور دل میں سوچتی رہیں میرا ایک داؤں ہی اچھا ہے۔

رضوان رضوی

دو بھائی

بیچ آنگن میں چار پائی بچھی ہوئی ہے۔ بیچ میں سرور اور ایک بغل میں خالد اور دوسرے بغل میں خالد کا چھوٹا بھائی شاہد لیٹے ہوئے ہیں۔

سرور نے کہا۔

اچھا آج میں تم لوگوں کو ایک بہت پرانی کہانی سناتا ہوں۔

کیسی ہے کہانی مزیدار بھی ہے یا نہیں۔" شاہد نے پوچھا۔

خالد نے بگڑ کر کہا" تم چپ چاپ سنے جاؤ"

"جی ہاں" سرور نے کہنا شروع کیا۔

" کسی گاؤں میں موہن اور رامو نام کے دو بھائی رہتے تھے، دونوں کسان تھے۔ روزانہ کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اتنا غلہ پیدا کر لیتے تھے جو سال بھر کے لئے کافی ہوتا تھا۔

دونوں بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ موہن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی

تھی۔ مگر رامو کے کوئی بچہ نہ تھا۔ صرف وہ تھا اور اس کی بیوی۔

ایک دن موہن رامو سے کہنے لگا۔

"بھیا رامو! ہماری میل و محبت کو دیکھ کر لوگ جلتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ ہم دونوں کو لڑا دیں۔ ہم دونوں میں کبھی جھگڑا ہو جائے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو بھائی جیسا بنا سکتا ہے اور ہر شخص بھائی سے لڑا سکتا ہے۔ پھر ہم دونوں کیوں نہیں لڑ سکتے؟"

"بات تو ٹھیک ہے بھیا" رامو نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ ہم دونوں کی چیزیں اگر الگ الگ ہو جائیں تو شاید لڑائی نہ ہو گی۔

"ہاں بھیا! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" رامو بولا "مگر یہ بات ہے کہ میل و محبت کا۔ بھیا" یہ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"ہاں ہاں" موہن کہنے لگا۔ "اسی لئے تو سب کام کیا جا رہا ہے۔ صرف ہم لوگ علیحدہ کریں گے اور علیحدہ رہیں گے۔ دل نہیں کچھ نہیں۔"

"تب میں تیار ہوں۔" رامو نے کہا "جو بھی کریں گے میں خوشی سے منظور کروں گا۔" اور پھر اسی دن دونوں بھائیوں نے مل کر تمام چیزوں کو تقسیم کر لیا۔ دو برابر بلا انصاف سے حصے لگ گئے۔ جب حصے لگ چکا تو موہن نے کہا۔

ایک حصہ لے لو۔"

اور رامو دوڑا دوڑا گھر گیا اور وہاں سے کلّو کو بلا لایا اور کہا۔

"دیکھو یہ کاغذ لو گے یا وہ؟" کوئی ایک لے لو۔"

کلّو موہن کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا۔ رامو نے دونوں حصّوں کی تمام فہرست بنا کر دو کاغذ پر لکھ لی تھی۔ اور وہ اسی کو بیٹے کو کہہ رہا تھا۔ رامو کے کہنے پر کلّو نے ایک کاغذ اٹھا لیا۔

وہ حصہ رامو کا ہوا۔

یہ دیکھ کر سارے گاؤں والے خوش ہو گئے اور اسی دن سے رامو دوسرے مکان میں رہنے لگا۔ جو کہ موہن کے مکان کے سامنے قریب دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔

اس طرح سے وہ بہت دنوں تک رہا۔ اب دھان کے کٹنے کا وقت آگیا۔ رامو پہلے

اپنے دھان کو کاٹ کر لایا۔ اور اپنے مکان کے سامنے کھلیان لگایا۔۔۔۔ تاکہ اسے بیوی کو چھوڑ کر باہر جاکر نہ سونا پڑے۔ کیونکہ وہ گھر پہ اکیلی رہتے ہوئے ڈرتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد موہن بھی اپنے دھان کو کاٹ لایا اور اس نے بھی بھائی کو دیکھ کر دروازے کے قریب ہی کھلیان لگایا۔ اور ان لوگوں کو دیکھ کر گاؤں والے بھی اسی طرح کھلیان لگانے لگے۔ وہاں پر ایک گاؤں سا آباد ہو گیا۔

ایک رات رامو نے خیال کیا۔

بھیا کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکی کی اب شادی بھی ہوگی۔ شادی میں کافی روپے خرچ ہوں گے۔ میرے پاس تو پچھلے سال کا بھی غلہ موجود ہے اور پھر اس دفعہ ہو ہی گیا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ کچھ غلہ انھیں دے دوں۔

اور یہ خیال کر کے رامو اپنے کھلیان میں سے ایک بوجھ اٹھا کر اپنے بڑے بھائی موہن کے کھلیان میں رکھ آیا۔

مگر دوسرے دن رامو حیران رہ گیا گھبرا کر گن رہا تھا۔ مگر بوجھ جتنے کا اتنا ہی رہا۔ اور پھر اسے خیال آیا کہ یہ بھگوان کی دین ہے۔

دوسری رات رامو نے سوچا کہ آج پھر اپنے بھائی کو ایک بوجھ اور دے آؤں۔ کیونکہ میرے پاس تو بہت ہے۔ یہ تو بھگوان نے مجھ کو دیا ہے۔

اور یہ خیال کرتے ہی رامو رات کے بارہ بجے اٹھا اور اپنے کھلیان سے ایک بوجھ اٹھا کر بھائی کے کھلیان میں رکھ آیا۔

پھر دوسرے روز صبح جب رامو کھلیان والے آیا تو اس نے پھر اپنے بوجھے کو گنا تو اس بار بھی اتنا ہی تھا جتنا وہ کھیت سے لایا تھا۔

تیسرے روز بھی رامو نے اسی طرح کیا۔ لیکن اسی روز وہ بہت پریشان تھا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اور اس لئے اس روز رات بھر نیند نہ آئی اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج چار بجے صبح جاؤں کیونکہ روز تو ۱۲ بجے کبھی دس بجے کبھی گیارہ بجے جاتا تھا آج کیوں نہ چار بجے چلوں اور دیکھوں کہ بوجھ کیسے بڑھ جاتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ چار بجے اٹھا اور

لیتے کھلیان سے ایک بوجھ اٹھا کر چلنے لگا۔
ابھی کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ اس نے دیکھا کہ کوئی سر پر بوجھا لئے ہوئے اسی کی طرف آرہا ہے۔ پہلے تو وہ ڈر سا گیا کہ کوئی بھوت تو نہیں۔ مگر فوراً ہی پوچھ بیٹھا کہ "کون ہے؟" لیکن آنے والے نے کچھ جواب نہیں



دیا اور آگے بڑھتا ہی رہا۔

جب وہ بالکل قریب پہنچا تو رامو نے حیرت سے کہا۔

"تم ہو بھیا؟"

"ہاں میں ہوں رامو! تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں تمہارے ہی طرف جا رہا ہوں بھیا۔"

"اچھا اب میں سمجھ گیا" موہن بولا" پریشان تھا کہ روز تمہارے کھلیان میں ایک بوجھ رکھ آنے کے باوجود بوجھ اتنا کیوں رہ جاتا ہے؟"

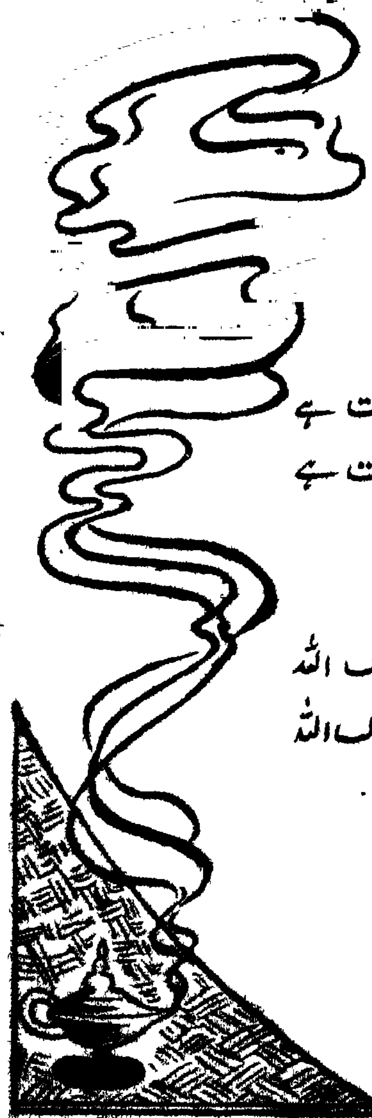
"اور میں بھی تو پریشان تھا بھیا کہ میرا غلّہ کیوں کم نہیں ہوتا۔"

پھر تو یہ دونوں بھائی اسی میل اور محبت سے رہتے سہتے رہے۔ سچ ہے آپس کا میل ملاپ، بہت حد تک دکھ درد کو دور کر دیتا ہے۔"



صادق اندوری

علم کا چراغ



علم ہے ہر مہم کا عقدہ کشا — علم کا فیض ہے جہاں آرا
علم ہے ایک آفتابِ ضیا — عالمِ جہل کا تو ذکر ہی کیا

علم اک گوہرِ صداقت ہے — علم اک حسنِ آدمیت ہے
علم اک روشنیٔ قدرت ہے — علم اک جلوۂ حقیقت ہے

علم دھوتا ہے جہل کا چہرا — علم بھرتا ہے دل میں نورِ ضیا
علم ہے گم شدوں کا راہ نما — ذہن کیا فکر کیا تخیل کیا

علم کی وسعتیں جذاک اللہ — علم کی رفعتیں جذاک اللہ
علم کی قدرتیں جذاک اللہ — علم کی طلعتیں جذاک اللہ

علم ہے ایک جلوۂ ازلی — بخشتا ہے ضیا جو فہم کو بھی
صادقؔ اپنا یہی ہے خیال رہی — کیوں نہ ہم بھی کہیں بقولِ ولیؔ

"جگمگاتی ہے عقل کی دنیا
علم کا جب چراغ جلتا ہے"

ــ وفاؔ شاہجہاں پوری



"آپ گھبرائیے نہیں، میں نے تو تین سال سے کسی کی ناک نہیں کاٹی ہے"





عمیق ملک

دُنیا میں سب سے خشک علاقہ

افریقہ کے شمالی حصّہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں گاڈیز ہے۔ جہاں پچاس سال سے بارش کی بوند تک نہیں پڑی۔ یہ دُنیا میں سب سے خشک علاقہ ہے۔ اگر یہاں بارش ہوتی بھی تو تمام مکان بہ جاتے۔ کیونکہ وہ سارے کے سارے مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں اینٹ، پتھر، چونے اور لکڑی کا نام تک نہیں۔ ہر مکان کی دو منزلیں ہیں۔ ایک منزل زمین کے اوپر اور ایک زمین کے نیچے ہے جو گرمیوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ زمین کے اندر سُرنگیں ہیں۔ جن میں لوگ چلتے پھرتے اور ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں۔ عورتیں تو خاص کر اوپر نہیں آتیں۔

گاؤں کی آبادی دو ہزار کے لگ بھگ ہے۔ دُنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں صبح شام ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے۔ اور ایسے بھی جہاں صدی ہونے کو آئی۔ بارش کی بوند تک نہیں پڑی۔ لیکن انسان یہاں بھی موجود ہیں۔ اور کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔



چاکلیٹ کی چوری

محمد حسیب حسّان
عمر ۱۲ سال دہلی

پرتاپ اور فیروز میں بہت دوستی تھی ایک کے بغیر دوسرے کو چین نہ آتا ایک دفعہ فیروز کی باجی کی سالگرہ تھی ہر طرف چہل پہل تھی لوگ آ جا رہے تھے سب کھیل کود رہے تھے۔ فیروز اور پرتاپ گلے میں باہیں ڈالے اِدھر اُدھر پھر رہے کہ اتنے میں فیروز نے کہا کہ میں ذرا باجی سے پیسے لے آتا ہوں تم یہیں فیروز نے جلدی سے دروازہ کھولا اور بھاگ گیا۔ پرتاپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سنہرا ڈبّا میز پر رکھا ہوا تھا اس نے ہلکے سے ڈبہ کھولا اس میں چاکلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ پرتاپ نے ایک اٹھا کر منہ میں رکھی تو اسے اچھی معلوم ہوئی وہ دوسری رکھنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے باجی آگئیں پرتاپ کی شرم سے نظریں جھک گئیں باجی نے پرتاپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں کہا کہ "یہ ڈبہ اور یہ سرخ موٹر تمھاری ہے لیکن بھیا ایسا نہ کرنا کسی کی چیز بغیر اجازت نہیں لیا کرتے۔ اچھا"۔ پرتاپ نے کہا آج سے میں کبھی کسی کی چیز بغیر اجازت نہیں لیا کروں گا۔ اتنے میں فیروز صاحب آئے اور بولے بھئی یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں ہمیں بھی تو بتاؤ یہ سن کر پرتاپ اور باجی مسکرا دیئے آج باجی بہت خوش تھیں کہ ان کو تحفے میں ایک بھائی ملا۔ اب باجی کے ایک بھائی نہیں بلکہ دو بھائی ہو گئے۔



پیارا پرچہ

عظمیٰ خاتون
عمر ۷ سال۔ گیا

اپریل کی پہلی تاریخ تھی اور میری سالگرہ کا دن تھا گھر میں چاروں طرف بجلی لگی تھی کہیں لال اور نیلی، پورا گھر جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا ہر طرف نوٹو پھول پتیاں بنی ہوئی تھیں گلدستے میں پھول سجے ہوئے تھے۔ لوگ مجھے بڑے ارمان سے تحفے دینے آئے تھے۔ لیکن نہ معلوم میں کیوں گھبرا رہی تھی ارے اب یاد آیا میں نے کئی دنوں سے پیام تعلیم نہیں پڑھا تھا میرا دل بہت گھبرا رہا تھا لوگ مجھے پریشان دیکھ کر گھبرا رہے تھے میری نظریں پیام تعلیم کو کھوج رہی تھیں میں بار بار اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ کاش اس وقت مجھے کوئی "پیام تعلیم" لا کے دیتا نہانے اور اچھے کپڑے پہننے کے بعد ایک بہت بڑے کمرے میں گئی یہ وہ کمرہ تھا جہاں میرے سارے مہمان تھے میں نے سبھوں کو سلام کیا اور بیٹھ گئی تو سبھوں نے تحفے دئے۔ میں ان تحفوں کو خوب غور سے دیکھ رہی تھی میرے پاس میری امی بھی بیٹھی تھیں جب میری سہیلی عذرا کی پیاری آئی تو وہ دوڑی ہوئی

باہر گئیں اور پھر آئیں تو اُن کے ہاتھ میں ڈبہ تھا میں نے جب عذرا کے ہاتھ میں ڈبہ دیکھا تو خوب خوش ہوئی۔ عذرا نے وہ ڈبہ امّی کو دے دیا۔ میں وہ ڈبہ لے کر خوش ہوئی امّی نے ڈبہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے ڈبہ کھولا تو اس میں سے لفافہ نکلا جس میں ایک کاغذ تھا۔ اس پر لکھا تھا "پیاری بہن عظمیٰ! 'اپریل فول'" یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا میں نے چاہا کہ عذرا کو اُٹھ کر ماروں مگر امی نے روک دیا اور عذرا وہاں سے غائب ہو گئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتی ہوں کہ عذرا سامنے سے آرہی ہیں میں سمجھی پھر مذاق اڑائیں گی میں نے کہا اب نہیں لوں گی تمہارا تحفہ جب وہ قریب پہنچیں تو ان کے ہاتھ میں میرا پیارا پرچہ "پیام تعلیم" تھا۔ میں یہ دیکھ کر پھولے نہ سمائی اور کرسی سے اچھل پڑی۔ میرا غم خوشی میں بدل گیا۔ اور میں نے اپنی سالگرہ میں جی بھر کر حصہ لیا۔ سہیلیوں کے ساتھ خوب

سیر اور تفریح کی۔ اور عذرا اور امی دونوں مجھے تعجب کی نگاہ سے دیکھ رہی تھے۔

بقیہ مریخ کی سیر صفحہ ۱۵ سے آگے

کہ اُن کے ایک ساتھی نے کہا "شن کرو ٹاں" مطلب یہ تھا کہ ہماری ایک تصویر اور کھینچ دو چنانچہ میں نے ان کی ایک اور تصویر کھینچ دی۔ اسی طرح ہم لوگوں کو وہاں پہنچے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے اب ہم لوگوں کو زمین پر واپس جانا تھا اور چلتے ہوئے ہم نے اُن سے کہا کہ "چیں پٹا" یعنی سلام علیکم جواب میں انھوں نے بھی یہی کہا اور پھر ہم لوگ راکٹ میں سوار ہو گئے اور ایک زور دار آواز "دھم" سے ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی اور اپنے آپ کو پلنگ کے نیچے پایا اور جب میں نے یہ کہانی بھائی جان کو سنائی تو وہ خوب ہنسے۔



ہمیں بھی سہیلی بناؤ

نیّر کاظمی
عمر ۷ سال، گیا

میں درجہ دوئم سے پاس کرکے درجہ سوئم میں آ چکی ہوں لیکن اس درجہ میں میری کوئی بھی سہیلی نہیں ہے اس کی بہ نسبت درجہ دوئم میں میری سہیلیوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ساری کی ساری لڑکیاں مجھے دل و جان سے چاہتی تھیں لیکن اس درجہ میں آنے کے بعد سب لڑکیاں مجھ سے چڑھنے لگیں، کوئی لڑکی بھی مجھ سے بولنا پسند نہیں کرتی ہے۔ جس کے پاس جاتی ہوں وہی مجھے دھتکار دیتی اسکا لئے میں ہمیشہ اپنے درجہ میں خاموش بیٹھی رہتی ہوں۔ جس پر بعض دفعہ استانی مجھ سے پوچھتیں کہ تمہیں کیا ہوا ہے جو اتنی اداس رہتی ہو تو میں بہانہ کرکے کہہ دیتی "میرے سر میں درد ہے!" اور کبھی کہتی "دل نہیں لگتا ہے" اسی طرح دن گذرتے گئے۔ میں جیسی تھی ویسی ہی رہی نہ کوئی لڑکی مجھ سے بات کرتی نہ میرے ساتھ کھیلتی۔ میں ہر وقت اپنے درجہ میں بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی دوسرے درجہ کی ایک دو لڑکیاں میرے پاس آ بیٹھتیں اور کہتیں تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو تو میرا دل خوش ہو جاتا میں کہتی

کیا تم ہمیں کھلاؤ گی؟ تو وہ کہتی "ہاں چلو میں کھلاؤں گی" میں خوش خوش ان کے ساتھ کھیلنے لگتی مگر دوسرے دن وہ بھی دوسری لڑکیوں جیسی ہو جاتیں۔ جب وہ لڑکیاں مجھے اپنے ساتھ کھیلنے نہ دیتیں تو میں اپنی جگہ پر جاکر اپنا سبق یاد کرنے لگتی جب میں پڑھنے لگتی ہوں تو سب لڑکیاں مجھے پڑھتا دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتی ہیں اور کہتی ہیں "بڑی پڑھنے والی آئی" پھر شور کرتے لگتی ہیں مجھے یہ دیکھ کر بڑا غصہ آتا ہے۔ خود بھی نہیں پڑھتی ہیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے نہیں دیتیں۔ جب میں اپنا سبق یاد کرتی رہتی ہوں تو استانیاں مجھے دیکھ دیکھ کر کہتیں "واہ ری لڑکی واہ جب دیکھو اپنا سبق یاد کر رہی ہے میں نے تو ایسی لڑکی کبھی نہیں دیکھی ہے" "یہ لڑکی نہیں فرشتہ ہے فرشتہ، لڑکی ہو تو ایسی" اس طرح مجھے پڑھتا دیکھ کر استانیوں نے مجھے شاباشی دی لڑکیاں جب دیکھتیں کہ مجھے شاباشی مل رہی ہے تو میری طرف سے منہ پھیر کر بڑ بڑانے لگتیں۔ میں ہر وقت پڑھنے کی وجہ سے اپنے درجہ میں ہمیشہ اول آتی ہوں تو لڑکیاں مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگتی ہیں۔ میں جب دیکھتی ہوں کہ دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی ہیں تو دل للچا جاتا ہے میں ان کے پاس جا کر کہتی ہوں "ہمیں بھی سہیلی بناؤ" مگر کوئی نہیں سنتا! کیا ہمیں کوئی لڑکی سہیلی نہ بنائے گی! کیا میری قسمت میں اکیلی ہی رہنا لکھا ہے؟ اب میری زبان پر ہمیشہ یہی جملہ رہتا ہے "ہمیں بھی سہیلی بناؤ" کاش میری بھی کوئی سہیلی ہوتی۔

بقیہ اپنی مدد آپ صفحہ ۵۸ سے آگے

بھی محنت اور کوشش کرنی چاہئے۔ خدا بھی اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ دیوتاؤں کے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھنے سے مدد نہیں ملتی۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے۔"

یہ کہہ کر ہرکولیس غائب ہوگیا۔



عقلمند چوہا

محمد عبداللہ
عمر [illegible] سال بلدور

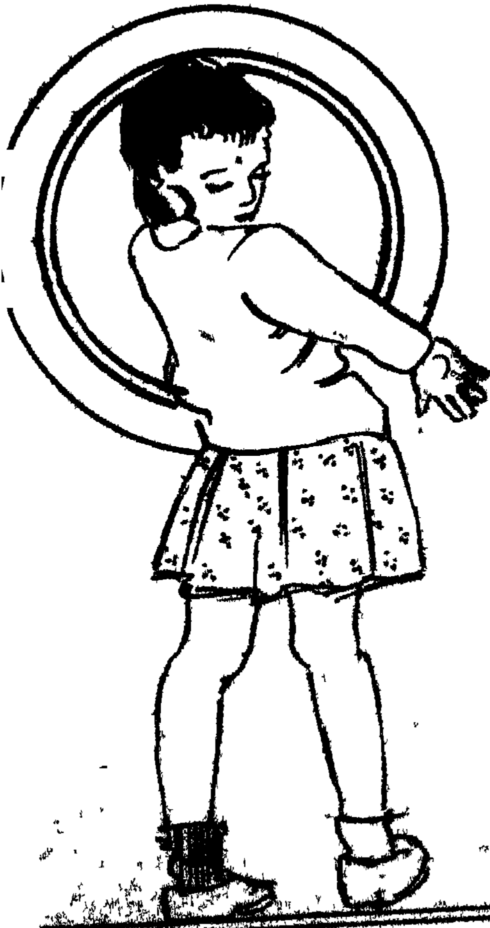
ایک گھنے جنگل میں برگد کا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کی جڑ میں ایک بل تھا جس میں ایک چوہا رہا کرتا تھا۔ اسی پیڑ پر ایک بلاؤ رہتا تھا۔

ایک دن ایک شکاری جو دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ وہاں آ نکلا۔ شام ہو چکی تھی شکاری نے برگد کے پیڑ کے نیچے اپنا جال لگا دیا اور گھر واپس چلا گیا اس خیال سے کہ صبح کو آ کر شکار پھنسا ہوا ملے گا۔ بلاؤ رات کو کھانے کی تلاش میں پیڑ سے نیچے اترا اور اترتے ہی جال میں پھنس گیا۔ چوہا بھی کھانے کی تلاش میں اپنے بل سے باہر آیا چاندنی رات تھی۔ رات کو پھرنے والے درندے پرندے جنگل میں گھومنے لگے تھے۔ چوہا چکر کاٹتا ہوا اس جال کے اوپر چڑھ گیا جس میں کہ بلاؤ پھنسا ہوا تھا۔ اتنے میں ہی ایک اُلّو اس پیڑ پر آ بیٹھا۔ اور ایک نیولا بھی چوہے کی تلاش میں وہاں آ گیا۔

اب تو چوہا بہت خوف زدہ ہوا اور تمام کھانا پینا سب بھول گیا اس کی

جان کے لالے پڑنے لگے۔ کیونکہ ہر شکاری جانور اس کے مارنے کی فکر میں تھا۔ چوہا بہت پریشان تھا۔ اوپر الو کا ڈر نیچے بلاؤ سے خطرہ اور برابر میں نیولے کا خوف۔ ذرا سی دیر کے بعد چوہے کی سمجھ میں ایک جان بچانے کی ترکیب آئی۔ اس نے بلاؤ سے کہا "بھئی بلاؤ اگر تم مجھے اپنے پاس بلا لو اور مجھے مارو نہیں تو میں جال کاٹ کر تمہیں شکاری سے بچا سکتا ہوں۔ اس طرح سے میری بھی جان بچ سکتی ہے اور تم بھی آزاد ہو سکتے ہو۔" بلاؤ کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے چوہے کو اپنے پاس بلا لیا۔ چوہے کو ہمدم دیکھا الو اور نیولا نا امید ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ اب چوہا باہر آیا۔ بلاؤ نے جال کاٹنے کو کہا۔ لیکن چوہے نے ایسا کرنے میں دیر کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر بلاؤ کو ابھی آزاد کر دیا گیا تو وہ کھا جائے گا۔

چوہا صبح تک وہیں رہا اور شکاری کو آتا دیکھ، جال کاٹنا شروع کر دیا۔ بلاؤ جلدی سے جال سے نکل کر پیڑ پر چڑھ گیا اور چوہا بھی تیزی سے اپنے بل جا گھسا۔ اگر چوہا پہلے ہی جال کاٹ دیتا ممکن تھا کہ بلاؤ چوہے کو کھا جاتا اب بلاؤ کو خود اپنی جان بچانے کی تھی اس لئے وہ چوہے کو نہ مار سکا اور اس طرح سے چوہے نے اپنی جان بچالی۔



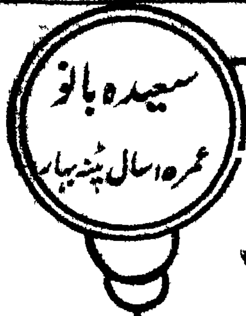
رات کون کون جاگا ؟

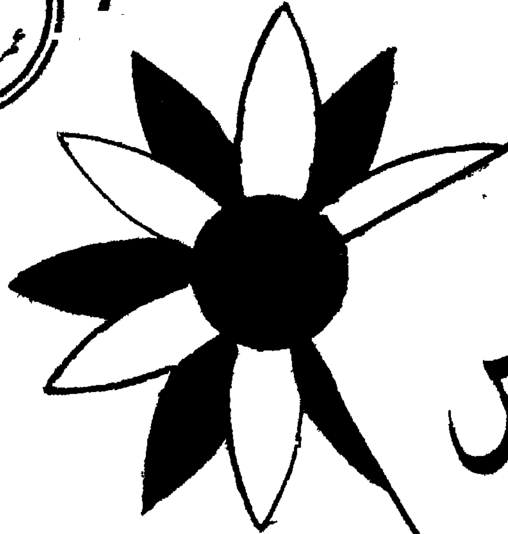
محمد سلمان بیگ
عمر ۱۱ سال دہلی

کل شب برات تھی - ہم لوگوں نے خوب حلوہ کھایا - مگر آج لڑکوں نے سوچا کہ ہم سب بچے مل کر حلوہ بنائیں، تجویز معقول تھی - بس اب کیا تھا ہر ایک اپنے اپنے گھر سے آٹا، گھی، شکر لے آیا - تھوڑی دیر میں حلوہ تیار تھا - حلوہ کافی تھا کچھ تمام لڑکوں کے گھروں میں بھی بھجوا دیا گیا - اور پھر ایک تجویز یہ بھی ہوئی کہ سب اپنا اپنا کھانا لا کر ساتھ ہی بیٹھ کر کھائیں - تجویز پر عمل ہوا سب نے کھانا کھایا اور پھر جی بھر کے حلوہ اُڑایا - بھئی حلوہ تو بڑے مزے کا بنا تھا - اور شاید ہم لوگوں کو زیادہ مزہ اس وجہ سے بھی آ رہا ہو گا کہ اپنی محنت جو تھی -

خیر صاحب کھا پی کر ہم سب بیٹھے - کس لئے ؟ گپ بازی کے لئے - اس کام کے لئے ہم لوگ تیاز کے گھر میں بیٹھے - کچھ لوگ تاش کھیلنے اور کتابیں پڑھنے میں لگ گئے کچھ لوگ گپ شپ کرنے لگے - حلوہ کی تعریف خوب چٹخارے لے لے کر کر رہے تھے - اور جن لوگوں نے حلوہ کھایا تھا یعنی ہمارے بڑے - انھوں نے

سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہم لوگ اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہے تھے ہم بچے کسی سے کم تھوڑا ہی ہیں۔ اپنے لئے حلوہ پکا لیا! ہا ہا کتنے مزے کا تھا کہ عورتیں بھی کیا پکائیں گی۔ لوگوں کو ہماری تعریف کرنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ اتنے میں طاہر صاحب اکڑ کر بولے کہ اگر کوئی پوچھے گا شبرات منائی تو ہم کہیں گے ہاں ہاں۔ اس جملے پر میں نے کہا" اچھا یہ تو بتایئے رات کو کون کون جاگا" اسلم بولا" میں اور رشید" طاہر صاحب بولے" کیا رات کو عبادت کی ؟" اسلم بولے نہیں۔ میں نے پھر کہا" تو کیا کیا ؟ تو اسلم صاحب بولے" بھئی رات کو مچھر بہت کاٹ رہے تھے تو مجبوراً جاگنا پڑا" اور سب نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ کہ خوب جاگے صاحب رات کو۔





تین چاپلوس

بہت دنوں کی بات ہے، کسی گاؤں میں تین چاپلوس رہا کرتے تھے۔ گاؤں کے ایک دولت مند کے دروازہ پر ان تینوں کا اڈہ تھا۔ دولت مند بہت چالاک اور مغرور تھا۔ آئے دن ایک نہ ایک دنگا فساد کسی نہ کسی طرح کھڑا کر دیتا۔ اور تینوں چاپلوس اس کا ہاتھ بٹاتے۔ اور ہر وقت دولت مند سے گاؤں والوں کی شکایت کرتے رہتے تھے۔

گاؤں بھر کے لوگ دولت مند کے ظلم سے تنگ آگئے تھے۔ اس کا گاؤں والوں پر کافی دباؤ تھا۔ لوگ اس کے خوف سے اس کے خلاف ایک حرف بھی شکایت کا زبان پر نہیں لاتے تھے۔ دولت مند کے تین بیٹے تھے۔ جو دوسرے شہر میں بلیک مارکیٹ سے غریبوں کا گلا گھونٹ کر کافی روپیہ کما رہے تھے اور اس کے گھر کے باقی لوگ بھی اپنے بیٹے کے ساتھ شہر ہی میں رہا کرتے تھے۔

دولت مند بڑا گھمنڈی تھا۔ اسے اپنی دولت پر بڑا ناز تھا۔ اور اسی لئے وہ گاؤں والوں سے سیدھے منہ باتیں کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا تھا پہلے تو گاؤں والوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ اپنی بے جا حرکتوں سے باز آجائے۔ لیکن اس پر تو دولت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ اور وہ کسی طرح

بھی نہ مانا۔

جب گاؤں کے لوگ مجبور ہو گئے تو ایک دن ان سبھوں نے مل کر ایک جلسہ کیا۔ اور جلسے میں یہ طے پایا کہ آج سے کوئی بھی دولت مند کے گھر کسی خوشی یا غمی یہاں تک کہ اس کے یہاں اگر کوئی مر بھی جائے تو نہ جائے۔ اس پر گاؤں کے سارے لوگ راضی ہو گئے۔ اور اس دن سے دولت مند کا حقّہ پانی بند ہو گیا۔

اور جب اس کی خبر چاپلوس نے جا کر دولت مند کو سنائی تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ مگر پھر تھوڑا ہی وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے پاس تو تین تین وفا دار دوست تھے۔ پھر غم کس بات کا تھا۔ اور پھر اطمینان سے دن گذرنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد گاؤں والوں نے مل جل کر سرکار میں ایک درخواست دے دی تاکہ کسی طرح ظالم کے ظلم سے نجات حاصل ہو۔ لیکن ہوا اُلٹا۔ جب پولیس جانچ کے لئے گاؤں میں آئی تو دولت مند نے دارو غہ جی کی جیب روپیوں سے بھر دی۔ اور وہ اُلٹے پاؤں پولیس چوکی کو واپس چلے گئے۔ اور تب سے دولت مند کی ہمّت اور بڑھ گئی۔ اور وہ دن رات من مانی کرنے لگا۔

گاؤں والوں کا گاؤں میں رہنا دو بھر ہو اور چاپلوسوں کے چائے بسکٹ میں پہلے سے اضافہ ہو گیا۔

اور اس طرح گاؤں والے کچھ دن اور خا رہے۔ اور خاموش رہنے سے جب ان کی تک اور بڑھتی گئی تو ان لوگوں نے سوچا، لات بھوت بات سے نہیں ماننے کا۔

سارے گاؤں کے بوڑھے بچے اور نوج اس کے خلاف ہو گئے۔ اور دولت مند کے خو کے پیاسے ہو گئے۔ اب تک وہ اپنی عزت ا غربت کی وجہ سے چپ چاپ بیٹھے تھے۔

جیسے چاپلوسوں کو معلوم ہوا تو وہ دولت کے پاس دوڑے ہوئے گئے۔ اور دوست بن ہو کر تمام منحوس خبروں سے اسے آگاہ کر دیا لیکن اس پر بھی اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ا اکڑ کر بولا۔

"میں ایسی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔"

"خطرہ تو ضرور ہے صاحب" ایک چاپلو نے کہا "مرتا کیا نہیں کرتا۔"

"بات تو ٹھیک ہے" دولت مند کچھ د

چپ رہنے کے بعد بولا "خیر ہم لوگوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے"

"آپ مطلق فکر نہ کریں" دوسرے چاپلوس نے جھٹ آؤ دیکھا نہ تاؤ کہہ ڈالا "کتوں کا کام بھونکنے کا اور اونٹ کا کام راستہ طے کرنے کا ہے۔ ہم لوگوں کے ہاتھ میں کیا مہندی لگی ہے مارنے آئیں گے تو مار بھی کھائینگے ہاں!"

اور پھر ناشتہ پانی کے بعد تینوں چاپلوس اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اور بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

چاپلوسوں کے چلے جانے کے بعد دولت مند دیر تک سوچتا رہا۔ اور اس نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ گاؤں سے کچھ دن باہر رہنا کہیں اچھا ہوگا۔ اور یہ ہی سوچ کر وہ دوسرے ہی دن شہر چلا گیا۔ لیکن وہاں بھی وہ چین سے نہ رہ سکا۔

ایک دن اچانک دولت مند کے گھر میں آگ لگ گئی۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ آگ کی لپٹ میں سارا گھر جل کر راکھ ہوگیا۔ چاپلوسوں کو جب اس کے گھر میں آگ لگ جانے کی خبر ملی تو روتے پیٹتے وہاں گئے۔ لیکن ان سبھوں کے وہاں پہنچتے پہنچتے آگ زور پکڑ چکی تھی۔ تینوں نے بہت شور و غل کیا۔ لیکن گاؤں کا ایک بچہ بھی وہاں پر نہ دکھائی پڑا۔



جب آگ ٹھنڈی ہوگئی اور وہاں پر دولت مند کے خوبصورت مکان کی بجائے راکھ کا ڈھیر نظر آنے لگا، تو تینوں چاپلوس مایوس ہو کر وہاں سے اپنے اپنے گھر واپس جانے لگے تو راستہ میں گاؤں کے لڑکوں نے ان تینوں کی خوب خوب مرمت کی اتنے پتھر مارے کہ بے چاروں کا کچومر ہی نکل گیا۔ کسی بکسی طرح تینوں گرتے پڑتے اپنے اپنے گھر بھاگے اور دوسرے دن سے ان لوگوں کا گھر سے باہر نکلنا بھی دشوار ہوگیا۔

اور ہفتوں بعد جب دولت مند کو اس حادثہ کی خبر لگی تو وہ بہت غصہ ہوا۔ اور دوسرے ہی

دن گاؤں واپس آیا۔ چاپلوسوں کو دولت مند کے آنے کی خبر ملتے ہی وہ سب دوڑتے ہوئے حاضری کے لئے وہاں آئے۔ ان سبھوں کو آتا دیکھ کر دولتمند کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا

ایک چاپلوس سلام کرتے ہوئے بولا "آپ آگئے۔ ہم لوگوں کے جان میں جان آئی۔ گاؤں والوں نے ہم لوگوں کا بُرا حال کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں کی گلیوں میں چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا ہے۔"

دوسرا کہنے لگا۔ "جس دن آپ یہاں سے گئے ان سبھوں نے ہم لوگوں کی خوب خوب مرمّت کی کہ بس چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔"

"پھر بھی ہم آپ پر مرمٹنے کو ہر وقت تیّار ہیں" تیسرے نے کہا۔ "آپ کا جہاں پسینہ گرے گا، ہم اپنا خون بہا دینے کو تیار ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے" دولت مند نے دانت پیستے ہوئے کہا: "اسی لئے تو مجھے گاؤں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" پہلے نے پھر کہا۔ "ہم لوگوں سے کیا غلطی ہوئی ہے؟"

"چلے جاؤ یہاں سے" دولت مند زور سے چلا کر کہنے لگا۔ "تم جیسے لالچی کتوں کی دوستی سے میں بھر پایا۔ مجھے ایسے دوستوں کی ضرورت نہیں، میرا گھر جل گیا۔ اور تم لوگوں نے مجھے خبر تک نہ دی۔ آگ تو بجھانا دور رہا۔"

ہم لوگوں نے بہت شور مچایا۔ پلہ کیا۔"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے" دولت مند پھر چلّایا۔ "مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔"

تینوں چاپلوس چپ چاپ اپنا سا منہ لئے اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ اور اپنی بیوقوفی پر دل ہی دل میں بہت رنجیدہ ہوئے۔ اور پھر گاؤں والوں کے ساتھ مل جل کر جی جان سے دولت مند کو مٹا دینے کی کوشش کرنے لگے۔

اور جب اس نے دیکھا کہ اب اس گاؤں میں میرا رہنا خطرے سے خالی نہیں، تو وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ اور پھر کبھی گاؤں واپس نہ آیا۔ اور گاؤں والوں کے باہمی میل ملاپ نے انہیں آئے دن کی مصیبتوں سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دی۔



بچیوں کے لئے

چاول کی کچریاں

آج کل گرمی کا زمانہ ہے۔ شام کے وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ شربت کے ساتھ کونسی ہلکی چیز کھائی جائے۔ یا صبح کے ناشتے میں ایک چیز کھاتے کھاتے دل گھبرانے لگتا ہے۔

اگر آپ چاول کی کچریاں بنالیں تو یہ پریشانی دور ہو جائے۔ کم خرچ اور مزے دار ناشتہ تیار ہوگا۔

چاول آدھ سیر۔ زیرہ۔ نمک اور کھانے کا سوڈا۔

ترکیب :۔ پہلے چاول کو خوب دھو لیں اور بھگو دیں۔ آدھ گھنٹے بعد خوب باریک پیس لیں۔ پھر بہت سا پانی ڈال کر چولھے پر چڑھائیں۔ اور پھر زیرہ اور نمک حسب پسند پیس کر ڈال دیں۔ اور ایک چائے کا چمچہ کھانے کا سوڈا ڈالیں یہ خیال رہے کہ سوڈا چمچہ بھر کے نہ ڈالیں۔ اور برابر چلائیں۔ یہاں تک کہ خوب گاڑھی لئی ہو جائے۔ جب جمنے لگے تو اتار لیں۔

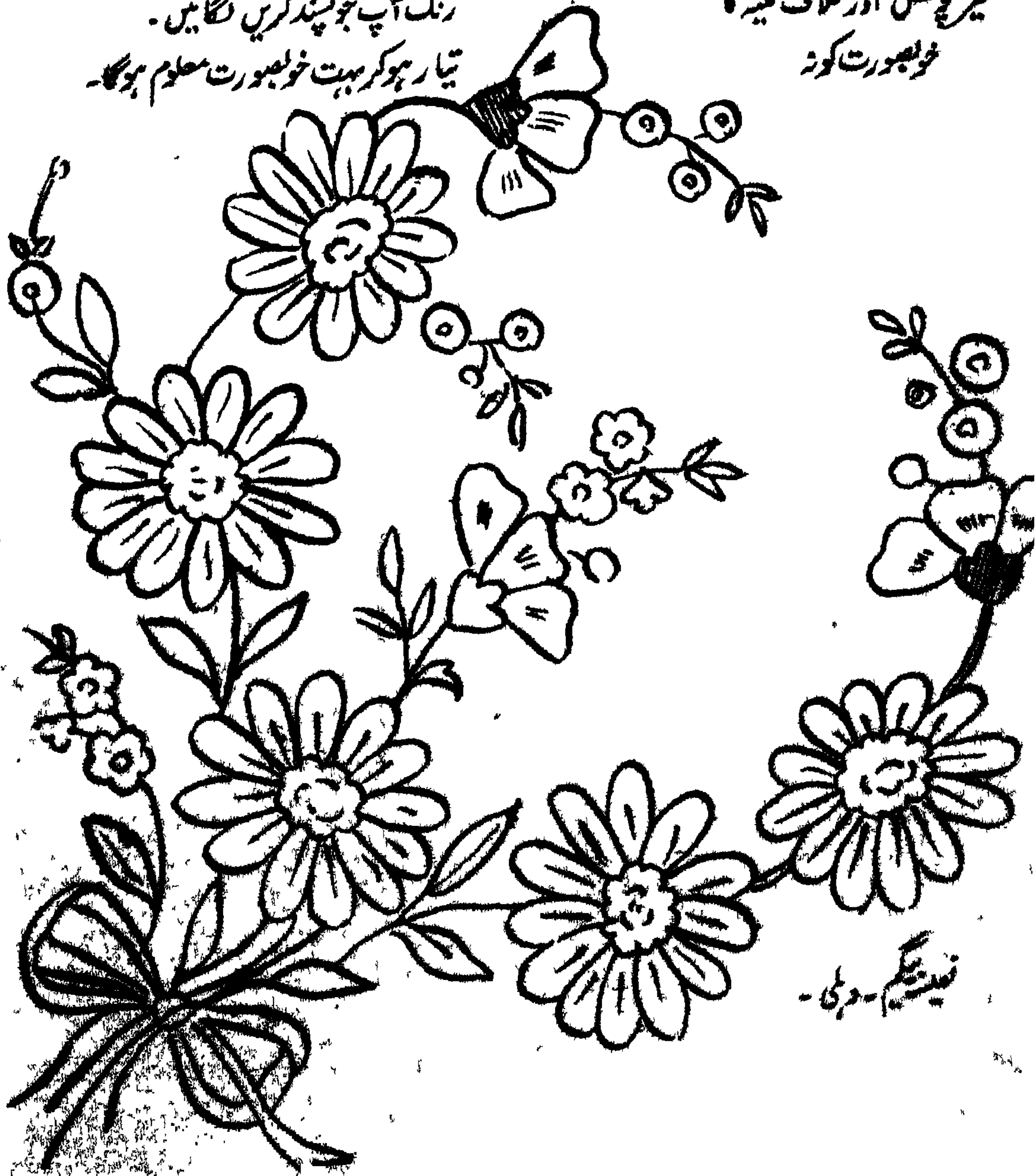
اب سفید ڈھلا ہوا موٹے لٹھے کا ٹکڑہ لیں۔ اس میں باریک سا چھید کریں پھر چاول کی لئی ڈال کر جلیبی کی طرح بنی پر جس پہ گھی لگا ہوا ہو، توڑیں بعد ازاں سفید باریک کپڑا ڈھک کر سوکھنے رکھ دیں۔

دن میں سوکھ جائیں گی۔ اب کسی صاف برتن میں بھر کے رکھ لیں۔ اور بہ وقت ضرورت گھی میں تل کر کھائیں۔

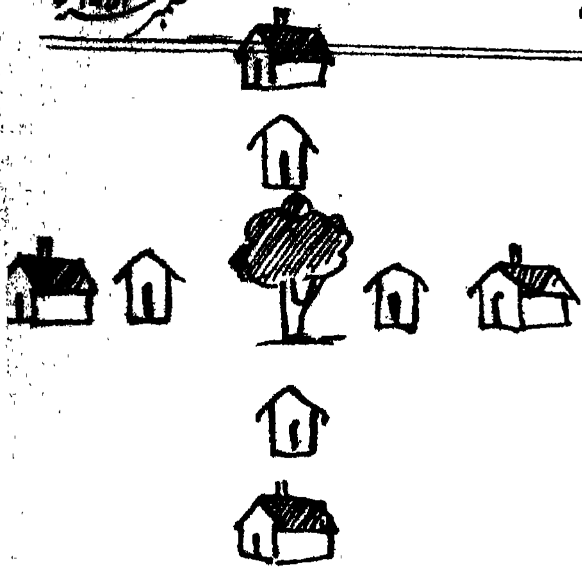
نجمہ سلطان

میز پوش اور غلاف تکیہ کا
خوبصورت کونہ

رنگ آپ جو پسند کریں لگائیں۔
تیار ہو کر بہت خوبصورت معلوم ہوگا۔



نفیسہ بیگم ۔ دہلی ۔



ذرا دیوار بنائیے

چار آدمی ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک بہت بڑا پیپل کا درخت تھا۔ وہ جگہ ان کو اتنی اچھی لگی کہ وہیں ٹھہر گئے۔ اور اس جگہ اپنے جھونپڑے بنائے۔ اور انہوں نے ان جھونپڑوں کو اس درخت کے چاروں طرف اس طرح رکھا کہ جب چاہیں ان جھونپڑیوں سے اس درخت کا نظارہ کر سکیں۔ روزانہ وہ اس درخت کے درشن کر لیتے تھے اور اس درخت سے ان کی عقیدت بڑھتی جاتی تھی، اس طرح ان کو ایک عرصہ گذر گیا۔ ایک دن چار دولت مند آدمی بھی سفر کرتے ہوئے وہاں ٹھہر گئے۔ انہوں نے مقدس اور خوبصورت درخت کو دیکھا اور طے کیا کہ وہ بھی اپنے مکانات اس جگہ بنوائیں تاکہ روزانہ اس کے درشن کر سکیں اور وہ درخت بھی ان کا ہو جائے۔ چنانچہ ان دولت مند لوگوں نے وہاں چار کوٹھیاں بنوائیں اور اس کے بعد ان سب نے مل کر ایک بڑی دیوار اس طرح کھڑی کرائی کہ وہ جب چاہیں اس کے درشن کر سکیں لیکن جھونپڑیوں میں رہنے والے غریب لوگ باہر ہو جائیں۔ اور اس درخت کو بالکل نہ دیکھ سکیں۔

اب آپ یہ بتائیے کہ وہ دیوار کس طرح بنائی گئی۔ جب آپ کو معلوم ہو جائے تو پھر اپنے دوستوں سے پوچھیے۔ ان سے کہیے کہ وہ اپنے دماغ پر زور ڈالیں۔ جب وہ تھک جائیں، تو پھر آپ ان کو دیوار کی شکل بنا کر دکھا دیجیے۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ دیوار کیسے بنائی گئی۔ اگر آپ بھی دیوار نہیں بنا سکے تو صفحہ ۱۳۲ کی تصویر دیکھیے۔ آپ سمجھ جائیں گے۔

قیصر نقوی۔ نگراں بچوں کی برادری۔ دہلی

بچوں کی برادری



پرویز بھائی! تسلیم

آپ نے لکھا ہے کہ میں "پیام تعلیم" میں بچوں کی برادری کے متعلق کچھ لکھا کروں۔ میں اس کے لئے خوشی سے تیار ہوں۔ اور اس مرتبہ برادری کے ایک بچے کے کلب کی سیر لکھ رہا ہوں۔ اگر بھائی چاہیں تو اپنے یہاں بچوں کے ایسے کلب بنا سکتے ہیں۔ برادری ان کی مدد کرے گی — قیصر نقوی

اسکول کی چھٹی کے بعد جمیل نے پریم کو تلاش کیا۔ اور پروگرام کے مطابق دونوں بچوں کا کلب بیری والا باغ چل دیئے۔

جمیل۔ تو آپ شام کو روزانہ اپنے کلب چلے جاتے ہیں۔

پریم۔ نہ صرف روزانہ شام ہی کو بلکہ یہیں گھر اور اسکول کے کام سے جب بھی چھٹی ملتی ہے ہم کلب ہی میں اپنا وقت گذارتے ہیں۔

جمیل۔ (کلب میں پہنچ کر آزادی کے ساتھ بچوں کو کھیلتا کودتا دیکھ کر خوش ہو کر) اچھا یہ ہے آپ کا کلب۔ لیکن یہ تو بتلایئے کہ یہ بچوں کا کلب کھلوایا کس نے ہے اور اس کا انتظام کون کرتا ہے۔

پریم۔ بیری والا باغ ہی کے ہم بچوں نے مل کر پہلے کلب کھولنا طے کیا اور پھر ہم میں سے کوئی صدر کوئی سکریٹری اور دوسرے عہدیدار چن کر ان کے سپرد اس کے تمام کام کر دیئے ہیں اور اب ہماری بچوں کی ورکنگ کمیٹی ہی اسے چلاتی ہے۔

جمیل :- آپ کے سپرد یہاں کیا کام ہے۔
پریم - میرے سپرد - میں کلب کا جوائنٹ سکریٹری ہوں اور سکریٹری صاحب کی مدد کرتا ہوں۔
جمیل :- کلب میں آپ لوگ کرتے کیا ہیں
پریم :- دیکھیے میدانی کھیلوں میں تو آج کل صرف بیڈ منٹن ہوتا ہے۔ فرشی کھیلوں میں کیرم۔ ڈرافٹ اور دوسرے دس بارہ کھیل ہیں یہ تو روزانہ کا پروگرام ہے۔ ویسے ہفتہ میں بچوں کا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں ساتھیوں ہی کی طرف سے۔ کہانیوں نقلوں، لطیفوں کا پروگرام ہوتا ہے اور آج کل چونکہ چھٹیاں ہیں۔ اس لئے سیروں کا پروگرام بھی جلدی جلدی بن جاتا ہے۔
جمیل :- اور یہ اس طرف بورڈ پر کیا ہے۔
پریم - ہاں یہ دیکھئے بچوں کا اخبار جس میں ہماری ورکنگ کمیٹی کی رپورٹ اور تصویروں کے ذریعہ لطیفے اور کہانیاں ہفتہ وار نکلتی ہیں اور اسے سب بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ آیئے میں آپ کو اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی ملا دوں۔
دیکھئے یہ صاحب جو ایک نل پر بچے کا منہ دھلا رہے ہیں ہمارے کلب کے صدر ہیں صاحب ہیں تو چھوٹے سے مگر ہم سب ان کا کہنا مانتے ہیں اور ہمارے تمام جلسوں کی یہی صدارت کرتے ہیں۔ اور یہ صاحب ہمارے کلب کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ان کا بس یہی کام نہیں ہے کہ شام کو کلب کی فیس ہی وصول کرتے رہیں بلکہ یہ خود بھی کھیلنے کے بہت شوقین ہیں تقریریں بھی کرتے ہیں اور بہت سے لڑکوں سے چھوٹے ہونے کے باوجود سب ان کو بھائی ریاض ہی کہتے ہیں۔
آیئے اب میں آپ کو بچوں کا ریڈنگ روم اور لائبریری اور دکھا دوں۔ لائبریری کی انچارج یہ نرجس بانو صاحبہ ہیں اور یہ علی حسین صاحب ریڈنگ روم کے انچارج ہیں۔ یہ اپنے رسالوں اور اخباروں کی نگرانی کرتے ہیں، اور نئے نئے پرچے لانے میں لگے رہتے ہیں۔
جمیل :- اور یہ ادھر بچوں کا بنک اور دکان کیسے ہیں؟
پریم :- جی یہ بچوں کا بنک ہے جہاں ہم اپنے پیسے جمع کرتے ہیں۔ اور ان پیسوں سے ہم نے ایک دکان کھول لی ہے۔ جس میں ہماری ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہیں۔ اور ہم سب یہیں سے یہ چیزیں خریدنے کی کوشش کرتے ہیں، دوکان کو جو نفع ہوتا ہے۔ اس

میں سے کچھ بنک کو ملتا ہے اور بنک اپنے ممبروں کو بانٹ دیتا ہے۔

جمیل:۔ اسے کون چلاتا ہے۔

پریم۔ اس کے انچارج بھی ہمارے ایک ساتھی سوہن صاحب ہیں۔ لیکن ان کے دو اسسٹنٹ بھی ان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

جمیل:۔ لیکن سب کام آپ خود ہی کر لیتے ہیں۔ یا کوئی مدد بھی کرتا ہے۔

پریم:۔ دیکھئے وہ صاحب بچوں کے ساتھ بیٹھے کیرم کھیل رہے ہیں۔ ان کا نام ہے سیدین صاحب یہی ہمارے کلب کے نگراں ہیں اور جب ہمیں کوئی مشکل پیش آجاتی ہے تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں۔ کاموں کو اچھی طرح چلانے میں ہماری مدد بچوں کی برادری کرتی ہے۔

جمیل:۔ اچھا بھائی اب کسی دن اطمینان سے بیٹھ کر آپ سے بچوں کے کلب کھولنے کے طریقے اچھی طرح سمجھ لوں گا۔ اور پھر اپنے محلے میں بھی بچوں کا کلب قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔

پریم۔ ضرور۔ ضرور۔ اس سلسلے میں نہ صرف میں ہی آپ کی مدد کروں گا بلکہ میرے تمام ساتھی اور بچوں کی برادری کا دفتر بھی آپ کی پوری مدد کرے گا۔ ہم بھی اسی سے اپنے کاموں میں مدد لیتے ہیں۔

بقیہ:۔ "آسام کے پہاڑی بچے"

لگا لگا کر اپنی زبان میں گاتے بھی تھے۔ اسی طرح پہاڑی بچوں کو شکار کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ یہ بچے تیروں سے اڑتے ہوئے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ سمجھ بوجھ رکھنے والے لڑکے تو خطرناک قسم کے جانوروں کا بھی شکار کرتے ہیں۔ انہیں جان کا ڈر نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی نشانہ چوکنے کا اندیشہ!

کہانی سنتے سنتے تینوں بچے اونگھنے لگے۔ بھائی جان کو بھی لمبے سفر کی تھکان محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بچوں کو اونگھتے دیکھ کر خود بھی سو گئے۔

معمہ نمبر تیرہ ۱۳ کا شاندار نتیجہ

تیرہ ۱۳ روپے کی شاندار تقسیم

صحیح حل معمہ نمبر ۱۳
دائیں سے بائیں
۱۔ شاہد۔
۴۔ بار
۵۔ یوگ
۶۔ غم
۹۔ کمر

صحیح حل معمہ نمبر ۱۳
اوپر سے نیچے
۲۔ آرام
۳۔ دور
۷۔ مٹا
۸۔ تام

صحیح حل کوئی برآمد نہیں ہوا۔

چونکہ صحیح حل کوئی موصول نہیں ہوا۔ لہذا پہلا انعام ایک غلطی والے گیارہ اشخاص پر ۹ فی کس تقسیم کر دیا گیا

(۱) عرفان احمد خاں۔ جونیر ہائی اسکول۔ کانپور۔ (۲) حبیبہ بنت سید سراج النبی تکیہ کلاں۔ رائے بریلی۔ (۳) نور جہاں بیگم ۱۸ صدیق منشن ۲۳۳ پارک اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ (۴) محمد شریف مڈل اسکول۔ بغداد الجدید۔ بہاولپور۔ (۵) اصغری سلطانہ معرفت سکندر خاں۔ ڈپٹی مینجر۔ سیہور۔ بھوپال (۷) سید یوسف اختر معرفت حشمت حسین ماسٹر سرور مڈل اسکول کوروائی اسٹیٹ۔ یاموہ (۸) ایس۔ ایم مسعود۔ سیہر کلاں۔ شاہد پور۔ مدھیہ بھارت (۹) محمد اسمٰعیل عبدالغفار درود والے۔ بھنڈوا رتیلی ضلع دھاروار (۱۰) عبدالاسد صدیقی ابن عبدالرشید انجم صدیقی۔ فیت والا منزل۔ پائپ روڈ۔ کیرلا (۱۱) کلدیپ لال [illegible] ولد صدر لال چوپڑہ۔ افغان اسٹریٹ۔ جموں۔

دوسرا انعام دو غلطی والے گیارہ اشخاص پر ۱ فی کس دیا گیا۔

(۱) عبداللہ آرم۔ محمد حاجی صابو صدیق انسٹی ٹیوشن بمبئی۔ (۲) رضوان رشید۔ جامعہ نگر۔ دہلی (۳) رضا حسین زیدی۔ جامعہ نگر۔ دہلی (۴) سید شکیل احمد۔ کلکتہ (۵) عبدالحلیم چوہان۔ مالیر کوٹلہ (۷) محمد عثمان۔ اندر کھیرا [illegible] مشرقی خاندیش (۸) مسعود حسین۔ علیہ شبیر (۹) بریام سنگھ الم جمشید پور۔ (۱۰) محمد عبدالرزاق فاروقی بلند و ضلع ورنگل (۱۱) محمد صادق [illegible] بہاولپور

تیسرا انعام تین غلطی والے ۱۲ اشخاص پر ۸ فی کس تقسیم کیا گیا

(۱) افشار احمد۔ [illegible] پوسٹ [illegible]۔ (۲) الطاف الہی انصاری۔ ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔ (۳) محمد حفیظ اللہ جگن ناتھ پور [illegible] (۵) اسمٰعیل اطہر عمادی۔ بمبئی۔ (۶) عبداللہ۔ حلدور ضلع بجنور (۷) عبدالباقی [illegible] (۸) محمد اسلم خواجہ۔ علی گڑھ (۹) زیب النساء بار گڑھ۔ ضلع سمبل پور (۱۰) محمد آفاق احمد [illegible]۔ کرنول۔ (۱۲) چرنجی سنگھ درجہ ہشتم جگسالی۔

فیس داخلہ ار کے ٹکٹ کی صورت میں ۱۵ روپے کے نقد انعامات ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے

آخری تاریخ داخلہ :- ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۷ روپے
دوسرا انعام ایک غلطی پر ۵ روپے
تیسرا انعام دو غلطی پر ۳ روپے

پیامی معمّا نمبر ۱۵

دائیں سے بائیں

۱- دنیا میں سب سے زیادہ آبادی —— کی ہے

۳- بڑے بڑے آدمی بھی اس سے ڈرتے ہیں۔

۷- راہ کے بجائے یہ بھی کہتے ہیں۔

۸- بچے بڑے سب اس کے نام سے ڈرتے ہیں

۹- —— کے چہرے ہی سے رعب پڑتا ہے۔

۱- —— کے بغیر درحقیقت ریاست ریاست نہیں کہلاتی

اوپر سے نیچے

۱- —— دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے

۲- بڑے سے بڑے لوگ بھی اس کے بغیر گزر نہیں کرسکتے

۴- ہندوستان میں زیادہ تر —— کے موسم میں گیہوں کاٹا جاتا ہے۔

۵- سب لوگ مل کر کام کریں تو اپنے ہاتھوں سے —— بنا سکتے ہیں۔

۶- مفت کی —— مل جائے تو کون بلا ضرورت بھی نہ لے گا۔

پیامی معمّا نمبر ۱۵

۱ چ		۲ ن	■	۳ ب	
	■	ا	۴	■	۵ ن
د	■		ر	۶	
۷	ه	■	۸ ع	ا	ر
■	■	۹	ی	ر	■
۱۰ آ	ب	ا	د	ی	■

کوپن پیامی معمّا نمبر ۱۵

نام ....

پتہ ....

....

بچوں کی کتابیں

یہ اچھی اچھی اور مزیدار کتابیں ہم نے مختلف عمر کے بچوں کے لئے نہایت خوشنما اور صاف خط میں چھپوائی ہیں۔ خوبصورت اور رنگین تصویروں نے کتابوں میں جان ڈال دی ہے۔ یہ سب کتابیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو دیکھ لو تو اٹھا لینے کو جی چاہتا ہے اور اٹھا لو تو پھر بغیر ختم کئے ہوئے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

کہانیاں اور قصّے

مزہ چکھائیں گے	۵ر	جگنو کی بلّی	۶ر
پرندوں کا ایکا	۴ر	مرغی اجمیر چلی	۵ر
ایک کچھوی تیل میں	۵ر	شہزادہ اور ٹھگ	۸ر
لومڑی اور خرگوش کی لڑائی	۵ر	چوہوں کی کانفرنس	۶ر
ننھا ٹٹو	۵ر	شہزادی گلنار	۵ر
چھوٹی لالٹین	۵ر	ہمت کے پھل	۶ر
ان تھک جان	۱۰ر	بھن بھن بانو	۱۰ر
جاں باز سپاہی	۱۰ر	چمپاوت کا آدم خور شیر	۵ر

ڈرامے

محنت	۵ر	پریم کی بھینٹ	۴ر

معلوماتی کہانیاں

بجلی کی کہانی	قدرت کے کرشمے
مقناطیس کی کہانی	دنیا کے بچّے
بجلی اور مقناطیس کے کھیل	دنیا کے بسنے والے

تاریخ ہند کی کہانیاں اول ۱۰ر | تاریخ ہند کی کہانیاں دوم ۱۰ر

تاریخ ہند کی کہانیاں سوم ۱۰ر

سماجی زندگی اول ۸ر | سماجی زندگی دوم ۱۰ر

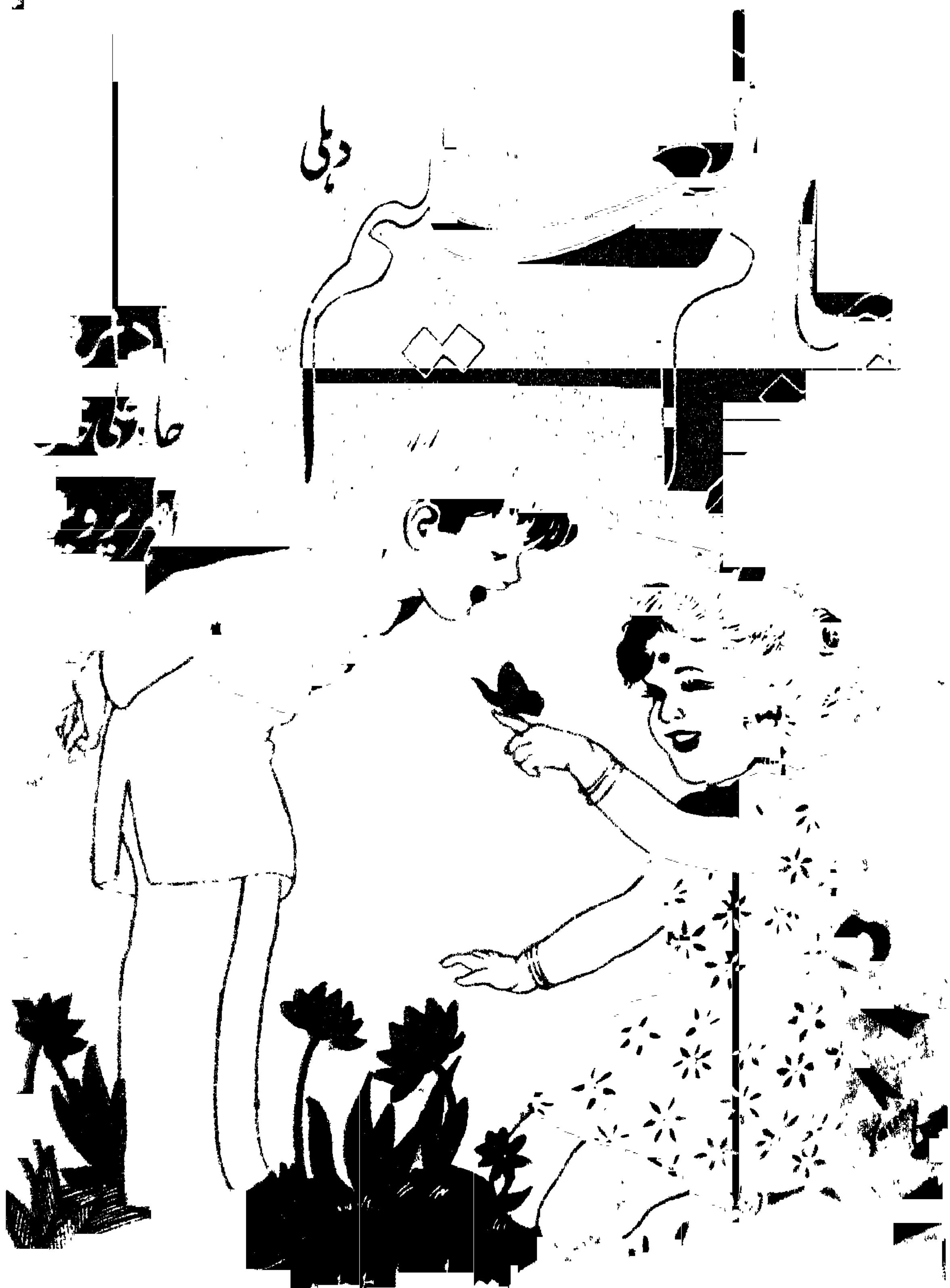
سماجی زندگی سوم ۱۲ر

بچوں کا کھلونا
فیتر صاحب کی نظمیں
۱۲ر

ہمارا راج
ہندوستان کی نئی حکومت کے کام کا ڈھنگ
۸ر

مزیدار پہیلیاں
دلچسپ پہیلیاں اور ان کی بوجھیں
۱۲ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی


دہلی



شاعروں کے یادگاری ٹکٹ

یہ ٹکٹ یکم اکتوبر سے جاری کئے گئے ہیں

(اندر کے صفحات میں حافظ نبی احمد صاحب کا مضمون پڑھئے)

پیام تعلیم

ادارہ
حامد علی خاں۔ بی۔ اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم۔ اے (علیگ)

سالانہ چندہ
۴ روپے
فی پرچہ ۶ر آنے

فہرست



بچوں سے باتیں



"پیام تعلیم" کا سالنامہ آپ کو ملا۔ ہمارے پاس بے شمار ایسے خط آئے جس میں بچوں اور بڑوں نے اس کی تعریف کی ہیں ہمیں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی اس لئے کہ کوشش ٹھکانے لگی۔ سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی ہے کہ پیامیوں نے اتنی دلچسپی لی۔ اگر آپ اتنی دلچسپی نہ لیتے تو واقعی ہم اتنا اچھا سالنامہ نہیں نکال سکتے تھے۔ یہ ہماری ہی کامیابی نہیں بلکہ آپ سب کی ہے۔ اگر آپ آئندہ بھی اسی طرح دلچسپی لیتے رہے تو ہمیں یقین ہے کہ ہم پیام تعلیم کو اور بہتر بنا سکتے ہیں

بعض پیامیوں کو اس کا افسوس ہے کہ ان کی کہانیوں کا انعامات نہ مل سکے۔ لیکن ہمت ہارنے کی کوئی بات نہیں۔ اگر آپ ابھی سے کوشش کریں تو ہمیں یقین ہے کہ اگلے سال ضرور انعام حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر پیامیوں نے اسی طرح دلچسپی لی تو ہم اگلے سال اس طرح کا مقابلہ پھر کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ جن بچوں کو اس سال انعام نہیں ملا ان کو اگلے سال مل جائے

جامعہ میں پھر تعلیمی میلے کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ یہ میلہ امسال پھر ہوگا

ہمیں یقین ہے کہ پچھلے سال سے زیادہ دلچسپ ہو گا۔ ہم پہلے کی طرح اس ل پھر میلے کی روئداد شائع کریں گے تاکہ وہ پیامی جو میلے میں شریک نہ ہو سکیں ، وہ بھی اس کا حال پڑھ سکیں گے۔

پیامی ہر ماہ بے شمار کہانیاں چھپنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ ان میں سے بعض بانیاں بہت اچھی بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ پیامی بڑی لمبی لمبی کہانیاں بھیجتے ہیں۔ اگر اس بات کا خیال رکھیں کہ کہانیاں بہت مختصر ہوں تو وہ جلدی چھپ سکتی ہیں۔ اس لئے کہ ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کی کہانی ضرور چھپے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ کہانیاں بہت مختصر ہوں۔ اس طرح اگر آپ مختصر کہانیاں بھیجیں تو وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپ سکتی ہیں۔

امید ہے کہ پیامی اس بات کا خیال رکھتے ہوئے آیندہ کہانیاں روانہ کریں گے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھئے کہ جب آپ لکھیں تو ایک لائن چھوڑ کر لکھیں۔ ناکہ اگر کہیں کوئی غلطی ہو تو اس میں اصلاح ہو سکے۔ امید ہے کہ آپ صاف اور وشں خط تو ضرور ہی لکھیں گے۔

خریداری نمبر میں تبدیلی

اگلے ماہ سے ہم خریداری نمبر میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ لہٰذا آپ کے پاس جب نومبر کا پرچہ پہنچے تو خریداری نمبر ضرور دیکھ لیجئے۔ خریداری نمبر آپ کے پتے کے ساتھ لکھا ہوتا ہے آئندہ جب آپ دفتر سے خط و کتابت کریں تو اسی نئے خریداری نمبر کا حوالہ دیں

شریر بچّے کا گیت

ضرار محمود طودی

دیر میں جب اسکول میں پہنچا		سارے بہانے بھول چکا تھا
اور سبق کا دل میں ڈر تھا		کل بھی کیا تھا جس کا وعدہ
غصّے میں اُستاد بھرے تھے
دیکھ کے مجھ کو فوراً جھپٹے
آنکھ نکالی، دانت کو پیسا		ڈیسک سے فوراً رُول کو کھینچا
میں نے واکھ کیا واویلا		پڑنے لگا ڈنڈے پر ڈنڈا
دوڑ کے کوئی مجھکو بچاؤ
ظالم کے پنجے سے چھڑاؤ
ہائے پڑی ہے جان کی جوکھم		اور اس پر یہ حال ہے اپنا!
ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم
ایک ذرا سی دیر میں بیٹھا		کھولی کتاب اور ہونٹ ہلایا
پڑھنے کا تھا ایک بہانہ		میں نے بہانے سے بہکایا
غافل جو اُستاد کو پایا
پھر تو شرارت پر میں آیا
ایک کی جھٹکی پہلے سیاہی		جلدی میں کاغذ پہ گرائی
دوسرے کی پھر چٹکی لے لی		دونوں چیخے "ہائے دہائی!"
حکم ہوا مُرغا بن جاؤ!
چوں نہ کرو، گردن توڑو!!

ہو گئے پھر ہم پشت کے بل جسم   اور اس پر یہ حال تھا اپنا!
ٹک ٹک و پدم دم نہ کشیدم

ختم ہوا اسکول تو بھاگے   کھیل کے میداں میں پھر پہنچے
دوڑ لگائی، اُچھلے، کودے   دھول دھپا گھوسم گھوسے
ایک کو مارا ایک کو پیٹا
گیند کو چھینی بلا جھپٹا

یوں دُنیا جو سر پہ اُٹھالی   اپنی شامت آپ بُلالی!
کر کے ایکا چال پہ میری   سب نے میری تاک لگالی
بولے! "آؤ اس پاجی کو"
مل کر سارا بدلا لے لو

مار پڑی پھر مجھ پر دھم دھم   اور اس پر یہ حال تھا اپنا!
ٹک ٹک و پدم دم نہ کشیدم

چھوٹے تو پھر گھر کو بھاگے   روتے دھوتے، شور مچاتے
گھر پہنچے تو پایا ہم نے   منّو کو واں کیک اُڑاتے
کیک جو دیکھا بھولے رونا
منّو سے جھٹ کیک کو چھینا

کیک چھنا تو منّو چیخے!   روئے، دھوئے دھول میں لوٹے
کیک مگر ہم چٹ کر بیٹھے   دیکھ کے سب یہ آ بگڑے!
"بات بُری ہے معافی مانگو!
کان پکڑ کر اُٹھو بیٹھو!!"

میں ہوا نادم، اماں برہم!   یاد ہوا پھر اُن کا کہنا!
"اسلم تسلم، ارحم ترحم!!"
[illegible]

حافظ نبی احمد صاحب

شاعروں کے یادگاری ٹکٹ

گاندھی جینتی کے موقعہ پر یکم اکتوبر ۵۲ء کو ہندوستان کے چھ مشہور شاعروں کی یاد میں نئے ٹکٹوں کا ایک سیٹ جاری کیا جا رہا ہے۔ اس سیٹ میں چھ ٹکٹ ہیں۔

۱۔ تین پیسے کے ٹکٹ پر کبیر کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ پیلا سبز ہے۔
۲۔ ایک آنہ کے ٹکٹ پر تلسی داس کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ قرمزی ہے۔
۳۔ دو آنے کے ٹکٹ پر میرا کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ گلناری ہے۔
۴۔ چار آنے کے ٹکٹ پر سور داس کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ نیلا ہے۔
۵۔ ساڑھے چار آنے کے ٹکٹ پر غالب کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ شوخ قرمزی ہے۔
۶۔ بارہ آنے کے ٹکٹ پر شاعر اعظم ٹیگور کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ گہرا بادامی ہے۔

یہ ٹکٹ بناوٹ کے لحاظ سے لمبوترے ہیں۔ ان کی لمبائی ایک اعشاریہ چھ انچ اور چوڑائی اعشاریہ پچانوے انچ ہے۔ اور حاشیہ سب کا ایک ہی طرح کا ہے۔ حاشیہ کا ڈیزائن تلسی داس کی تصویر سے لیا گیا ہے۔ یہ ٹکٹ فوٹوگریور (عکسی کندہ کاری) کے طریقے سے چھاپے گئے ہیں۔ ایسے ٹکٹ ہندوستان میں پہلی مرتبہ شائع کئے جا رہے ہیں۔

پہلے چار ٹکٹوں پر جن میں شاعروں کی تصویر دی گئی ہے ان کا تعلق ہندوستان کی تاریخ کے اس دور سے ہے۔ جس کو زمانہ وسطیٰ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

غالب اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ اور شاعر اعظم ٹیگور کے نام سے کون واقف نہیں؟ آپ کو نوبل پرائز مل چکا ہے۔

پیامی بھائیوں کی دلچسپی کے لئے ہم نئے ٹکٹوں کے بلاک چھاپ رہے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ کسی اگلی اشاعت میں ہم ان شاعروں کے حالات بھی سنائیں۔ (بقیہ دیکھئے صفحہ ۱۲ پر)

غوث انصاری

بمبئی سے لندن تک

پیامیوں کو یہ سُن کر خوشی ہو گی کہ جناب غوث انصاری اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے ہیں۔ آپ نے جاتے وقت ہم سے وعدہ کیا تھا کہ پیام تعلیم کو اپنا دلچسپ سفر نامہ بھیجیں گے۔ چنانچہ اس سفر نامے کی پہلی قسط انھوں نے بھیجی ہے۔ امید ہے کہ آپ اِسے شوق سے پڑھیں گے اور آئندہ قسط کا انتظار کریں گے۔

اِدارہ

۱۳؍ اگست کو دن کے ٹھیک گیارہ بجے ہمارے جہاز "جل آزاد" نے زور کی سیٹی دی اور جلدی جلدی وہ تمام سیڑھیاں ہٹا لی گئیں جو پورٹ اور جہاز کے درمیان لگی ہوئی تھیں۔ اس طرح سے دیکھتے ہی دیکھتے ہم ہندوستان کی سرزمین سے بالکل الگ تھلگ کر دئے گئے۔ سامنے پورٹ کی لمبی چوڑی عمارت تھی جس پر بہت سے مرد عورتیں اور بچے اکٹھا تھے۔ یہ تمام لوگ اپنے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو رخصت کرنے آئے تھے۔ عمارت کی چھت پر کھڑکیوں پر، پلیٹ فارم پر غرض کہ ہر ہر جگہ آدمی ہی آدمی نظر آرہے تھے۔ ادھر جہاز کے تمام مسافر جہاز کے عرشے پر کھڑے ہوئے اپنے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ سچ پوچھو تو یہ روانگی کا وقت ہی کچھ ایسا افسوسناک ہوتا ہے۔ ایک دو دن کا سفر نہیں، پورے بائیس تیئس دن جہاز پر کاٹنے، اور وہ بھی ایسے کہ ایک ایک لمحہ ہندوستان سے دور کرتا جائے۔

چند ہی منٹ کے بعد جہاز نے حرکت کی اور آہستہ آہستہ کنارے سے دور ہونے لگا۔ کنارے پر ایک عجیب منظر تھا۔ ہوا میں سینکڑوں رومال ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

ادہر ہم لوگ اپنے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو آخر تک دیکھتے رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاز دور ہوتا گیا حتیٰ کہ بمبئی کی صرف ایک جھلک دکھلائی پڑ رہی تھی اور کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہو گئی۔

اب ہم ہندوستان سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ یہاں پر جو کچھ دلچسپیاں ہیں وہ سب جہاز کے اندر ہیں۔ آیئے آپ کو اپنے جہاز کی سیر کرائیں۔ یہ ایک چھوٹا سا ہندوستانی جہاز ہے جس پر کل ڈیڑھ سو مسافر سفر کر رہے ہیں۔ جہاز پر کام کرنے والوں کو ملا کر اس کی آبادی ڈھائی سو ہو گی۔ جہاز کے سب سے نچلے حصہ میں انجن وغیرہ ہے اس کے اوپر سامان لادنے کا حصہ ہے تیسری منزل پر ہم لوگوں کے کھانے کا کمرہ تفریح کا کمرہ اور کچھ دوسرے درجہ کے کیبن (کمرے) ہیں۔ چوتھی منزل دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف دوسرے درجہ کے کمرے ہیں اور دوسری طرف فرسٹ کلاس کے کمرے ہیں۔ ہم لوگوں کے ایک کمرے (یعنی دوسرے درجہ کے کیبن) میں چھ چھ آدمیوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ کمرے خوب ہوا دار اور آرام دہ ہیں۔ ضرورت کی چیزیں یعنی بستر، تولئے، صابن وغیرہ اس کے اندر قرینے سے لگے ہوئے ملے۔ سب سے اوپر ایک منزل اور ہے۔ جس پر سگریٹ پینے کا بڑا سا کمرہ ہے اور کھیل کود کا چھوٹا سا میدان ہے۔ جہاز کے ہر ہر کونے پر لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں، جن پر خبریں اور ریکارڈ سنتے ہیں۔ تفریح کے کمرے میں بڑے بڑے صوفے لگے ہوئے ہیں، ایک کونے میں پیانو باجا رکھا ہے۔ دوسرے کونے میں لکھنے کی میز رکھی ہوئی ہے اور دیوار پر ایک بڑا سا نقشہ لگا ہوا ہے جس پر ہر روز نشان کے ذریعہ ہم لوگوں کو یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ ہمارا جہاز کس جگہ پر ہے۔ کھانے میں ہم لوگوں کو ہندوستانی اور انگریزی دونوں ہی قسم کے کھانے ملتے ہیں۔ مگر ہم تو ابھی تک ہندوستانی کھانا کھا رہے ہیں۔ لندن پہنچنے پر تو پھر شاید ہی یہ کھانا نصیب ہو۔

آیئے اب سمندری زندگی کا تھوڑا بہت حال سنائیں۔ بمبئی چھوڑنے کے کوئی ایک گھنٹہ

بعد جب جہاز کھلے سمندر (بحر عرب) میں آیا تو ایسی طوفانی لہروں کا سامنا کرنا پڑا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ ایسی اونچی اونچی لہریں جیسے اپنے یہاں کی چار منزلوں کی عمارت۔ جہاز اس بری طرح ڈگمگا رہا تھا کہ ہم لوگوں کو ایک قدم بھی سہارے کے بغیر چلنا ممکن نہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ جیسے کسی بہت بڑے جھولے پر بیٹھے ہوں جو مستقل اوپر نیچے آ جا رہا ہو۔ جھولے کا نام سنتے ہی آپ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر یوں سمجھئے کہ اگر آپ ایک گھنٹہ متواتر جھولتے رہیں تو چکر آنے لگتا ہے، اور یہاں ہم لوگ چار راتیں اور چار دن اسی جھولے کے مزہ کے شکار بنے رہے۔ کتنے ہی لوگ جو متلی اور قے کے مارے ادھر اُدھر پڑے تھے۔ نہ کھا سکتے تھے نہ پی سکتے تھے۔

ایک روز تو اتنی سخت قسم کی حرکت ہو رہی تھی کہ مجھے بھی اس مصیبت سے دو چار ہونا پڑا۔ اس روز دن بھر مجھ سے بھی بالکل کھانا نہیں کھایا گیا۔ مگر شام ہوتے ہوتے طبیعت کسی قدر ٹھیک ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی کو جہاز پر چکر نہ آئے تو سفر بے حد پُرلطف ہوتا ہے۔ ہاں تو چار دن اور چار راتیں اس طوفان میں گزاریں جن میں سے بیچ کی دو راتیں تو اتنی سخت تھیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ سوتے سوتے زور کے جھٹکے سے آنکھ کھل جاتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ بس اب جہاز ڈوب رہا ہے ویسے بھی دن کے مقابلے میں راتیں زیادہ ڈراؤنی ہوتی ہیں۔ دن کو تو ہم دیکھ بھی سکتے ہیں مگر رات کے اندھیرے میں سوائے لہروں کی ڈراؤنی آوازوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

شروع کے پورے تین دن تک تو سورج بالکل غائب ہی رہا۔ اوپر بادل، نیچے پانی اور بیچ میں جہاز۔ ہوا اتنی تیز کہ اگر ہاتھ سے کوئی کاغذ وغیرہ چھوٹ جائے تو اس کا پکڑنا نا ممکن ہو جائے۔ پھر تو وہ سمندر کی لہروں میں ہی جا کر دم لیتا۔ البتہ کل صبح کو جہاز خلیج عدن میں داخل ہو گیا اور اس طرح سے کھلے سمندر اور اس کی طوفانی لہروں اور ہوا سے نجات ملی۔ موسم میں بھی کسی قدر تبدیلی آگئی۔ دھوپ کی گرمی بڑھنے لگا ہے۔

راتیں البتہ ٹھنڈی رہتی ہیں۔ اگر آپ خلیج عدن کو نقشے میں دیکھیں تو ایک طرف افریقہ کا براعظم ہے اور دوسری طرف عرب کا علاقہ۔ یہ دونوں ہی ریگستانی علاقے ہیں، جہاں دن میں خوب گرمی پڑتی ہے اور راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

ایک اور مزے کی بات سنئے۔ جس روز سے ہم روانہ ہوئے، ہر روز رات کے بارہ بجے وقت آدھ گھنٹہ پیچھے ہو جاتا ہے۔ آج ۱۸ر اگست ہے۔ روانہ ہوئے چھ روز گذر چکے ہیں اور اس طرح سے یہاں کا وقت بھی ہندوستان کی گھڑیوں سے تین گھنٹے پیچھے ہے۔ اس وقت جہاز کی گھڑی میں۔ دس بج رہے ہیں مگر ہندوستان میں اسی وقت ایک بج چکا ہو گا۔ بات در اصل یوں ہے کہ جہاز عرض البلد پر چل رہا ہے اور اس طرح سے ہم طول البلد کو چھوڑتے چلے آ رہے ہیں۔ دن کو ٹھیک بارہ بجے جب سورج ہندوستان میں بالکل سر کے اوپر ہوتا ہے، اُس وقت یہاں صرف ۹ بجے ہوتے ہیں۔

آج ۱۸ر اگست کو ٹھیک گیارہ بجے ہمارا جہاز عدن پہنچے گا۔ جہاز کے تمام مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔ ہر ایک نہا دھوکر تیار ہو رہا ہے، عدن میں پورے چھ روز کے سمندری سفر کے بعد زمین پر قدم رکھنے کا موقعہ ملے گا، پھر وہی سمندر ہوگا اور ہم ہوں گے۔ گو کہ عدن پہنچنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے مگر زمین کے قسم کی چیز اب بھی دور دور نہیں دکھلائی پڑتی۔

عدن میں ہم جو کچھ دیکھیں گے اس کی تفصیل اگلی دفعہ لکھیں گے اب اجازت دیجئے تاکہ ذرا نہا دھو کر ہم بھی عدن گھومنے کے لئے تیار ہو لیں۔

امام حسنؑ کا دسترخوان

امام حسنؓ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے بڑے بیٹے تھے۔ آپ کا سارا وقت دکھیاؤں کی مدد اور غریبوں کی خاطر داری میں گذرتا تھا۔ آپ روزانہ سیکڑوں غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک غریب مسافر مسجد میں آکر ٹھہرا۔ اس زمانے تک وہاں کوئی سرائے یا ہوٹل نہیں تھا۔ پردیسی مسجدوں میں آکر ٹھہر جاتے اور وہیں انھیں کوئی نہ کوئی آکر کھانا کھلا جایا کرتا۔

مسافر جب نماز پڑھ کر مسجد کے صحن میں نکلا تو اس نے دیکھا کہ دالان میں ایک بہت ہی غریب آدمی بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا ہے۔ مسافر اس کے پاس گیا تو اس آدمی نے سلام کیا اور اپنا رومال اس کی طرف بڑھاتے ہوئے "کھانا حاضر ہے"۔ مسافر نے تعجب سے اس کے رومال پر نظر ڈالی تو جَو کی روٹی کے تھوڑے سے سوکھے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے اور وہ بھی پتھر جیسے سخت۔ جو کسی طرح دانتوں سے نہیں ٹوٹتے تھے۔

مسافر بلا کچھ کھائے پئے چپ چاپ اٹھ آیا اور مسجد کے باہر جا کر لوگوں سے کہا کہ "میں کھانا کھانا چاہتا ہوں"۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ تم امام حسنؑ کے مہمان خانے چلے جاؤ۔ ان کے دستر خوان پر روزانہ سیکڑوں غریب اور پردیسی کھانا کھاتے جاتے ہیں۔

رات ہو چکی تھی مسافر پوچھتا ہوا امام حسنؑ کے گھر پہونچا۔ ایک بہت بڑے فرش پر سیکڑوں آدمی بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ اچھے اچھے مزیدار کھانے اور تازی تازی کھجوریں۔ مسافر بھی ہاتھ دھو کر بیٹھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ کھانا کھانے میں وہ بار بار اپنے برابر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا اور نظر بچا کر چپکے چپکے کچھ کھجوریں اور روٹیاں اپنی جیب میں رکھتا جاتا۔ مسافر کی یہ چوری بہت دیر تک نہ چھپ سکی۔ آخر ایک برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے دیکھ ہی لیا اور پوچھا: "کیوں بھائی یہ کھانا تم کس کے

لئے چرا رہے ہو۔ اگر تمھارے بال بچے بھوکے ہیں تو شوق سے ان کے لئے کھانا لے جاتے بنتے ہو۔ مگر چوری کر کے اپنا ایمان کیوں بگاڑ رہے ہو؟"

مسافر نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ کہنے لگا "میں ایک غریب پردیسی مسافر ہوں میرے کوئی بال بچے میرے ساتھ نہیں ہیں۔ آج ہی اس شہر میں آیا ہوں۔ جس مسجد میں میں ٹھہرا ہوں وہاں ایک مجھ سے بھی زیادہ غریب آدمی رہتا ہے جس کے پاس جَو کی سوکھی روٹی کے سوا کچھ بھی کھانے کو نہیں ہے اور وہ سوکھے ٹکڑے بھی اتنے سخت ہیں جنھیں وہ بیچارا اپنے کمزور دانتوں سے نہیں توڑ پاتا"

پاس بیٹھے ہوئے کچھ اور مہمان بھی یہ باتیں سن رہے تھے۔ سب لوگوں نے صلاح کی کھانا ختم ہو جائے تو مسافر کو امام حسن کے سامنے پیش کر کے کچھ کھانا دلوا دیں کہ وہ اپنے دوست کے لئے لے جا سکے۔ کھانا ختم ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کر لوگ اس مسافر کو امام حسن کے پاس لے گئے۔

مسافر جیسے ہی اُن کے سامنے گیا۔ اس نے پہچان لیا۔ ارے یہ تو وہی ہیں جو کوفے کی مسجد میں بیٹھے ہوئے سوکھی روٹی کے ٹکڑے کھا رہے تھے۔

—— نادم سیتاپوری

(بقیہ شاعروں کے یادگاری ٹکٹ صفحہ ۷)

ٹکٹوں کے ساتھ ہی اس موقعہ پر ایک لفافہ بھی جاری کیا جا رہا ہے۔ جس پر بائیں طرف کے نچلے حصے میں ایک مور اور ستار کی تصویر بنائی گئی ہے۔ اس لفافہ کی قیمت پانچ پیسے ہے۔

پورا سٹ ایک خوبصورت البم کی شکل میں بھی ملے گا۔ البم کی قیمت دو روپیہ ہوگی اس البم میں شاعروں کی زندگی کے مختصر حالات بھی دیئے گئے ہیں۔ اور ان کے کلام کا کچھ نمونہ بھی دیا گیا ہے۔

لفافہ اور البم کی تصویریں بھی شائع کی جا رہی ہیں۔

سید منیر الحسن

میاں خوجی نے ریل کا سفر کیا



میاں خوجی تھے بڑے سیلانی ایک دن جو انھیں شوق چرآیا تو جھٹ پٹ تیاری کر اور اپنے دوست مرزا جی کو ساتھ لے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دئے۔

مرزا جی نے کہا "لیجئے صاحب وہ سامنے ہماری ریل کھڑی ہے۔" میاں خوجی نے کہا "آخر مرزا جی کیوں غل مچا کر یہ کھلائے جارہے ہو، ابھی تو انجن پانی پینے جا رہا ہے اور پھر حضرت یہ تو جنکشن ہے یہاں تو آدھ گھنٹے سے زیادہ ریل کھڑی رہتی ہے۔ غرض جوں توں کر کے اسٹیشن میں داخل ہوئے تو مرزا جی نے فوراً کہا کہ بس میاں اسی سامنے والے ڈبے میں چلے چلو نا۔ دو قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ کسی کی آواز آئی۔ حضرت یہ تو دوسرا درجہ ہے۔" یہ سنتے ہی میاں خوجی فوراً بگڑ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "دوسرا اور تیسرا کیا جی۔ جب دام دتے ہیں ٹکٹ خریدا ہے تو اس جانب کا جہاں جی چاہے گا بیٹھیں گے۔"... ابے رکھ دے قلی سب سامان اسی درجے میں۔

جب قلی اس درجے میں سامان رکھنے لگا تو ایک مسافر دروازہ سے لگا کھڑا تھا

میاں خوجی نے اُس سے کہا " اما صاحب ذرا دوازے کے پاس سے ہٹنا۔ دیکھتے نہیں ہو ہم اپنا سامان رکھوا رہے ہیں۔" یہ دھکا پیل۔ دیکھ کر مرزا جی سے نہ رہا گیا انھوں نے کہا " یار خوجی۔ خواہ مخواہ ضد پر اڑے ہوئے ہو۔ آگے بڑھ چلو بھائی۔" مرزا جی کی یہ بات سنتے ہی میاں خوجی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔" خوجی! کیا کہا؟ پھر تو کہنا۔ اجی خوجی کس مردک کا نام ہے؟" ادھر وہ مسافر دروازے سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ خوجی نے پھر کہا " آغا ہو آغا۔ ذرا دروازہ چھوڑ کے کھڑے ہو۔ ایں، ہم چلّا رہے ہیں اور یہ گونگا سنتا ہی نہیں۔ کھڑکی میں سے آدھا دھڑ نکالے بچوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔"

آغا نے اپنے خاص انداز میں بولتے ہوئے کہا " یاں کاں چلا آرا اے بھائی۔ آگے جا کے بیٹھو۔ یہ دوسرا درجہ اے (یہاں کہاں چلے آرہے ہو بھائی آگے جا کے بیٹھو یہ دوسرا درجہ ہے)۔ میاں خوجی نے کہا " دوسرا درجہ ہے تو تمھارے ٹھینگے سے۔ تمھارے باپ کی ریل ہے کیا؟ کہنے لگے دوسرا درجہ ہے۔ چل بے قلی۔ میری صورت کیا دیکھتا ہے۔ رکھدے سامان اسی درجہ میں۔ مرزا جی نے جب یہ حال دیکھا تو کہا " بھئی خواجہ صاحب۔ کیا غضب کر رہے ہو۔ افغانی آدمی کے منہ نہ آنا۔ پھر گیا تو کچومر نکال دے گا۔" میاں خوجی نے کہا " ہم نے بہت دیکھے ہیں ایسے ایسے افغانی۔ وہ تو کہو سفید پوشی دیکھ کر طرح دے رہا ہوں۔ نہیں تو وہ جھاپڑ رسید کروں کہ دن کو تارے دکھائی دینے لگیں۔" اے او کُلاہ والے خان! لے اب ہٹتا ہے کہ دوں دھکّا۔" خان نے غصہ میں چلّا کر کہا۔ " تم بوت گستاخ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ام تمھارا گوشمالی کر کے درست بنائے گا۔ (کھڑکی سے کان پکڑنے کے لئے ہاتھ باہر نکالتا ہے)۔

(افغانی میاں خوجی کا کان زور سے پکڑ لیتا ہے خوجی زور لگا کر چھڑانا چاہتے ہیں۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی) میاں خوجی درد کے مارے کراہتے ہوئے " ارے ا ر

یہ کیا مسخرہ پن ہے؟ اجی خاں صاحب چھوڑو میرا کان۔ واللہ دل لگی کی حد ہوتی ہے۔ ارے بھائی خان صاحب کان لیا۔ ابے او گیدی۔ جان نکلی۔ یہ کیا کر رہا ہے۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ بھونک کر قیمہ بنا دیتا۔ ارے بھئی افغانی صاحب قسم پروردگار کی سخت درد ہو رہا ہے،، خاں صاحب نے لطف لیتے ہوئے کہا۔" زنیں تیں۔ تم بد معاش آج ہم تمھارا کان اکھاڑ کر پھینک دے گا"۔

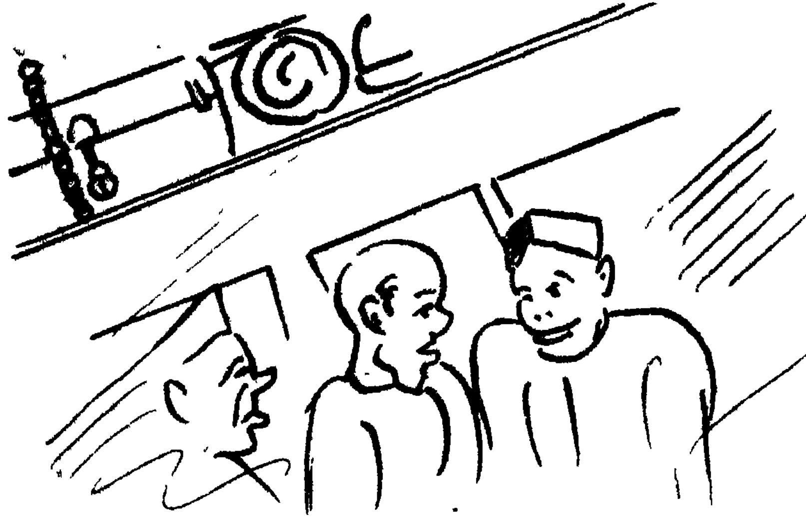
میاں خوجی نے جب یہ اپنی حالت دیکھی تو کہا" سر عزیز کی قسم بھائی۔ گوش من رفت (یعنی میرا کان گیا)۔ منہ پر طمانچے مار کے وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس طرف رخ نہ کروں گا"۔ میاں خوجی کی یہ حالت



دیکھ کر مرزا جی نے آہستہ سے کہا" منع کرتے تھے کہ نہ الجھو اب منہ کی کھائی تو لگے فارسی بولنے بچے اب صبح تک گوشمالی کرلتے رہیے۔ بندہ تو چل کے دوسرے ڈبے میں بیٹھتا ہے۔ میاں خوجی نے کہا" اجی یہ ہمارے ابا جان مرحوم کے جگری دوست سردار گل محمد خاں کی سگی بھتیجی کے دیور ہیں۔ ان سے تو ہمارا پرانا مذاق کا رشتہ ہے۔ (درد سے کراہتے ہوئے) اوہ کان اکھڑ جائے گا ظالم واسطے خدا کے اب دل لگی چھوڑ۔ خاں نے کہا" اچا جاؤ۔ تمھارا چوٹا چوٹا (چھوٹا چھوٹا) آت پاؤں (ہاتھ پاؤں) پہ رحم کرکے کان چوڑے (چھوڑے) دیتا ہے۔ اب کبھی زبان درازی نہ کرنا۔ خوجی کی جان میں جان آئی تو خان سے کہنے لگے" یار خاں صاحب

تو تم اتنے تگڑے نہ تھے۔ چٹکی ہے یا لوہے کا شکنجہ۔ واللہ کان کا دیوالہ نکال دیا۔ اچھا بھئی پھر ملیں گے۔ اس وقت ذرا جلدی ہے (میاں خوجی قلی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں) لاحول ولا قوت کس دل لگی باز سے پالا پڑا تھا۔ بھئی مرزا جی۔ یہ لوگ غیر ملک کے ہیں تو کیا مگر ایمان کی بات یہ کہ ہوتے ہیں بڑے خوش مزاج۔ —— لا بھائی قلی۔ اسباب ادھر رکھ دے۔ اس طرف ہاں یہاں۔ اور لے بھائی یہ ہیں تیرے پیسے۔ اور آؤ مرزا جی ہم تم یہاں بیٹھیں۔ اس کھڑکی کے پاس۔ میاں خوجی نے اکڑ کر کہا: "جگہ کیسے نہ ملتی؟ ارے بھائی خواجہ بدیع الزماں (یعنی میاں خوجی) ساتھ ہیں کہ مذاق ہے۔ قسم ہے جو ایسی تل دھرنے کی گنجائش نہ ہو اور ایں جانب چھکڑا بھر جگہ نکال لیں۔ واللہ صورت سے وہ شان افسری ٹپکتی ہے کہ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کے اٹھ جاتے ہیں۔ مرزا جی نے کہا "لے اب بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ۔ اس وقت تو ایسی کرکری ہوئی کہ تمھیں، چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔" میاں خوجی نے کہا "پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ لگے اوٹ پٹانگ اڑانے۔ ارے بھائی کہہ تو دیا کہ خاں صاحب سے ہمارا دل لگی کا رشتہ ہے۔ جبھی تو ہم نے برا نہیں مانا۔ اور جو کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا میرے ساتھ یہ حرکت کرتا تو قسم خدا کی وہ مرمت کرتا، وہ مرمت کرتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔"

میاں خوجی نے کہا "مرزا جی ذرا گٹھری سنبھال کر رکھنا۔ اگر خدانخواستہ کہیں گٹھری اِدھر سے ادھر ہو گئی تو میرا تو سمجھ لیجئے بے افیم کے انتقال ہو جائے گا۔ ارے ہاں یار مرزا جی ذری پوچھنا تو اس خوانچے والے کے پاس کھیر کے پیالے بھی ہیں یا نہیں۔" مرزا جی نے جھلا کر کہا "آپ کی بھی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ یہ پان سگریٹ والا ہے کہ کھیر کے پیالے بیچتا ہے؟ دیکھتے نہیں ہیں آپ بنے ہوئے پان نکال نکال کے مسافروں کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔



میاں ٹھو جی نے کہا "اجی تو احتیاطاً پوچھ لیتے ہیں کیا مضائقہ ہے بھائی کیا عجب جو اس کے پاس کھیر کے پیالے بھی نکل آئیں۔ اب دیکھئے نا وہ جو ہمارے محلہ میں شیخ گھسیٹے ہیں۔ کہنے کو تو بساط خانے کی دوکان رکھتے ہیں لیکن آخر ان کے یہاں کہانے تمباکو بکتا ہے کہ نہیں۔ بس اسی سبب سے تو ہم ریل کے سفر سے گھبراتے ہیں۔ یہاں نہ کھیر کے پیالے بکتے ہیں نہ گنڈیریاں نہ حلوہ سوہن اب دیکھئے کہ وقت ہوا ہے اور افیم کھانے کو یعنی عمل کرنے کو بے طرح جی چاہ رہا ہے لیکن اس ڈر سے افیم نہیں گھولتے کہ چسکی لگا کر منہ کاہے سے میٹھا کریں گے"

(باقی آئندہ)

ریحان احمد عباسی



چار بیوقوف

کسی گاؤں میں چار بیوقوف رہا کرتے تھے۔ کام کاج میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ وہ تمام دن یونہی گھر میں پڑے رہتے یا پھر گاؤں میں مارے مارے پھرتے۔ ایک دن ان کے ماں باپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آج شام کو کسی کو کھانا نہ دیا جائے اور زبردستی کہیں نہ کہیں ملازمت کیلئے بھیجا ہی جائے۔ چنانچہ اس دن شام کو کسی کو کھانا نہ ملا اور گھر سے نکالے گئے الگ۔ چاروں نے رات تو جیسے تیسے گاؤں میں کاٹی۔ صبح ہوتے ہی شہر کا رخ کیا۔ بیچاروں کو گھر کے چھٹنے کا غم تھا۔ اس وجہ سے بہت دور تک منہ لٹکائے خاموشی سے چلتے رہے۔ آخر کب تک؟

ایک صاحب بولے "بھئی اس طرح کیسے راستہ کٹے گا کچھ باتیں ہی کرو"

سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور اپنی اپنی آپ بیتی چھیڑ دی۔ جب تین بیوقوف اپنی اپنی کہہ چکے تو چوتھے صاحب کا نمبر آیا۔ انھوں نے بغیر کوئی قصہ سنائے ہی فرمایا "یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ میں تم سب سے زیادہ عقلمند ہوں۔"

وہ تینوں یہ کیسے گوارا کرسکتے تھے۔ پہلے تو آپس ہی میں ایک دوسرے کو سمجھاتے رہے کہ "نہیں نہیں .... عقلمند میں ہوں، جب جھگڑے تک نوبت آ گئی تو فیصلہ ہوا کہ مقابلہ کیا جائے۔

"اس دریا کو تیر کر سب سے پہلے جو اُدھر پہنچ جائے وہ عقلمند!" چاروں پانی میں کود پڑے جلدی جلدی دریا کو پار کیا۔ جب دوسرے کنارے پر پہنچے تو ہر شخص دوسرے کی طرف دیکھنے لگا کہ کون آیا؟ کون نہیں؟ کچھ دیر تو ایسے ہی کھڑے رہے لیکن جب ہر ایک نے اپنے سامنے تین آدمی ہی دیکھے تو چلا چلا کر رونا شروع کر دیا "ہائے ایک آدمی ڈوب گیا۔ ہائے ایک ڈوب گیا" اتفاقاً اُدھر سے کوئی سوار جا رہا تھا۔ اس نے جب شور سنا تو ان کے پاس آیا اور ماجرا پوچھا۔

سب نے اسی طرح رو رو کر بتایا کہ ہم چار آدمی گھر سے چلے تھے۔ ایک مقابلہ کی وجہ سے دریا میں تیرنا پڑ گیا اور اسی میں ایک آدمی ڈوب گیا۔ اُس سوار نے دیکھا کہ چاروں آدمی کھڑے ہیں تو سمجھ گیا کہ یہ بیوقوف ہیں۔ اول تو سمجھایا کہ کوئی نہیں ڈوبا تم چاروں موجود ہو لیکن جب کوئی نہ مانا تو جلدی سے اپنا ہنٹر نکال زور سے ایک کو مارا اور کہا "ایک" دوسرے کو مارا اور کہا "دو" تیسرے کو مارا اور کہا "تین" پھر چوتھے کو مارا اور کہا "اور یہ چار" مار کھا کر ان کی سمجھ میں بھی آ گیا کہ ہم چاروں زندہ ہیں تو بہت خوش ہوئے۔

چاروں نے سوار کو بتایا کہ ہم لوگ ملازمت کے لئے نکلے ہیں۔ سوار نے یہ سوچا کہ کیوں نہ ان کی بیوقوفی سے فائدہ اٹھایا جائے یہ سوچ کر اس نے ملازم رکھ لیا اور اپنے گھر لے آیا۔ سب کو الگ الگ کام پر مقرر کر دیا اور کہا کہ اگر کسی نے ذرا بھی نقصان کیا یا تکلیف پہنچائی تو الگ کر دیا جائے گا۔

پہلے آدمی کو ایک کمرہ کی چوکیداری پر مقرر کیا۔ کئی دن تک تو ٹھیک ٹھیک کام کرتا رہا۔ ایک دن جب مالک دوسرے کمرے میں آرام کر رہا تھا تو چپکے سے اندر چلا گیا۔ کمرہ بہترین طریقہ پر سجا ہوا تھا ہر طرف

شیشے ہی شیشے۔ انہیں چاروں طرف اپنا ہی فوٹو نظر آیا تو سمجھے کہ مجھے بہت سے آدمیوں نے مارنے کے لئے گھیر رکھا ہے۔ اب تو ان کو بہت غصہ آیا۔ پہلے تو گالیاں دیں۔ جب کمرہ کی گونج کی وجہ سے وہی آواز واپس آکر سنائی دی تو آپے سے باہر ہو گئے بغل میں لاٹھی تو تھی ہی جلدی سے ہاتھ میں لے کر زور زور سے گھمانا شروع کر دی ان کی اس حرکت سے تمام سامان خراب ہو گیا اور شیشے ٹوٹ گئے۔ اور جب اپنی تصویر نظر نہ آئی تو سمجھے کہ وہ سب لوگ بھاگ گئے۔ بڑی شان سے اکڑتے ہوئے باہر آئے۔ غصہ کی وجہ سے بڑ بڑا رہے تھے "ہوں . . . سب کو مار بھگایا۔

ادھر اس گڑ بڑ کی وجہ سے مالک کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جو یہ ماجرا دیکھا تو بڑا افسوس ہوا فوراً انہیں کھڑے کھڑے نکال دیا۔

دوسرے صاحب کو کھانا کھلانے پر ملازم رکھا۔ ایک دن ایک پلیٹ ذرا میلی تھی مالک نے کہا "اسے دھو کر لاؤ" آپ کی سمجھ آیا دو کر لاؤ۔ دور جا کر کھڑے ہو گئے سوچتے رہے اگر فرش پر مارتا ہوں اور دو کے بجائے تین ٹکڑے ہو گئے تو مالک ناراض ہوں گے جب بہت دیر ہو گئی تو مالک نے آواز دی "نوکر نوکر" اب تو گھبرا گئے کہنے لگے عجیب آدمی ہے ابھی کہتا تھا دو کر لاؤ اب کہتا ہے نوکر پلیٹ کو زور سے فرش پر مارا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ مالک نے اس دن تو خیر معاف کر دیا۔ لیکن ایک دن جب یہ پنکھا جھل رہے تھے ایک مکھی بار بار کھانے کی طرف آتی تھی۔ غصہ کی وجہ سے بیتاب ہو گئے تو زور سے پنکھا کھینچ مارا مکھی تو گئی بھاگ اور پنکھا پلیٹوں میں لگا۔ سب کھانا خراب ہو گیا اور ساتھ میں کھانے والوں کے کپڑے بھی۔ اس دن ان بیچاروں کو بھی الگ کر دیا گیا۔

تیسرے صاحب کو مال گودام پر مقرر کیا۔ ایک دن مالک اپنے کسی دوست سے کہہ رہا تھا "بھئی کیا بتاؤں، بڑی مشکل



میں ہوں، مالی بالکل نہیں نکل رہا۔ گودام بھرا پڑا ہے، تم ہی کچھ کوشش کرو اسے نکالنے کی۔" آپ نے باتیں سنیں تو بہت خوش ہوئے کہ چلو مجھے اپنی کار گذاری دکھانے کا موقع تو ملا۔ بھاگ کر آئے اور دروازے پر بیٹھ گئے اب جو بھی کوئی اُدھر سے گذرتا کچھ نہ کچھ اسے ضرور دے دیتے۔ بھلا مفت کا مال کسے برا لگتا ہے۔ شام تک گودام کا ایک حصہ خالی کر دیا۔ مالک کو معلوم ہوا تو بھاگا بھاگا آیا۔ بہت برہم ہوا پوچھا ایسا کیوں کر رہے تھے۔ جواب ملا "حضور آپ ہی تو اپنے دوست سے کہہ رہے تھے کہ مال نکالنے کی کوشش کرو" میں نے سوچا کچھ میں بھی آپ کی مدد کروں" الغرض انہیں بھی نکالا گیا۔

چوتھے صاحب کو تجارت کے کام میں رکھا۔ انہیں ایک بیل گاڑی میں اناج بھر کر دوسرے شہر میں فروخت کرنے کے لئے بھیجا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر وہ تینوں ساتھی بھی مل گئے۔ چونکہ گاڑی نئی تھی اس لئے اس میں سے چرّخ چوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ گاڑی والے صاحب بولے "یہ تو بول رہی ہے" تینوں نے بہ زور تائید کی۔ تمام راستہ یہی ذکر رہا۔

اناج اچھی قیمت پر فروخت ہوا۔ واپسی پر اتفاق سے بھیگنے کی وجہ سے گاڑی سے آوازیں نکلنا بند ہوگئیں اب تو سب فکرمند ہوئے "کیا ہوا؟ اب کیوں نہیں بولتی؟

آخر یہ نتیجہ نکالا "کہ گاڑی مر گئی" سوال پیدا ہوا اب کیا کرنا چاہیئے۔ ایک صاحب نے سمجھایا "مرنے کے بعد کریا کرم ہی کیا جاتا ہے" روپئے تو تھے ہی مٹی کا تیل منگا اور آگ لگا دی۔ بیلوں کو بھی اسی کے ساتھ باندھ دیا۔ لیکن رسّی جلنے کی وجہ سے وہ تو وہاں سے بھاگ گئے۔

چاروں رات ہو جانے کی وجہ سے سونے کے لئے ایک تالاب کے کنارے رک گئے۔ برسات کا موسم تو تھا ہی مینڈک اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ آدھی رات کو ان میں سے ایک کی آنکھ کھل گئی۔ جلدی جلدی سب کو اٹھایا کہنے لگے "یار میرے دادا کے زمانے کے قوّال گا رہے ہیں۔

ایک صاحب نے رائے دی قوالوں کو انعام دینا چاہیئے۔

قوالوں کو انعام دیا تمام روپئے دریا میں پھینک دئے گئے۔ اب مالک کے پاس جانا بیکار تھے اس لئے خود ہی اپنے گھر کو لوٹ آئے۔

(بقیہ مضمون بدحواسیاں صفحہ ۱۴)

ہمارے گھر کے پاس ایک گولر کا درخت تھا۔ جو اس زمانے میں گولروں سے لال ہو رہا تھا۔ میرے بھائی دہلی سے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو گولر دیکھا تو ایک دم بول اٹھے "ا لے پولا کا پولا گولر لال ہو گیا"۔ میں ان کی اس بدحواسی پر زور سے ہنس دیا اور وہ اپنی جھینپ مٹانے اک دم اٹھ کر باہر آ گئے۔

اک دن کا ذکر ہے کہ ہمارے بھائی صاحب ہمیں جیومیٹری سمجھا رہے تھے۔ انہوں نے ایک لائن کھینچی وہ کافی موٹی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا یہ تو دوسری لائن سے مل گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ہے وہ لائن وہ بتاتے ہوئے بولے اور غصہ سے کہنے لگے اس پنسل کی نوک موٹی ہے۔ میں زور سے ہنس دیا وہ غصہ سے چلّا اٹھے۔ اور پھر..... تو آپ جانتے ہی ہیں کیا ہو گا۔

اظہر راہی۔ بھوپال

بشکریہ شنکرز ویکلی

کالو مینا کی کہانی



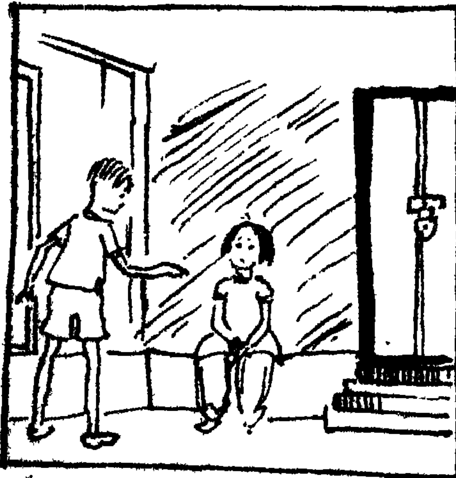
بابوجی ہمارا اسکول چھٹیوں کی وجہ سے بند ہوگیا ہے



لیکن مینا کہاں رہ گئی ؟



جا کر دیکھتا ہوں۔



میں اسکول کھلنے کا انتظار کررہی ہوں ۔ میری سلیٹ ٹوٹ گئی ہے۔

"اچھا مذاق"

ا ع . انصاری

حامد اور شفیق ایک دوسرے کے دوست تھے۔ وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے اور ایک ہی اسکول میں ساتویں درجے میں پڑھتے تھے۔ لکھنے پڑھنے میں بھی دونوں کے دونوں بہت ہی تیز اور ہونہار تھے۔ لیکن حامد کی طبیعت میں دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ شوخی تھی وہ ایک دولت مند باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اور اس کے ماں باپ اُس کے ساتھ بے حد لاڈ پیار کرتے تھے اس لئے وہ بگڑ گیا تھا۔ مگر شفیق بہت ہی سیدھا سادا اور نیک لڑکا تھا۔ اُس کے باپ ایک معمولی دکاندار تھے۔ اس کے علاوہ شفیق کے اور بھی بھائی بہن تھے۔ اس لئے اس کے ساتھ حامد جیسا لاڈ پیار کیسے ہوتا۔۔۔؟

گرمی کے دن تھے۔ اسکول بند ہو چکا تھا۔ اوروں کی طرح وہ دونوں بھی صبح سویرے سورج نکلنے سے ایک آدھ گھنٹے پہلے ہی اٹھ بیٹھتے اور شہر کے باہر ساتھ ساتھ سیر کرنے نکل جایا کرتے۔ اور پھر سورج چڑھتے گھر واپس آ جاتے۔

ایک دن وہ دونوں سیر کرتے کرتے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ وہاں سے

کچھ دور پر ایک ادھیڑ عمر کا گھسیارا گھاس چھیل رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا لگا ہوا تھا کہ اُسے ان دونوں کے آنے اور بیٹھنے کی بالکل خبر نہ ہو سکی۔

حامد اور شفیق جس درخت کے نیچے آکر بیٹھے تھے، وہ ایک کھیت کی مینڈھ پر تھا۔ اس کے آس پاس بیروں کی جھاڑیاں تھیں۔ یکایک حامد کی نظر پاس کی جھاڑی میں چھپائے ہوئے جوتوں پر پڑی۔ اس نے شفیق کو بھی دکھاتے ہوئے کہا۔ "ارے یار! ذرا دیکھو تو، وہ جھاڑی میں نہ جانے کس کے جوتے پڑے ہیں۔"

"کہاں...؟" شفیق نے پوچھا۔

"وہ سامنے..." حامد نے انگلی سے جوتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں یار! ہیں تو... میرے خیال میں یہ اُسی گھسیارے کے ہیں۔ اُسی نے چھپا رکھے ہیں۔ گھاس جمع کر لینے کے بعد گھر جاتے وقت انھیں پہنے گا۔" شفیق نے جوتوں کو دیکھ کر کہا۔

"اچھا تو پھر کروں مذاق... کیا رائے ہے تمھاری؟" حامد نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے...؟ شفیق نے دریافت کیا۔

"جوتوں کو گھسیارے کی نظر بچا کر کسی دوسری جگہ چھپا دیں اور ہم لوگ یہاں سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھیں۔ جب وہ آکر تلاش کرے گا اور جوتوں کو نہ پا کر پریشان ہو گا تو مزا آئے گا۔"

لیکن شفیق کو اپنے دوست حامد کی یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے کہا۔

"نہیں کسی کو خواہ مخواہ پریشان کرنا اچھا نہیں۔ لیکن اگر تم مذاق ہی کرنا چاہتے ہو تو ایسا مذاق کرو، جس سے اُس غریب کا کچھ بھلا بھی ہو جائے۔"

"وہ کیا...؟ حامد نے پوچھا۔

"تمھارے پاس جو دو روپے ہیں، انھیں اس کے دونوں جوتوں میں ایک ایک رکھ دو، پھر دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتا ہے۔" شفیق نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ تم بھی کیا کہہ گئے۔"

یہ کہہ کر حامد چپکے سے اٹھا اور گھسیارے



کی طرف دیکھتا رہا کہ کہیں وہ دیکھ تو نہیں رہا۔ جوتوں کے پاس جا کر اس نے دونوں جوتوں میں ایک ایک روپیہ رکھ دیا۔ پھر وہ اور شفیق اپنی جگہ سے اٹھے اور تھوڑی دور پر ایک جھاڑی کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد گھسیارا اٹھا اور اپنی چھیلی ہوئی گھاس کا گٹھا بنا کر جوتے پہننے کے لئے وہاں آیا۔ اُس نے جوتوں کو اٹھایا تو دونوں میں اُسے دو چمکتے ہوئے روپے نظر آئے۔ وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا بھالا، لیکن اُسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ حامد اور شفیق جھاڑی میں چھپے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔

پہلے تو وہ روپیوں کو اُٹھاتے ہچکچایا۔ لیکن پھر اُس نے کچھ سوچا اور اُٹھا کر اپنے کُرتے کی جیب میں رکھ لیا۔

ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد گھسیارا گھاس کا گٹھا اُٹھا کر شہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ جب وہ کچھ دور نکل گیا تو شفیق نے کہا: "دیکھو دوست! ہمارا یہ مذاق بھی کتنا اچھا مذاق رہا۔ آج گھسیارا ہی نہیں، اُس کے بیوی بچے بھی کتنے خوش ہوں گے۔ شاید اُس نے کبھی ایک دن میں گھاس بیچ کر دو روپے نہ پائے ہوں گے۔"

پھر وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ شہر کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی کے باہر اُس گھسیارے کا ایک چھوٹا سا، کھپریل اور مٹی کا مکان تھا۔ وہ اپنے دروازے پر

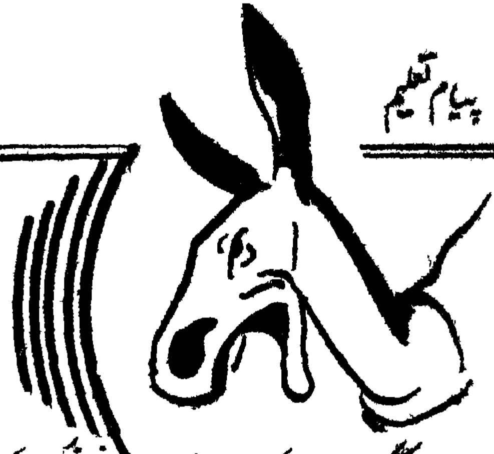
([illegible] دیکھئے)

اُس دن...؟

ایس، ایم، ماجد۔ رام پور

اُس دن میری آنکھ اندھیرے ہی سے کھل گئی اور میں نے نہانے کی تیاری شروع کی۔ نہانے کے بعد بھی جب صبح نہیں ہوئی تو میں نے گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ اُفوہ! ابھی تو چار ہی بجے تھے۔ دن نکلنے کا انتظار میں نے بالکل اس طرح کیا جیسے کوئی امتحان کے نتیجہ کا انتظار کرتا ہے۔ آج ہماری "بچوں کی برادری" میں سنٹرل کمیٹی "بچوں کی برادری" دہلی کے آرگنائزر ستیش کمار صاحب دہلی سے تشریف لا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے دس بجے اور دس بجتے ہی میں نے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ راستہ میں سکریٹری افسر علی صاحب بھی مل گئے۔ ٹھیک ۱۱ بجے طوفان میل سے ستیش صاحب تشریف لائے۔ ہم نے ان سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ۱۲ بجے ستیش صاحب، میں، سکریٹری اور مغان اللہ نگراں دفتر پہونچے۔ وہاں ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ پہلی بات میں نے اطہر بھائی صاحب اور پیام تعلیم کے سالنامہ کے بارے میں پوچھی۔ افسر صاحب نے ستیش صاحب سے کہا کہ اب آپ مہینہ بھر رکیں گے۔۔ ستیش صاحب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "جی ہاں ۳۱ اگست کو آیا ہوں۔ یکم ستمبر کو جاؤں گا۔ ہو گیا نہ مہینہ" اس بات پر ایک قہقہہ پڑا جس میں ستیش صاحب کی مسکراہٹ بھی شامل تھی۔ شام کو ۴½ بجے میں قلعہ پہونچا جہاں کہ ہماری آج کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ ستیش صاحب معہ نگراں اور سکریٹری کے وہیں موجود تھے۔ میٹنگ کلکٹر صاحب رام پور کی صدارت میں ہوئی جس میں کڑامی صاحب، ستیش صاحب، کلکٹر صاحب اور مشتاق صاحب نے بڑی اچھی اچھی تقریریں کیں۔ ۸ بجے ستیش صاحب کو رام پور اسٹیڈیم دکھایا گیا اور اس کے بعد وہ واپس اپنی قیام گاہ پر آ گئے یہاں میں نے ان کو ایک رام پور کی مشہور چیز کھلائی اور اسکے بعد لا کر "خدا حافظ" کہا۔



لطیفے

کلکتہ میں ایک صاحب نے ٹیکسی کے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے جمشید پور لے چلو۔۔ چنانچہ ڈرائیور نے جمشید پور پہنچ کر ٹیکسی کو ایک ہوٹل کے سامنے روکا۔ جب اترے تو ریڈیو سے آواز آئی کہ "یہ دلّی ہے"۔۔۔ یہ سننا تھا کہ صاحب آگ بگولا ہو گئے اور ڈرائیور پر برس پڑے "ہم نے تم سے کہا تھا کہ جمشید پور لے چلو اور تم لے آئے دلّی، اب بتاؤ کیا ہوگا۔

جسپال سنگھ بھاٹیہ۔ ٹاٹانگر

ایک دوست۔ اگر میں خط پر لکھ دوں کہ یہ خط دنیا کے سب سے بڑے بیوقوف کو ملے اور پیچھے صرف اپنا ہی پتہ لکھ دوں تو یہ خط کس کو ملے گا۔

دوسرا دوست۔ یقیناً آپ کو۔۔۔

اسد اللہ بیگ۔ ہندوپور

احمد۔ اگر میں تم کو قتل کر دوں تو تم کیا کرو گے۔

رشید۔ چونکہ تم میرے دوست ہو اس لئے پہلی دفعہ تو معاف ہی کر دوں گا۔ مگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔

مالک۔ (نوکر سے) جا میری دوا کی شیشی اٹھا لا۔۔

ملازم۔ لیجئے حضور۔

مالک۔ (پینے کے بعد) مگر یہ تو روشنائی تھی نالائق، اب بتا کیا کروں۔

ملازم۔ لیجئے سوختہ کاغذ (بلاٹنگ پیپر) کھا لیجئے انشاءاللہ سب سیاہی خشک کر دے گا۔

گردیال سنگھ بھاٹیا۔ جگسلائی

سلیم۔ ارے بھائی تمہارے مکان میں تو آگ لگ رہی ہے۔

مجد ۔ مجھے خوب معلوم ہے۔
سلیم ۔ تو پھر خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔
مجید ۔ خاموش کہاں بیٹھا ہوں۔ بارش کے لئے دعا مانگ رہا ہوں۔

خیرالنساء بیگم ۔ ایلینر

معید ۔ حمید! تم نے امریکہ دیکھا ہے۔
حمید ۔ جی ہاں
معید ۔ کہاں ہے
حمید ۔ نقشے پر۔

فاطمہ بیگم۔ ایلینر

پہلا دوست۔ جب میں نے کارخانہ جاری کیا تو میرے پاس کچھ بھی نہ تھا صرف دماغ تھا۔
دوسرا دوست۔ مگر اتنے چھوٹے سے دماغ میں اتنا بڑا کارخانہ کیسے سما گیا۔

سید یوسف اختر زکی۔ کوروائی۔

پہنچ کر رک گیا اور سر سے گھاس کا گٹھر اتار کر اُس نے نیچے رکھ دیا۔ اتنے میں حامد اور شفیق تیزی سے چلتے ہوئے گھیارے کے مکان کے قریب ایک ایسی جگہ آکر کھڑے ہو گئے۔ جہاں سے وہ دونوں اسے اور اس کی بیوی کو دیکھ سکتے تھے۔

گھیارے کی بیوی جو دروازے ہی پر بیٹھی، شاید اُسی کا انتظار کر رہی تھی اپنے شوہر کو خوش دیکھ کر بولی "آج بہت خوش دکھائی دیتے ہو، کیا بات ہے۔۔؟" گھیارا پہلے تو خوب ہنسا اور پھر اس نے اپنی جیب سے دونوں روپئے نکال کر بیوی کی ہتھیلی پر رکھ دئے۔ اس کی بیوی نے روپیوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس کے بچے بھی کہیں سے کھیلتے ہوئے آئے اور ان کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ حامد اور شفیق اس غریب خاندان کی خوشی سے خوش ہوتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں حامد نے کہا: "دوست! میں تمھارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اتنا اچھا مذاق کرنا سکھا دیا!"

اختر جاروی



دوسری دنیا کا مسافر

ایک دفعہ کی بات ہے کہ ایک عورت درخت کے سایہ میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ اور تھوڑی دور اس کا کسان شوہر ندی میں گھوڑے کو نہلا رہا تھا۔

اتفاقاً ایک آدمی ادھر سے گزرا پوچھا" آپ کہاں سے آرہے ہیں ؟

وہ آدمی در اصل چور تھا۔ فوراً کچھ سوچ کر بولا" دوسری دنیا سے"

وہ عورت جتنی بڑی تھی اتنی عقل مند نہیں تھی۔ اس نے "اس آدمی کے جواب پر کوئی غور نہ کیا اور بڑی اشتیاق بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر بولی" واہ ! میں کیسی خوش قسمت ہوں۔ کیا تم میرے شمیم کو جانتے ہو؟"

وہ شخص بولا" اچھی طرح۔ صرف ایک چیز کی اسے سخت تکلیف ہے۔ وہ یہ کہ اس کی خواہش کے مطابق وہاں اسے دودھ نہیں ملتا"!

عورت اپنے لڑکے کی موجودہ تکلیف کو سن کر بہت گھبرائی اور دل ہی دل میں پریشان ہونے لگی۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ رہی

ی کہ یہ آدمی نہیں دیوتا ہے۔ وہ ضرور اس
مدد کرے گا۔ اس لئے وہ نہایت سنجیدگی
کے ساتھ کہنے لگی "کیا آپ اس وقت میرا
یہ کام کر سکتے ہیں۔ اس تھیلے کو دوسری
دنیا میں میرے لڑکے کے پاس پہنچا دیں،
بڑی مہربانی ہوگی"۔

اس عورت کی بیوقوفی پر وہ شخص دل
ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ وہ چور تو تھا
ہی۔ اتنی آسانی سے آتے ہوئے ایک تھیلی روپے
کو وہ کیوں چھوڑ دیتا۔ بہت خوشی سے اس
نے تھیلے کو لیا اور فوراً قدم بڑھاتا اس عورت
کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اِدھر وہ عورت
بہت خوش تھی کیوں کہ اب اس کا لڑکا دوسری
دنیا میں آرام سے رہے گا۔ اسے اب خواہش
کے مطابق دودھ مل جایا کرے گا

اب اس عورت کا شوہر اپنا کام ختم
کر چکا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کے ساتھ درخت
کے پاس آیا جس کے تھوتھنے سے پانی ٹپک رہا
تھا۔ عورت نے فوراً ہی یہ عجیب خبر اپنے
شوہر کو سنائی۔ یہ سن کر اس کا شوہر بہت
پریشان ہوا۔ اس عورت کی بیوقوفی پر وہ بہت
شرمندہ ہوا۔ اپنی عورت کو کچھ کہے بغیر گھوڑے
کی پیٹھ پر ایک چھلانگ مار بیٹھ گیا اور چور
کے پیچھے ہو لیا۔

کسان نے بڑی سرگرمی سے اس
بدمعاش کا پیچھا کیا۔ مگر جیسے ہی اس نے
گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سنی وہ سمجھ گیا کہ
اس کی چوری کا پتہ لگ گیا۔ وہ چھپنے کی
جگہ تلاش کرنے لگا اور خوش قسمتی سے اس
نے اونچی پہاڑی کے نیچے آٹے کی چکی دیکھی
وہ بلا کچھ سوچے سمجھے چکی والے کے پاس گیا
اور چلّا اٹھا "بھاگو دوستو! ایک بدمعاش
سوار اس طرف کو آرہا ہے وہ تم لوگوں
کو قتل کر ڈالے گا۔ چکی والے نے اس کی
بات پر یقین کر لیا۔

اِدھر اُس شخص نے چکی والے کی ٹوپی
پہن لی۔ جلدی جلدی اس نے اپنے کپڑوں
پر آٹا ملا اور پھاٹک پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے
لمحہ کسان اس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا
کہ کیا اس نے کسی چور کو اِدھر سے بھاگتے
دیکھا ہے۔

اونچی پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے



تھیلی کا نام سن کر چ
والے کے ہوش و حواس
گئے، وہ اتنا گھبرایا کہ اس کے
چور ہونے میں اس سوار کو شک
ہو گیا۔ دونوں میں کچھ دیر تک
بحث ہوتی رہی۔ آخر کار ان
لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ دونوں
بے وقوف بنائے گئے ہیں۔ وہ
دونوں پہاڑ سے اترے لیکن بڑی
مایوسی ہوئی جب کہ بدمعاش کا
کہیں پتہ نہ لگا۔ کسان ہاتھ مل
کر رہ گیا۔

اور جب وہ کسان اپنی بیوی کے
پاس واپس آیا تو اس کی بیوی اس کو
پیدل لوٹتے دیکھ کر گھبرائی۔ اور پوچھنے
لگی" تمہارا گھوڑا کہاں ہے؟
اور اس پر اس نے کہا" جہاں تمہارا
تھیلی وہیں گھوڑا بھی ہے" میں تمہارے لڑکے کا
پیدل چلنے کا خیال برداشت نہ کر سکا اس
لئے میں نے اس دنیا کے آدمی کو گھوڑا اس لئے دے
دیا ہے کہ وہ تمہارے لڑکے کو دیدے"

بدمعاش نے کہا" اُدھر ابھی کوئی بھاگ رہا ہے"
کسان گھوڑے سے اتر گیا۔ گھوڑا
بہت تھک گیا تھا اس لئے اس نے بدمعاش
کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام دے دی اور وہ خود ہاتھ
میں تلوار لے کر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ آخر کار
اس نے چکی والے کو پکڑا۔ بے چارہ ڈر کے
مارے پیلا پڑ گیا اور اس کے پیروں پر گر
پڑا۔ کسان کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا
وہ چلایا۔ "کمینے. میری تھیلی لا ورنہ مرنے کے
لئے تیار ہو جا"

دنیا کی آب و ہوا بدل رہی ہے

محمد امین ایم، اے (علیگ)

۱۹۳۰ء سے پہلے بعض سائنس داں یہ سمجھتے تھے کہ دھرتی کی آب و ہوا بدل کر یک دم سرد ہو جائے گی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے دوران میں اس کے متعلق کافی چھان بین کی گئی اور دس سال کے تجربے اور تحقیقات کے بعد سائنس دانوں نے اپنی رائے بدل دی۔ سب سے پہلے امریکہ کے فضائی محکمہ میں کام کرنے والے مشہور سائنس داں ڈاکٹر آئیون۔ آر۔ تینیس ہل نے اپنی رائے دنیا کے سامنے پیش کی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ دھرتی کی آب و ہوا گرم اور خشک ہوتی جا رہی ہے۔

سن ٹنائی نام کی ایک یونی ورسٹی امریکہ میں بہت مشہور ہے۔ اس کے ایک سائنس داں ڈاکٹر کلیرنس مل نے سوچ بچار کے بعد چند اہم باتیں بتائی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا کی آب و ہوا یقیناً گرم ہو رہی ہے اور اس کے اثرات بہت دور دور تک نمایاں ہوں گے۔ بعض تبدیلیاں خوشگوار ہوں گی تو کچھ ایسی بھی ہوں گی جن سے تکلیف [illegible]

آئیے پہلے ہم اس بات پر غور کریں کہ آب و ہوا گرم ہو جانے کے بعد کیا فائدے پہنچیں گے۔

گرین لینڈ کا جزیرہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ یہ شمالی امریکہ کے اتری پوربی سرے پر واقع ہے۔ پہلے اس کی آب و ہوا بہت سرد تھی اور وہاں کچھ نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے اب گرم ہو رہی ہے اور وہاں بھیڑیں پالی جانے لگی ہیں۔

گرین لینڈ میں گرم حصوں سے اڑ اڑ کر نئی چڑیاں بھی آنے لگیں ہیں۔ ان میں پچیس قسم کی چڑیاں بہت نمایاں ہیں۔ ڈن مارک کے باشندے گرین لینڈ جا کر جب ان چڑیوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور شکار کھیلنے کے لئے ان کا جی تڑپ اٹھتا ہے۔

آئس لینڈ ایک دوسرا جزیرہ ہے جو گرین لینڈ کے پاس ہی جنوبی مشرقی حصے کی طرف ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بھی سرد ہے۔ لیکن دنیا کی آب و ہوا کے ساتھ ساتھ یہاں بھی گرمی بڑھ رہی ہے۔ یہاں بھی جنوبی حصوں سے چھ قسم کی نئی نئی چڑیاں پہنچ رہی ہیں۔ باشندے اس بات سے بہت خوش نظر آتے ہیں کہ ان کی قسمت کے دن جاگ اٹھے ہیں اور اب بہت جلد وہ لوگ جو اور گیہوں کی کاشت شروع کر دیں گے۔

ناروے تو آپ جانتے ہیں، یورپ کا سب سے شمالی حصہ اسی کی سر زمین میں شامل ہے۔ یہاں بھی خاصی سردی پڑتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی یہاں پہنچ جائے تو وہاں کی کڑکڑاتی سردی سے پریشان ہو جائے گا۔

اسکیمو کہاں کا باشندہ ہے؟ ٹنڈرا کا۔ یہاں بھی غضب کی سردی پڑتی ہے اور اگر آپ وہاں سیر و تفریح کے لئے جائیں تو ظاہر ہے آپ کو اپنا گھر ضرور یاد آئے گا۔ گھر یاد آتے ہی ہو سکتا ہے آپ کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ سردی یہاں ایسی بلا کی پڑتی ہے کہ آنسو نکلتے ہی وہ جم جائے گا۔ پھر کیا ہے رونا دھونا

چھوڑ کر آپ خود برف سے کھیلنے میں لگ جاتیں گے۔ اسکیمو گرمیوں میں بارہ سنگھے کا شکار کھیلتا ہے۔ وھیل مچھلی پکڑتا ہے اور انہیں سے اپنی غذا اور کپڑا مہیا کرتا ہے۔ وھیل مچھلی کھاتے کھاتے اسکیمو بھی تنگ آگیا تھا۔ اس نے پچھلی بار گرمی کے موسم میں ایک نئی مچھلی پکڑی۔ کھانے میں یہ مچھلی وھیل سے کہیں زیادہ لذیذ اور بہتر ثابت ہوئی۔ اس مچھلی کا نام کاڈ ہے اور پہلے ٹنڈرا کے خطہ میں اس مچھلی کا کہیں دور دور سے پتہ نہیں تھا۔ اب بحر منجمد شمالی میں یہ مچھلی عام طور سے نظر آتی ہے اور اسکیمو اس کا شکار نہایت شوق اور نئے جوش و خروش کے ساتھ کرتے ہیں۔

اب ذرا روس کی طرف آئیے۔ رقبہ کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے لیکن شمال میں مغرب سے مشرق کی طرف ایک بہت بڑا علاقہ برف کے تہہ خانے میں بند رہتا ہے۔ برف کی موٹی موٹی سلیں ان کے دانت کھٹے کر دیتی تھیں۔ اب وہاں قدرت فیاضی پر آمادہ ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بھی گرم ہو رہی ہے۔ سال بہ سال یہاں برف جمی رہتی تھی اب وہاں سیکڑوں گز نئی زمین اور اس کی مٹی خود بخود نکلتی آرہی ہے۔ روسی باشندے قدرت کی اس فیاضی پر حیران ہیں۔ ان کی زراعت کا خط بڑھ رہا ہے اور آج ٹنڈرا کے میدان میں بھی گیہوں کا ایک نیا بیج بویا جاتا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ اس کی کاشت کی جاتی ہے۔

فن لینڈ جس کا مشہور شہر ہلسنکی ہے۔ یہاں حال ہی میں بین الاقوامی او اولمپک ہوئی تھی۔ یہ بحرۂ بالٹک کے کنارے ہے۔ سردی زیادہ پڑنے کی وجہ سے بحیرۂ بالٹک کی ساری بندرگاہیں برف سے جمی رہتی ہیں۔ لیکن اب پہلے کے مقابلہ میں ہر سال کئی ہفتے دیر تک جہاز رانی ہوتی ہے۔ روس کا بہت پرانا خواب پورا ہو جائے گا اور بہت جلد اس کے ساحل کی بندرگاہیں ... بھر کھلی

رہیں گی۔

آیئے اب ذرا نئی دنیا کی طرف چلیں۔ امریکہ میں کناڈا ایک مشہور ملک ہے۔ یہ شمال کی جانب ہے اور روس کی طرح ایک بڑا ملک ہے۔ گیہوں یہاں کی خاص پیداوار ہے اور سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے پہلے اس کی کاشت صرف جنوبی مغربی حصہ میں کی جاتی تھی لیکن وہاں کے کسانوں نے تجربے کی بنا پر یہ محسوس کیا کہ شمالی حصہ کی طرف وہ کاشت کا علاقہ بڑھا سکتے ہیں۔ پھر کیا تھا دیکھتے دیکھتے چند سالوں میں سیکڑوں میل شمال کی طرف بھی گیہوں بڑے پیمانے پر پیدا ہونے لگا۔ وہاں کی حکومت کے پاس ہر سال لاکھوں ٹن گیہوں بچتا ہے۔ اب کپاس کی بھی کاشت ہو رہی ہے۔ پہلے آب و ہوا موافق نہیں تھی اور کپاس ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی تھی لیکن آب و ہوا گرم ہونے کی وجہ سے صوبہ اونٹ ریو کے جنوبی حصہ میں کپاس کی کاشت کامیابی کے ساتھ شروع کی جا چکی ہے۔

سائنس دانوں کی پیشین گوئی ہے کہ جیسے جیسے آب و ہوا گرم ہو گی قطب شمالی کے ارد گرد کے ممالک ترقی کریں گے۔ زمین کے اندر سے نئی نئی قیمتی معدنیات جیسے یورنیم، سونا نکالی جائیں گی اور دن بدن ان میں خوش حالی بڑھتی جائے گی۔ پچھلی بار جب کہ دنیا کی آب و ہوا گرم ہوئی تھی وہ ۱۰۰۰ء کا زمانہ تھا۔ انہیں تاریخوں میں ڈن مارک نے نمایاں ترقی کی تھی وہاں کے باشندے جو وائکنگ کہلاتے تھے دور دور تک پھیل گئے تھے اور انگلستان، فرانس میں حکومت کرتے تھے۔ روس اور سسلی میں بھی ان لوگوں نے اپنی اپنی ریاستیں قائم کر کے اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔

ڈن مارک کی برتری اور ترقی کے دو وجوہات تھے۔ پہلی بات یہ کہ آب و ہوا گرم ہونے کی وجہ سے ان کے دیش کی مٹی اور ان کی نو آبادیات گرین لینڈ اور آئس لینڈ کی بھی مٹی بہت زرخیز ہو گئی تھی۔ مٹی زرخیز ہونے سے کاشت بڑے پیمانہ پر ہوتی تھی اور وہاں کے لوگ بہت خوش حال

ہو گئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ آب و ہوا موافق ہونے کی وجہ سے ڈن مارک کے باشندوں میں سیاحت اور تحقیق کا نیا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

ڈن مارک میں فضا کی سائنس کے ماہرین اعداد و شمار سے ثابت کرتے ہیں کہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان شمالی سرد خط درجہ حرارت دو ڈگری بڑھ گیا ہے۔ گرین لینڈ میں ۴ ڈگری اور اسپٹس برجن (روس کا شمالی جزیرہ) میں چار ڈگری کے قریب بڑھ گیا ہے۔

قدرت کے خود برفیلے تھرما میٹر یعنی گلیشیر کا مطالعہ کرنے سے بھی درجہ حرارت کی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارا آخری برفیلا دور (Great Ice Age) دھرتی پر ۲۵ ہزار سال پہلے آیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اندازہ ہے کہ زمین کی آدھی برف پگھل چکی ہے۔ ہر سرد حصہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ گرمی بڑھنے کی وجہ سے گلیشیر پیچھے کی طرف کھسک رہے ہیں اور ان کی رفتار دن بدن تیز ہو رہی ہے۔ اکثر گلیشیر کے نیچے ایسی زمین ڈھکی رہتی ہے جو برف کے پگھل جانے کے بعد زراعت کے لئے اچھی طرح استعمال کی جا سکتی ہے اور کھانے پینے کی بے شمار اشیا اگائی جا سکتی ہیں۔

اس کے برخلاف جب گلیشیر پگھلتے ہیں تو ان کا پانی بہہ بہہ کر سمندر میں ملتا جاتا ہے اور اس طرح سمندر میں پانی کی سطح کی اونچائی بڑھتی جاتی ہے گویا ہر سال سمندر کا پانی ایک ایک انچ اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر زمین کے اوپر کے گلیشیر کی برف ۴۰,۰۰,۰۰۰ کیوبک میل کی وسعت میں پگھل جائے تو اندازہ ہے کہ سمندر کی سطح ۱۶۵ فٹ اونچی ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہالینڈ، انگلستان، امریکہ، تمام سمندروں کے ساحل کے ممالک شہروں اور بندرگاہوں کو ہمیں آخری سلام کہنا ہو گا اور ان کی دولت اور ساری عماروں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر ہمیں صبر و تحمل کا نیا سبق سیکھنا ہو گا۔ اگر سمندر کا پانی اونچا ہو گیا تو بندرگاہ اور ساحل کے بے شمار شہروں کو بچانے کے لئے ہماری

کوئی تدبیر نہیں کام دے گی اور نہ ہی بڑے بڑے بند کام دیں گے۔ البتہ دور جدید کی انسانی نسل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ابھی فوراً یہ مسئلہ درپیش نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایسا ہوتے ہوتے صدیاں گذر جائیں گی۔

ڈاکٹر ملس کا کہنا ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلی سے معتدل خط میں سب سے زیادہ خراب نتیجہ بر آمد ہوگا وہ یہ کہ وہاں کے باشندوں کی ذہنی اور جسمانی طاقت گھٹ جائے گی۔ جوں جوں گرمی میں اضافہ ہوتا ہے انسان اور جانور دونوں کے قد چھوٹے ہونے لگتے ہیں۔ جانوروں پر تجربہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہر جاندار کے لئے نئے خطرے پیدا ہو رہے ہیں۔

آب و ہوا گرم ہونے کے ساتھ ساتھ شمالی معتدل علاقے قطعی طور سے خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ استوائی علاقوں میں بھی بعض آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ افریقی جھیلیں خشک ہو رہی ہیں اور کلی من جارو پہاڑ کی برف آہستہ آہستہ پہاڑ کی ہر سمت سے پیچھے کی طرف کھسک رہے ہیں۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان بارش کی مقدار بھی گھٹ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ شمالی نصف کرہ میں ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔

آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھے گا۔ کہ آخر دنیا کی آب و ہوا گرم کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے تو لیجئے بہت سے سائنس دانوں کی رائے سن لیجئے۔

انگلستان کے فضائی ماہرین کا کہنا ہے کہ گرمی بڑھنے کی وجہ غالباً فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کا اضافہ ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ کیا بلا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک قسم کا خراب گیس ہے جسے ہم اپنی ہر سانس کے ساتھ باہر نکالتے ہیں۔ تو یہ کاربن ڈائی آکسائڈ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے؟ انسان کی بنائی ہوئی بھٹیاں، انجن موٹر اور کارخانے جن میں روزانہ کوئلہ اور تیل جلتا رہتا ہے وہ کاربن ڈائی آکسائڈ

پیدا کرتے رہتے ہیں۔ قدرتی نباتات جیسے جنگلات، گھاس کے میدان بہت کافی کاٹ کاٹ کر گرائے جا چکے ہیں اور ضائع کئے جا چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب دنیا میں پودے، درخت نسبتاً پہلے کے مقابلہ میں بہت کم ہو گئے ہیں اور انسان کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ پودے اور درخت انسان کی نکالی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ سب نہیں ہضم کر پاتے اور اس لئے فضا میں اس کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ چونکہ ہر گیارہویں سال سورج ہمارے کے جسم میں لرزہ پڑتا ہے اس لئے اس کے اثر سے آب و ہوا بدل جاتی ہے۔ سائنس داں اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ جب لرزہ کی تعداد کم ہوتی ہے تو ہماری آب و ہوا گرم ہونے لگتی ہے اور اس کے بر خلاف جب لرزہ کی تعداد بڑھتی ہے تو تھرما میٹر کا پارہ اترنے لگتا ہے۔

دھرتی پر پہلے بھی کئی بار آب و ہوا بدل چکی ہے۔ اس کی تاریخ میں بہت اختلافات اور تضاد ملتے ہیں لیکن موجودہ دور میں بہر حال یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ گرمی بڑھ رہی ہے۔ نئے نئے امکانات اور نئے نئے خطرے پیدا ہو رہے ہیں۔ شمالی جنوبی نصف کروں والے ممالک کا مستقبل شاندار ہے۔ نئے نئے میدان کھیتی باڑی کے لئے صاف ہو رہے ہیں۔ نئی نئی معدنیات زمین کے اندر سے نکلنے والی ہیں۔ نیا ملک روئے زمین پر ابھرنے کا امکان ہے اسی کے ساتھ ساتھ سائنس دانوں کو یہ ڈر ہے کہ آب و ہوا کی اس تبدیلی سے گرم خط کھسک کر کناڈا کی سرحد یا اس کے عرض البلد کے سیدھ میں نہ کہیں آ جائے پھر تو بھیا سارے سنسار کی کایا پلٹ ہو جائے گی اور نہ جانے کیا ہو گا۔

کارٹون



اب بھی نہیں چلتا، اب تو سارا بوجھ اپنے اوپر رکھ لیا ہے

شمیم ہزاروی

یوگوسلاویہ کے بچے

آیئے آج ہم ان بچوں کی کہانی سنائیں۔ جو بڑے خوب صورت اور محنتی ہوتے ہیں۔ ان کو دور سے دیکھ کر آپ یہ سوچنے لگیں گے کہ یہ بچے ہیں یا چینی کے بنے ہوئے خوبصورت کھلونے۔۔۔۔ دیکھئے اس تندرست بچے کو۔۔۔۔

غور سے دیکھئے یہ چینی کی گڑیا نہیں۔

سفید رنگ، گول مٹول چہرہ، چمکتے ہوئے دانت، سرخ سرخ گال اور گٹھا ہوا جسم، جانتے ہیں آپ یہ بچہ کس جگہ کا رہنے والا ہے "یوگوسلاویہ" کا۔۔۔۔

یوگوسلاویہ یورپ کا ایک خوشنما ملک ہے، یہاں صاف ستھرے، خوب صورت اور محنتی لوگ رہتے ہیں، نکھٹو، نکمے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یوگوسلاویہ کے بچے ہنس مکھ ہوتے ہیں، یہ بچے ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ صبح کے وقت نہا دھو کر ناشتہ کرتے ہیں، صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسکول جاتے ہیں، پڑھائی کے وقت پوری توجہ سے پڑھتے ہیں اور چھٹی کے بعد ایک گھنٹہ تک انہیں ورزش کرائی جاتی ہے۔ ورزش کے بعد دودھ اور شہد دیا جاتا ہے یہ ایسے ایسے ورزشی کھیل کھیلتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ان کے جسم میں ہڈی ہے ہی نہیں۔ کھیلتے وقت جسم کو کچھ اس طرح سے جنبش دیتے ہیں کہ ان پر ربڑ کی گڑیا ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

پڑھائی اور کھیل سے فارغ ہو کر یہ بازاروں میں سودا سلف بیچتے ہیں۔ یہ دودھ بیچتے ہوں یا پیٹھ پر سبزیوں کے گٹھے باندھتے ہوں، بغل میں کتابوں کا

تھیلہ ضرور لٹکائے پھرتے ہیں جب دودھ، سبزی اور دوسری چیزوں کو بیچ کر فارغ ہو جاتے ہیں تو پھر کسی پارک میں بیٹھ کر سستا لیتے ہیں۔ کام دھندا کرنے والی عورتیں جب گھروں سے نکلتی ہیں، تو اپنے بچوں کو سرکاری پرورش گاہوں میں چھوڑ جاتی ہیں، جہاں بچوں کی دیکھ بھال کا بندوبست نرسوں کے ذمہ ہوتا ہے، یہ نرسیں دن بھر ان کی نگہداشت کرتی ہیں، خوراک دیتی ہیں پھر انہیں خوبصورت جھولوں میں سلا دیتی ہیں کام دھندے سے فارغ ہو کر جب عورتیں واپس لوٹتی ہیں تو اپنے اپنے بچوں کو لے جاتی ہیں۔

آپ جانتے ہیں یوگوسلاویہ کے بچوں کا لباس کیا ہوتا ہے؟

کمر میں نیکر، گلے میں جالی دار بنیائن کی طرح بنی ہوئی قمیض یا بُشرٹ .... اور سر پہ گول سی ٹوپی ....

لڑکیوں کا لباس، ذرا مختلف ہے۔ کمر تک غرارہ، گلے میں گون، اور سر پہ گھنگھریالے بال۔

بقیہ ص۳۳ سے جن پیامیوں کی کہانیاں خاص طور سے پسند آئیں ان کے نام یہ ہیں: "بن پیسے کی تجارت"، "بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے"۔ اور "لڑکیوں کے کارنامے"

بڑوں کی کہانیوں میں "بے گھڑی کا دن" قابل تعریف ہے اور نظموں میں اخگر مشتاق کی نظم "کھلونے" لاجواب ہے۔ رسالہ کی ظاہری خوبیوں میں "پیام تعلیم" کے سرورق نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

غرض کہ اتنا اچھا سالنامہ نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ رہا میری کہانی کا وہ آپ کی اور ناظرین کی پسند کا معاملہ ہے۔ اس میں میں کیا کر سکتا ہوں البتہ اپنی پسند کا اظہار میں نے کر دیا ہے۔

فقط والسلام   سید منیر الحسن۔ دہلی

محترم   السلام علیکم

سالنامہ مل گیا اور اس کے بعد کارڈ ملا۔ شکریہ۔ سالنامہ خوب ہے۔ آپکی محنت قابل تعریف ہے کہانیاں بچوں کے قلم سے بھی خوب ہیں اور سلیقہ سے لکھی گئی ہیں۔ نظمیں البتہ کم رہیں۔

راشد حسن قادری۔ آگرہ

سالنامہ ملا

اطہر صاحب، تسلیم

"سالنامہ" تو بہت ہی خوبصورت رہا بچوں کی دلچسپی اور ان کی اصلاح کے لئے اس میں کیا کچھ نہیں ہے۔ جملہ مضامین نظم و نثر بے حد پر لطف اور مفید ہیں۔ انعامی مقابلے کی کہانیوں نے اس نمبر میں واقعی ایک خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ اکثر تصاویر بھی اپنی جگہ پر بڑی ہی جاذب نظر ہیں خصوصاً یہ "تصویر" "آما چھوڑو بھی کیا روتے ہو" تو اس قدر لاجواب ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ کارٹون بھی بڑے مزیدار ہیں اور سر ورق بھی پہلے سے بہتر غرض ہر حیثیت سے "سالنامہ" نمایاں طور پر کامیاب ہے۔ جس کے لئے ادارہ "پیام تعلیم" کی بہترین کوششیں اور اس کی خوش مذاقی قابل مبارکباد ہے

انگر مشتاق

محترمی! تسلیم

آخر "پیام تعلیم" کا دل آویز سالنامہ سامنے آ ہی گیا۔ شکریہ۔ اسے دیکھتے ہی انتظار کی ساری کلفتیں بے پناہ مسرت سے بدل گئیں دل باغ باغ ہو گیا واقعی سالنامہ آپ کے اعلان کے مطابق ہر حیثیت سے شان دار ہے اس کامیاب پیشکش پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ا۔ ع۔ انصاری

محبّی پرویز صاحب

"پیام تعلیم" کا سالنامہ ماہ ستمبر ۵۵ء مجھے بہت پسند آیا۔ آپ نے سچ مچ اس کو اچھا بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے ننھے منے اور بڑے پیامیوں سے جو کہانیاں لکھوائیں ہیں۔ وہ بھی بہت خوب ہیں۔ ان کو دیکھ کر آپ کے ساتھ ساتھ پیامیوں کی بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پیامیوں کی کہانیوں نے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ یہ آپ کی محنت کا بہت اچھا صلہ ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

بچوں کی کوششیں



بہادر لڑکا

کل خالد کا تاریخ کا پرچہ تھا۔ اور وہ تاریخ یاد کر رہا تھا۔ جب کلاک نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجائے تو اس نے کتاب بند کر کے سرہانے میز پر رکھ دی۔ اور سونے کی تیاری کرنے لگا اس کے ابا جان شہر کے راشننگ آفیسر تھے۔ وہ اپنے دورہ کے سلسلے میں کہیں گئے ہوئے تھے۔ جب وہ روشنی بجھا کر کرسی سے اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے والد کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ خالد چپکے سے کمرے کے پاس آیا۔ اور دیکھا کہ کمرہ تو اندر سے بند ہے لیکن کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ خالد آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس آیا اور اسنے چپکے سے اندر جھانکا۔ اندر کا سین دیکھ کر اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کمرے کے اندر ایک چور تھا۔ اس کے باپ کی میز کی دراز کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دراز میں شہر کے ایک مشہور بلیک مارکیٹ کرنے والے سیٹھ لالہ چندو مل کے خلاف فائل رکھی ہوئی تھی۔ اس فائل میں ان کے اس کیس کی مکمل رپورٹ تھی جو کہ پرسوں شہر کے بڑے بازار میں پکڑا گیا تھا۔ خالد کے ذہن میں فوراً یہ

خیال آیا کہ اس سیٹھ چندو مل نے اس آدمی کو لالچ دے کر یہ فائل چرانے کے لئے بھیجا ہے۔

خالد کو جھٹ ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنے آپ سے کہنا شروع کیا۔ "ارے منشی جی لائٹ اور کھڑکی کھلی چھوڑ گئے" یہ کہہ کر کھڑکی سے کود کر اس نے چپکے سے پردوں کے پیچھے ہوتے ہوئے جا کر روشنی بجھا دی کھڑکی بھی بند کر دی۔ اور پھر وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکل کر برآمدہ کی طرف چلا۔ جہاں کہ اس کے گھر کا نوکر سو رہا تھا۔ چور اپنا کام یہ سوچتے ہوئے اطمینان سے کرتا رہا کہ خالد نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ خالد نے جاکر نوکر کو جگایا اور چور کو پکڑوا دیا۔ اس کے ابا جان جب دورے سے واپس آئے تو بہت خوش ہوئے۔

ایس۔ ایم ماجد رام پور۔

پھول کی آپ بیتی

کشمیر کے سر سبز و شاداب جنگلوں میں میرا جنم ہوا۔ مجھے شاخ نے اپنی آغوش میں سو چونچلوں سے پالا۔ میں ٹھنڈی ہوا کے سرد اور لطیف جھونکوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ یکا یک -----------

؎ دل پہ اک ٹھیس لگی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے کیا جانے کیا یاد آیا

بزرگوں کی زبانی سن رکھا تھا کہ انسان پھول کا دشمن ہے۔ وہ ذرا سی فرحت کے لئے پھولوں کو اپنی ماں کی آغوش سے جدا کرتا ہے۔ وہ نہایت بے رحم۔ سنگدل ہوتا ہے ....کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نازک اندام کشمیری لڑکی اٹھلاتی ہوئی میری طرف مجھے اپنی ماں کی آغوش سے جدا کرنے کے لئے اپنے بھائیوں سے الگ کرنے کے لئے بڑھ رہی ہے۔ اس نے مجھے توڑ کر اپنے سیاہ بالوں کی زینت بنا لیا۔

میری خوبصورتی سے متاثر ہو کر۔

اس کے بھائیوں نے میری خوب گت بنائی کچھ دیر بعد اس لڑکی نے مجھے اپنے بالوں میں لگا لیا۔ رات بھر میں اس کے بالوں کی زینت بنا رہا۔ صبح اٹھا تو میری پتیاں منتشر تھیں۔ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ اس کشمیری لڑکی نے مجھے دریچہ سے باہر پھینک دیا۔

اب میں اس کے بالوں کے بجائے راستے پر پڑا تھا کہ اتنے میں کسی موئے سنگدل انسان کا جوتا مجھے روندتا ہوا چلا گیا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ مجھے اپنی پیاری ماں کی، پیاری پیاری آغوش یاد آ رہی تھی۔ ماں کی گود یاد آ رہی تھی۔ کشمیر کے سرسبز جنگلات زعفران کے کھیت۔ چنار و شالیمار باغ کے دوست یاد آ رہے تھے۔ اتنے میں سر پہ ٹوکرا اٹھائے ہوئے کسی آدمی نے مجھے ٹوکرے میں رکھ لیا۔ میری کمر بوجھ سے دبی جا رہی تھی یکایک ٹوکرا ٹیڑھا ہو گیا اور میں ٹوکرے میں سے گر کر۔ گندی نالی میں جا پڑا۔ اور آج بھی وہیں پڑا ہوں یہاں روزانہ گندے پانی سے نہاتا ہوں۔ یہاں نسیم منہ دکھانے نہیں آتی۔ جب کبھی گندے پانی میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ چہرہ اداس اور سوکھا ہوا پاتا ہوں۔ چہرہ پر نہ خوبصورتی ہے نہ رنگت ہے نہ نکھار۔

اب جب کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو جیسے میرے اوپر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

عبدالرحمٰن فقیہ۔ عمر ۱۳ سال۔ ٹھٹھ

عقلمند جج

کسی ملک میں ایک امیر آدمی رہا کرتا تھا۔ اس کے محل میں کام کرنے کے لئے کئی نوکر چاکر تھے اس امیر کو جانوروں کے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ان جانوروں میں آپ اپنے سفید رنگت والے خوبصورت، دراز قد گھوڑے سے محبّت تھی۔

ایک مرتبہ ایک چور نے وہ گھوڑا اڑا لیا۔ جب کہ گھوڑا گھاس چر رہا تھا۔ امیر کے آدمیوں نے اسے دیکھا اور اس کو گرفتار کرنے کے لئے دوڑے۔ اور اسے پکڑ کر جج کے سامنے حاضر کیا۔

عدالت کی کاروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے جج نے امیر سے پوچھا "کیا یہ تمھارا گھوڑا ہے" امیر نے جواب دیا جی ہاں یہ میرا گھوڑا ہے۔ اور یہ چور اسے چرا لے گیا تھا"۔ پھر جج نے چور سے پوچھا "کیا یہ تمھارا گھوڑا نہیں ہے"۔ چور نے جواب دیا "یہ میرا ہی گھوڑا ہے۔ اور یہ امیر مجھ پہ چوری کا جھوٹا الزام لگا رہا ہے"۔

اب جج کے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ مگر جج نے اپنی عقلمندی سے اس گتھی کو سلجھا دیا۔ اس نے گھوڑے کی آنکھوں پر کپڑا ڈال کر گھوڑے کو چور کے سامنے کر دیا۔ اور کہا "کہ بتاؤ اس کی دونوں آنکھوں میں سے سیدھی طرف والی آنکھ اندھی ہے یا بائیں طرف والی۔ چور کو معلوم نہ تھا کہ گھوڑا اندھا ہے یا اس کی کون سی آنکھ خراب ہے۔ پھر بھی اس نے کہا دائیں جانب کی آنکھ اندھی ہے"۔ جج نے گھوڑے کی آنکھوں سے کپڑا ہٹایا۔ اور چور سے کہا کہ یہ تمھارا گھوڑا نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے گھوڑا امیر کے حوالے کیا اور چور کو ایک ماہ قید با مشقت کی سزا دی۔

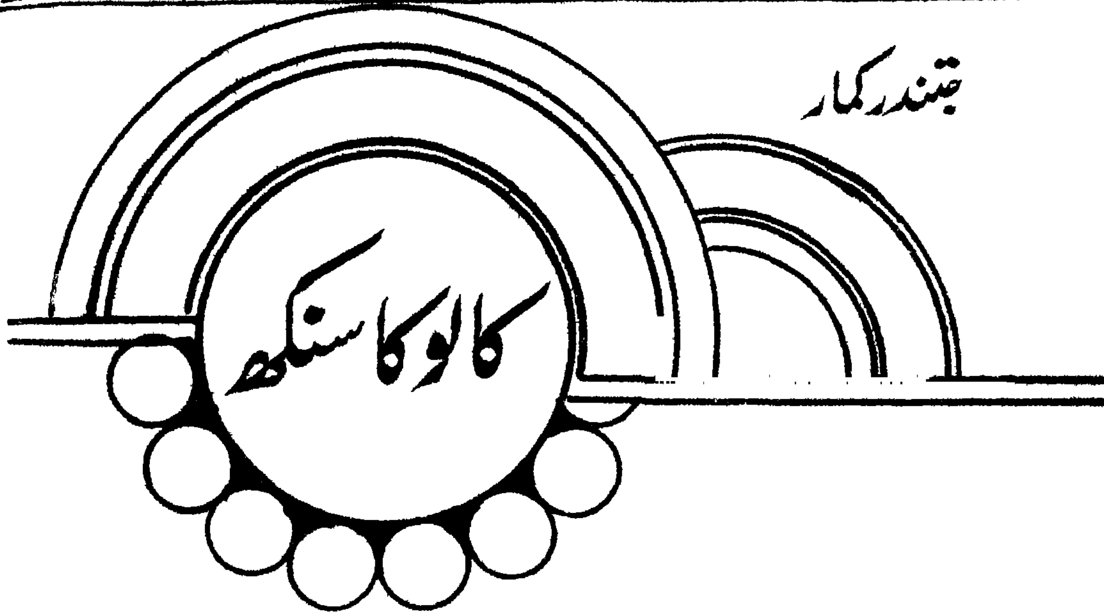
عبدالرحمٰن زین الدین - بھمڑی

بدحواسیاں

بدحواسی اُسے کہتے ہیں۔ جو ایک دم بغیر کسی ارادہ کے منہ سے نکل پڑے اور اکثر ایسی غلطیاں تیز بولنے یا غصہ کی حالت میں سر زد ہو ہی جاتی ہیں۔ ایسے ہی دو تین واقعے سنئے۔

ماسٹر صاحب حساب سمجھا رہے تھے۔ لڑکے شور و غل کر رہے تھے۔ ماسٹر صاحب ایک دم بہت زیادہ غصہ میں آ گئے اور زور سے چلاکر بولے۔ "نالائقو! خاموش رہو کانوں سے دیکھو آنکھوں سے سنو۔

سب لڑکے ایک دم زور سے ہنس دئے اور پھر ماسٹر صاحب اپنی بدحواسی پہ شرمندہ سے ہو گئے۔ (بقیہ صفحہ ۲۲ پر دیکھئے)



موہن نیند کے جھونکوں میں مست تھا۔ مگر اس کے پتاجی (پنڈت جی) صبح سویرے ہی اپنی تپسیا کرنے چلے گئے۔ وہ روز تپسیا کرنے جایا کرتے تھے۔ اسی لئے موہن جب بھی سو کر اٹھتا اپنے پتا کو نہ پاتا۔ کیونکہ اس کے پتا سویرے ۴ بجے سے بھی پہلے سنسان جنگلوں کی طرف چل دیتے تھے اور دور ایک پیپل کے نیچے بیٹھ کر خدا کی عبادت کرتے تھے۔ گاؤں والے پنڈت جی کو بہت بڑا آدمی سمجھ کر اُن کے درشن کے لئے آتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ پنڈت جی پورے گاؤں میں کالو پنڈت اور ایک اچھے گیانی کہلاتے تھے۔ پنڈت جی روز خاموشی سے پیپل کے نیچے جا بیٹھتے تھے۔ مگر آج اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اُچھلتے کودتے ناچتے، گاتے چلے جا رہے تھے۔ گاؤں والے آپ کی اِس حرکت سے حیران ہو رہے تھے کہ ہمارے گیانی جی کو کیا ہو گیا۔ مگر آپ تن کر چلے جا رہے تھے۔ نہ اپنے گھر کی سُدھ نہ اپنی عزت کا خیال بس ہیں کہ زور زور سے ڈگ بھرتے پیپل تک پہنچنے کی فکر کر رہے ہیں۔

خدا خدا کر کے پنڈت جی پیپل کے نیچے پہنچے جہاں ہر ایک سادھو مہاراج پہلے سے کالو پنڈت کے انتظار میں کھڑے تھے۔
کالو پنڈت سادھو جی کو دیکھتے ہی چونک پڑے اور لگے بڑ بڑانے۔ رام، رام، سادھو جی رام رام۔

سادھو۔ "رام رام بیٹا رام رام۔ جیتے رہو۔ ہاں بیٹا آج میں وعدہ کے مطابق ایک سکہ دوں گا۔ اور لو یہ لو مگر ہاں اس سے تم جو کچھ مانگو گے یہ سکہ تمھیں دے دے گا تم سے دوگنا تمھارے ہمسایوں کو ملے گا۔ سمجھے"

سننا تھا کہ کالو پنڈت کا چہرہ سفید ہونے لگا۔ اور لگے چیخنے "دوگنا۔ ارے مجھ سے دوگنا میرے ہمسایوں کو۔ کبھی نہیں میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ہرگز نہیں بھوکا مرنا منظور مگر اپنے سے زیادہ اپنے ہمسایوں کے پاس دیکھنا منظور نہیں۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں۔ ایسا نہیں ہونے دوں گا"

آخر کار کالو پنڈت سکہ ہاتھ میں لئے گھر پہنچے اور بیوی کو اس سکہ کا حال بتایا۔ دوسرے دن شہر کسی کام پر چلے گئے۔ اور جاتے جاتے کہہ گئے کہ "ہرگز ہرگز اس سکہ سے کام نہ لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سے دوگنا ہمارے ہمسایوں کو مل جائے۔ میری بیوی! بھوکا رہنا پڑے تو رہنا۔ مگر بھول کر بھی اس سکہ کو استعمال نہ کرنا" ایک گھنٹہ کی مسلسل تقریر کے بعد پنڈت کالو شہر چلے گئے۔ اور ادھر ان کی تجربے پسند بیوی سے رہا نہ گیا اور لگیں سکہ سے فریاد کرنے کہ مجھے بھگوان کے واسطے ایک اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی مل جائے اتنا ان کے منہ سے نکلنا تھا۔ کہ سکہ زور سے بجا اور آن کی آن میں ان کے سامنے اشرفیوں کی تھیلی آ گئی۔ مگر کالو پنڈت کی بیوی کو یہ یقین نہ آیا کہ میرے ہمسایوں کے پاس ایک کے بجائے دو تھیلیاں اشرفیوں کی گئی ہوں گی۔ چنانچہ اس نے دوسرا حکم سکہ کو دے دیا کہ ایک بہت خوبصورت محل تیار ہو جائے جس میں چار سو نوکر کام کرتے ہوں۔ حکم کے مطابق سکہ نے رات ہی رات میں ایک شاندار محل چن دیا

کی جھونپڑی کی جگہ تیار کرا دیا۔ مگر۔۔۔ اِدھر ایک محل اور چار سو نوکر آئے اور اُدھر پنڈت جی کے ساتھ والوں کے دو محل تعمیر ہوئے اور چار سو کی بجائے آٹھ سو نوکر کام پر حاضر ہوئے۔ اب تو پنڈت جی کی بیوی کو بھی یقین آنے لگا۔ مگر سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی فرمائش ضرور کر دیتی اور نتیجہ کے طور پر ان کے یہاں ایک اور اُدھر دو چیزیں موجود رہتیں۔

اِن دو تین دنوں کے بعد پنڈت جی بھی واپس لوٹے اور دور ہی سے دیکھ لیا کہ ایک محل اس طرف ہے اور دو محل اس طرف، تاڑ گئے کہ کیا معاملہ ہے اب جناب سے نہ رہا گیا۔ اور آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھے "ایک محل" میں گھسے چلے گئے اور لگے موٹی موٹی گالیاں دینے اور بچاری بیوی کا تو کچھ نہ پوچھئے ؛ ــــــ

ــــــ وہ لگے بڑ بڑانے کہ کمبخت تو نے ــــــ میری سال بھر کی محنت کو خاک میں ملا دیا۔ تو تو دوسروں کو کھلا پلا کر خوش کرتی ہے۔ شہر میں ان کمبختوں کی بھی خبر لیتا ہوں۔ ٹھیر میں انہیں مفت کے محل میں سیر کراتا ہوں۔ ٹھہرا کہا اور فوراً سنکھ ہاتھ میں لے کر لگے چیخنے کہ "اے سادھو جی کے سنکھ جلدی ہی میرے بچے کی اور بیوی کی اور میری صرف ایک آنکھ اندھی کر دے۔ جنتر منتر پھینتر گھنتر ہا اب کیا تھا اِدھر ان سب کی ایک آنکھ اندھی ہو گئیں اور اُدھر ان بچارے پڑوسیوں کی دونوں کی دونوں آنکھیں ختم ہوئیں اب پنڈت جی کی بیوی نے بہت سمجھایا مگر کالو پنڈت کہاں ماننے والا تھا۔ پھر سنکھ ہاتھ میں لے لیا اور حکم دیا کہ" اے سادھو جی کے سنکھ جلد از جلد میرے گھر (محل) کے سامنے ایک گہرا کنواں کھد جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے محل کے آگے ایک اور اندھے پڑوسیوں کے محل کے آگے دو کنویں کھد گئے۔ اب کیا تھا بے چارے دونوں آنکھوں سے پہلے ہی تھے جہاں ذرا کام کو آگے بڑھے کہ کنویں کی نذر ہوتے۔ اس ایک دو دن میں کے

بعد دیگرے پنڈت جی کے پڑوسی والے سب کے سب کنوئیں میں گر کر جنت کو چل دیئے تھے۔ اب پنڈت جی خوشی خوشی اپنی ایک سلامت آنکھ کو مٹکاتے پڑوس والوں کے محلوں کا معائنہ کرتے نکلے اور واپسی پر بیوی کو طعنے دینے لگے کہ دیکھ اس طرح کھاتے ہیں ایک تم تھیں کہ بغیر سوچے سمجھے فریاد کرتی تھیں۔ کہ محل مل جائے اور نوکر مل جائیں اور یہ مل جائے تو وہ مل جائے۔ مگر ہمیں دیکھ کہ اس طرح کھاتے ہیں کہ دوسروں کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور دیکھ سادھو جی پر اب ہمارا سکہ بیٹھ جانے والا ہے کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ تم سے دوگنا تمہارے پڑوس والوں کو ملے گا۔ مگر جھوٹ سادھو جی جھوٹ، ہا ہا ہا آہ یا ہاہا او پنڈت خوش تھا اُسے ہونے والی مصیبت کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کالو پنڈت کو یقین نہ آتا تھا کبھی خرگوش سے کچھوا بھی جیت سکتا ہے۔ اور خرگوش کے بچے بھی ایک پاپی راجہ کو مار سکتے ہیں۔ مگر آج کی رات وہ رات تھی کہ جس نے کالو پنڈت کا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ اور پنڈت کالو کا سارا پول گاؤں والوں کے سامنے کھل چکا تھا۔ اب وہی گیانی پنڈت پورے گاؤں میں بدنام ہو چکا تھا۔ لوگ حقارت کی نظروں سے اس کے جھونپڑے کو دیکھتے تھے جس کی جگہ کل اور پرسوں ایک محل تھا۔ مگر اب وہاں خاک بھی نہ تھی لوگ گاؤں کی گندگیاں اس جگہ ڈالتے آتے تھے۔ مگر پھر بھی کالو پنڈت نہ شرمایا اور دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود ترقی کرنے کی سوچتا مگر پوری کوئی بھی نہ ہوتی۔ اب اس کے پاس تنکا نہ تھا۔ محل نہ تھا۔ کیا تھا؟ صرف بدنامی جس نے کالو پنڈت کی زندگی تباہ کر دی۔ اور آخر کار آج وہ دن آ گیا کہ کالو پنڈت تباہ ہو گیا اور وہ آدمی کامیاب ہوا جس نے اپنے ساتھ دوسروں کا بھی فائدہ کیا جس نے خود کھایا اور دوسروں کو کھلایا

رضا حسین

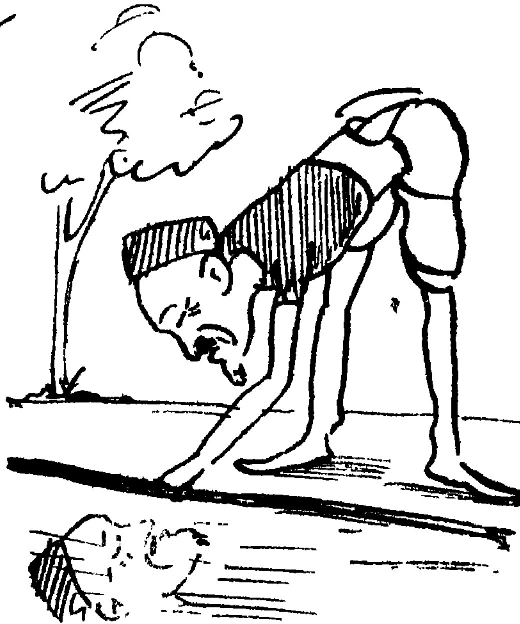
دو برس کی بڑھیا

کسی گاؤں میں ایک بہت غریب جلاہا رہتا تھا۔ اس کی عمر ہوگی ساٹھ برس کی۔ بیوی بھی اِس کی بڑھیا تھی۔

ایک دن جلاہا کچھ گاڑھے گزی کے تھان بن کر شہر میں جا رہا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ بڈھے کو پیاس، سر کے اوپر کپڑے کا گٹھر اور بڑھاپے کی عمر۔ بچارا تھک گیا۔ پیاس مارے الگ جان نکلی پڑ رہی تھی۔ اُسے ایک درخت کے سائے میں ایک سا چشمہ دکھائی دیا۔ آہستہ آہستہ چشمے کی طرف گیا۔ گٹھر سر سے اُتار چشمے کے کنارے بیٹھ گیا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ چلّو پانی پیا۔ جی خوش ہو گیا۔ دوسرا چلّو پانی کا پینے کو ہی تھا۔ چشمے کے صاف پانی میں بڈھے کو اپنی شکل نظر آئی۔ دیکھتا کیا ہے کہ سر کے تمام بال کالے ہو گئے۔ چہرے کی تمام جھریاں غائب ہو گئیں۔ صا

ی بدل گئی۔ اب اس نے چلو کا
انی تو پھینک دیا۔ اپنے سارے جسم
و غور سے دیکھنے لگا۔ منہ میں انگلی
ڈالی تو دیکھا۔ دانتوں کی پوری بتیسی
نکل آئی ہے۔ پہلے منہ میں ایک
دانت بھی نہ تھا۔
بڈھا حیران تھا۔
اس کے بعد اس کا
دل چاہا کہ بھلے چنگے
جوانوں کی طرح میدان
دوڑ لگائے۔ اب
کھڑا ہوا تو اس
جسم میں اتنی جان
کہ کسی جوان میں
ہو گی۔ جب
و کو پورا یقین
ہو گیا کہ وہ اب بڈھا نہیں رہا
تو بہت خوش ہوا۔ اور جی میں کہنے
لگا یہ چشمہ جادو کا چشمہ ہے۔
بڈھا بھلا اب کپڑا وغیرہ کیا
بچاتا۔ تو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

خوشی کے مارے زمین پر قدم رکھتا
کہیں تھا اور پڑتے کہیں تھے۔ غرض
کہ گھر پہنچا۔ بیوی نے جو ایک جوان
گبرو کو گھر میں آتا دیکھا۔ تو دور
سے ڈانٹنے لگی "موئے اندھا ہو گیا
ہے۔ جلاہے نے
کہا "چل ری بوڑھیا
چڑیل۔ دیکھتی نہیں
میں جوان ہو گیا
ہوں"۔



اپنے میاں کی
آواز سن کر بڈھی جلاہی
اُسے پہچان گئی۔ مگر
اُسے یقین نہ آتا تھا
کہ یہ اس کا خاوند
ہے۔ جلاہے نے
جب اُسے ہر طرح یقین دلا دیا۔
کہ میں تیرا خاوند ہوں کوئی اور نہیں
ہوں تو وہ بولی۔ تم کس طرح
جوان ہوئے۔ مجھے بتاؤ۔ میں بھی
جوان بنوں گی۔ تمھاری طرح جلاہے

نے کہا۔ کل صبح میرے ساتھ چلنا۔ جوان بن جاؤ گی۔ جلا ہی کو بھلا اتنی تاب کہاں تھی۔ اُس نے کہا "ابھی چلو۔ نہیں تو گھر سے نکل جاؤ۔"



مجبور ہو کر اُس نے چشمے کا پتہ بتا دیا۔ جلد ہی اس چشمے پر پہنچ گئی۔ چشمے کے کنارے پر بیٹھی تو پانی پیتے چلی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جتنا پانی پیتی گئی۔ اتنی ہی چھوٹی ہوتی چلی گئی۔ ہوتے ہوتے بالکل دو برس کے بچے کی طرح ہو گئی۔ اب کیا کرے۔ وہیں کنارے پر ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ لطف یہ کہ زبان بھی بند ہو گئی۔ ننھے سے بچے کی طرح غوں غوں کرنے لگی۔

جب اسے وہاں پڑے پڑے پورے آٹھ گھنٹے گزر گئے۔ تو بڈھا بیوی کی تلاش میں نکلا۔ آکر دیکھا۔ تو بیوی ننھی سی بچی پڑی ہے۔ بچاری رو رہی تھی۔ بڈھے نے بیوی کو بچے کی طرح گود میں اُٹھایا۔ اور اُس کی بیوقوفی پر روتا ہوا چلا گیا۔

صحیح حل معمہ نمبر ۱۴
دائیں سے بائیں
۱۔ غالب
۲۔ کہہ
۴۔ خالق
۶۔ ذات
۸۔ عاقل

معمہ نمبر چودہ ۱۴ کا شاندار نتیجہ

۱۵ روپے کی شاندار تقسیم

صحیح حل کوئی برآمد نہیں ہوا

صحیح حل معمہ نمبر ۱۴
اوپر سے نیچے
۱۔ قل
۳۔ بندوق
۵۔ تعمیل
۷۔ برا

۔ تار

چونکہ صحیح حل کوئی موصول نہیں ہوا لہذا پہلا انعام ایک غلطی والے تین اشخاص پر ۲ روپے ۵ آنے ۴ پائی فی کس تقسیم کیا گیا

۱۔ محمد عثمان صاحب۔ اندرکھیڑا (بارولا) مشرقی خاندیش ۲۔ کلبھوشن کمار صاحب۔ معرفت پرمانند کوہلی صاحب شیدپور ۳۔ سید یوسف اختر زکی معرفت حشمت حسین صاحب۔ کوروائی اسٹیٹ۔ ودھیہ بھارت۔

دوسرا انعام دو غلطی والے ۲ اشخاص پر ۱ روپیہ ۱۰ آنے ۶ پائی فی کس تقسیم کیا گیا۔

۱۔ محمد ایوب۔ محمد خسرل۔ محلہ کوٹ۔ سیتاپور ۲۔ عثمان غنی عبدالکریم شیخ۔ کھڑکی محلہ۔ بانسوٹ (ضلع بھروچ)

تیسرا انعام تین غلطی والے ۶ اشخاص پر ۸ آنے فی کس تقسیم کیا۔

۱۔ محمد سمیع اللہ انصاری۔ ایم۔ ای۔ اسکول پرتاب گنج (ضلع سہرسہ) ۲۔ گوردیال سنگھ بھاٹیہ، جگسلائی ایم۔ ای۔ اسکول۔ ٹاٹانگر (جمشید پور) ۳۔ یو۔ ایل۔ پال۔ درجہ نہم۔ شیر کشمیر ہائی اسکول۔ لیہ (لداخ۔ کشمیر) ۴۔ محبوب احمد۔ جامعہ نگر۔ دہلی ۵۔ عبدالحفیظ۔ پورنیہ ۶۔ ماموننہ بیگم۔ جودھپور

۱۵ روپے کے نقد انعامات

ایک حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ فیس داخلہ ۱ر کے ٹکٹ کی صورت میں

آخری تاریخ داخلہ :- ۱۰ر نومبر ۱۹۵۲ء

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۷ روپے
دوسرا انعام ایک غلطی پر ۵ روپے
تیسرا انعام دو غلطی پر ۳ روپے

پیامی معمہ نمبر ۱۶

دائیں سے بائیں

۱- ... ہے جس کا نام ہیں جانتے ہیں داغ
۳- ... اس کی روشنی دور دور پھیلتی ہے (چار حرفی)
۵- ... کرنے سے انسان کو بھی تو تسلی ہوتی ہے (پانچ حرفی)
۷- تھکے ہارے کو ... پر خوب ہی تو نیند آتی ہے۔
۱۰- نئے چین کا رہنما۔

اوپر سے نیچے

۱- پیامی معمے صحیح حل کر کے نقد ... حاصل کیجئے۔
۲- اگر اچھی طرح احتیاط نہ کی جائے تو اچھی سے اچھی ... بھی برباد ہو جاتی ہے۔
۶- اگر اس کا اچھا استعمال کیا جائے تو دنیا خوب ترقی کر سکتی ہے۔
۸- اچھی لکڑی کو ... ہونے سے بچانا چاہیئے۔
۹- ایک ہندسہ جس کو اگر دو سے تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم ایک ہی ہوتا ہے۔

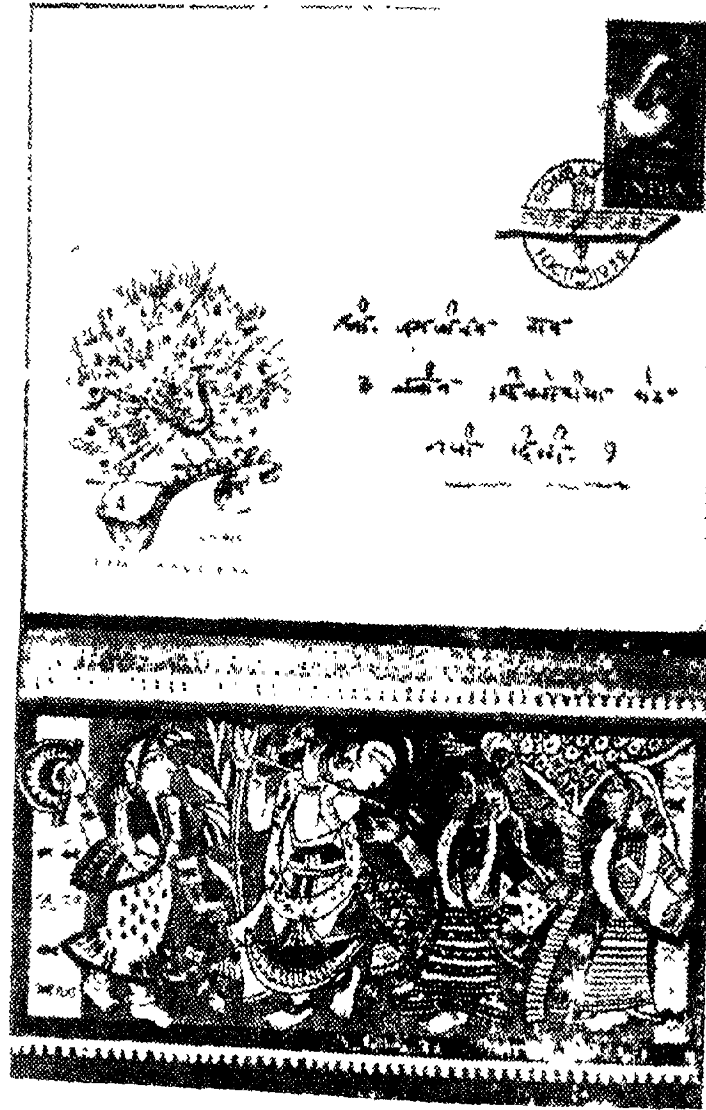
پیامی معمہ نمبر ۱۶

۲		و	ے	ر	۱ ا
	غ	ا		ہ	۳ ن
ل	ت	د	ا		۵
		[redacted]			ا
۹		ل		۸	۷ م
و		۱۰ م		[redacted]	

کوپن پیامی معمہ نمبر ۱۶

نام ---------------
پتہ ---------------

مدیر ناشر ... نے اشوک پریس میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر سے شائع کیا



نئے ڈاک کے ٹکٹوں کا لفافہ جو یکم اکتوبر کو جاری
کیا گیا ساتھ ہی ٹکٹوں کا خوبصورت البم بھی ہے

Regd. No. D. 96.
OCTOBER 1952.


ادارہ
حامد علی خان

دلی کے تین بڑے آدمی

اندر کے صفحات میں مضمون پڑھئے



لالہ کیدار ناتھ



ڈاکٹر انصاری



حکیم اجمل خاں





فہرست

نومبر ۵۲ء

ادارہ

حامد علی خان بی اے (علیگ)

اطہر پرویز ایم اے (علیگ)

سالانہ چندہ ۴ روپئے

فی پرچہ ۶ آنے

پیام تعلیم و ہلال کے تمام ریلوے بک اسٹالوں پر مل سکتا ہے

بچوں سے باتیں



جامعہ میں تعلیمی میلے کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی ہیں اور کیوں نہ ہوں، آخر دن بھی تو کم رہ گئے ہیں۔ ۱۵ر نومبر سے میلا شروع ہونے والا ہے۔ تین دن رہے گا۔ جو بچے پہلے سے پیامِ تعلیم پڑھتے ہیں، وہ تو تعلیمی میلے کا نام سنتے ہی پھڑک اٹھے ہوں گے۔ نئے پیامی حیران ہوں گے کہ بھائی یہ کیسا میلا ہے۔ آئیے ہم آپ کو اس میلے کا حال سنائیں۔

اس میلے میں یوں تو بڑوں کے لئے بھی بہت کچھ ہوتا ہے لیکن میلے کی خصوصیت تو بچوں ہی کی وجہ سے ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب آپ کو ہر طرف بچوں کا خوانچہ، بچوں کی پھلوں کی دکان، بچوں کی چاء کی دوکان اور بچوں کی دوسری دکانیں نظر آتی ہیں۔ لیکن بس دکانیں ہی تو سب کچھ نہیں ہوتیں، میلے میں بڑے مزے مزے کا پروگرام ہوتا ہے۔ بچوں کی قوالی، بچوں کا مشاعرہ، بچوں کی کانفرنس اور کیمپ فائر، جس میں بچے خوب مزے مزے کی نقلیں کرتے ہیں۔ یہ سارا پروگرام اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ جامعہ نگر کی بستی میں تین دن کے لئے بڑی چہل پہل ہو جاتی ہے۔ اگر ریڈیو والوں نے بچوں کے پروگرام میں میلے کے خاص خاص پروگراموں کو نشر کر لیا۔ جس کی بہت امید ہے تو آپ بھی چاہے دور ہی سے سہی، لیکن میلے کے اچھے اچھے پروگراموں کو ریڈیو سے سن سکیں گے۔ اگر ریڈیو سے نہ نشر ہو سکا تو پھر آپ کو ذرا صبر سے کام لینا ہوگا پیامِ تعلیم میں تو میلے کا حال چھپے گا ہی۔ اچھی اچھی تصویریں ہوں گی جن کو دیکھ کر آپ مزا

لے سکیں گے۔

آپ اب اس پرچے کا انتظار کیجئے جس میں میلے کی یہ کہانی چھپے گی۔

مشتاق بھائی کے نام سے تو پیامی واقف ہوں گے۔ مشتاق بھائی پیام تعلیم کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے "سائنس داں کی کہانی" لکھی تھی جو مسلسل کئی اشاعتوں میں شائع ہوئی اور بے حد پسند کی گئی۔

پیامیوں کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ مشتاق بھائی کچھ سیکھنے کے لئے یورپ گئے ہیں۔ ہماری درخواست پر انھوں نے "دہلی سے پیرس" تک کا اپنا ہوائی جہاز کا سفرنامہ بھیجا ہے۔ یہ سفرنامہ بے حد دلچسپ اور معلومات سے بھرا ہوا ہے۔

ہمارا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اسی پرچے سے چھاپنا شروع کر دیں۔ لیکن ایک مجبوری ہمارے راستے میں آگئی۔ ہم اکتوبر کے پرچے سے جناب غوث انصاری صاحب کا سفرنامہ شائع کر رہے ہیں۔ جس کی دوسری قسط اسی پرچے میں جا رہی ہے۔ مشتاق بھائی کا سفرنامہ بھی طویل ہے۔ اس لئے وہ بھی مسلسل شائع ہوگا۔ اس طرح ایک پرچے میں دو سفرنامے شائع کرنا ہم نے ٹھیک نہیں سمجھا۔ لیکن اگر پیامی مشتاق بھائی کے سفر کی دلچسپ کہانی پڑھنا ہی چاہتے ہیں تو ہمیں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر بھائی ہم کو خط ضرور لکھئے کہ آپ کی کیا خواہش ہے تاکہ ہم اسی پر عمل کریں۔ ہم آپ کے خط کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

جیسا کہ پچھلے پرچے میں اعلان کیا تھا۔ ہم نے اس ماہ سے خریداری نمبر میں تبدیلی کر دی ہے۔ یہ پرچہ آپ کے پاس نئے خریداری نمبر کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔ پرچے پر جو چِٹ لگی رہتی ہے اس پر آپ کا نیا خریداری نمبر ہے۔ اس کو غور سے پڑھ لیجئے۔ خریداری نمبر کے ساتھ آپ کی خریداری کی مدت بھی درج ہے۔ یعنی اس لکھی ہوئی مدت کے بعد آپ کو جو پرچہ جائے گا، وہ وی، پی سے جائے گا۔ اس سے آپ کو یہ سہولت ہوگی کہ آپ پہلے سے وی، پی چھڑانے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور آپ کو اپنی خریداری کی مدت کا اندازہ رہے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ چِٹ کو اچھی طرح پڑھ لیجئے۔





لوری

وامق جونپوری



سرسوں پھولی۔ پھول بسنتی
ننھے ننھے پیارے پیارے
سوجا سوجا میری گڑیا!
صبح چلیں گے کھیت کنارے
گھول کے پانی میں صابن کو
بہت سے چھوڑیں گے غبارے
سوجا سوجا میری گڑیا
گود میں میری پاؤں پسارے
آنکھ مچولی نندیا کھیلے
چندا ممّاں تھپکی مارے



بمبئی سے لندن تک

غوث انصاری بی۔ اے

(۲) عدن

۱۸ر اگست کو دن کے تقریباً ۱۱ بجے جب میں نہا دھو کر غسل خانے سے باہر نکلا تو سامنے عدن کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ تمام لوگ جہاز کے عرشے (چھت) پر آ کر جمع ہو گئے تھے اور بہت اشتیاق سے پہاڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔

آپ اگر نقشہ پر نظر ڈالیں تو سرزمین عرب کے جنوبی کونے پر عدن کا نقطہ ملے گا۔ ویسے تو یہ ایک معمولی سا شہر ہے، مگر اپنی جغرافیائی جائے وقوع کے اعتبار سے بہت اہم بندرگاہ ہے۔ یورپ سے ایشیا اور ایشیا سے یورپ آنے جانے والے تمام جہاز عدن ضرور ٹھہرتے ہیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ عرب کا علاقہ سارے کا سارا ریگستانی علاقہ ہے۔ بارش تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ خوب گرمی رہتی ہے اور پیداوار میں کھجور کے علاوہ دوسری چیزیں بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ بس بالکل یہی کیفیت عدن میں بھی نظر آئی۔ ویسے تو جہاز پر سے ہی دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری پہاڑیاں خالص چٹانی ہیں۔

صرف دو ایک جگہوں پر کچھ درخت دکھلائی پڑ گئے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ کے اندر ہمارا جہاز عدن کے ساحل کے قریب جا لگا۔ یہاں چونکہ کنارے پر سمندر کی گہرائی زیادہ نہیں ہے اور بیچ بیچ میں چٹانیں بھی ہیں، اس لئے بالکل کنارے پر جہاز نہیں لگ سکتا تھا۔ جہاز کے لنگر انداز ہونے کے بعد ایک لمبی سی سیڑھی نیچے سمندر تک لگا دی گئی اور بہت سے موٹر بوٹ آکر نیچے لگ گئے۔ اب ہم لوگوں کو عام اجازت تھی کہ جو کوئی شہر گھومنے جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ ہم لوگ تو اس انتظار ہی میں تھے۔ جلدی جلدی اتر کر موٹر بوٹ میں بیٹھ گئے۔ اور پانچ منٹ کے اندر اندر ساحل پر جا پہنچے۔ ہم کو گھومنے کے لئے صرف چار گھنٹے کا وقفہ دیا گیا تھا، اور ان چار گھنٹوں کے اندر ہم عدن کا زیادہ سے زیادہ حصہ دیکھ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم آٹھ آدمیوں نے مل کر سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ایک موٹر ٹیکسی کرایہ پر لے لی تاکہ خوب تیزی سے ہر طرف گھوم لیں۔

عدن میں ہم لوگوں کو دو خاص مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو وہاں کی زبان دوسرے وہاں کا سکہ۔ یہاں کے لوگوں کی زبان خالص عربی بھی نہیں ہے، بلکہ تین چار زبانیں مل کر ایک عجیب سی زبان بن گئی ہے۔ چنانچہ اپنی بات وہاں کے لوگوں کو سمجھانے اور وہاں کے لوگوں کی بات سمجھنے میں بہت دقت ہوئی۔ ہم کچھ پوچھتے تھے اور وہ جواب کچھ دیتے تھے۔ بہر حال کچھ اشاروں سے اور کچھ انگریزی سے کام نکالا۔ ہمارے ایک ساتھی عفو میاں (عصمت اللہ انصاری۔ ایک پرانے پیامی) عربی جانتے تھے مگر یہاں ان کی عربی کام نہ دے سکی۔ اسی طرح سکے میں ہم لوگوں کے پاس یا تو انگلستان کا تھا یا پھر ہندوستان کے روپئے۔ یہاں رائج ہے مشرقی افریقہ سکہ۔ چنانچہ خرید و فروخت اور کرایہ دینے میں بھی بہت مشکل پیش آئی۔ ہر جگہ ہم لوگوں کو بہت زیادہ دام دینے پڑے، بلکہ چھپائیں کیوں یوں کہیے کہ خوب خوب ٹھگے گئے۔ اب جیسے صرف ٹیکسی کے کرایہ میں ہم لوگوں نے اڑتالیس روپئے دئے۔

ہاں تو ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم لوگ سب
ے پہلے وہاں کے ڈاکخانے پہنچے۔ ہم میں سے
ایک کو کئی کئی خط روانہ کرنے تھے۔ ڈاکخا
لکل اپنے یہاں جیسا تھا البتہ تمام بورڈ اور
ٹس وغیرہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں
ے۔ گو کہ اس وقت صرف ڈیڑھ ہی بجا ہوگا
اکخانہ بند ہو چکا تھا، صرف ٹکٹ وغیرہ مل
سکتے تھے۔ یہاں کے ٹکٹ بیچنے والے بابو
نکہ ہندوستانی تھے اس لئے ہم لوگوں
بڑی آسانی ہوئی۔

ڈاک خانے میں تمام خط ڈالنے کے بعد
لوگ عدن کی پرانی آبادی کی طرف روانہ
ے۔ یہ ساحل سمندر سے تقریباً بارہ میل
فاصلہ پر ہے۔ سڑک پختہ ہے۔ راستہ میں
دور تک تو نئی نئی عمارتیں نظر آئیں
بعد میں آٹھ میل تک بالکل ریگستان ہے
ھنؤ اور دہلی کی مئی جون کی گرمی یاد آگئی،
ستم یہ کہ لو کے تھپیڑے لگ رہے
گرم گرم ریت کے ذرے بھی جسم پر پڑ
تھے اور منہ ہاتھ وغیرہ پر ہلکی ہلکی
ک رہی تھی۔ چونکہ ہماری ٹیکسی خوب
تیزی کے ساتھ جا رہی تھی اس لئے ریت
پوری طرح سے اُڑ اڑ کر ہم پر پڑ رہی تھی

جب ہم لوگ اس پرانی آبادی میں پہنچے
تو بالکل ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اپنے یہاں
کے کسی قصبہ میں آ گئے ہوں۔ زیادہ تر کچے
مکانات، کہیں کہیں پر دو منزلہ پختہ مکان۔
کچے راستے جو ریت سے اَٹے ہوئے تھے
فرق صرف اتنا تھا کہ لوگ اپنے یہاں سے
بالکل مختلف تھے۔ اور تمام جگہیں آدمیوں سے
بھری ہوئی تھیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا معمولی
بازار تھا، جہاں غریب آدمیوں کی ضرورت
کی تمام چیزیں ملتی تھیں۔ چائے خانے بہت
کثرت سے تھے۔ ہر تین چار دوکانوں کے بعد
ایک چائے خانہ اور کوئی بھی ان میں سے
ایسا نہ تھا جو آدمیوں سے خالی ہو۔ اس
حصہ میں چونکہ خالص عربی آبادی ہے اس
لئے یہاں کا لباس لمبا کرتہ، پاجامہ اور
سفید گول ٹوپی ہے۔ مگر غریبی کا یہ حال
ہے کہ شاید ہی کسی آدمی کے جسم پر ثابت
کپڑے ہوں۔ اسی طرح دوکانوں پر خریدار
کم تھے اور دوکاندار کے دوستوں کا مجمع

زیادہ۔

پرانے عدن سے روانہ ہو کر ہم لوگ نئے عدن کی طرف چلے۔ یہ حصہ ساحل سمندر کے کنارے آباد ہے۔ ہر طرف پختہ سڑکیں ہیں، دو دو تین تین منزلہ جدید قسم کی عمارتیں ہیں، ایک بڑا بازار ہے اور پیچھے کی طرف ایک چھوٹا سا بازار۔ یہاں زیادہ تر انگریز رہتے ہیں یا پھر بڑے بڑے تاجر ایک خاص بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ ہر انگریز کے مکان کے پاس ایک ایک موٹر کار کھڑی تھی اور دوسری طرف عدن کے لوگ پھٹے حال اور پریشان حال دکھلائی دیئے بازار میں تو پہنچ کر یہ حالت دیکھی کہ بھیک مانگنے والوں کا ایک بڑا مجمع ہم لوگوں کے پیچھے ہو لیا اور ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ چار گھنٹوں کی گھمائی میں ہم لوگوں کو ایک بھی عدنی موٹر کار پر دکھائی نہ پڑا جب کہ اتنی دیر میں کم سے کم پانچ سو کاریں تو ملی ہوں گی، جن سب پر انگریز تھے۔

عدن کے اس نئے علاقے میں افریقہ کے حبشی بھی تھے، انگریز بھی، عرب بھی، اور تھوڑے بہت ہندوستانی بھی۔ اسی طرح لباس بھی مختلف تھے۔ عرب تو زیادہ تر لمبے کرتے پاجامے میں تھے، حبشی قمیض اور نیکر پہنے تھے۔ اور انگریز قمیض پتلون میں۔ یہاں کے بازار میں ضرورت کی تمام چیزیں مل جاتی ہیں اور دوکانیں بھی بڑی بڑی ہیں۔ کئی ایک بڑے بڑے چائے خانے ہیں۔ ہم لوگ جہاز پر ڈبہ کے دودھ کی چائے پیتے پیتے عاجز آ گئے تھے۔ اس لئے چائے پینے کے لئے ایک چائے خانے میں جا بیٹھے، جہاں ہمیں اونٹنی کے دودھ کی چائے پینے کو ملی۔ بازار میں ہمارے ساتھیوں نے تھوڑی بہت خریداری بھی کی۔ جس کے بعد ہم لوگ جہاز پر واپس آ گئے

ایک بات اور آپ کو بتانا بھول گئے وہ یہ کہ چونکہ سارے کا سارا پہاڑی علاقہ ہے اس لئے سڑکیں اونچی نیچی ہیں۔ دو جگہوں پر پہاڑیوں کے نیچے سرنگوں میں سے سڑکیں نکالی ہیں۔ دونوں سرنگیں کافی لمبی ہیں اور اندر بالکل اندھیرا ہے۔ چوڑائی صرف اتنی ہے کہ ایک موٹر کار ایک وقت میں جا سکے۔ اس کے اندر سے نکلتے ہوئے ہم لوگ

بقیہ صفحہ ۲۲ پر

اطہر پرویز

دو دوست



جمیل اور ندیم بڑے گہرے دوست تھے۔ ہمیشہ ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ کبھی کسی نے ان کو جھگڑتے نہ دیکھا۔ محلے والوں کا کہنا تھا کہ جہاں ایک ہو وہاں دوسرا ضرور ہو گا۔ اُن کی دوستی ایک دوسرے سے اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔

ایک بار دونوں کے جی میں آیا کہ کیوں نہ تھوڑی دیر گپ بازی کریں۔ یہ خیال آنا تھا کہ دونوں لگے اونچی اونچی ہانکنے، جمیل نے کہا "ندیم بھیا! مجھے اگر خدا نے روپیہ دیا تو میں ایک بہت بڑا ڈیری فارم کھولوں گا۔ اس میں سیکڑوں گائیں اور بھینسیں پالوں گا۔ اس طرح پھر ہزاروں روپیہ کماؤں گا۔

ندیم نے کہا "جمیل میاں، تم لالچی آدمی ہو، تم کو تو بس روپیہ ہی کمانے کی فکر ہے۔ خیر تو تم پالنا گائیں بھینسیں، میں بھی وہیں تیرے ڈیری فارم کے پاس ببر شیر پالوں گا۔ جسے دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آئیں گے۔

شیر کا نام سن کر تو جمیل میاں چونک ہی پڑے: "شیر تو میں ہرگز نہ پالنے دوں گا۔ میرے جانور کھا جائے گا۔"

"تو پھر میں تم کو گائیں بھینسیں نہیں پالنے دوں گا۔ دیکھیں کیسے پالتے ہو"، ندیم نے کہا۔

"گائیں بھینسیں تو میں ضرور پالوں گا" اب تو جمیل میاں بھی آپے سے باہر ہو گئے تھے۔"

لیکن ندیم کا پارا تو اور بھی چڑھ گیا تھا۔ "اچھا دیکھوں تم کیسے پالتے ہو گائیں بھینسیں" یہ سننا تھا کہ جمیل میاں نے زمین پر ایک بڑی لکیر کھینچ دی۔ "لو میں نے پال لیں گائیں بھینسیں، کر لو کیا کرتے ہو میرا؟"

یہ دیکھ کر ندیم میاں نے فوراً اس کے پاس ہی ایک اور لکیر کھینچ دی، "لو میں نے پال لیا اپنا شیر، کر لو کیا کرتے ہو!" بس پھر کیا تھا، دونوں غصے میں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور ذرا سی دیر میں چاقو چھری چلنے لگی اور بات کی بات میں دو لاشیں تڑپنے لگیں ... دو دوستوں کی لاشیں۔

انور عظیم



آپ میں سے ہر لڑکا بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔ جس طرح ایک پھل دار درخت بننے کے لئے سورج، پانی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح آدمی بھی اچھی صحبت، علم، خدمت اور قربانی سے عام آدمیوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ اور بڑا آدمی کہلاتا ہے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو خود غرض نہیں ہوتا۔ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو قوم اور ملک کی خدمت کرتا ہے۔ جو ہم سایوں اور دوسرے انسانوں کے فائدے کے لئے قربانی دیتا ہے۔

ہندوستان میں ہمیشہ ایسے سپوت پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے پیارے وطن کے لئے اپنے تن، من، دھن کی بازی لگا دی۔ اسی لئے ایسے لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور ان کے نام لاکھوں اور کروڑوں زبانوں پر بڑی عزت کے ساتھ آتے ہیں۔ اور ایسا آدمی جو صرف اپنے لئے جیتا ہے وہ زندگی ہی میں مر جاتا ہے اور مرنے کے بعد وہ اس طرح مٹ جاتا ہے جس طرح آپ کی کاپی پر لکھا ہوا غلط لفظ ربڑ سے مٹ جاتا ہے آپ میں سے ہر لڑکا بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ آپ کے فائدے کے لئے ہم آپ کو تین بڑے

آدمیوں کی کہانی سناتے ہیں۔ ان سے آپ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اور ان کی ہی طرح اپنا نام روشن کر سکتے ہیں۔

حکیم اجمل خاں کا نام کس نے نہیں سُنا وہ صرف ایک بڑے حکیم ہونے کی وجہ سے مشہور نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے علم اور علاج سے لاکھوں ہندوستانیوں کی جان بچائی۔ حکیم تو بہت ہوتے ہیں۔ لیکن جس چیز نے ان کو اتنی شہرت اور عزت دی وہ ان کی قومی خدمت اور قربانی تھی۔ ان کی اچھائیاں آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ وہ دِلّی میں رہے لیکن ان کا نام ملک کے کونے کونے میں پہنچا

وہ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور ترسٹھ سال تک زندہ رہے۔ ساری زندگی بیماروں کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے قوم کے لئے قربانیاں دیں اور مصیبتیں جھیلیں۔ ان کی شہرت تو شروع میں ایک حکیم کی حیثیت سے تھی۔ ان کے علاج کی برکت صرف بڑے نوابوں اور راجاؤں کے لئے نہ تھی۔ انھیں نوابوں اور راجاؤں سے ایک فیس ہزار ہزار روپے کی ملتی تھی۔ مگر وہ روپے کے پجاری نہ تھے۔ وہ ایک انسان کا درد بھرا دل رکھتے تھے۔ ان سے غریب اور حاجت مند انسانوں کی مصیبت نہ دیکھی جاتی تھی۔ ان کا ایک قدم اگر نوابوں کے محل میں ہوتا تھا تو دوسرا قدم غریب اور مفلس انسانوں کی جھونپڑیوں میں۔ ان کی آنکھوں میں امیر اور غریب کا فرق نہ تھا۔ ان کے دل میں صرف زندگی کی محبت تھی۔ وہ امیر اور غریب دونوں کو موت کے منہ سے بچاتے۔ غریبوں سے فیس نہ لیتے۔ الٹا پیسوں سے ان کی مدد کرتے اور جب تک ضرورت ہوتی مفت علاج کرتے دوا کے پیسے نہ لیتے۔ اور اپنی طرف سے ان کی پرہیزی کا انتظام کرتے۔

۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے خلاف تحریک ترک موالات چلی تو وہ قوم سے الگ کھڑے نہ رہے۔ انھوں نے اپنا خطاب واپس کر دیا۔ حاکموں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور قومی خدمت کے لئے سختیاں جھیلنے لگے۔ ان کی شہرت ایک لیڈر کی حیثیت سے بھی آناً فاناً پھیل گئی۔ وہ ہر کام سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ اور جب ایک بار فیصلہ کر لیتے تھے تو اس پر آخر وقت تک

ڈٹے رہتے تھے۔ اسی لئے جب وہ ایک بار سیاسی زندگی میں آئے تو پھر آخر وقت تک قوم کے ساتھ قربانیاں دیتے رہے اور کڑے وقت کا مقابلہ کرتے رہے۔ قوم نے ان کی محنت اور بے لوث محبت کی پوری عزت کی اور انھیں "مسیح الملک" کا خطاب دیا۔

ایک بار برسات کی رات میں وہ ریل گاڑی میں رام پور سے دہلی کا سفر کر رہے تھے پل کے ٹوٹ جانے سے گاڑی کے کئی ڈبے ندی میں گر گئے۔ خوش قسمتی سے وہ بچ گئے۔ ان کا دل انسانوں کی چیخ پکار پر تڑپ اٹھا۔ انھوں نے قریب کے لوگوں کو بلایا۔ اور خود بھی پانی میں سے مصیبت کے ماروں کو نکالتے رہے۔ انھوں نے اپنے کپڑے ان میں بانٹ دئے۔

ان کی پوری زندگی ایسے ہی کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ انھوں نے اپنے آرام اور چین کو چھوڑ کر ہمیشہ غریبوں اور بیماروں کی خدمت کی۔ قوم اور ملک کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کے سپوتوں کی قطار میں آج بھی اونچی جگہ پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

اب رائے صاحب لالہ کیدار ناتھ کا حال سنئے وہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی سے چھ میل دور شاہدرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام لالہ رام جس مل تھا۔ وہ ایک سادھو بھگت قسم کے آدمی تھے۔ وہ اپنے چھوٹے سے گھرانے کے ساتھ کوچہ پرمانند دریا گنج میں ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کی ایک چھوٹی سی ریوڑیوں کی دوکان تھی۔ رائے صاحب کیدار ناتھ چھ سال کی عمر میں پاٹھ شالے میں داخل کرا دئے گئے۔ چھوٹے بچے ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اور وہ اپنا زیادہ وقت پاٹھ شالے ہی میں گزارتے تھے۔

وہ امتحان کے زمانے میں رات رات بھر پڑھا کرتے۔ ان کے پاس پیسہ نہ تھا۔ اس لئے وہ ساری کتابیں نہ خرید سکتے تھے۔ وہ اپنے ایک ہم جماعت کے یہاں جاتے اور پڑھ کر رات کے گیارہ بجے واپس آتے۔

وہ جس ہائی اسکول میں پڑھتے تھے وہاں اس وقت اردو اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن ان کے دل میں سنسکرت زبان کی بھی بڑی عزت تھی۔ وہ کلاس میں اول آتے تھے۔ مگر

آخری بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے۔

وہ دھن کے بڑے پکے تھے۔ ایک مرتبہ کلاس میں یہ بحث چھڑ گئی کہ عربی سب سے مشکل زبان ہے انھوں نے کہا کہ عربی میں کیا رکھا ہے۔ یہ تو بہت آسان ہے۔ ایک لڑکے نے کہا اگر آسان ہے تو پاس کرکے دکھاؤ۔ اس کے بعد وہ سیدھے بازار پہنچے اور عربی کی کتاب خرید لائے اور پڑھنا شروع کردی۔ عربی میں امتحان دیا۔ نتیجہ نکلا تو کامیاب لڑکوں میں ان کا دوسرا نمبر تھا اور عربی میں تیسرا۔

[illegible]ء میں ایم، اے کلکتہ سے کیا اور ٹریننگ لاہور میں حاصل کی۔ اس کے بعد ایک اسکول میں سائنس ماسٹر ہو گئے۔

انھوں نے اپنی شادی میں گھوڑے پر چلنے سے اس لئے انکار کر دیا کہ ان کے والد پیدل چلیں گے۔ وہ اسے ادب کے خلاف سمجھتے تھے۔ شادی کے بعد وہ صوبائی امتحان میں بیٹھے اور پاس ہوگئے اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر مامور ہوگئے۔

ان کو کسی کام سے عار نہ تھا۔ ایک اینٹ کے بھٹوں میں مزدوروں نے زیادہ مزدوری مانگی اور کام کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے خود ہی کام شروع کر دیا۔ مزدور یہ دیکھ کر پھر کام کرنے لگے۔

انھیں رعب اور دبدبے سے نفرت تھی۔ وہ دوسروں کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ بہت سے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ایک لڑکے کو تو انھوں نے لندن تک پڑھنے کے لئے بھیجا۔

۱۹۰۵ء میں پلیگ پھیلا اور موت کے ڈر سے شہر کے تمام افسران ادھر ادھر چلے گئے۔ لیکن وہ وہیں بیماروں کی خدمت کرتے رہے۔ اور اپنی موت کی بھی پرواہ نہ کی۔ پلیگ کے حادثے کے فوراً بعد وہ ہوشیارپور چلے گئے اور پنشن لے کر ۱۹۱۱ء میں دہلی آگئے۔

لدھیانے میں انھوں نے اپنی لڑکی کے نام پر لجاوتی گرلز اسکول بنایا۔ اپنی نوکری کے زمانے میں جہاں بھی گئے۔ انھوں نے عوام کے لئے اپنی کوئی نہ کوئی یادگار ضرور چھوڑی۔

پنشن کے بعد انھوں نے اپنی نوکرانی کو ہٹا دیا اور بیوی سے کہا کہ تم اب جج کی بیوی نہیں ہو۔ اور اب میں جج نہیں ہوں بلکہ تم

کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اور خادم کو خادم کے رکھنے کا حق نہیں۔

آئیے اب ہم ایک اور بڑے آدمی کا قصہ آپ کو سُنائیں۔ اگر آپ کو اوکھلا میں جامعہ ملیہ دیکھنے کا موقع ملے تو آپ کو ایک بہت بڑا خوبصورت مزار نظر آئے گا۔ یہ ڈاکٹر انصاری کا مزار ہے۔ اس کے اندر ہندوستان کا ایک بہت بڑا سپوت سویا ہوا ہے۔ ان کی عزت کرنے اور ان کا نام لینے والے آج لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔

وہ ایک اچھے مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان میں انگریزی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ انھوں نے اس رواج کو توڑا۔ لیکن انگریزی تعلیم نے انھیں انگریزوں کا غلام نہیں بنایا۔ بلکہ وہ قوم اور ملک کی خدمت اور بھی لگن سے کرنے لگے۔

وہ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ وہ دوسروں کی مدد کرنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے آخر وقت تک لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ وہ جب انگلستان میں تھے اس وقت بھی ان کا ہاتھ دوسروں کے لئے اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ ان کی ذات سے بہتوں کو فائدہ پہنچا۔ وہ دوسروں کی مدد اس طرح کرتے کہ کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ دکھاوا تو ان میں بالکل نہیں تھا۔

وہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے۔ اور سب سے اپنوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ اگر ان سے کوئی اپنی تکلیف یا مصیبت چھپاتا تو انھیں بڑا رنج ہوتا۔

جب ۱۹۱۱ء میں ترکوں پر حملہ ہوا تو ان کا دل بے چین ہوگیا۔ وہ اپنا کام کاج چھوڑکر اپنے پچیس دوستوں کے ساتھ ترکی چلے گئے۔ وہاں انھوں نے بڑی مفید طبی خدمات انجام دیں۔

ان کے دل میں دوسرے ملکوں کی محبت اس لئے تھی کہ وہ جنگ آزادی کے سپاہی تھے۔ وہ انگریزی حکومت پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بھی حکیم اجمل خاں کی طرح ترک موالات میں حصہ لیا۔ اور اس وقت سے برابر آزادی کی جنگ میں آگے آگے رہے۔

وہ ملک کی ترقی اور آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا دل آپس کی نا اتفاقی پر بہت کُڑھتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ آپس کی نا اتفاقی دشمن کا ہاتھ مضبوط کرتی ہے

بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے



"مگر مجھے اپنا وزن کیسے معلوم ہوگا؟"
"کل وزن کو تین سے تقسیم کر دینا۔"

زکی انور

بھنڈار خانے کا بھوت

بیگم صاحبہ نے جیسے ہی بھنڈار خانے کا دروازہ کھولا ان کی چیخ نکل گئی۔ بھنڈار خانے میں دھواں بھرا ہوا تھا اور لوبان کی بو سے ساری کوٹھری معطّر تھی۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے کوٹھری میں داخل ہو گئیں۔ انھیں نعمت خانے سے انڈے کا حلوہ نکالنا تھا انھوں نے نعمت خانے کا پٹ کھولا تو یہ دیکھ کر اُن کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی کہ حلوے کے برتن سے حلوہ غائب تھا البتہ اس کی جگہ کچھ انڈے، بادام، کشمش برتن میں رکھے تھے۔ بیگم صاحبہ کے ہوش و حواس جاتے رہے اور وہ ہانپتی کانپتی الٹے پاؤں واپس ہو گئیں۔

خاں صاحب حلوے کے انتظار میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے بیگم صاحبہ کو اس انداز میں واپس آتے دیکھ کر پوچھا

"کیا بات ہے؟ خیر تو ہے بیگم؟"

"خیر کیا رہے؟" بیگم صاحبہ خوف اور خفگی کے ملے جلے انداز میں کہنے لگیں "میں نے پچاس ہزار بار آپ کو کہا کہ بھنڈار گھر میں بھی ایک بتی لگوا دیجئے۔ اندھیری کوٹھری میں بھوت

نہیں رہے گا تو اور کیا ہو گا۔ اب آج انڈے کا سارا حلوہ غائب ہے اور کوٹھری لوبان کی بو سے بسی ہوئی ہے۔ آخر یہ سب کچھ بھوت نہیں تو اور کیا ہے؟ پہلے تو آپ میری بات مانتے ہی نہ تھے، پر اب۔۔۔۔۔؟"

کہتے کہتے بیگم صاحبہ کی آواز بھرّا گئی اور انھیں حامد یاد آ گیا۔ حامد خاں صاحب اور بیگم صاحبہ کا بڑا لڑکا تھا اس کی عمر بارہ سال کی تھی مگر وہ بلا کا ہوشیار اور شریر تھا۔ ساتھ ہی وہ بہت زیادہ ذہین بھی تھا۔ وہ آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا اور اسکول کے زیادہ تر امتحانوں میں اول رہا کرتا تھا۔ مگر اس کی شرارت سے سارا گھر اور سارا اسکول عاجز تھا۔ آٹھ دس دن پیشتر خاں صاحب نے حامد کو اس کی کسی شرارت پر کافی پیٹا تھا۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ اب میاں حامد کو نانی یاد آ جائے گی اور وہ دوسرے ہی دن سے اپنی شرارتیں بھول جائیں گے۔ لیکن دوسرے دن سے حامد اپنی شرارتیں بھولا یا نہیں یہ تو کسی کو معلوم نہیں مگر وہ کہیں بھاگ ضرور گیا۔ اور اس کی پلنگ پر ایک خط پڑا تھا جس میں لکھا تھا۔

"پیاری امی"

مجھے اسکول کے ماسٹر صاحب نے بتایا ہے کہ بچے گھر کی رونق ہوتے ہیں۔ پھر کل ابا جان نے اپنے گھر کی رونق کو پیٹ دیا۔ اب میں جا رہا ہوں تاکہ ابا جان کو بھی معلوم ہو کہ بچے واقعی گھر کی رونق ہوتے ہیں۔ پھر میں جا بھی رہا ہوں، میرا جانا ضروری ہے۔ گھبرائیے نہیں امی میں اسی شہر میں رہوں گا اور میں جہاں رہوں گا مجھے کھانے پینے کی تکلیف نہیں ہو گی۔ میرے بھاگ جانے پر ابا جان اور خفا ہوں گے اُن سے میری طرف سے معافی مانگ لیجئے گا اور انھیں میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ ننھے اور زریا کو کہئے گا کہ بھیا گھومنے گئے ہیں

آپ کا پیارا — حامد"

خاں صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خاں صاحب بغیر کچھ کھائے پیے میز پر سے اٹھے اور دفتر چل دئے۔ اور بیگم صاحبہ [illegible]

یٹھی رہیں۔

شام کے وقت خاں صاحب دفتر سے واپس آئے تو بیگم صاحبہ نے جلدی سے پوچھا۔

"آپ نے بجلی کے مستری کو بلایا؟"

"کیوں کیا بات ہے؟" خاں صاحب پریشان ہو گئے۔

"تو گویا آپ نے آج بھی نہیں بلایا؟" بیگم صاحبہ خفا ہو گئیں۔ "بھئی، اب اس اندھیرے بھنڈار گھر میں جانے کی ہمت کسی کو نہیں۔ آپ کو معلوم ہے وہ جو صراحی گھر سے غائب ہوئی تھی، وہیں کونے میں پڑی پائی گئی اور آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ اس میں برف کا پانی بھی تھا۔ میں تو سوچتی ہوں یہ گھر ہی چھوڑ دیا جائے۔ پڑوس کی شبراتن نے ٹھیک ہی تو بتایا تھا کہ اس گھر میں سایہ ہے۔ اب تو بھئی حد ہو گئی۔ کبھی کباب غائب، کبھی حلوہ غائب کبھی فرنی چٹ کبھی پلاؤ کی دیگچی خالی۔ آج تو میں نے سوچا کہ نعمت خانہ ہی وہاں سے نکلوا دوں پھر آگے دھروں گی کہاں؟"

"خیر اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا" خاں صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"آپ تو ہر روز یہی کہتے ہیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بیگم صاحبہ بولیں۔

"لیکن اب واقعتاً سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" خاں صاحب کہنے لگے "حامد میاں کا خط آیا ہے...."

"کیا خط آیا ہے۔ کب خط آیا ہے" بیگم صاحبہ جیسے سب بھول کر ہنسنے لگیں۔ "میرے لال کا خط ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

خاں صاحب نے شیروانی کے جیب سے ایک خط نکالا اور پڑھ کر سنانے لگے۔

"ابا جان اور امی پیاری، تسلیمات

میں اسی شہر میں ہوں اور بالکل خیریت سے ہوں۔ اتفاق سے میری ملاقات ایک شاہ صاحب سے ہو گئی ہے اور میں ان سے دعا تعویذ سیکھ رہا تھا۔ اب میں بہت خوش ہوں کہ میں جلد ہی گھر پہنچ کر اپنے گھر کے بھنڈار خانے والے بھوت کو بھگاؤں گا تاکہ آپ لوگوں کا یہ شک دور ہو جائے کہ نعمت خانے سے مٹھائیاں اور حلوے

وغیرہ شریر حامد چرایا کرتا تھا۔

میں شہر کے کنارے ایک غیر آباد مسجد میں شاہ صاحب کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپ لوگ فکر نہ کریں میں بہت اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوں اور بہت جلد گھر واپس آ جاؤں گا۔ مُنّے اور زیبا کو پیار،

آپ کا لاڈلا۔ حامد"

خط سُن کر بیگم صاحب نے کہا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ سب کچھ میرے لال کی شرارت نہیں بلکہ بھوت کے کھیل تھا۔ یہ آپ کاہے کو مانتے تھے۔ سب کچھ کھل گئی نا! بچے کو ناحق پیٹ دیا آپ نے؟"

خاں صاحب نادم نظر آئے۔ پھر انھوں نے کہا۔۔۔

"میں سمجھ گیا حامد کہاں ہوگا! شہر کے کنارے وہ جناتی مسجد ہی تو ایک غیر آباد مسجد ہے وہ وہیں ہوگا۔ کل دفتر بند ہے۔ میں کل اپنے بچے کو خود لینے جاؤں گا۔"

دوسرے دن صبح سویرے خاں صاحب جناتی مسجد پہنچے۔ مسجد کے بارے میں ایسی خطرناک افواہیں مشہور تھیں کہ مسجد میں قدم رکھتے خاں صاحب کا کلیجہ کانپ رہا تھا وہ سوچ رہے تھے کہ مسجد کے جنّات کہیں انھیں بھی چھپکلی نہ بنا دیں۔ یا انھیں غائب نہ کر دیں۔ مگر بیٹے کی الفت بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ خاں صاحب ہمت کر کے مسجد کے اندر چلے ہی گئے۔

اندر پہنچ کر خاں صاحب کا سارا خوف جاتا رہا۔ بلکہ خوشی سے اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ اُن کا خیال درست نکلا تھا میاں حامد مسجد کے ایک کونے میں سجدے میں پڑے تھے۔ خاں صاحب نے حامد کی عبادت میں خلل انداز ہونا اچھا نہ سمجھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر اُس کے سجدے سے سر اٹھانے کا انتظار کرنے لگے۔

کافی دیر کے بعد حامد نے سجدے سے سر اٹھایا، اور باپ کو دیکھ کر ایک دم دوڑا اور باپ سے لپٹ گیا۔

کافی دیر باپ بیٹے باتیں کرتے رہے۔ حامد نے بتایا کہ اب تک وہ چھپکلے سے بچنے بھوت کو بھگانے کی دعا اور ترکیب سیکھے

چکا ہے اور اس سے زیادہ کچھ سیکھنے کو اُن کے اُستاد شاہ صاحب نے منع کیا ہے۔ چنانچہ آج کسی وقت وہ خود ہی گھر پہنچ جاتا۔

خاں صاحب نے کہا۔

"تو بیٹا اب میرے ساتھ چلو۔



"ہاں ابا جان میں چلا تو چلتا" حامد نے کہا "لیکن شاہ صاحب آئیں تو میں انھیں اور ان کو سلام کرتا چلوں تو ٹھیک ہے۔" خاں صاحب کہنے لگے۔

"نہیں بیٹا اب میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ واقعی تم گھر کی رونق ہو۔ تمھارے بِنا بچ بچ گھر سونا سونا ہے اب تمھیں چلنا ہی ہوگا۔

حامد مسکرانے لگا، پھر بولا

"خیر جب آپ کا یہی حکم ہے تو میں چلا چلوں۔ شاہ صاحب سے بیٹھ کر مل کر حالات کہہ دوں گا، یا یہ کلّو سب کچھ کہہ دے گا۔

"کلّو کون؟" خاں صاحب نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں اِن دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا آدمی نہ تھا۔



حامد نے ایک ایک چھپکلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

یہ کلّو ہے۔ یہ ایک مشہور ڈاکو تھا۔ ایک دن کہیں چوری کر کے اس مسجد میں چھپنے آیا تھا۔ میرے شاہ صاحب نے اسے چھپکلی بنا دیا ہے یہ سب کچھ انھیں بتا دے گا۔ چلیے میں چلتا ہوں!"

خاں صاحب نے حیرانی سے چھپکلی کی طرف دیکھا پھر حامد کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور مسجد سے باہر نکل گئے۔

حامد گھر آ گیا۔ گھر میں عید آ گئی گھر میں پھر رونق ہو گئی۔ بیگم صاحبہ نے بلائیں لیں اور مُنّے اور زیبا اپنے بھیا سے لپٹ گئے۔ گھر کی اُداسیاں دور ہو گئیں۔

اور اُسی دن شام کو حامد نے منتر پڑھ پڑھ کر ایک چراغ بنایا اور بھنڈار خانے میں روشن کر دیا۔ یہ چراغ سات دنوں تک مسلسل جلائے گئے اور بھنڈار گھر کا بھوت بھاگ گیا۔ پڑوس کے گھروں میں حامد بہت ہی عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ عورتیں اس کی عزت کرنے لگیں۔ اُن کے ہم عمر بچے اُس سے ڈرنے لگے کہ کہیں وہ اُنہیں چھپکلی نہ بنا دے.... لیکن اس کا پڑوسی اور پیارا دوست پرکم ہی ایک ایسا لڑکا تھا جو حامد سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ بلکہ جب کبھی حامد بچوں میں [illegible] جماتا تھا۔ اور پرکم وہاں آ جاتا تو حامد چپ ہو جاتا۔ کیوں کہ پرکم جانتا تھا کہ بھنڈار خانے کا بھوت حامد ہی تھا۔ جو بھنڈار خانے سے حلوے وغیرہ چرا کر کھڑکی کی راہ اُسی کے ہاں آ کر کھایا کرتا تھا۔ اور اگلے دن وہ اُسی کے گھر چلا

رہا تھا

بقیہ بمبئی سے لندن تک صفحہ ۸ سے آگے

کو تھوڑا بہت ڈر ضرور معلوم ہوا۔ مگر کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ عدن میں سواری کی قسم سے صرف دو سواریاں ملیں۔ ایک تو موٹریں اور دوسرے اونٹ گاڑیاں۔ ــــــ

اونٹ گاڑیاں صرف سامان لانے لے جانے کے کام آتی ہیں اور موٹریں آدمیوں کی سواری کے لئے۔ یہاں لاری بسیں بھی چلتی ہیں جن پر غریب لوگ چلتے ہیں۔ بازار میں برقعہ پوش عورتیں بھی بہت سی ملیں۔ گھر اور باہر کا کام عورتیں کرتی ہیں۔

اپنے ساتھیوں میں میرے علاوہ سات لوگ اور ہیں اور ہم سب ہر جگہ مل جل کر گھومتے ہیں۔ جہاز پر بھی ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آگے چل کر ان سب کا تعارف آپ سے کرائیں گے۔ یہ سب کے سب بڑے اچھے لوگ ہیں۔

بیربل کی حاضر جوابی



"آسمان کے تارے"

ایک بار اکبر نے بیربل سے کہا "ارے بیربل تم بڑے سمجھ دار بنتے ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ آسمان پر کتنے تارے ہیں؟" بیربل بھلا کب خاموش ہونے والے تھے۔ "جہاں پناہ! ابھی بتاتا ہوں!"

اب انھوں نے نوکر سے فوراً ایک رائی بھری ہوئی تھال منگوائی۔ اور بادشاہ کے سامنے رکھ کر کہا" تھال میں جتنی رائی ہے اتنے ہی آسمان پر تارے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو گن لیجئے:

بیربل کے اس جواب کو سن کر درباری چونک پڑے اور ہر ایک کی زبان سے بے ساختہ واہ وا نکل گیا۔

"متبرک پانی"

ایک دن بادشاہ نے دربار میں بیٹھے ہوئے اپنے درباریوں سے پوچھا "سب سے

زیادہ متبرک پانی کس دریا کا ہے؟"

سب درباریوں نے ایک زبان ہو کر کہا "گنگا جی کا پانی۔" مگر بیربل چپ چاپ بیٹھے رہے۔ تب اکبر نے کہا "بیربل تمھاری کیا رائے ہے؟ تم بھی تو کچھ کہو۔"

بیربل نے جواب دیا "جہاں پناہ! جمنا جی کا پانی" سب سے زیادہ متبرک ہے۔" بادشاہ کو یہ جواب سُن کر بڑی حیرت ہوئی اور بولے "تم کیسی باتیں کر رہے ہو، بیربل تمھارے ہندو شاستروں میں تو جو اہمیت گنگا کو حاصل ہے وہ جمنا کو نہیں، تو پھر گنگا کے پانی سے جمنا کا پانی زیادہ متبرک ہوا!"

بیربل بولے "جہاں پناہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ گنگا جل تو امرت ہے اس کی برابری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو پانی کا ذکر کر رہا ہوں، اسی لئے تو میں نے جمنا جی کے پانی کو سب سے زیادہ متبرک بتایا۔

بیربل کے اس جواب سے بادشاہ کے ساتھ ساتھ درباری بھی خوش ہو گئے۔

مجھے ہنساؤ

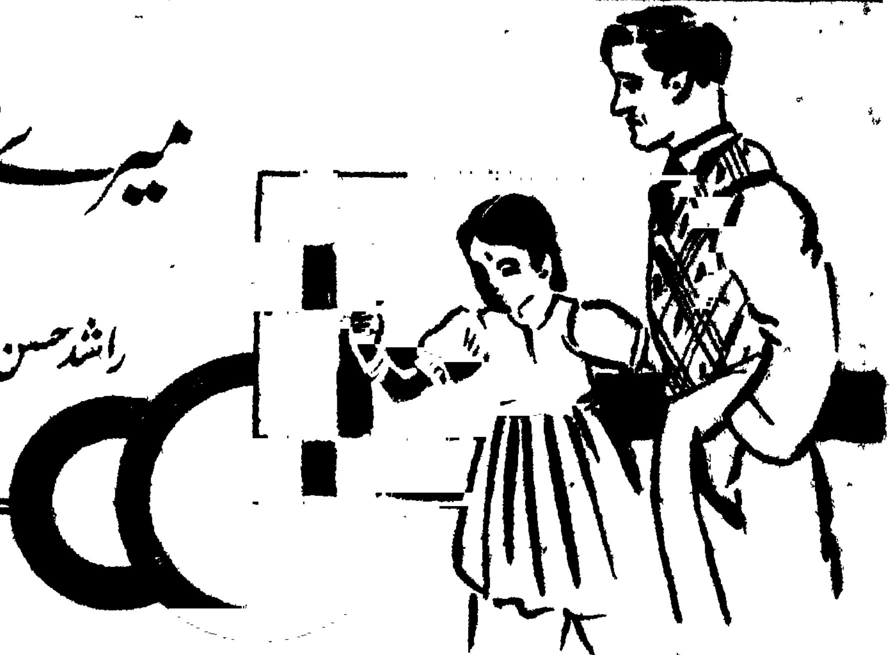
ایک دن بادشاہ بیربل سے بولے "اگر تم مجھے ہنسا دو تو میں تم کو بہت سا انعام دوں گا۔"

بیربل نے ہنسانے کی بہت کوشش کی مگر بادشاہ کو بالکل بھی ہنسی نہ آئی۔ بادشاہ نے تو طے کر لیا تھا کہ وہ ہنسے گا ہی نہیں جب بیربل نے دیکھا کہ بادشاہ کسی طرح نہیں ہنستا تو ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا "اگر اب بھی نہ ہنسے تو آپ کو گدگداؤں گا۔ پھر تو ہنسئے گا!"

بیربل کی بچوں کی سی بات سُن کر بادشاہ فوراً ہنس پڑا۔

میرے بھیّا

راشد حسن قادری



ہمارے بھیّا ارشد ایک معزز عہدے پر فائز ہو گئے تھے اور مجھے اپنے ہمراہ وہاں لے گئے تھے۔ امی جان نے بھیا کی خدمت کے لئے مجھے اور بڑی بی نصیبن کو ساتھ بھیجا۔ میں خود بھی جانا چاہتی تھی۔ ان کے ساتھ رہ کر میری پڑھائی خوب ہوتی تھی۔ میں نے ان کے خوشنما بنگلے کو خوب سجایا تھا۔

بھیا مجھے ہمیشہ ستایا کرتے تھے مگر اب چھیڑنا کچھ کم کر دیا تھا اس لئے کہ کہیں میں ناراض نہ ہو جاؤں لیکن بھیا کی یہ عادت چھوٹتی تو بھلا کیسے چھوٹتی۔

ایک روز بھیا اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھے ٹائپ کر رہے تھے۔ میں وہاں پہنچی۔

"کیا وحشت ہے" مجھے دیکھ کر بولے

"کیا آپ کام کر رہے ہیں بھیا؟" میں نے پوچھا

"تمہاری آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سوجھتا کم ہے" بھیا نے چھیڑنے کے لئے کہا

"پھر آپ تو میرے بھائی ہیں آنکھوں کا علاج کیوں نہیں کرا دیتے۔ کنجوس تو خود ہیں"

میں نے فوراً جواب دیا"

"بہت چل نکلی ہو تم تو" بھیا ٹائپ بند کرتے ہوئے بولے" چلو اچھا کام تو کیا ہوگا کچھ بکواس ہو گی"

"خیر بکواس ہی سہی ۔ سن تو لیجئے"

ہم دونوں دوسرے کمرے میں آ گئے

میں نے کہا" آپ کے ملازم صاحبزادے سعید کل سے غائب تھے ۔ آج ذرا آیا تھا بہت پریشان صورت ۔ میں نے حال پوچھا تو رونے لگا ۔ اس کا باپ مزدور ہے کہیں اوپر سے گر پڑا ۔ بہت چوٹ آئی ہے ۔ صرف ایک لڑکا سعید ہے وہ بھی چھوٹا ہے ۔ بچارے پر بڑی مصیبت پڑی ہے ۔"

"لو پھر تم تو تقریر کرنے لگیں صاف کیوں نہیں کہتیں کہ میں جا کر اس کی مزاج پرسی کروں ۔ ڈاکٹر کو دکھاؤں اور ان حضرت کی تیمار داری کروں ۔

بھیا کچھ بگڑنے لگے ۔

"آپ تو میری نہیں سنتے ۔ بھیا غریبوں کی مدد کرنا کوئی برا کام نہیں ہے ابھی اگر آپ کے صاحب بہادر کو زکام بھی ہو جاتا تو اپنی ساری ڈپٹی کلکٹری بھول جاتے اور ادردلی کی طرح حاضری دیتے ۔ بھیا مجھے افسوس ہوگا اگر آپ نے مدد نہ کی" میں نے کچھ طنزیہ لہجے میں کہا ۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے کسی کی تکلیف دیکھی یا سنی نہیں جاتی اور غریبوں سے تو مجھے خاص طور پر ہمدردی ہے ۔ بھیا بھی رحمدل ہیں مگر اس وقت خدا جانے کیوں سنگدل بن گئے تھے کچھ دیر تک خاموش کمرے میں ٹہلتے رہے پھر بولے

"ارے بھئی کھانا بھی کھلواؤ گی یا بھوکا دفتر چلا جاؤں"

میں نے کہا" کھانا تو کھا لیجئے مگر اس غریب کے لئے کیا سوچا"

"میں نے کسی غریب امیر کے لئے کچھ نہیں سوچا ۔ کوئی مرتا ہو تو مر جائے ہم کیوں مفت میں پریشان ہوتے پھریں ۔ تم نے سنا نہیں کمزور اور غریب کو جینے کا کوئی حق نہیں" بھیا بیزاری کے انداز سے بولے ۔ مجھے بڑی حیرت تھی کہ بھیا اتنے سنگدل کیوں کر ہو گئے کیا آدمی کے پاس کچھ پیسے ہو جاتے ہیں تو وہ بدل جاتا ہے ۔ مجھے بھیا پر بہت غصہ آ رہا تھا ۔ مگر ڈر کے مارے کم سے کم منہ تو انھیں ایسا جیسا

جیتی تھی۔

شام کو بھیا کی واپسی کا وقت ہو گیا ر وہ نہیں آئے۔ دو ایک گھنٹے انتظار میں کٹے رح طرح کے خیالات آ رہے تھے اب یاد آیا بح بھی بھیا دفتر کے وقت سے پہلے چلے گئے تھے۔ بھیا کبھی دیر نہیں لگاتے تھے میری وجہ سے نھوں نے کلب جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں میرے علاوہ صرف بڑی بی نصیبن تھیں۔ میں اسی پریشانی میں تھی کہ بڑی بی نے آ کر کہا "چپراسی آیا ہے کہتا ہے کہ صاحب، کلکٹر صاحب کے بنگلے چلے گئے ہیں ضروری کام ہے" مجھے اس اطلاع سے اطمینان ہو گیا چپراسی سے دریافت کرایا کہ "کب تک آئیں گے" اس نے کہا "ٹھیک نہیں بتایا یہ کہا تھا کہ آٹھ نو بجے تک آ جاؤں گا"

میں نے کچھ وقت پڑھائی میں گذارا پھر مغرب کا وقت ہو گیا۔ بڑی بی نے کھانا پکا لیا تھا۔ ان سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی نو بجے اور پھر دس۔ کچھ خیال نہیں کیا مگر جب ساڑھے دس بج گئے تو بڑی بی بہت پریشان ہوگئیں "ارے بے نہ جانے آج بچہ کہاں چلا گیا اس موئے کلکٹر نے جانے کس کام میں لگا دیا آج چائے بھی نہیں پی میرے بچے نے۔"

میں نے کہا "بڑی بی گھبراؤ نہیں بھیا نے کلکٹر صاحب کے یہاں چائے پی لی ہوگی پریشانی کی کیا بات ہے کوئی کام ہوگا۔ انھیں تو خود ہماری تنہائی کا خیال رہتا ہے۔"

میں نے بڑی بی کو تو تسلی دے دی مگر مجھے خود بہت فکر تھی وقت گزرتا رہا اور ہم دونوں پریشان ہوتے رہے۔ آخر ساڑھے گیارہ بجے بھیا تشریف لائے۔ میں نے اور بڑی بی نے سوال پر سوال کرنے شروع کر دیئے آخر بھیا نے تنگ آ کر کہا "ارے بھئی میں تو خود تمہاری وجہ سے کہیں نہیں جاتا اسی شرط پر تو امی جان نے تمہیں میرے ساتھ بھیجا ہے۔ کلکٹر صاحب کے یہاں بیٹھا تھا جو جج صاحب آ گئے وہ ابا جان کے دوست ہیں وہاں سے وہ اپنے گھر لے گئے بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔ مجھے خود تمہارا خیال تھا......"

"مگر بھیا یہ کون جج صاحب ہیں ابا جان کے دوست ہوتے تو مجھے معلوم ہوتا انھوں نے کبھی ذکر نہیں کیا نہ آپ نے بتایا" میں نے بات کاٹ

کر پوچھا

"تم بھی عجیب انسان ہو اچھا چلو کھانا تو کھاؤ باتیں پھر ہوں گی" بھیا نے کہا۔

کئی دن گذر گئے۔ بھیا اسی طرح صبح کو جلدی چلے جاتے اور شام کو دو ایک گھنٹے دیر کرکے واپس آتے تھے۔ میرے پوچھنے پر طرح طرح کے بہانے بنا دیا کرتے تھے۔ میں نے اس عرصے میں کئی بار بھیا سے سعید کے باپ کے لئے مدد کی درخواست کی مگر وہ ہمیشہ ناراضگی سے اس ذکر کو سُن کر ٹال دیا کرتے تھے۔ سعید بھی اس عرصہ میں نہیں آیا۔ بھیا دفتر کے علاوہ کہیں جاتے ضرور تھے، پوچھنے پر کبھی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو آج ضرور پوچھوں گی۔

چائے پیتے میں میں نے پوچھا "دیکھئے بھیا آج مجھے بتا دیجئے"

"کیا بتا دوں بھئی یہ خوب تم میری جان کھا کر رہو گی" بھیا نے بناوٹی غصہ سے کہا

"ہا قیامت نائیے" میں نے سنجیدگی سے کہا "آخر بتانے میں کیا حرج ہے آپ کہاں جاتے ہیں۔ میں روک تو نہیں لوں گی۔ مگر معلوم تو ہو جائے"

"بات یہ ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں تم امی جان کو نہ لکھ دو" بھیا بولے۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ امی جان کو نہیں لکھوں گی"

"اپنی بات پر قائم رہنا" بھیا بولے "میں نے سوچا کہ تمھیں اپنے لئے بھابی تلاش کرنے میں بہت دقت ہو گی۔ لہٰذا میں خود کیوں نہ تلاش کروں۔ یہاں جو جج ہیں ان کے گھر اسی لئے جاتا ہوں۔ ان کی لڑکی بہت قابل ہے"

"جی ہاں۔ سب معلوم ہے مجھے۔ اگر آپ کو وہ بات نہیں بتانی ہے تو نہ بتائیے۔ بہانے کیوں بنا رہے ہیں" میں نے کہا

"ارے تم جھوٹ سمجھ رہی ہو" بھیا نے کہا "کسی دن تم بھی چلنا"

"بس مجھے تو معاف رکھئے" میں نے کہا "آخر آپ کو ستانے میں کیا مزا ملتا ہے۔ بتا کیوں نہیں دیتے کہ کہاں جایا کرتے ہیں"

"بتا تو دیا اب تم نہ مانو تو میرے پاس کیا علاج ہے"

"آپ ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتے بھیا" میں

نے کہا

"افوہ تمھیں یقین نہیں آتا" بھیا نے مسکراتے ہوئے کہا" میں تمھارا امتحان لے رہا تھا!!"

"امتحان ... کیسا ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"غریبوں سے ہمدردی کے سلسلے میں! دیکھنا تھا کہ تمھیں کتنی ہمدردی ہے؟ سعید کے باپ کی طرف سے بیزاری تو ظاہری تھی جب تم نے اس کے باپ کے گرنے کی خبر سنائی تھی اس روز دیر میں جو آیا تھا تو اسے ہسپتال میں داخل کرانے گیا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ خدا نے بہت فضل کیا۔ سعید کو بھی اس لئے نہیں آنے دیا کہ تمھیں حال نہ معلوم ہو جائے۔ چپراسی کو سمجھانا پڑا۔ اب وہ اچھا ہے کمزور بہت ہے ویسے ہی بوڑھا بھی کافی ہے۔"

میں حیرت اور خوشی سے بھیا کی باتیں سن رہی تھی۔

"بھیا آپ نے ایک اسٹاد میں مجھے نتھ دلھن پریشان کیا۔ مجھے بہت رنج اور تعجب تھا۔"

"اتنا تو میں بھی سمجھ سکتا ہوں مگر تم نے جج صاحب والی بات کا یقین کیوں نہیں کیا۔"

"اس لئے کہ میں معلوم کرا چکی تھی کہ جج صاحب کے کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اور آج بھی آپ بتاتے تھوڑی میرے پیچھے پڑنے پر بتا دیا" میں نے کہا۔

"بڑی تیز ہو تم۔ تم نے کس سے معلوم کیا؟"

"کسی سے بھی کیا آپ کو کیا۔ آپ نے تو ستا لیا" میں نے کہا۔

"بس یوں ہی میں نے سوچا دیکھوں تم کیا سمجھتی ہو" بھیا بولے۔

"ایسی خوشی بھی کیا جو دوسروں کو ستا کر حاصل کی جائے۔ بڑے اچھے لگتے ہیں ہنستے ہوئے" میں نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے آج سچی خوشی حاصل تھی۔



کسی جزیرے میں جمیس نامی ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ کافی پڑھا لکھا تھا۔ اور اُسے سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار وہ ایک جہاز میں بیٹھ کر سفر کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

جہاز ایک شہر میں آ لگا۔ یہ شہر بڑا ہی صاف ستھرا تھا۔ اور یہاں کے مکانات بڑے اچھے تھے۔ ایک دن جیمس ایک پہاڑی پر ٹہل رہا تھا اور دل ہی دل میں وہاں کے مکانات کی تعریف کر رہا تھا "کتنے اچھے مکانات ہیں یہ۔ اس میں رہنے والے کتنے خوش رہتے ہوں گے" کہ ایک مکان سے کسی نے پکارا اس نے مڑ کر دیکھا تو کوئی سے ایک بڈھا اسے پکار رہا تھا۔ مکان کی طرف بڑھا۔ دروازے پر سے بڈھا نکل کر کہنے لگا

"یہ شاندار مکان میرا ہے کیا آپ اس کو اندر سے نہ دیکھیں گے!"

یہ گھر اندر سے بڑے قرینے سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ مکان کی سجاوٹ دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گیا اور بڈھے سے کہنے لگا "یہ مکان تو بڑا ہی خوبصورت ہے

اگر میں اس میں رہتا تو ہر وقت ہنستا رہتا مگر آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

بڈھے نے جواب دیا "تم اگر چاہو تو اس سے زیادہ شاندار مکان لے سکتے ہو تمھارے پاس کچھ روپے ہیں؟"

"پچاس روپے!" جیمس نے جواب دیا

"گرچہ آگے چل کر تمھیں تکلیف ہو گی مگر پچاس میں یہ تمھارا ہے۔" بوڑھا بولا

"کیا یہ گھر!" جیمس خوشی سے پھولا نہ سمایا

"نہیں! یہ بوتل" بڈھے نے ساتھ ہی ساتھ ایک لمبی گردن کی ایک بوتل نکالی۔

بوتل کا شیشہ دودھ کی طرح سفید تھا اور ہر وقت رنگ بدلتا رہتا تھا۔ اندر ہی کوئی پرچھائیں پھر رہی تھی جیمس اسے مذاق سمجھ کر ہنس دیا۔ "تم ہنس رہے ہو!" بڈھے نے کہا۔ "اگر تم اسے مذاق سمجھتے ہو تو اس بوتل کو توڑنے کی کوشش کرو۔" جیمس نے بوتل اٹھائی اور پوری طاقت کے ساتھ زمین پر دے مارا۔ بوتل ٹوٹنے کے بجائے گیند کی طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"عجیب بوتل ہے! یہ تو شیشے کی بنی ہوئی نہیں معلوم ہوتی!" جیمس حیرت میں پڑ گیا۔

"شیشے کی تو یہ ضرور ہے۔ مگر اس کا شیشہ دیوتوں کے ملک کا بنا ہوا ہے۔ اس کے اندر ایک شریر دیو بند ہے اندر جو پرچھائی گھوم رہی ہے وہ اسی کی ہے۔ اسے ایک بادشاہ نے قید کر رکھا ہے یہ جس آدمی کے پاس رہے گا اسے دولت، تندرستی، عزت دے گا۔ اور اس میں ایک خرابی بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اسے کوئی مرنے سے پہلے فروخت نہیں کرے گا تو وہ جہنم میں جائے گا۔

جیمس جہنم کا نام سن کر تو گھبرا گیا۔ بڈھے نے اس سے کہا "ڈرو مت۔ بلکہ اس بات کی کوشش کرو کہ اس بوتل سے زیادہ چیزیں نہ مانگو اور جب تمھارا دل اس سے بھر جائے تو کسی کے ہاتھ بیچ دینا۔"

جیمس نے بڈھے سے کہا "میں دو باتیں سوچ رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ تم ہر وقت ٹھنڈی آہیں کیوں بھر رہے ہو؟ دوسرا یہ کہ اس بوتل کو اتنا سستا کیوں بیچ رہے

بڈھے نے جواب دیا" میں ٹھنڈی آہیں کیوں بھر رہا ہوں یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور بوتل کم قیمت پر اسی لئے فروخت کر رہا ہوں کہ یہ ایک شرط ہے کہ جتنے میں یہ بوتل خریدی گئی ہو اُس سے کم میں بیچی جائے"

"مگر میں کس طرح سمجھوں کہ یہ سب بالکل سچ ہے؟" جیمس نے بڈھے سے پوچھا

"تم اس کی آزمائش ابھی کر سکتے ہو۔ اپنے پچاس روپے مجھے دے دو اور بوتل لے لو بوتل سے اپنے پچاس روپے واپس لانے کو کہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے روپے واپس کر دوں گا"

جیمس نے بوتل لے لی اور کہا" اے بوتل کے غلام، میرے پچاس روپے واپس لا دو"

ابھی اس بات کو ختم بھی نہ کیا تھا کہ اس کی جیب میں روپے چھنکنے لگے۔

"یہ سچ مچ بڑی اچھی بوتل ہے!" اب تو جیمس خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

"تو اب جاؤ، میرے دوست، اور دیو کو اپنے ساتھ لئے پھرو" بڈھے نے کہا

"ٹھہرو! مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں تم اپنی بوتل لے لو" جیمس نے چلا کر کہا۔ بڈھے نے جیمس کی ایک نہ سنی اور اپنے نوکر سے کہہ کر اس کو گھر سے نکلوا دیا۔

جیمس نے گھر سے نکل کر سب سے پہلے اپنا روپیہ گنا۔ سب ٹھیک تھا





مگر اب تو وہ بوتل سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچنے لگا اور راستے میں بوتل چھوڑ دی۔ دو مرتبہ اس نے مڑ کر دیکھا تو بوتل وہیں پڑی ہوئی تھی۔ تیسری بار دیکھ کر جب وہ مڑا تو اسے کسی چیز سے چوٹ لگی۔ دیکھا تو یہ بوتل کی گردن تھی۔ اور اس کے کوٹ کی جیب میں تھی۔ "بڈھے نے ٹھیک ہی کہا تھا" جیمس دل میں سوچنے لگا۔

سمندر کے کنارے ایک دکان تھی جہاں سمندر کی لائی ہوئی چیزیں فروخت ہوتی تھیں جیمس نے وہاں یہ بوتل ساٹھ روپے میں بیچ دی اور گھر جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا۔

جیمس کو جہاز پہ بھوک لگی تو کھانے کی چیزیں نکالنے کے لئے اس نے اپنا بکس کھولا وہ دم بخود رہ گیا۔ بوتل بکس کے ایک کونے رکھی ہوئی تھی۔ بڈھے کی بات بالکل سچ نکلی۔ اور جیمس یہ سمجھ گیا کہ یہ سچ مچ جادو کی بوتل ہے۔

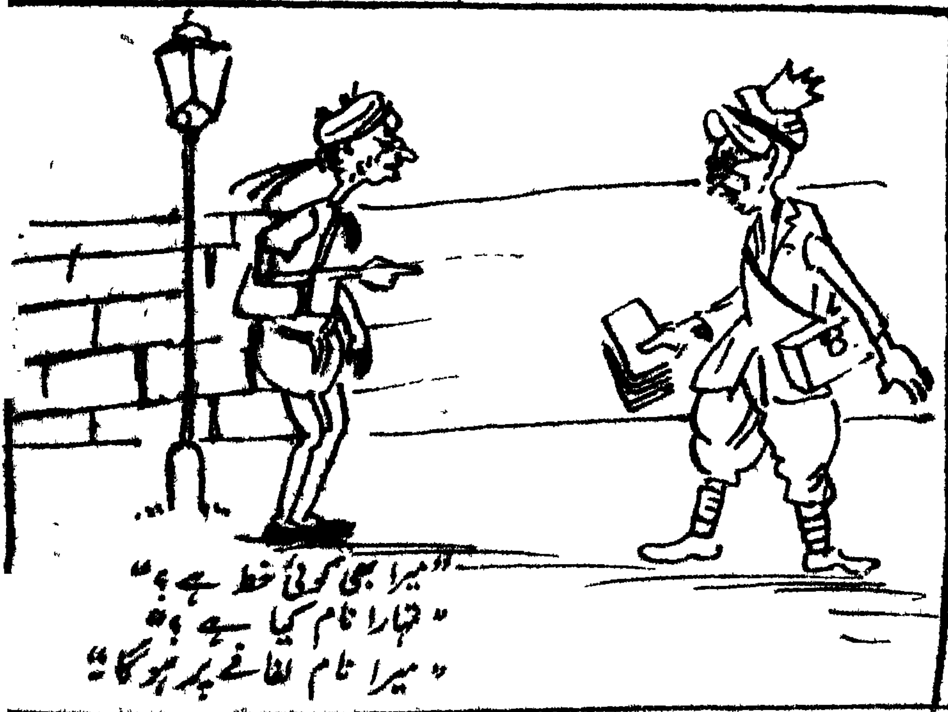
اپنے گھر پہنچ کر جیمس ایک ٹھیکیدار کے یہاں گیا اور ایک نہایت ہی خوبصورت اور شاندار محل تیار کرنے کا کہہ دیا۔ جتنے روپے کی بھی ضرورت ہوتی سب بوتل کا غلام حاضر کر دیتا۔

محل تیار ہو جانے پر اس نے چین کی شہزادی سے شادی کر لی۔ بلکہ بڑی خوبصورت تھی۔ اس لئے اور بھی خوش ہو گیا اور اب تو وہ چین کا شہزادہ بھی کہلانے لگا تھا۔

بقیہ صفحہ ۴۹ پر دیکھئے



ایکسپیر ــــــ نہیں نہیں ایک گز دودھ دیجئے۔



"میرا بھی کوئی خط ہے ؟"
"تمہارا نام کیا ہے ؟"
"میرا نام لفافے پر ہوگا"

سیّد منیر الحسن

میاں خوجی نے ریل کا سفر کیا

اُن سب چیزوں کے نہ ملنے سے اور اس طرح ریل کا سفر کرنے سے میاں خوجی بری طرح ناراض ہو ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک مسافر ریل کے ڈبے میں (جس میں میاں خوجی بیٹھے تھے) داخل ہوا۔ میاں خوجی نے زور سے چلا کر کہا "ابے ہائیں، ہائیں۔ او مسافر کے بچے۔ کہاں سر پر چڑھا چلا آرہا ہے" (مسافر میاں خوجی کے سامان پر اپنا سامان رکھ دیتا ہے تو خفا ہو کر کہتے ہیں) "لے اب ہٹاتا ہے میری گٹھری پر سے اپنا بستر کہ جماؤں ایک دھپ، گنوار لٹھ کہیں کا واللہ جانت سجانت کا جانور ہے کہ گھسا چلا آتا ہے۔"

مرزا جی نے کہا "اجی خواجہ صاحب چھوڑیئے سفر میں ایسا ہو ہی جاتا ہے اور ہاں یہ تو بتایئے کہ اُس دن نخاس (شہر لکھنؤ میں ایک مشہور بازار کا نام) میں آپ کو اگر میں نہ سنبھالوں تو اُس کمبخت ٹھیلے والے کے چھپٹے میں آکر آپ کچل ہی گئے ہوتے" میاں خوجی نے جواب دیا۔ "کون کچل گیا ہوتا؟ میں! اجی توبہ کیجئے۔ وہ تو کہئے کہ مجھ میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ اپنے زور اور تیزی میں آکر گھومتا ہوں —— اور ہاں بھئی اُس دن نہ جانے کس دھن میں گردن جھکائے چلا جا رہا تھا کہ نظر جو اٹھاتا ہوں تو ٹھیلا سر پر۔ اب اگر ہٹتا نہیں تو ڈر تھا کہ میری ٹکر سے ٹھیلے کے پرخچے نہ اُڑ جائیں۔ بس جناب، پھرتی سے جھکائی دے کے بجلی کی

طرح جو ایک کنارے مڑا تو بدن کا بوجھ نہ سنبھل سکا۔ اب میری جگہ کوئی دُبلا پتلا آدمی ہوتا تو صاف اپنے کو بچا جاتا۔ مگر میں ٹھہرا پیل تن جوان۔ آپ اپنے جھونک میں نیچے آ رہا۔"

مرزاجی نے منہ بناتے ہوئے کہا:" اور وہ بھی منہ کے بل!" میاں خوجی نے جل کر جواب دیا:" بس اسی نکتے کو تو تم سمجھتے نہیں ہو اجی ہم نے پہلوانی کی ہے پہلوانی، اور پھر ہم ہی کیا یہ تو ہمارے باپ دادا سے چلی آتی ہے سینکڑوں، ہزاروں دنگل سر کئے ہیں۔ تم نے اناڑی سمجھا ہے کہ چت گرتے۔ ایک بات یاد رکھو کہ اکھاڑے کا لڑا ہوا پہلوان جب گرے گا تو منہ کے بل۔ کیا مجال جو زمین سے پیٹھ لگ جائے۔" مرزاجی نے کہا:" او ہو۔ ہو! مانتا ہوں استاد۔ بھئی کیا بات پیدا کی ہے۔"

میاں خوجی نے کہا:" اچھا تو لے اسی بات پر ہماری گٹھری ادھر لاؤ دوست۔ ذری سی افیم گھول کے دو ایک چسکیاں لگا لوں تو جان میں جان آئے۔" مرزاجی بولے — "تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ گاڑی چھوٹ جائے تو گھونٹنا افیم۔" میاں خوجی نے کہا:" واہ میاں خدا کی قسم جماہیوں پہ جماہیاں آ رہی ہیں۔ اب نہیں ٹھہرا جاتا۔" مرزاجی نے کہا:" تو لیجئے حضرت سنبھالئے اپنی گٹھری — لیکن ہاں خواجہ صاحب۔ ذری کم زیادہ کا بھی خیال رکھیئے گا۔ کہیں آپ پینک میں اتنا غفیل ہو گئے تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

میاں خوجی نے کہا:" اجی توبہ کیجئے ایسی سدھی ہوئی چٹکی رکھتے ہیں کہ کیا مجال جو رتی بھر کم یا زیادہ ہو جائے۔ لے اب میں ذری گٹھری کھول کے ڈبیا نکال لوں۔ (گٹھری کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں) اونہہ۔ تو یہ! کس قدر سخت گانٹھ لگائی ہے کہ کھلتی ہی نہیں۔ میں نے تو اس سلیقے سے گرہ لگائی تھی کہ ناخنوں کے سہارے کھل جائے۔ (پھر گرہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر کھلتی ہی نہیں۔ تو خفا ہو کر کہتے ہیں) بھئی میں نہ مانوں گا۔ اس گٹھری کو کسی پاجی نے چھیڑا ضرور ہے۔ یہ ہرگز ہرگز میری لگائی ہوئی گرہ نہیں ہو سکتی۔ (پھر کھولنے کی کوشش کرتے ہیں) اونہہ — بات تمہارے کی (اطمینان

کے بیچ میں) اب جا کے کھلی تا معقول — ایں تھیلی کیا ہو گئی۔ اس کا تو کہیں پتہ ہی نہیں (زور سے چلا کر) اماں یار۔ اس میں وہ تھیلی تو ملتی ہی نہیں۔ جس میں افیم کی ڈبیا تھی" مرزا جی نے کہا " یہ کیسے ہو سکتا ہے گٹھری کسی نے چھوئی تک نہیں"

میاں خوجی نے روتی آواز میں کہنا شروع کیا " ہائے۔ ہائے غضب ہو گیا۔ ارے بھائی مرزا جی ہم تو نانا جان کی قسم بے موت مرے۔ واللہ بے موت۔ خدا جانتا ہے قیامت ٹوٹ پڑی" مرزا جی نے کہا — " اجی ذرا حواس سے ڈھونڈیے تھیلی جائے گی کہاں؟ کپڑوں کی تہ میں ادھر سے ادھر ہو گئی ہو گی" میاں خوجی روتی صورت بنا کر بولے " ادھر ادھر کہاں ہو گئی ہو گی صاحب؟ ایک ایک کپڑا تو جھاڑ کر دیکھ رہا ہوں — اے یہ لیجئے۔ (پھر دوسرا کپڑا جھاڑنے کی آواز) اور اے یہ لیجئے۔ (پھر تیسرا کپڑا جھاڑنے کی آواز) اور صاحب یہ لیجئے — وہ ایک انگل کی بھی نہیں پورے ڈیڑھ بالشت کی تھیلی ہے۔ آخر زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ جائیو میں تو لٹ گیا۔ واللہ کہیں کا نہ رہا — (روتے ہوئے) گٹھری بندھی کی بندھی رہ گئی اور کوئی گرہ کٹ صاف تھیلی نکال لے گیا۔ ہائے، ہائے۔ آنکھوں میں خاک جھونک کے بھری کی بھری ڈبیا کوئی موذی لے گیا"

مرزا جی نے کہا — " آخر لے کون جائے گا۔ گٹھری نگاہوں کے سامنے سے بھی تو نہیں ہٹی" میاں خوجی نے چلا چلا کر بین کرتے ہوئے کہا " ارے خدا غارت کرے اس ملعون کو۔ اُس نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا اُف دل بیٹھا جاتا ہے"

ایک مسافر میاں خوجی سے بولا " کیا ہوا کوئی چیز جاتی رہی کیا — کتنا روپیہ تھا تھیلی میں" دوسرے مسافر نے جواب دیا " کوئی بھاری رقم ہو گی جب تو پچھاڑیں کھا رہا ہے"

پہلا مسافر میاں خوجی کے قریب آ کر کہتا ہے " ابھی تو گاڑی کھڑی ہوئی ہے — پولس میں رپورٹ کر دیجئے" دوسرے مسافر نے میاں خوجی کے قریب آ کر کہا — " آخر آپ کی تھیلی میں کتنی رقم تھی؟" میاں خوجی نے اپنی دُھن میں روتی آواز سے کہا —

"ڈھیروں تھی بھائی کئی روز چلتی۔ سب لے اڑا اٹھائی گیرا۔ اور گھولنے کی ننھی ننھی دو پیالیاں گھاتے ہیں — ہائے اب جینے کے لالے پڑ گئے۔ کیونکر زندگی ہوگی! — ارے بھائی کوئی سنبھالو مجھے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آرہا ہے۔"

مرزاجی نے ڈانٹ کر کہا "کیا عورتوں کی طرح واویلا مچا رکھی ہے۔ ذراسی چیز کے لئے جیسے آپ کی جان ہی تو اس ڈبیا میں بند تھی۔ چلو اگلے اسٹیشن پر اتر کر ہم تمہیں افیم کے کھیت میں چھوڑ دیں گے۔ پیٹ بھر کے چر لینا۔" میاں خوجی نے نڈھال آواز میں جواب دیا — "میاں جان نکلی جارہی ہے تمہیں دلگی سوجھی ہے۔ خدا کے لئے اس وقت ہمیں پریشان نہ کرو۔" مرزاجی نے جب یہ دیکھا کہ میاں خوجی کی جان پر بنی ہوئی ہے تو انھوں نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔ اہاہاہا — اہاہاہا آگئے نہ چکمے میں۔ بڑے سائیاں بنتے تھے۔ اہاہاہا۔" میاں خوجی نے بگڑ کر کہا "یہ کون ہنسی کا وقت ہے۔ قسم قرآن کی میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔" مرزاجی نے اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ زور سے قہقہہ لگایا "اہاہاہاہا۔ اہاہاہاہا۔" اس کے ساتھ ہی مرزاجی نے سوچا کہ اب زیادہ پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ ڈبیا دے ہی دینا چاہیے۔"

میاں خوجی کو بھی کچھ کچھ شک ہونے لگا تھا کہ ہو نہو ڈبیا مرزاجی کے پاس ہے چنانچہ اب میاں خوجی نے مرزاجی سے کہا۔ "بھئی تمہیں قسم قرآن کی سچ سچ بتاؤ مرزاجی" مرزاجی نے کہا۔ "اکے (یعنی تانگے) میں بیٹھتے وقت جب آپ باتوں میں لگے ہوئے تھے تو میں نے چپکے سے گٹھری کھول کے آپ کو دق کرنے کے لئے ڈبیا صاف اڑا دی۔" میاں خوجی نے کہا۔ "بھئی تم نے مجھے دوبارہ زندہ کر دیا۔ بخدا پھر سے زندگی پائی — افوہ یہاں تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ اب تک اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہے۔ مگر یار مرزا ہو تم بڑے شیطان۔ آخر اس جان جوکھم کی دلگی سے کیا فائدہ تھا؟ لے اب سیدھے سیدھے ڈبیا ہمارے حوالے کر دو نہیں تو قسم ہے پروردگار کی اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گا۔" مرزاجی نے کہا "بس نکل گئی سب تیزی۔

بڑے چالاک اور تجربے کار بنتے تھے۔ لگے ایک ہی مجرے میں چکر گھنی کی طرح ناچنے۔ لیجئے سنبھالئے اپنی تھیلی اور یہ دیکھئے اس میں آپ کی ڈبیا اور چینی کی پیالیاں دونوں موجود ہیں۔" میاں خوجی نے تھیلی لیتے ہوئے کہا "جیتے رہو۔ بھئی یہاں تو گویا مر کے پھر سے جی اٹھے ۔۔۔ لے مرزا جی۔ اب ذری اپنی صراحی سے رتی بھر پانی تو ہم کو انڈیل دو، اس چینی کی پیالی میں" مرزا جی نے پانی دیتے ہوئے کہا "لیجئے" میاں خوجی بولے "بس بس کافی ہے۔ (پانی میں افیم گھولنا شروع کر دیتے ہیں) شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے، جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔ ہاہا بھئی کیا خوشبو نکلی ہے۔ دماغ تر و تازہ ہو گیا ۔۔۔ لو بھئی وہ برفی والا بھی آ نکلا۔ نہ سہی کھیر کے پیالے بلا سے۔ برفی ہی سے منہ میٹھا کریں گے۔ (چلا کر) او برفی والے۔ ابے او برفی والے ہوت، ابے او خوانچے والے کے بچے"

مرزا جی نے میاں خوجی کی جب یہ حالت دیکھی تو کہا "اماں پھر دہی بوکھلا گئے دور ہی سے کسی خوانچے والے کو دیکھ لیا اور کفن پھاڑ کے چیخنے لگے ۔۔۔ یہ تم نے کیسے اتنی دور سے پہچان لیا کہ برفی والا ہے۔ چسکی لگانے (یعنی افیم کھانے) سے پہلے ہی بہکنے لگے" میاں خوجی بڑے طمطراق سے بولے "اجی ہم اپنے مطلب کی چیز کو کوسوں دور سے تاڑ لیتے ہیں واللہ سہ

خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

(ایک مسافر کو مع سامان اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر) ابے ہائیں ہائیں! چھاتی پر چڑھا چلا آتا ہے مردود۔ ہٹا اپنی چھتری ایک طرف کو۔ ادھر جا کے بیٹھ دوسری طرف آنکھیں ہیں کہ ٹک کے ڈھیلے۔ دیکھتا نہیں ہے کہ ہم ادھر بیٹھے افیم گھول رہے ہیں۔ اور جو چھلک جائے تو"

مسافر نے بگڑ کر کہا "زبان سنبھال کر بات کیجئے۔ میں بھی قوم کا شیخ ہوں۔ کوئی بھنگی چمار نہیں ہوں کہ تو تکار کرنے لگے"۔ میاں خوجی نے غصہ سے کہا "چپ بے بڑا شیخ کا چچا بن کے آیا ہے۔ زیادہ تین پانچ کرے گا تو وہ طمانچہ رسید کروں گا کہ منہ

چرخا ہو جائے گا — بڑا آیا ہے لڑنے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ چلے ہیں وہاں سے کمیدانوں اور رسالداروں سے الجھنے۔" مسافر نے بھی غصے میں چیخ کر کہا — "ابے تیرے کرو گے تو ابھی ٹھیک بنا دوں گا۔" میاں خوجی نے بپھر کر کہا — "بس خبردار ملعون! زیادہ بولا تو گدی سے زبان کھینچ لوں گا۔ نہ ہوئی قرولی نہیں تو قسم ہے استاد کی اس مردود کی بوٹی بوٹی کاٹ کے ڈال دیتا۔" مسافر کا پارہ بھی چڑھ گیا۔ اس نے بھی نہایت غیظ کے عالم میں کہا — "بڑا ہیکڑ خاں بنتا ہے! تو یوں نہ مانے گا۔ یہ لے (طمانچہ مارتا ہے) — — اور بولے گا؟"

میاں خوجی بینچ سے اُٹھ کر مسافر سے گتھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں — "تیری ایسی کی تیسی مردود۔ قیمہ بنا کے رکھ دوں گا۔ لانا تو میری قرولی۔" مرزا جی نے جب یہ حال دیکھا تو لگے کہنے "ہائیں۔ ہائیں۔ اماں جانے بھی دو خواجہ صاحب بس رہنے دو۔" مگر میاں خوجی کہاں ماننے والے تھے۔ جب مرزا جی نے یہ دیکھا کہ میاں خوجی کا پارہ اس وقت بہت گرم ہے۔ تو پھر مرزا جی مسافر کی طرف منہ کرکے کہنے لگے "آپ ہی مان جائیے حضرت!" مسافر تو غصہ میں تھا ہی کہنے لگا "آج میرے ہاتھ سے اس کی قضا آئی ہے بدمعاش!" میاں خوجی کیا اس سے کم تھے کہنے لگے "چھاتی پر چڑھ کے خون چوس لوں گا مردک۔" مرزا جی نے دونوں کو سنبھالا اور بیچ بچاؤ کرنے کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "بس بس چھوڑ دو جی چھوڑ دو۔ اجی بھئی خوجی تم ہی الگ ہو جاؤ۔"

گاڑی کی سیٹی کی آواز سنائی دی تو مرزا جی کہتے ہیں — "لیجئے۔ گاڑی بھی چھوٹ گئی۔ لے بڑے میاں اب غصہ تھوک ڈالئے (گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی) ارے ارے ہاتھ نہ مروڑیئے خواجہ صاحب کا جناب۔ یہ آپ کیا کرتے ہیں۔" میاں خوجی درد سے کراہتے ہوئے بولے "ابے ہاتھ ٹوٹا ملعون اوگیدی۔ ابے او بہروپئے۔ ہائے جان نکلی۔ دہائی ہے ریل کے صاحب کی! دہائی ہے انگریز بہادر کی!"

گاڑی دھیرے دھیرے خوب تیز ہو جاتی ہے۔

بھگت کبیر

وقار خلیل شاہ پوری



ڈاک کے نئے یادگاری ٹکٹ تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے۔ اس بار ہماری حکومت نے ہمارے شاعروں کو اہمیت دیتے ہوئے ان کے یادگاری ٹکٹ جاری کئے ہیں۔ تین پیسے کے ٹکٹ پر بھگت کبیر کی تصویر ہے۔ کبیر داس جی کے دوہے کس نے نہیں سنے۔ اور آج ان ہی دوہوں کی بدولت بھگت کبیر کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔

بابا کبیر داس بنارس کے رہنے والے تھے۔ ان کا زمانہ ساڑھے پانچ سو برس پہلے کا ہے۔ کبیر بابا کی پیدائش کے بارے میں بہت سے قصّے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک جولاہا جس کا نام نورا تھا اور ان کی بیوی کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک تالاب کے کنارے ان کو ایک بچہ پڑا ہوا ملا۔ ان کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ نورا نے اُسے اٹھا لیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ "اللہ میاں نے ہم کو ایک چاند سا بچہ دیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کی دیکھ بھال کریں۔ انھوں نے اس کا نام کبیر رکھا۔

بڑے ہو کر کبیر نے جولاہے کا کام سیکھ لیا۔ وہ کپڑا بھی بُنتے اور بنارس کی گلیوں میں گھوم گھوم کر بیچتے بھی۔

یوں تو کبیر داس بالکل ہی اَن پڑھ تھے مگر تھے سمجھ دار۔ ان کا کہنا تھا کہ ظاہری اور دکھاوے کی عبادت سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل میں تو انسان کو تن من سے خدا یا پرماتما سے محبت کرنی چاہیئے۔ کچھ دن بعد کبیر جی نے دوہے کہنے شروع کئے۔ یہ دوہے اُس زمانے کی عام بول چال میں ہوتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ عام لوگ ان کے خیالات کو سمجھنے لگے۔ ان کا ایک دوہا ہے:-

جب تک ہے بیکنٹھ کی آسا
تب تک نہ ہری چرن نواسا

یعنی جب تک تمھیں جنت کی خواہش ہے اس وقت تک تم ہری یا پرماتما تک نہیں پہنچ سکتے۔

وہ اسی طرح کے دوہے کہتے رہے اور گلی کوچوں میں جا جا کر گاتے رہے لیکن کپڑا بُننے کا کام انھوں نے پھر بھی نہ چھوڑا۔ آپ روز اتنا ہی کام کرتے تھے جتنے پر کہ ایک روز کا خرچ نکل آتے۔

ایک دن آپ کپڑا بیچنے کے لئے بازار گئے۔ ایک سادھو آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا "بھگوان، تیرا بھلا کرے، یہ کپڑا مجھے دے دے، میں ننگا ہوں"! آپ کپڑے کو پھاڑنے لگے تاکہ آدھا اُسے دے دیا جائے۔ مگر سادھو نے کہا کہ "نہیں آدھے کپڑے سے میرا کام نہ چلے گا"۔ کبیر جی نے پورا کپڑا اُن کے حوالے کر دیا۔ اور وہ دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔ ادھر آپ بھی خوش کہ چلو میں نے کسی کی سیوا تو کی۔ اس خوشی کے ساتھ ایک ڈر بھی آپ کے دل میں پیدا ہوا۔ وہ یہ کہ اگر میں خالی ہاتھ گھر جاؤں گا تو ماتا جی کیا کہیں گی۔ اس ڈر کے مارے وہ ایک جگہ جا کر چھپ گئے۔ تین دن اِدھر اُدھر چھپنے کے بعد گھر آئے۔

بنارس کے لوگ اُن کو اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جلاہے کا کام کرتے ہیں اور پڑھے لکھے نام کو نہیں۔ اسی لئے انھوں نے کبیر داس جی کا نام "بے پیر" رکھ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جس نے خود ہی کسی سے سبق

نہیں لیا وہ دوسروں کو کیا سبق دے گا۔ اس لئے کبیر جی نے سوچا کہ ضرور کسی پڑھے لکھے گرو کا چیلا بن جانا چاہئے۔

اس زمانے میں سوامی راما نند جی کا بڑا چرچا تھا۔ کبیر نے بھی ان کا نام سُن رکھا تھا۔ سوامی راما نند روز گنگا اشنان کے لئے جایا کرتے تھے، ایک دن جو وہ گھاٹ کی سیڑھی سے اُترے تو اُن کا پاؤں کسی آدمی پر پڑا۔ وہ رام، رام کہہ کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ در اصل راما نند جی کے قدموں کو چھونے کے لئے ہی وہاں آکر لیٹ گئے تھے۔ تبھی تو انھوں نے فوراً سوامی راما نند جی سے کہا "سوامی جی، مجھے اب اپنے قدموں میں سدا کے لئے جگہ دیجئے۔" انھوں نے کبیر کو اپنا شاگرد بنا لیا۔ ان کے ساتھ ساتھ راما نند جی کے شاگردوں میں ایک چمار، ایک جاٹ اور ایک نائی بھی تھا۔

چیلا بننے کے بعد بھی کبیر اپنے گھر پر جلاہے کا کام اسی دلچسپی سے کرتے رہے۔ کرگھے کے سامنے بیٹھ جاتے اور لوگوں کو اپنے بھجن گا گا کر سناتے۔ انھوں نے شادی بھی کر لی تھی۔ وہ دکھاوے کی عبادت کے سخت خلاف تھے۔ اور ہندو مسلمانوں کے اختلاف کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ چنانچہ کاشی کے ہندو مسلمان ان کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے جب اپنے ایک دوہے میں کہا کہ:۔

ایک جوت ہی تو سب اپجا کون برہمن، کون سُدا
کہے کبیر اک رام جپو، ہندو ترک نہ کوئی

یعنی ایک ہی طاقت سے سب پیدا ہوئے ——— کبیر داس کہتے ہیں کہ ایک پرماتما کو یاد کرو، نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان۔

اس سے ہندو مسلمان دونوں خفا ہو گئے۔ چنانچہ دونوں نے دلّی کے بادشاہ سکندر لودھی سے کبیر داس کی شکایت کی، کبیر کو بادشاہ نے بلوا بھیجا۔ آپ دربار میں پہنچے تو شاہی سلام بھی نہ کیا۔ درباری یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے، کبیر نے کہا مجھے نہ سلام آتا ہے اور نہ مجھے بادشاہ سے کوئی کام ہے، میرا تو بادشاہ اور ہی ہے۔ یہ سُن کر سکندر کو بہت غصہ آیا اور اس نے اُن کو

بنارس سے نکلوا دیا۔ مگر کبیر نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کو کون ان کے دل سے نکال سکتا تھا۔ اب تو وہ گھوم گھوم کر بنارس کے باہر بھی لوگوں کو اپنے دوہوں کے ذریعے اپنا پیغام پہنچاتے رہے۔ کچھ دنوں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد کبیر جی بنارس لوٹے۔ اب تو اُن کی بڑی عزت ہونے لگی، اور اُن کے بہت سے ماننے والے ہو گئے۔

مرنے سے تین دن پہلے وہ بنارس چھوڑ کر مگہر چلے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنارس کے بارے میں تو لوگوں کا خیال تھا کہ جو کوئی بنارس میں مرے وہ سیدھا بیکنٹھ (جنت) میں جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مگہر میں مرتا ہے تو اگلا جنم گدھے کا ہوتا ہے لوگوں کے اس وہم کو نکالنے کے لئے انھوں نے مگہر میں مرنا پسند کیا۔ اپنے ایک دوہے میں انھوں نے کہا ؎

کیا کاشی کیا اوسر مگہر رام ہردے بس میرا
جو کاشی تن تجے کبیر رام تو کو نہ نہورا

یعنی کاشی یا مگہر جیسی جگہ میرے لئے دونوں برابر ہیں۔ میرے من میں تو رام بسے ہوئے ہیں۔ اگر کبیر کی موت بنارس میں ہوتی ہے تو رام کا کون سا احسان؟

کہتے ہیں کہ جب کبیر داس اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تو اُن کی لاش کو دفنانے کے لئے مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک نیا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ کبیر کی لاش کو ہم دفن کریں گے اور ہندوؤں کی خواہش تھی کہ اُن کی ارتھی کو ہندو دھرم کے مطابق جلائیں۔ یہ بات بہت بڑھ گئی جب لوگوں نے کبیر داس کی لاش پر سے چادر ہٹائی تو لاش تو وہاں نہ تھی بلکہ اس کی جگہ کچھ پھول پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ آدھے پھول ہندوؤں نے اور آدھے مسلمانوں نے بانٹ لئے اور اپنے اپنے دھرم اور مذہب کے مطابق ان کی یادگار بنائی۔

کبیر داس جی بہت بڑے شاعر تھے ان کے دو تین دوہے اور پڑھئے۔

پاہن پوجے ہری ملے، تو میں پوجوں پہاڑ
تاتے یہ چاکی بھلی پیس کھائے سنسار

یعنی اگر پتھر پوجنے سے خدا مل سکتا

تو میں ضرور پہاڑ پوجنے لگتا۔ ان پتھروں سے تو چکی ہی بھلی ہے جس سے لوگ اناج پیس کر کھا لیتے ہیں۔

پریم نہ باڑی اپجے، پریم نہ ہاٹ بکائے
راجا پرجا جو بے روچے، سیس دئی لے جائے

یعنی پریم نہ تو باغیچے میں پیدا ہوتا ہے اور نہ ہاٹ بازار میں بکتا ہے۔ وہ تو سر دے کر ملتا ہے، راجا ہو یا پرجا جس کا جی چاہے لے جائے۔

نہائے دھوئے کیا بھیا، جو من میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے، دھوئے باس نہ جائے

اگر من کا میل دور نہ ہو تو نہانے دھونے سے کیا فائدہ، مچھلی ہمیشہ پانی میں ہی رہتی ہے۔ لیکن اس کی بدبو دھلنے سے بھی نہیں جاتی۔

بقیہ دلی کے تین بڑے آدمی صفحہ ۱۵ سے آگے

وہ انسانی محبت، نیکی، سچائی، ہمت اور قربانی کا بہترین نمونہ تھے۔ وہ قوم اور ملک کے لئے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں جیل بھی گئے۔ وہاں ان کی صحت اتنی خراب ہوئی کہ آخر ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی بہت مشہور تھے۔ وہ ہر شخص کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ ان کی مسکراہٹ اور دلجوئی سے مریض کی آدھی بیماری بھاگ جاتی تھی۔ ان کے تمام جاننے والے ان کی مہربانیوں کو آج تک یاد کرتے ہیں۔ ان کا انتقال ہوا تو سب نے ایسا محسوس کیا جیسے ان کے سر سے ایک شفیق باپ کا سایہ اٹھ گیا ہو۔

لطیفے

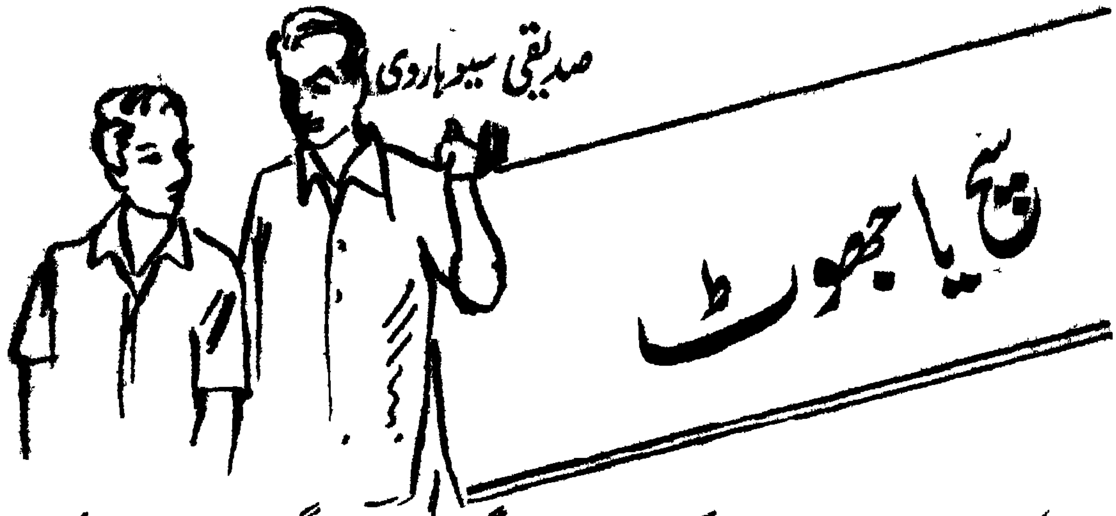
ایک دفعہ ایک افسر کچھ پرانے خطوط
پھاڑ رہا تھا۔ اس کے نوکر نے اس سے کہا۔
نوکر:۔ حضور یہ خط مت پھاڑیئے۔
افسر:۔ کیوں ؟
نوکر:۔ میری بیوی نے مجھ سے کہا ہے کہ
ہر ہفتہ ایک خط بھیجا کرو۔ میں ہر
ہفتہ ان میں سے ایک خط ڈاک میں
ڈال دوں گا۔

نوکر:۔ (اپنے مالک سے) حضور! مجھے ایک ہفتہ
کی چھٹی دی جائے۔ کیونکہ میری بہن کی
شادی ہونے والی ہے۔
مالک:۔ کس سے ہوگی ؟
نوکر:۔ ایک آدمی سے ہوگی۔
مالک:۔ ارے بیوقوف کبھی عورتوں سے
بھی شادی ہوتی ہے ؟
نوکر:۔ جی ہاں! میرے بھائی کی شادی ایک
عورت سے ہوئی تھی۔

انسپکٹر:۔ جب قیدی فرار ہوا تھا تو کس کا
پہرہ تھا ؟
کانسٹبل:۔ جناب میرا پہرہ تھا
انسپکٹر:۔ تم نے اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا تھا
کانسٹبل:۔ وہ فرار ہو کر اس باغ میں چلا گیا تھا
جہاں لکھا تھا کہ گھاس پر چلنا منع ہے
سید انور حسین

ماسٹر۔ موہن تمہاری گھڑی اسکول سے ملی ہے
موہن۔ جی نہیں مجھے تو بھائی سے ملی ہے۔

راشدہ دوا کی ٹکیہ نہیں کھاتی تھی چنانچہ اس کی ماں نے
رس گلا چیر کر اس میں دوا کی ٹکیہ رکھ دی۔
تھوڑی دیر بعد ماں نے دریافت کیا۔
ماں:۔ بیٹی رس گلا کھا لیا۔
راشدہ:۔ ہاں رس گلا تو کھا لیا مگر اس میں جو بیج
تھا وہ نکال کر پھینک دیا۔



سچ یا جھوٹ

صدیقی سیوہاروی

گوپال ایک مالدار تاجر تھا۔ اس کی رنجیت سے بڑی گہری دوستی تھی۔ مگر رنجیت غضب کا چالاک تھا۔ اسی لئے تو لوگ اس کو بُرا سمجھتے تھے۔ مگر گوپال اس کو بہت اچھا سمجھتا تھا۔ اور اس پر اتنا بھروسہ کرتا تھا کہ ایک بار جب وہ باہر جانے لگا تو اس نے بہت سے روپئے رنجیت کے حوالے کرتے ہوئے کہا "بھیا رنجیت میری اس امانت کو احتیاط سے رکھو، میں جب واپس آؤں گا تو اسے لے لوں گا ــــــ مجھے تمہارے علاوہ اور کسی آدمی پر بھروسہ نہیں ہے، اسی لئے تمہارے پاس رکھے جاتا ہوں"

رنجیت نے بڑی خوشی سے وہ روپئے لے لئے اور کہا "گوپال بھیا! تم بے فکر رہو، میں اس کی اسی طرح خبرگیری کروں گا جس طرح اپنے مال کی کرسکتا ہوں۔ جب تم آؤگے تو تمہیں تمہارا یہ مال اسی حالت میں ملے گا"

اب گوپال مطمئن ہوکر اپنے سفر پر چل دیا۔

ادھر اتنے بہت سے روپئے دیکھ کر رنجیت کی نیت ڈانوا ڈول ہوئی۔ اس نے سوچا کہ آج کل بڑی تنگی ہے۔ دوست کے کچھ روپے خرچ کر لینے میں کیا حرج ہے جب

گوپال آئے گا تو دیکھا جائے گا۔

کچھ دنوں کے بعد جب گوپال سفر سے واپس آیا تو اس نے جاکر رنجیت سے تقاضا کیا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ رنجیت تو کچھ روپئے خرچ کر چکا تھا۔ پورے ہوتے تو دے دیتا۔ اب وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ گوپال کو شبہ ہوا اور اس نے سختی سے تقاضا کیا۔ آخر رنجیت نے صاف انکار کر دیا اور بولا "ارے گوپال بھیا! اتنی جلدی بھول گئے۔ مال تو تم واپس لے گئے، اب میں کہاں سے دوں"

یہ سن کر گوپال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس لئے کہ کبھی اس کے خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ رنجیت اس کے ساتھ بے ایمانی کرے گا۔ مگر اب تو رنجیت صاف انکار کر رہا تھا۔ گوپال نے پھر بھی صبر سے کام لیا اور بولا "رنجیت بھیا! کیوں مذاق کرتے ہو۔ لاؤ اب تو واپس کر دو، بس بہت کر لیا مذاق"

مگر رنجیت کوئی مذاق تھوڑا ہی کر رہا تھا۔ فوراً بولا "تم کو مذاق ہی سوجھ رہا ہے، گوپال! بھلا جب میں تمہارا روپیہ واپس دے چکا تو اب کہاں سے لاؤں"

اب تو سچ مچ گوپال سٹ پٹا گیا اس نے سوچا کہ سیدھی انگلیوں گھی نکلنا مشکل ہے چنانچہ گوپال نے گھر آکر اپنے دوسرے دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔ دوستوں نے پہلے تو گوپال کی حماقت پر افسوس کیا پھر رائے دی کہ پنچائت کے سامنے اپنا معاملہ رکھ دو۔

گوپال نے ایسا ہی کیا۔ آخر پنچ نے دونوں کو بلایا اور دونوں کی باتیں بڑے غور سے سنیں۔ گوپال کہتا تھا کہ میرے روپے رنجیت نے واپس نہیں کئے اور رنجیت کہتا تھا کہ روپے تو میں نے گوپال کو واپس کر دئے ہیں۔ اب پنچ اس پریشانی میں تھے کہ کس کو سچا کہیں اور کس کو جھوٹا۔ آخر فیصلہ اس پر ہوا کہ دونوں قسم کھا کر بات کریں۔ گوپال نے فوراً گنگا جلی اٹھالی اور بولا "گنگا مائی کی قسم، میرے روپے رنجیت نے واپس نہیں کئے ہیں"

اب تو قسم کھانے کی رنجیت کی باری

تھی۔ اس نے بھی اسی طرح دوڑ کر گنگا جلی اٹھا لی اور کہا "بھگوان کی قسم، روپے رنجیت کے پاس ہیں۔ میں نے اسے واپس دے دیئے ہیں۔"

اب تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا فیصلہ دیں۔ مگر ان پنچوں میں ایک آدمی بڑا سمجھ دار تھا۔ اس نے سوچا کہ آخر یہ کیا بات تھی کہ رنجیت نے گنگا جلی اٹھاتے وقت اپنی رضائی گوپال کو پکڑا دی تھی۔ ضرور کوئی ایسی بات ہے ورنہ وہاں تو رنجیت کے اور رشتے دار بھی کھڑے تھے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے فوراً رضائی لے کر ٹٹولی اور کہا "ارے! اس میں تو کچھ کاغذ ہیں" ایک طرف سے رضائی کو کھولا تو اس میں سے نوٹ نکلے۔ اب تو رنجیت کا چہرا اتر گیا۔ رنجیت نے سچ سچ جھوٹی قسم کب کھائی تھی۔ اس نے تو قسم کھانے سے پہلے روپے گوپال کے ہاتھ میں دے دیئے تھے۔

(انگریزی سے ماخوذ)

بقیہ عجیب بوتل صفحہ ۴۳ سے آگے

جب جیمس بوتل سے سب کچھ مانگ چکا تو اُس نے اسے ایک شرابی کے ہاتھ دو روپے میں فروخت کر دیا۔ ایک دن شرابی نشہ میں چور دریا کے پاس سے گذر رہا تھا کہ اس کا پاؤں لڑکھڑایا اور وہ بوتل کے ساتھ دریا میں جا گرا۔

اب تو وہ اور بھی خوش رہنے لگا کیونکہ اُس نے بوتل بیچ دی تھی۔ اور بوتل دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔

بقیہ بچوں کی کوششیں صفحہ ۵۳ سے آگے

نہیں گزرتی، مگر اب کبھی خودکشی کا خیال بھی نہیں کرتا۔ مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے آخر ماں باپ نے مجھے کتنی تکلیف اٹھا کر پالا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں اور بھی مرنے کے نام سے گھبراتا ہوں۔

محمد علی زین الدین
(عمر ۱۳ سال) بھیونڈی

لالچ کا نتیجہ

بچوں کی کوششیں

ایک جنگل میں ایک چیتا رہتا تھا۔ وہ اتنا بوڑھا ہوگیا تھا کہ خود شکار تک نہ کر سکتا تھا۔ اسی لئے اس نے سوچا کہ تالاب کے کنارے جوگی بن کر بیٹھ جاؤں تو لوگ بے خوف و خطر میرے پاس آئیں گے۔ اگر کبھی موقع ملا تو میں ایک آدھ کو چٹ کر جاؤں گا۔ یہ سوچ کر وہ تالاب کے کنارے بیٹھ گیا اور جھوٹ موٹ خدا کی عبادت کرنے لگا۔ اس نے اپنے پاس ایک سونے کی زنجیر اور کچھ متبرک گھاس رکھ لی۔

ایک دن ایک شامت کا مارا آدمی وہاں آیا۔ چیتے کے پاس سونے کی زنجیر دیکھ کر اس کے دل میں لالچ پیدا ہوئی۔ چیتے نے اس سے بہت ہی محبت کے ساتھ باتیں کیں اور زنجیر دینے کا وعدہ کیا۔ اس آدمی نے کہا۔

"میں بہت غریب ہوں اور اس کا بدلہ نہیں دے سکتا ہوں" چیتے نے کہا۔

"میں غریبوں کی ہی مدد کرتا ہوں۔ تم ڈرو مت۔ میں نے دنیا چھوڑ دی ہے اور میرے پاس جنگل کے تمام جانور آتے ہیں تم نہا کر آؤ۔ میں تم کو یہ زنجیر دیتا ہوں۔"

وہ آدمی غریب تھا وہ پہلے تو ڈرا لیکن پھر جب اس نے یہ باتیں سنی تو وہ سونے کی لالچ میں آگیا۔ اور نہانے گیا۔ اچانک اس کا پاؤں دلدل میں پھنس گیا۔ چیتے نے کہا۔

"گھبراؤ مت میں تمہاری مدد کرتا ہوں"

اور چیتے نے اس کو نکال کر اپنا شکار بنالیا۔

ٹھیک ہے لالچ بری چیز ہے۔
لالچ نہ کرنا چاہیئے۔

سید انور حسین

محنت کا پھل

کسی زمانے میں ایک بہت غریب کسان رہتا تھا اس کے تین لڑکے تھے۔ ہریش۔ نریش اور رمیش۔ رمیش سب سے چھوٹا تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے سنا تھا کہ غریب آدمی بھی اگر پڑھ لکھ لیں تو بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔ وہ بھی بڑا آدمی بننا چاہتا تھا لہٰذا اس کا یہ شوق دن بدن بڑھنے لگا۔

رمیش ایک ایسے غریب کسان کا لڑکا تھا جن کو دو وقت روٹی بھی تو میسّر نہ تھی۔ کسان بوڑھا ہونے کی وجہ سے زیادہ تر کام اپنے بیٹوں سے کرواتا تھا۔ اس کو اس بات کا بہت رنج تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کو تعلیم نہیں دے سکا۔

ایک دن رمیش نے اپنے باپ سے کہا "ابا میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کتاب لادو" اس کے باپ کو یہ سن کر ہنسی آئی لیکن جلد ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی رمیش اپنے باپ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا وہ بھی اپنے سوال پر کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔ اسے بالکل یاد نہ رہا تھا کہ آج دوپہر کو روٹی بھی نہ پکی تھی تو پھر قاعدہ کے لئے پیسے کہاں سے آتے؟ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اس کے باپ نے کہا " بیٹا میں تمہیں ضرور کتاب منگا دیتا لیکن میرے پاس ایک پیسہ بھی تو نہیں۔ اگر تم کو پڑھنے لکھنے کا اتنا شوق ہے تو کہیں نوکری کرلو اور کام سے جو وقت بچے بیٹھ کر پڑھ لیا کرو"

رمیش کو یہ صلاح بہت پسند آئی۔ اس نے دو روپیہ مہینہ پر زمیندار کے یہاں نوکری کرلی۔ اس کا کام شہر سے سودا سلف لانا تھا۔ وہ اپنا کام جلدی جلدی سے کرکے شام کے وقت زمیندار کے لڑکے سے پڑھنے لگا۔ وہ پڑھنے میں بہت دل لگاتا تھا اسی وجہ سے اس کا قاعدہ بہت جلد ختم ہوگیا۔ پھر اس نے دوسری کتاب منگالی اور وہ بھی خوب دل لگا کر پڑھی۔ زمیندار کے لڑکے نے جب اس کا یہ شوق دیکھا تو اپنے باپ سے کہہ کر گاؤں کے اسکول میں اسکو داخل کروا دیا۔

گاؤں میں اس نے چار درجے تک پڑھا۔ پھر وہ زمیندار کے لڑکے کے ساتھ شہر پڑھنے چلا گیا اور وہاں ایک اسکول میں داخل ہوگیا۔ رمیش اسکول میں بہت محنت سے پڑھتا یہاں تک کہ اس نے اوّل نمبر میں ہائی اسکول پاس کرلیا۔ اب تو گاؤں بھر میں اس کے چرچے ہونے لگے۔ اس کا باپ بھی بڑا خوش ہوا۔

پھر رمیش نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب تو وہ اپنی تعلیم کا خرچہ بچوں کو پڑھا پڑھا کر پورا کرتا تھا۔ وہ بھی اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ اسی طرح پڑھ پڑھ کر اس نے آخر کار ایم۔ اے بھی کرلیا۔ اور ایک کالج میں پروفیسر ہوگیا۔

اب تو اس کے ماں باپ ہنسی خوشی رہنے لگے اور رمیش کی دیکھا دیکھی گاؤں کے دوسرے لوگوں کو بھی اپنے بچوں کو پڑھانے کا شوق پیدا ہوگیا۔

ضیا احمد رضوی

ایک مفلس کی آپ بیتی

میری جھکی ہوئی کمر اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں پیشانی پر جھرّیاں۔ میری یہ حالت اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ میں اسّی سال کا بوڑھا ہوں۔ مگر میری عمر تو تیس۳۰ سال کی ہے مسلسل فاقوں کی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی ہے۔

میں بوری بندر اسٹیشن کے باہر نکلا لوگوں کی گالیاں کھاتا ہوا۔ سامنے ایک مکان نظر آیا جس میں ایک عورت آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے پاس اس کا کتّا بیٹھا تھا۔ وہ اس کتّے کو بسکٹ کھلا رہی تھی۔ میرے دل میں تو آیا کہ اس عورت کا گلا گھونٹ دوں۔ مگر پھر میں اپنے راستے پر چل دیا۔ سڑک پر موٹریں، لاریاں اور بسیں گذر رہی تھیں۔

اتفاقاً ایک ٹرام میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے سوچا شاید کوئی خدا کا بندہ مل جائے۔ مگر سب نے مجھے جھڑک دیا مجھے بہت رنج ہوا مگر میں کر ہی کیا سکتا

تھا۔ میں اپنے غم کو پی گیا۔ میرے سامنے سے اچھی سے اچھی موٹریں جا رہی تھیں۔

پھر ایک ہاتھی صفت بس میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے ایک بابو جی اترے۔ میں نے بابو جی سے کہا کہ مجھے ایک پیسہ دیدیجئے میں چار دن سے بھوکا ہوں لیکن انھوں نے الٹا مجھے ایک چانٹا رسید کیا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت پیدا ہو گئی۔ میرا دل کہنے لگا یہ دنیا امیروں کی ہے اس دنیا میں غریبوں کو کوئی زندہ رہنے کا حق نہیں۔ میں مرجاؤں گا ابھی مرجاؤں گا، ضرور مرجاؤں گا۔

ادھر سے مجھے ایک بس آتی نظر آئی۔ میں نے سوچا اس بس کے نیچے میں مرجاؤں تو اچھا ہے۔ جب بس میرے بہت قریب آئی تو میرے دل میں ڈر پیدا ہوا یہ ہاتھی صفت بس میرے جسم پر سے گزر جائے گی۔ نہیں۔ — نہیں — میں نہیں — میں نہیں مروں گا ایک مفلس کا بھی دل ہے۔ جب بس رکی تو اس میں سے ایک سیٹھ صاحب اترے میرا ہاتھ ان کے کوٹ کو لگا۔ وہ آگ بگولہ ہو گئے اور بولے کیا تم اندھے ہو۔ میرا کوٹ خراب کر ڈالا۔ میں نے واشنگ کمپنی سے دھلوایا تھا۔ ذرا دیکھ کر چلا کرو۔ اس کی گالیاں سن کر مجھے بہت رنج ہوا اور میں رونے لگا اور میں نے پھر سوچا کہ اب میں مرجاؤں گا۔

ایک اور بس مجھے آتی نظر آئی۔ میں نے سوچا اس بس کے نیچے آجاؤں گا تو اچھا ہو گا۔ بس میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ جب بس میرے بہت قریب آگئی تو پھر مجھے ڈر پیدا ہوا کہ یہ بس میرے اوپر سے چلی جائے گی۔ میں بس کے نیچے آکر مرنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ خیال آنا تھا کہ جیسے میرے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور میں نے سوچ لیا کہ اب میں ان پریشانیوں کا ہمت کر کے مقابلہ کروں گا۔ محنت مزدوری کروں گا اور کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا اور وہ دن ہے اور آج کا دن، میں دن بھر قلی کا کام کرتا ہوں اور دونوں وقت کھانا کھاتا ہوں۔ یوں تو زندگی آرام سے

صحیح حل معمہ نمبر ۱۵	صحیح حل معمہ نمبر ۱۵
دائیں سے بائیں	اوپر سے نیچے
۱- چین	۱- چادر
۳- بد	۲- نان
۷- رہ	۴- گرمی
۸- مار	۵- نگر
۹- شیر	۶- ساری
۱۰- آبادی	

معمہ نمبر ۱۵ کا شاندار نتیجہ

۱۵ پندرہ روپے کی شاندار تقسیم

صحیح حل موصول نہ ہونے کی وجہ سے پہلا انعام ایک غلطی دو اشخاص پر بحساب ۷ روپے ۸ آنے فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

۱- رابعہ خاتون۔ معرفت ایم۔ ایم۔ حق۔ پیش امام۔ مسجد گھوسیان۔ سہارنپور

۲- شکیل احمد۔ مکان ۹۵/۱۹۶۔ ہمایوں باغ۔ کانپور۔

دوسرا انعام دو غلطی والے پانچ اشخاص پر بحساب ایک روپیہ فی کس تقسیم کیا گیا

۱- شہزاد محمد خاں۔ جبلپور۔ ۲- اقبال النساء۔ کمال کاؤں۔ ۳- شریفہ بیگم عثمانی۔ جودھپور۔ ۴- مامونہ بیگم عثمانی جودھپور ۵- محمد احمد۔ کانپور۔

تیسرا انعام تین غلطی والے ۱۲ اشخاص پر بحساب ۸ر فی کس تقسیم کیا گیا

۱- احمد بادشاہ۔ نیلور۔ ۲- فخر الدین۔ کلکتہ۔ ۳- سید رضا۔ جامعہ نگر۔ ۴- گوپال چند۔ بجادلپور ۵- عبد الستار۔ فلیح احمد نگر۔ ۶- سراج احمد۔ پٹنہ۔ ۷- تعقدار خاں۔ فیض آباد۔ ۸- محمد اسماعیل۔ رائے بریلی ۹- سعد الدین احمد۔ رامپور۔ ۱۰- الہٰی بیگم۔ صورت ۱۱- امین الرحمٰن۔ دہلی۔ ۱۲- اشفاق احمد۔ کانپور۔ سید یوسف اختر زکی، کورد وائی اسٹیٹ۔

معمہ نمبر ۱۷ کے حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ ر نومبر [illegible] ہے

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

۱۵ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں

داخلے کی آخری تاریخ ۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء ہے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۷ روپے
دوسرا انعام ایک غلطی پر ۵ روپے
تیسرا انعام دو " " ۳ روپے

پیامی معما نمبر ۱۷

دائیں سے بائیں

۱۔ پڑھو گے لکھو گے بنو گے ___
۵۔ کمزور کو تو ہر کوئی ___ لیتا ہے۔ دبا۔ جلا
۶۔ مجرم اگر بڑا ہو تو سزا بھی ___ دینا چاہیے۔ بڑی۔ کڑی
۸۔ ___ کس کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔
۹۔ چھوٹے بچے ہی بڑے ہو کر دنیا میں بڑا ___ کرتے ہیں۔ کام۔ نام

اوپر سے نیچے

۱۔ اس کے بغیر کھاتا ہی کیا۔ نان۔ نون
۲۔ اس کا ہونا بھی مصیبت سے کم نہیں۔ دولت۔ شہرت
۳۔ زیادہ تر ___ ہی کہانیاں سناتی ہیں۔ نانی۔ دادی
۴۔ زیادہ ___ اچھا نہیں ہوتا۔ رونا۔ سونا
۷۔ ___ کو تو سزا ملنی ہی چاہیے۔ ملزم۔ مجرم

پیامی معما نمبر ۱۷

گ				ب	ا	د	ن
د	ا			ڑ	ک		
ن				ی	ڑ		ن
ا	ی	ت	م				
			ج	ا	ن	ا	
			ر		م	ا	۹
			م				

کوپن پیامی معما نمبر ۱۷

نام ....

پتہ ....

پرنٹر و پبلشر حامد علی خاں
مطبوعہ:- چکوری پریس دہلی



یہ ہیں ننھے دوست ہمارے

میں بھی تو دیکھوں
دادا کیسے بھلے ہیں



Regd. No. D. 96.
NOVEMBER 1952.

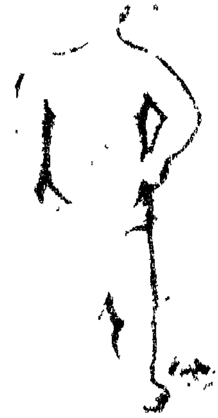


ہمارے دیس کے لوگوں کی مختلف پوشاکیں **D. 96.**

1952.



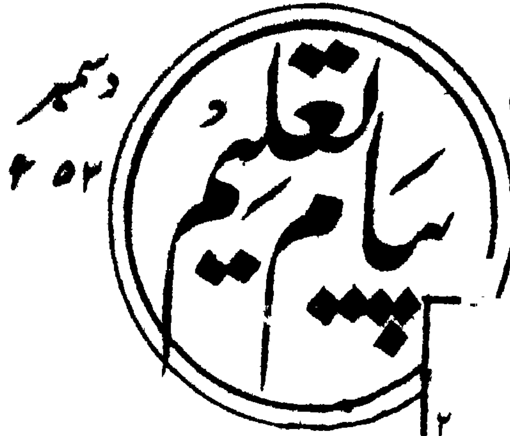




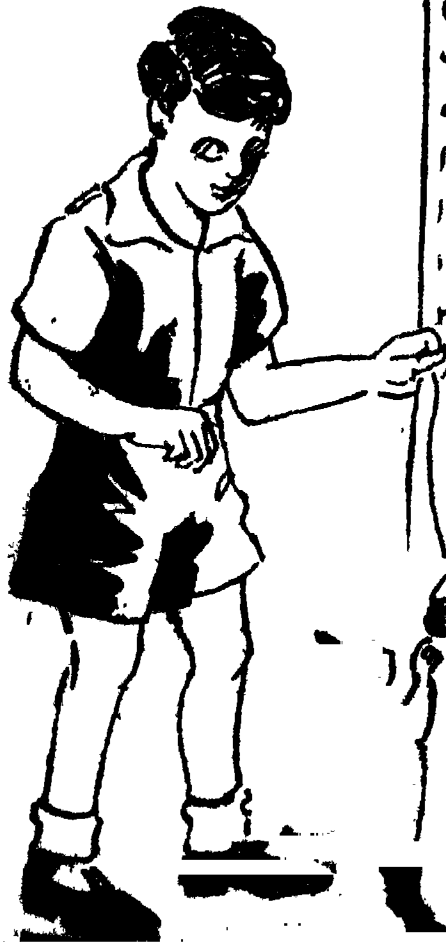




دسمبر
۵۲ء



ادارہ حامد علی خاں بی، اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم، اے (علیگ)
سالانہ چندہ ۴ روپے
فی پرچہ ۶ آنے



فہرست



بچوں سے باتیں

آپ اس بار یہ انتظار کر رہے ہوں گے کہ شاید پیام تعلیم میں میلے کی کہانی چھپے۔ مگر میلے کی تاریخیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ دسمبر کے پرچے میں اس کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ اب اگلے پرچے تک اس کا انتظار کیجئے۔

لیکن آئیے ہم آپ کو ایک خبر سنائیں، جس کو سن کر آپ پھڑک اٹھیں گے۔ آپ کے "پیام تعلیم" نے اس بار میلے کے دنوں میں اپنا ایک روزانہ ضمیمہ نکالا۔ جس میں ہر روز میلے کا حال چھپتا رہا۔ میلے میں آنے والے بچوں نے تو خیر اسے دلچسپی لے کر پڑھا ہی، لیکن بڑوں نے بھی پسند کیا۔ تین دن جامعہ نگر میں دھوم مچی رہی۔ بچوں کا روزانہ اخبار دیکھ کر بڑے بھی دنگ رہ گئے اور کیوں نہ ہوتے، نئی بات جو تھی۔ بڑوں کے اخبار تو نہ جانے کتنے نکلتے ہیں۔ بچوں کا تو یہ پہلا اخبار تھا۔

اس بار بھی تعلیمی میلہ بہت کامیاب رہا۔ حکومت ہند کے وزیر اطلاعات جناب کیسکر صاحب نے افتتاح فرمایا۔ جامعہ نگر میں بجلی کے آنے کی وجہ سے

میلے کی شان دوبالا ہوئی۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ ساری دُکانیں برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھیں۔ چاٹ کی دوکان سے لے کر انگریزی مٹھائی کی دُکان تک۔ ہر طرف بھیڑ لگی رہتی تھی۔ پھر اس کے ساتھ دن بھر کے پروگرام تو اور بھی مزیدار ہوتے تھے۔ بچوں کا مشاعرہ، گانے کا پروگرام، اور رات کا کیمپ فائر، ان سب نے میلے کی شان کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اس میلے کی ایک خصوصیت اور تھی جس نے اس کو پچھلے میلوں سے بڑھا دیا تھا۔ اتوار کے دن شام کو پنڈت جواہر لال نہرو، مسز اندرا گاندھی اور اُن کے دونوں بچے بھی میلہ دیکھنے آئے اور بچوں نے انھیں خوب سیر کرائی۔

ہم پیام تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں لیکن دراصل پیام تعلیم صرف ہماری کوششوں سے ہی ترقی نہ کر سکے گا۔ اس کے لئے یہ بھی تو ضروری ہے کہ آپ بھی اس سے دلچسپی لیں۔ اس کے لئے خریدار بنائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ دلچسپی لیں تو یقیناً خریدار بنا سکیں گے۔ اس طرح ہم پیام تعلیم کو اور زیادہ خوبصورت بنا سکیں گے۔ اس ماہ میں جو بچے خریدار بنائیں گے۔ ہم ان کے نام اگلے ماہ کے پیام تعلیم میں شائع کریں گے۔

امید ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچے اس مہم میں شریک ہوں گے

ادارہ

لالو اور لالی کی کہانی

لالو اور لالی دونوں بہن بھائی بڑے مزے میں رہتے تھے۔ بس کبھی کبھی کسی چھوٹی موٹی بات پر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ لالی زور سے ڈانٹ دیتی تو لالو خاموش ہو جاتا۔





ایک دن جیسے ہی لالو گھر میں داخل ہوئے تو لالی نے ڈانٹ بتائی "ارے تم نے بنئے کے روپے نہیں دئے ۔" لالو بولے "واہ تم نے مجھے روپے دئے کب جو دیتا۔" اب لالی کو اور غصہ آگیا "آج صبح ناشتہ کرتے وقت میز پر رکھ دئے تھے۔"

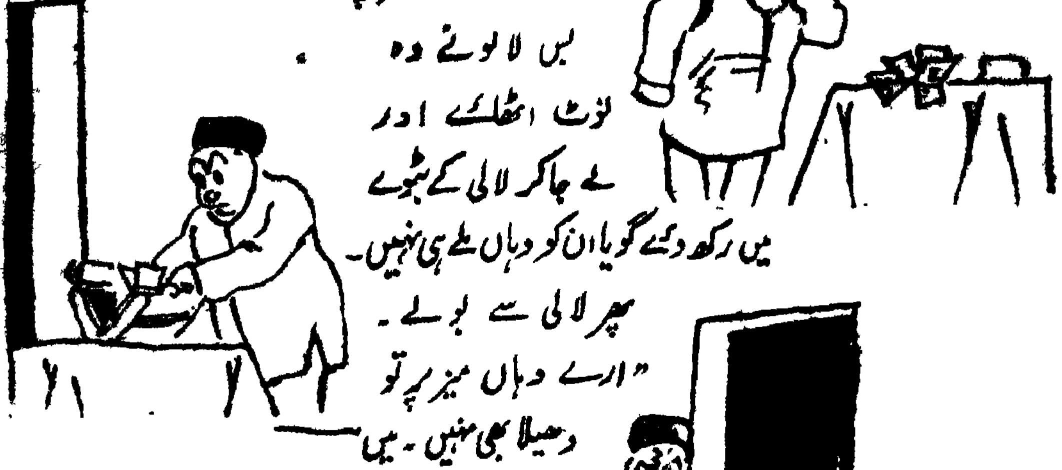
لالو بیچارے چپ ہو گئے اور لگے تلاش کرنے ایک ایک میز کے نیچے جا کر دیکھتے کہ کہیں گر گئے ہوں لیکن یہی کہتے جاتے "مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھے نہیں دئے ۔"

آخر لالی نے اپنے بٹوے میں دیکھا تو وہ روپے اسی میں رکھے ہوئے تھے۔ اس نے چپ چاپ کھانے کی میز پر رکھ دئے۔ دوسرے کمرے میں جا کر دیکھا تو لالو میز کے نیچے تھے اور سب سامان کو الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ لالی بناوٹی غصے سے بولی "کھانے کی میز تو جا کر دیکھو، مجھے یقین ہے کہ وہیں رکھے ہوں گے ۔"





اب لالو کھانے کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ نوٹ اسی میز پر رکھے ہوئے تھے۔



بس لالو نے وہ نوٹ اٹھا کے اور لے جا کر لالی کے بٹوے میں رکھ دئے گویا ان کو وہاں ملے ہی نہیں۔ پھر لالی سے بولے۔ "ارے وہاں میز پر تو دھیلا بھی نہیں۔ میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ جاؤ تم بھی دیکھ لو"



مگر لالی یہ سُن کر حیران ہو گئی کہ یہ کیا ماجرا ہے میں تو خود کھانے کی میز پر رکھ آئی تھی۔

اس نے اپنے بٹوے میں دیکھا تو وہ نوٹ اسی طرح بٹوے میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔



لیکن ذرا سی دیر بعد وہی نوٹ لالو کی ٹوپی میں سے نکلے۔ یہ بات نہ لالو کے سمجھ میں آئی اور نہ لالی کو معلوم ہو سکا کہ یہ روپے اِدھر سے اُدھر کیسے پہنچ جاتے تھے۔



سونے والو جاگو

حفیظ جالندھری

جاگو سونے والو جاگو
وقت کے کھونے والو جاگو

باغ میں چڑیاں بول رہی ہیں
کلیاں آنکھیں کھول رہی ہیں

پھول خوشی سے جھوم رہے ہیں
پتّوں کا منہ چوم رہے ہیں

جاگ اٹھے دریا اور نہریں
جاگ اٹھیں موجیں اور لہریں

ناؤ چلانے والے جاگے
پار لگانے والے جاگے

ساری دنیا جاگ رہی ہے
کام کی جانب بھاگ رہی ہے

لکھنے پڑھنے والو جاگو
چھوٹے بڑے پڑھنے والو جاگو

منہ دھو دھا کر ناشتہ کھاؤ
بستے لے کر مدرسے جاؤ

صبح کا سونا خوب نہیں ہے
اچھا یہ اسلوب نہیں ہے

جاگو سونے والو جاگو
وقت کے کھونے والو جاگو



مسعود الحق

ایک ملک، ایک مِلّت

(ڈراما)

ڈرامے تو آپ نے دیکھے ہوں گے۔ لیکن آج جو ڈراما ہم آپ کو دکھائیں گے وہ بالکل انوکھا ہے۔ دوسرے ڈراموں سے بالکل مختلف۔ دیکھو رنگ برنگی روشنیوں سے کیسی جگ مگ جگمگ ہو رہی ہے۔ سامنے ایک خوبصورت پردہ جھول رہا ہے۔ لو وہ گھنٹی بجی۔ اور پردہ اُٹھا ایک لڑکا اور ایک لڑکی سامنے نکلے۔ لڑکا دھوتی پہنے ہوئے ہے۔ سفید دھوتی، سفید کرتا۔ پاؤں میں سیاہ چپل۔ لڑکی ساری باندھے ہے لیکن یہ ساری باندھنے کا خاص انداز ہے۔ ساری کمر سے لپٹی ہوئی سامنے سے ہوکر کندھے پر سمٹتی ہوئی پشت پر جھرنے کی طرح گر رہی ہے۔

لڑکی۔ ہم بنگال سے آئے ہیں۔

لڑکا۔ اسی لئے ہمیں بنگالی کہتے ہیں۔

لڑکی۔ ہم چاول اور مچھلی شوق سے کھاتے ہیں۔

لڑکا۔ ہماری بنگالی زبان بڑی میٹھی اور رسیلی ہے۔ اس زبان کا سب سے بڑا شاعر رابندر ناتھ ٹیگور گذرا ہے۔ ہندوستان میں پہلی بار اسی

شاعر نے دنیا کا سب سے بڑا
انعام ' نوبل پرائز، حاصل کیا تھا۔

لڑکی۔ ہمارے یہاں اکثر لڑکیوں کو ناچنا گانا آتا ہے۔ یہ ہماری تہذیب میں شامل ہے۔

لڑکا۔ ہمارا کلکتہ شہر ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ وہاں تقریباً پچاس لاکھ کی آبادی ہے۔ یہاں کی ٹرامیں بہت خوبصورت اور آرام دہ ہوتی ہیں۔ یہاں فٹبال کا کھیل ہندوستان بھر میں سب سے اچھا ہوتا ہے۔

لڑکی۔ اوہو! تم چڑیا خانے اور میوزیم کو تو بھول ہی گئے اور وکٹوریہ موریل کی عمارت جو انگریزوں نے بنوائی تھی۔

لڑکا۔ ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا اچھا جانے سے پہلے اپنا نام تو بتلاتی جاؤ؟

لڑکی۔ ہمار نام بینا رائے ہے —— اور تمہارا؟

لڑکا۔ میرا نام سنتوش بھٹاچاریہ۔

یہ کہہ کر دونوں چل دیے مگر بھئی مزا آگیا۔ تو ایسے ہوتے ہیں بنگالی۔ ان کا لباس بہت سادہ ہوتا ہے۔ ان کی رنگت عام طور پر گندمی ہوتی ہے۔ نہ کالی، نہ گوری۔

ارے یہ دیکھو اب پردے کے پیچھے سے کون نئے چلے آرہے ہیں۔ ان کا لباس تو دیکھو۔ بس کُرتا اور لنگی۔ اور لڑکی پورے آستین کا کُرتا اور ساری پہنے ہوئے ہے۔ اچھا دیکھو یہ بھی کچھ کہہ رہے ہیں۔

لڑکی۔ ہم بہار سے آرہے ہیں۔ اُتر پردیش سے بنگال جاتے ہوئے ریل گاڑی ہمارے ہی شہروں سے گذرتی ہے۔ ہمارے کھیتوں میں چاول پیدا ہوتا ہے۔

لڑکا۔ ہمارے کھیتوں میں گیہوں بھی پیدا ہوتا ہے۔ دونوں کی ایک ایک فصل ہوتی ہے۔

لڑکی۔ ہمارے یہاں چاول دال کھاتے

ہیں۔ سور کی مچھلی بھی بڑے مزے کی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ تر کسان بستے ہیں۔ یہ بڑے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔

لڑکا۔ اور مظفر پور میں بڑی اچھی لیچی ہوتی ہے۔

لڑکی۔ آزادی کی تحریک ہمارے یہاں بڑی مضبوط رہی ہے۔

لڑکا۔ ۱۹۴۲ء میں بھارت کی آزادی کے لئے بہار کے بہت سے نوجوان شہید ہوئے تھے۔

لڑکی۔ اور آج بہار کے سب سے بڑے نیتا بابو راجندر پرشاد جمہوریہ ہند کے صدر ہیں۔

لڑکا۔ ہمارے یہاں دھات اور کوئلے کی کانیں ہیں۔ اور لوہے کا سب سے بڑا کارخانہ ٹاٹا نگر بنا ہوا ہے۔ یہاں سوئی جیسی چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تیار ہوتی ہے۔

اب یہ دونوں بہاری لڑکا اور لڑکی چل دئے۔ اچھا دیکھو اب کے کون آتا ہے۔ نئے نئے لباس، نئی نئی باتیں، لو ایک لڑکی اور آئی۔ انگوری غرارہ۔ جمپر، نیلا دوپٹہ۔ یہ لباس اس لڑکی پر کتنا کھل رہا ہے۔ اور ذرا اس لڑکے کو تو دیکھو۔ کیسا چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن رکھی ہے۔

لڑکی۔ میں اُتّر پردیش کی رہنے والی ہوں۔

لڑکا۔ ہمارے یہاں لکھنؤ جیسا شہر ہے۔ جہاں اب تک پرانی تہذیب زندہ ہے۔

لڑکی۔ یہاں کی زبان بڑی پیاری ہے۔ جیسے یہاں کے آم اور خربوزے۔

لڑکا۔ یہ بہت بڑا صوبہ ہے اور یہاں بہت بڑے بڑے شہر ہیں۔ کانپور الہ آباد، آگرہ، بنارس۔

لڑکی۔ کانپور کے کارخانے مشہور ہیں۔ الہ آباد میں گنگا جمنا کا سنگم ہے، اور آگرہ میں تاج محل۔ بنارس کو کون نہیں جانتا یہ اپنے مندروں اور ساریوں کے لئے مشہور ہے۔

یہ کہہ کر دونوں چل دئے۔ اس کے

بعد دو بچے اور آئے۔ دیکھنا، دونوں کتنے خوبصورت اور تندرست ہیں۔ اتر پردیش سے لباس کچھ ملتا جلتا ہے۔ البتہ لڑکی غرارہ نہیں شلوار پہنے ہے۔ اور لڑکا بھی شلوار پہنے ہے۔ سر پر پگڑی ہے۔

لڑکی۔ میں پنجاب سے آئی ہوں۔

لڑکا۔ پنجاب کی سب سے بڑی ندی جہلم ہے۔ یہاں سے سکندر اعظم کو واپس لوٹنا پڑا تھا۔

لڑکی۔ یہاں کے گیہوں بڑے بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ دودھ اور لسی ہمارے یہاں کی خاص چیزیں ہیں۔

لڑکا۔ یہاں کے سورما بھی مشہور ہیں یہیں امرتسر میں جلیان والا باغ کا واقعہ ہوا تھا۔ جہاں آزادی کی لڑائی میں نہتے ہندوستانیوں پر گولیاں برسائی گئی تھیں۔

لڑکی۔ پنجاب نے بھگت سنگھ جیسے بہادر کو جنم دیا تھا جو آزادی کے لئے شہید ہوا۔

لڑکا۔ اور آج بھی اسی صوبے سے سب سے زیادہ سپاہی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔

لڑکی۔ امرتسر میں سکھوں کا سب سے بڑا گردوارہ ہے۔ اس میں بڑا سونا لگا ہے۔

یہ کہہ کر دونوں چلے گئے مگر لڑکے کی چال تو دیکھو بالکل سپاہی کی طرح اکڑتا ہوا گیا ہے۔

اب پھر پردہ ہلا۔ اب کے بڑی خوبصورت لڑکی سامنے آرہی ہے۔ شلوار اور کرتا۔ کرتے کی آستین کتنی ڈھیلی ڈھالی ہیں۔ سر پر رومال ہے جو گردن تک جھول رہا ہے۔ کان میں بڑے بڑے بالے چمک رہے ہیں۔

لڑکی۔ میں کشمیر سے آئی ہوں۔ کیسر کے دیس سے۔ چیڑ اور جھیلوں کی وادی سے۔

لڑکا۔ یہاں برف برستی ہے۔ پہاڑیاں چاندی کی طرح سفید نظر آتی ہیں۔ کشمیر کی سیر کو دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

لڑکی۔ کشمیر کا پٹو، پشمینہ اور رفل کتنا مشہور ہے۔

لڑکا۔ یہاں کی ڈل جھیل میں کتنے شہیدوں کا خون ہے۔ جنھوں نے آزادی کے لئے جنگ کی۔

لڑکی۔ یہاں کے باغ پھلوں اور پھولوں سے لدے شہزادی کی طرح مہکتے ہیں۔

لڑکا۔ ہمارے وزیر اعظم پنڈت نہرو کشمیر ہی میں پیدا ہوئے ہیں۔

لڑکی۔ یہاں فطرت کا جتنا حسن ہے اسی قدر غربت ہے۔

ان کے جاتے ہی دو بچے اور آئے ذرا اس لڑکی کا لباس دیکھو۔ زرد لہنگے پر یہ سرخ چولی بھی خوب معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر دوپٹہ نیچے زمین تک لٹکتا چلا گیا ہے۔ اور لڑکا کتنا چست اور بہادر نظر آرہا ہے۔ چست پاجامہ، انگرکھا اور صافہ۔

لڑکی۔ میں راجستھان کی رہنے والی ہوں ہم الگ نہیں سب ایک ہیں۔

لڑکا۔ ہماری بہادری کی کہانیوں سے پوری تاریخ بھری پڑی ہے۔

لڑکی۔ ہمارے یہاں ایک بڑا ریگستان ہے۔

لڑکا۔ لیکن ہمارے دل پہاڑوں کی طرح مضبوط ہیں۔ ہماری آنکھوں سے خودداری اور عزت کی ندیاں بہتی ہیں۔

لڑکی۔ راجستھان کی جھیلیں اور چتوڑ گڑھ کا قلعہ مشہور ہے۔

یہ ابھی پوری طرح غائب بھی نہ ہوئے تھے کہ دو بچے اور دکھائی دیے۔ لڑکی لہنگے کے ساتھ بلاؤز پہنے ہے دوپٹہ غائب ہے۔ لڑکا قمیص، پاجامہ اور جوتے پہنے چھتری ہلاتا آرہا ہے۔

لڑکا۔ ہم اس گجرات سے آئے ہیں جہاں مہاتما گاندھی پیدا ہوئے تھے۔

لڑکی۔ جو ہندو مسلم اتحاد اور انسانی محبت کے لئے شہید ہوئے۔

لڑکا۔ یہاں سے آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے والے سردار پٹیل جیسے سورما نکلے ہیں۔

لڑکی۔ ہمارے یہاں کی گائیں اور بھینسیں بھی مشہور ہیں۔

اس کے بعد جو لڑکی آئی اس کی ساری

کا رنگ، بہت گہرا اور پہننے کا انداز بھی نرالا ہے۔ اس نے ساری کو دھوتی کی طرح پیچھے کھونس رکھا ہے۔ بلاؤز کمر سے اوپر تک ہے۔ لڑکے نے دھوتی اور کوٹ پہن رکھا ہے۔ سر پر ٹوپی بھی ہے۔

لڑکی۔ میں مہاراشٹر سے آئی ہوں۔

لڑکا۔ مہاراشٹر کی تاریخ بہت شاندار ہے اس نے شیواجی جیسے سورما پیدا کئے۔

لڑکی۔ اب ہمارے یہاں بڑی صنعتی ترقی ہو گئی ہے۔

لڑکا۔ مہاراشٹر سے بہت اچھے گانے اور ناچنے والے نکلے ہیں۔

لڑکی۔ ہمارے یہاں آج بھی پرانی تہذیب نئے روپ میں زندہ ہے۔

ارے یہ بھی چلدئے۔ اب دیکھو یہ کون لڑکی ہے۔ یہ بھی ساری اسی طرح پیچھے کھسی ہوئی پہنے ہے۔ اس کے ساتھ جو لڑکا ہے اسی کی طرح کالے رنگ کا ہے اس نے دھوتی کو تہمد کی طرح لپیٹ رکھا ہے۔

لڑکی۔ میں سیدھی مدراس سے چلی آ رہی ہوں۔

لڑکا۔ مدراس کے کناروں پر سمندر کی موجیں سر ٹکراتی ہیں۔

لڑکی۔ ہمارے یہاں سے جدید علم کے بڑے بڑے عالم نکلے ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کو کون نہیں جانتا کتنے بڑے فلسفی ہیں۔

لڑکا۔ مشہور کانگریسی نیتا راجگوپال آچاری بھی تو یہیں کے ہیں۔

لڑکی۔ یہاں چاول کے ساتھ کھٹائی اور مرچ بہت کھاتے ہیں۔

لڑکا۔ یہاں عورتوں میں بھی تعلیم اور ترقی کا شوق ہے۔

لو صاحب اب کون آ رہا ہے۔

ارے دیکھو تو یہ لڑکی کتنا لمبا کرتا اور پاجامہ پہنے ہے۔ اور پھر دوپٹہ کو کس طرح سمیٹے ہوئے ہے۔ بہت شرما شرما کر چل رہی ہے اور اس کے ساتھ کا لڑکا شیروانی، پاجامہ اور ترکی ٹوپی میں ہے۔

لڑکی۔ میں حیدر آباد سے آئی ہوں۔

لڑکا۔ نظام حیدرآباد کو کون نہیں جانتا۔
دنیا کے سب سے زیادہ دولتمند
لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔
لڑکی۔ یہاں مشرو اور کمخواب جیسے کپڑے
تیار ہوتے ہیں۔
لڑکا۔ حیدرآباد میں بٹن وغیرہ بھی بڑے
عمدہ بنتے ہیں۔
لڑکی۔ گولکنڈے کا تاریخی قلعہ یہیں
تو ہے۔
لڑکا۔ اور اجنتا اور ایلورا کے غار بھی
یہیں ہیں جو مصوری اور سنگ تراشی
کا بہترین نمونہ ہیں۔
لڑکی۔ ہم مرچ اور کھٹائی پر جان دیتے
ہیں۔
ان کے بعد جو لڑکی آئی وہ صرف
ساری باندھے ہوئے ہے۔ اور آنچل
سے ہی بلاؤز کا کام لے لیا ہے۔ لڑکا
ایک دھوتی اور کرتا پہنے ہے۔
لڑکی۔ میں بنگال سے بھی آگے مشرقی صوبے
آسام سے آئی ہوں۔
لڑکا۔ آسام کے جنگل بہت مشہور ہیں۔

ہمارے یہاں بنگالی سے ملتی جلتی زبان
بولی جاتی ہے۔ جسے آسامی کہتے ہیں۔
لڑکی۔ ہمارے یہاں چاول پیدا ہوتا ہے۔
لڑکا۔ ہمارے یہاں مرد اور عورتیں چاء
کے باغات میں کام کرتی ہیں۔
لڑکی۔ یہاں بنگال کی طرح کیلے اور ناریل
کے درخت پائے جاتے ہیں۔
لڑکا۔ یہیں سے تبت کی سرحد شروع
ہوتی ہے۔
ان کے جانے پر دو بچے اور آئے
ان کا تو کوئی خاص لباس نہیں ہے۔ دیکھو
بتاتے کیا ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں؟
لڑکی۔ ہم بمبئی کے رہنے والے ہیں۔
لڑکا۔ بمبئی ایسی جگہ ہے جہاں ہر طرح
کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کا کوئی
ایک لباس نہیں۔
لڑکی۔ ہمارا شہر بہت ہی خوبصورت ہے
نہ جانے کتنی جگہیں دیکھنے کے
قابل ہیں۔
لڑکا۔ اپالو بندر، میرین ڈرائیو، چوپاٹی
فورٹ کا علاقہ ایک سے ایک

خوبصورت جگہیں ہیں۔

لڑکی۔ انڈیا گیٹ، وکٹوریا گارڈن، عجائب خانہ اور Hanging Garden یہ سب تو تم بھول ہی گئے۔

لڑکا۔ چوڑی چوڑی سڑکیں، خوبصورت بسیں، جگمگاتی دکانیں جن پر سے نگاہ ہٹانے کو دل نہیں چاہتا ہے

لڑکی۔ ہندوستان کے ہر گوشے کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ رہنے سہنے کے مختلف طریقے اور مختلف لباس ہیں۔

اب دیکھیں کون آتا ہے۔ ارے اب تو کوئی بھی نہیں آرہا ہے۔ یہ لو گھنٹی بج گئی۔ خاتمے کی ہے۔ بھیا میں نے تو اس سے بہت کچھ سیکھ لیا۔ اب یہ دیکھو لباس، زبان، پچھلی تاریخ، رنگ روپ، غذا سب کا پتہ چل گیا۔ اب میں سمجھا، سارے ہندوستان میں رہنے والے ویسے تو ایک ہی قوم ہیں۔ ہندوستانی قوم۔ لیکن یہ اتنا بڑا ملک ہے۔ اور اس کے اتنے الگ الگ علاقے ہیں کہ ہر جگہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنا خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم ایک ہوتے ہوئے جدا جدا ہیں۔ ہم جدا جدا ہوتے ہوئے ایک ہی ہیں۔ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ ایک ساتھ اپنے ملک کو آگے بڑھانے ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اب پھر گھنٹی بجی اور سب بچے ایک ساتھ اسٹیج پر آئے۔ دیکھنا، دیکھنا! تو قومی ترانہ گا رہے ہیں۔ آؤ سب کھڑے ہو جائیں۔



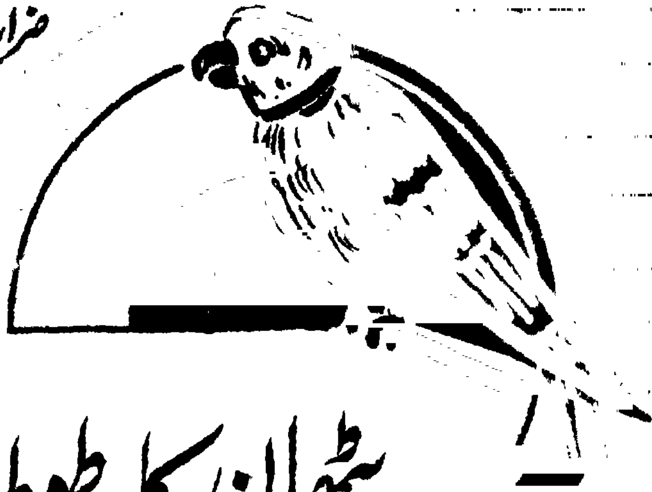
ہمدان ایران میں ایک جگہ کا نام ہے۔ ایک دفعہ وہاں ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس انجمن
قاعدے یہ تھے کہ ممبروں کی تعداد سو سے زیادہ نہ ہو اور یہ کہ اس انجمن کے ممبر سوچیں
ده اور بات کم کریں۔ ایران کے جتنے بڑے عالم تھے وہ سب اس انجمن کا ممبر ہونا بڑی
ت کی بات سمجھتے تھے۔

ایک مرتبہ انجمن میں ایک ممبر کی جگہ خالی ہوئی اور بہت سے قابل لوگوں نے ممبر بننے
لئے اپنی اپنی عرضیاں بھیجیں۔ ہمدان سے دور ایک بہت قابل حکیم رہتا تھا۔ اس کا
زیب تھا۔ جب زیب نے سنا کہ ایک ممبر کی جگہ خالی ہے تو وہ بھی ہمدان کو روانہ ہوا۔
ن کے قریب پہنچ کر اس نے انجمن کے سردار کو ایک خط لکھا کہ میں آپ کی انجمن میں
ل ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن اتفاق یہ ہوا کہ حکیم زیب کے آنے سے پہلے ہی ایک اور
م اس جگہ آگیا تھا۔ اس لئے ممبروں کو افسوس ہوا۔ کیونکہ اب وہ حکیم کو نہ
نا کر سکتے تھے اور انکار کرنا بھی ٹھیک نہ تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ اتنے عالم فاضل
طرح انکار کریں کہ اُسے بُرا بھی نہ معلوم ہو اور ان کا مقصد بھی پورا ہو
ے۔ آخر ان کے سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ انھوں نے حکیم کو بُلا بھیجا۔ جب

وہ آگیا تو اس کے سامنے ایک پانی سے لبالب بھرا ہوا پیالہ رکھ دیا۔ وہ پیالہ اس قدر بھرا ہوا تھا کہ اگر اس میں ایک قطرہ پانی بھی ڈال دیا جاتا تو ضرور چھلک جاتا۔ حکیم عقل مند تو تھا ہی پیالے کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس سے یہ مطلب ہے کہ ممبروں کی تعداد پوری ہوگئی اور اب ایک ممبر کی بھی جگہ نہیں ہے۔ حکیم کو یہ معلوم ہوکر افسوس تو بہت ہوا مگر اس نے یہی سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہیئے کہ یہ لوگ لاجواب ہو جائیں۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر گلاب کی ایک پتّی پر پڑی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً وہ پتّی اٹھاکر پیالے میں ڈال دی۔ پتّی ہلکی تو تھی ہی اس لئے پیالے میں سے پانی نہیں گرا۔ انجمن کا صدر بھی کچھ کم عالم نہ تھا وہ بھی دانا اور ہوشیار تھا فوراً سمجھ گیا کہ حکیم کا یہ مطلب ہے کہ میرے داخل ہونے سے کچھ فرق نہ پڑے گا۔ چنانچہ حکیم کی اس عقلمندی سے وہ بہت خوش ہوا اور فوراً اس کو انجمن کا ممبر بنا لیا۔ اب حکیم نے سوچا کہ ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ اس لئے اس نے ایک کاغذ پر انجمن کے ممبروں کی تعداد لکھ کر بائیں طرف ایک صفر بڑھادیا (اس طرح ۰۱۰۰) جس کا یہ مطلب تھا کہ جس طرح بائیں طرف صفر بڑھانے سے گنتی میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی اسی طرح میرے آنے سے آپ کی تعداد میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ انجمن کا صدر اپنی عادت کے مطابق بولا تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس نے سَو کے داہنی طرف ایک صفر اور بڑھا دیا (۱۰۰۰) جس کا یہ مطلب تھا کہ آپ کے آنے سے ہماری تعداد دس گنی ہوگئی۔

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے اور ساتھ ہی اپنا پتہ بھی صاف اور خوش خط لکھئے۔

ضرار محمود طوسی



پٹھان کا طوطا

ایک پٹھان نے ایک خوبصورت پہاڑی طوطا پال رکھا تھا۔ طوطے نے تھوڑے ہی دنوں میں کچھ کچھ بولنا بھی سیکھ لیا تھا۔ جب کبھی پٹھان طوطے سے کہتا کہ "تو کہاں ہے؟" تو طوطا فوراً بول اُٹھتا۔ "میں یہاں ہوں"

ایک دن پٹھان کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے پڑوسی کا ایک لڑکا بڑا شریر تھا۔ وہ موقع پاکر گھر میں گھس آیا۔ اس نے فوراً طوطے کو پنجرے سے نکال کر اپنی قمیض میں چھپا لیا ــــ مگر جیسے ہی وہ دروازے سے باہر نکلنے والا تھا کہ پٹھان آگیا ــــ اب تو لڑکا سہم گیا، نہ تو کھڑا ہی رہا جاتا ہے اور نہ قدم آگے بڑھتے ہیں۔ لڑکے کو اس طرح گھبرایا ہوا دیکھ کر پٹھان فوراً تاڑ گیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ اس نے وہیں سے آواز دی "تو کہاں ہے؟" اس کے جواب میں طوطا لڑکے کی قمیض کے اندر سے بولا "میں یہاں ہوں" یہ سننا تھا کہ پٹھان نے جھپٹ کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا ــــ ذرا سی دیر میں طوطا خوش خوش اپنے پنجرے میں چلا گیا اور پٹھان نے لڑکے کا کان گرم کیا۔

(فارسی سے ترجمہ)



۱۸ر اگست کو شام کے ۶ بجے سامنے عدن کی تمام عمارتوں میں بجلی کی روشنی ہو چکی تھی اور ان کا عکس سمندر کے پانی میں پڑ رہا تھا۔ ان عمارتوں کے پیچھے سیاہ پہاڑیاں ابھی تک دکھلائی دے رہی تھیں۔ یہ سارا منظر اس قدر دلکش تھا کہ ہم تمام مسافر جہاز کے عرشہ (چھت) پہ بیٹھے ہوئے اس سے لطف لے رہے تھے۔ اس وقت گرمی بھی کم ہو چکی تھی اور کسی قدر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے جہاز نے سیٹی دی اور رینگنا شروع کر دیا۔ روشنیاں دور ہوتی چلی گئیں اور اب پھر جہاز تاریک سمندر میں چلنے لگا۔ ہر طرف پانی اور اندھیرا۔

اب ہمارا جہاز بحر احمر (Red sea) میں داخل ہو گیا تھا۔ نقشہ میں دیکھئے تو عدن کے نقطہ کے کچھ ہی بعد سے سیدھے ہاتھ کو مڑ کر بحر احمر ہے۔ آپ لوگ شاید یہ سمجھ رہے ہوں کہ چونکہ اس کا نام Red sea ہے اس لئے یہاں کے پانی کا رنگ لال ہوگا، مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے اس کا رنگ بالکل ویسا ہی ہے جیسا بحر عرب اور خلیج عدن میں تھا۔ اس کے ایک طرف، عرب کا ریگستانی علاقہ ہے، اور دوسری طرف افریقی ریگستان۔ اور پھر دونوں کا فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ ایک کنارہ بھی

جہاز سے نہیں دکھائی پڑتا۔ عدن کے بعد سے ہمارے جہاز نے ایشا کی سرزمین کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ یہ اب براعظم ایشا کے کسی بندرگاہ پر نہیں ٹھیرے گا۔

بحر احمر میں ہم کو سخت گرمی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیبن (کمروں) کے اندر سونا دشوار تھا ہم سب کے سب جہاز کے عرشہ پر اپنے اپنے بستر لگا کر کھلی ہوا میں سوتے تھے۔ اس طرح گرمی سے کسی قدر چھٹکارا مل جاتا تھا۔ یہ منظر بھی عجیب ہوتا تھا، یہاں سے وہاں تک تمام عرشہ پر بستر لگے ہوتے، رات کے بارہ بجے تک آپس میں بات چیت کرتے رہتے۔

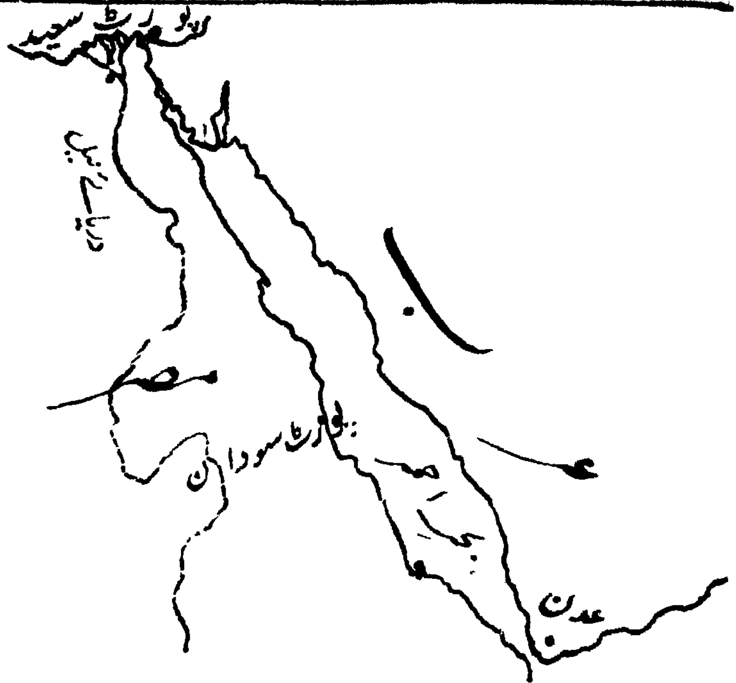
اب چونکہ طوفانی ہوا کا زور بھی کم ہو چکا تھا اور جہاز کا ہلنا جلنا بھی بند ہو چکا تھا اس لئے تمام مسافر متلی وغیرہ کی مصیبت سے نجات پا چکے تھے۔ اور سچ پوچھئے تو ہر وقت خوب چہل پہل رہنے لگی تھی۔ ورنہ بحر عرب کے چار روز تو قیامت کے روز تھے، ہر طرف سناٹا، خاموشی ..... اس کے بالکل برعکس یہاں ایک عجیب سماں دیکھنے میں آتا۔ لوگ آٹھ آٹھ دس دس کی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے گپ شپ کرتے، کہیں تاش کھیلے جا رہے ہیں، کہیں گراموفون بج رہا ہے، کہیں شطرنج ہو رہی ہے، غرض کہ ایسا لگتا ساری دنیا سے الگ ہر ایک اپنی اپنی ٹولی میں مست ہے۔ کسی کو کوئی غم نہیں، کوئی فکر نہیں۔ ہنسی ہے کہ ہر ایک کے منہ پر رکھی ہوئی ہے۔ بے بات کی بات پر ہنسی ہو رہی ہے، قہقہے پر قہقہے لگ رہے ہیں اور ہر ایک خوش ہے۔

جہاز پر ایک خاص بات جو دیکھنے میں آئی وہ ہے یہاں پر کام کرنے والوں کی پھرتی۔ رات کو سونے کے علاوہ اُن میں سے کسی کو بیکار بیٹھے نہیں دیکھا۔ یہ لوگ ہر وقت مستعد رہتے ہیں اور خوب پھرتی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ جہاز کا سب سے اعلیٰ افسر کپتان ہے۔ یہ سارے کاموں کی نگرانی کرتا ہے اور ویسے جہاز رانی میں سب سے زیادہ تجربہ رکھتا ہے، اس کی عمر ہوگی کوئی ساٹھ برس کے قریب۔ اس کے ماتحت تین آفیسر ہوتے ہیں۔ یہ باری باری ڈیوٹی دیتے ہیں اور جہاز کی صحیح سمت دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تین انجینیر باری باری جہاز کے انجن پر کام کرتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر ہے جو مسافروں کی صحت کی دیکھ بھال کرتا ہے اور بیمار یا چوٹ

وغیرہ کا علاج کرتا ہے۔ ایک نرس ، ہے جو مسافروں کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ایک حجام ہے جو بال بناتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی پندرہ کے قریب ملازم ہیں جن کو اسٹیوارڈ Stewards کہتے ہیں۔ یہ سب کے سب مسافروں کو کھانا کھلاتے ہیں، اُن کے کیبن کی صفائی کرتے ہیں۔ بستر وغیرہ ٹھیک کرتے ہیں، جوتوں پر پالش کرتے ہیں۔ اور پھر سب سے کم تنخواہ پانے والے کوئی بیس کے قریب خلاصی ہیں۔ خلاصی روز صبح دھوتے ہیں۔ باہر کے بڑے بڑے پردے لگاتے ہیں اور اسی طرح دوسرے محنت کے کام کرتے ہیں۔ غرض کہ یہ سب ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں، اپنے اپنے گھروں اور بیوی بچوں سے دور یہ سب ہر طرح سے مسافروں کے آرام کا خیال رکھتے ہیں۔

پورٹ سوڈان: آج ۱۷ر اگست ہے۔ عدن سے روانہ ہوئے دو روز ہوئے ہیں اس وقت رات کے تقریباً دس بجے ہیں، سامنے پورٹ سوڈان کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم براعظم افریقہ کے بندرگاہ سوڈان پر جا پہنچیں گے آپ میں سے جو بچے اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ اُن کو معلوم ہوگا کہ حال ہی میں مصر اور انگریزوں کے درمیان یہ جھگڑا چلا تھا کہ سوڈان پر کس کا قبضہ ہو۔ مصر والوں کا کہنا تھا کہ سوڈان کا مصر سے بہت قریبی تعلق ہے اور ۱۹۳۶ء سے پہلے تک سوڈان مصر کا ایک حصہ تھا اس لئے سوڈان مصر کے قبضہ میں ہونا چاہئیے انگریزوں کا کہنا یہ ہے کہ سوڈان کے لوگ اپنی علاحدہ حکومت بنانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اصلی بات تو یہ ہے کہ انگریز سوڈان کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے ہیں ----- ایک مرتبہ پھر نقشہ دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سوڈان کا علاقہ مصر سے بالکل ملا ہوا ہے۔ پورٹ سوڈان اس کا مشہور اور بڑا بندرگاہ ہے۔

لو اب ہمارا جہاز بالکل ساحل سے جا لگا اس وقت یہاں تین چار جہاز اور بھی کھڑے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی سنگا پور سے آیا ہوا ہے، کوئی ہانگ کانگ سے اور کوئی لورپول سے۔ سامان لادنے اور اتارنے کا کام جاری ہے۔ ہمارے جہاز کو یہاں دو راتیں اور ایک دن ٹھہرنا ہے اور ہم لوگوں کو شہر وغیرہ گھومنے کا خوب موقع ملے گا۔



سے دوڑتی ہوئی دکھائی دیں۔
یہاں بھی سواری کی قسم سے یا تو موٹریں دیکھیں یا اونٹ گاڑیاں یہاں کے لوگ خوب لمبے چوڑے سیاہ رنگ کے ہیں، جن کو اگر آپ رات کے وقت دیکھ لیں تو مارے ڈر کے چیخ ہی تو نکل پڑے۔ لباس میں یہ لوگ زیادہ تر پاجامہ۔ لمبا کرتا اور سر پر چھوٹی سی پگڑی باندھتے ہیں۔ زبان خالص عربی بولتے ہیں۔

پورٹ سوڈان کا سب سے بڑا بازار ایک گول دائرہ میں بنا ہے، جس کے بیچ میں پارک ہے اور چاروں طرف دوکانیں۔ یہاں کی سرکاری عمارت پر برطانیہ اور مصر دونوں ملکوں کے جھنڈے لگے ہیں۔

بازار وغیرہ گھومنے کے بعد ہم لوگوں نے جہاز پر واپس آکر کھانا کھایا اور پھر گھومنے نکل پڑے۔ شہر تو تھوڑا بہت دیکھ ہی چکے تھے، اس مرتبہ ایک سمندری باغ دیکھنے گئے۔ سمندری باغ سے آپ کو تعجب تو ضرور ہو رہا ہوگا! اس لئے کہ

جہاز کے ٹھیرنے کے بعد سیڑھی لگا دی گئی اور ہم لوگ ساحل کے پلیٹ فارم پر اُتر کر گھومنے لگے۔ یہاں کا پلیٹ فارم بہت لمبا ہے۔ جس میں ایک ہی وقت میں آگے پیچھے چھ جہاز لگ سکتے ہیں۔ کنارے کنارے ریل کی پٹڑی بچھی ہوئی ہے اور سامان جہازوں سے براہ راست ریل کے ڈبوں میں اترتا ہے۔

دوسرے روز ہم لوگ ناشتہ وغیرہ کر کے شہر گھومنے کے لئے چل پڑے۔ یہاں کا شہر بھی خاصہ بڑا ہے۔ اچھی اچھی عمارتیں ہیں، خوب پختہ چوڑی سڑکیں ہیں جن پر موٹریں تیزی

اب تک تو آپ نے زمین پر لگے ہوئے باغ دیکھے ہیں۔ ویسے یہ چیز ہم لوگوں کے لئے بھی نئی تھی۔ تو ہم نے ایک کشتی کرایہ پر لی اور اس باغ کو دیکھنے روانہ ہو گئے۔ اس کا نام ہے کورل باغ، کورل کے معنی ہیں سمندری پودے۔ کنارے کے بالکل قریب ایک حصہ میں یہ قدرتی باغ واقع ہے اس جگہ پر گہرائی بہت کم ہے اور پانی اس قدر صاف ہے کہ زمین کی تہہ تک بالکل صاف نظر آتی ہے۔ یہاں پانی کے اندر دیکھنے پر طرح طرح کے رنگ برنگے سمندری پودے دکھائی دیتے ہیں آس پاس سنہری مچھلیاں تیرتی ہیں۔ یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

باغ دیکھنے کے بعد ہم لوگوں نے سینما کا پروگرام بنایا۔ طے یہ ہوا کہ چھ بجے کھانا کھا کر چل دیا جائے اور پہلا شو دیکھا جائے۔ چونکہ ابھی چھ بجنے میں کافی دیر تھی اس لئے ہم اور عصو میاں ٹہلتے ٹہلتے ساحل سے قریب ایک چھوٹے سے بازار میں جا نکلے۔ یہاں ایک لائن میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں بنی ہوئی تھیں، جن میں زیادہ تر ہوٹل تھے۔ باقی میں چھوٹی موٹی چیزیں بکتی تھیں۔

کھانا وغیرہ کھا کر جب ہم لوگ سینما ہال پہنچے تو تماشہ شروع ہو چکا تھا۔ اس روز ایک انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی اور ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ یہ سینما ہال بھی عجیب قسم کا تھا، جس میں چاروں طرف دیواریں تو تھیں مگر چھت غائب تھی اسکرین خوب بڑا سا تھا اور کافی اونچائی پر تھا۔ بیٹھنے کے لئے لوہے کی کرسیاں تھیں۔

سینما دیکھ کر جب ہم لوگ جہاز پر واپس آئے تو کافی رات ہو چکی تھی اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے سب ہی کو بری طرح سے نیند آرہی تھی۔ آتے ہی بستر پر جو لیٹے تو خوب مزے کی نیند آئی۔

بحر احمر - ۲۴ر اگست ۵۲ء

بقیہ لکھنے پڑھنے کی کہانی صفحہ ۳۰ سے آگے

کے طریقے میں بھی ایسی اور ایجادیں اور سہولتیں پیدا ہوں گی۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں کوئی ایجاد آپ ہی میں سے کوئی صاحب کریں۔

جیسے کو تیسا

جاڑوں کی ایک اندھیری رات تھی ایک مسافر اپنے راستے سے بھٹک گیا۔ اب اس نے سوچا کہ رات کہاں گذاری جائے۔ آخرکار اُسے کچھ لوگوں نے ایک مسافر خانے کا پتہ بتا دیا۔ مسافر نے اس مسافر خانے کی راہ لی۔ وہاں پہنچتے ہی اُس نے مسافر خانے کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ دروازے کے کھٹ کھٹانے کی آواز سُن کر چوکیدار اندر سے بولا "کون ہے، اور کیا کام ہے؟"

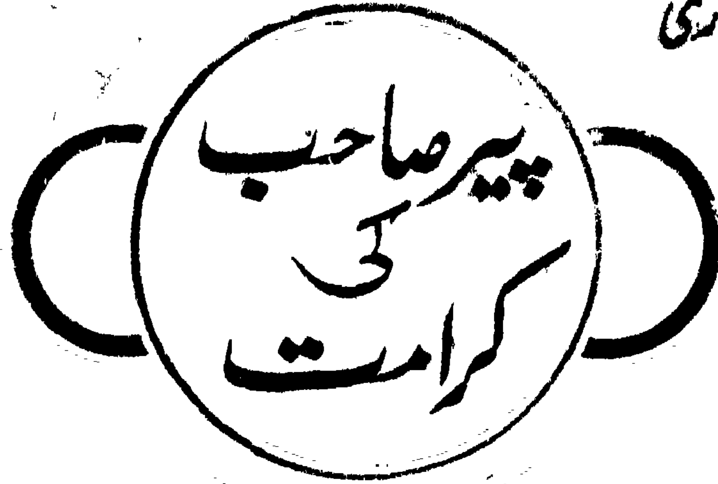
مسافر نے جواب دیا "میں مسافر ہوں۔ آج کی رات مسافر خانے میں گذارنا چاہتا ہوں"

چوکیدار نے کہا "بھیّا مسافر مجھے افسوس ہے کہ اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا۔ میرے تالے کی کنجی کہیں کھو گئی ہے۔ اور رات کے وقت جب چابی کھو جاتی ہے تو یہ تالا بس چاندی ہی سے کھل سکتا ہے۔"

مسافر سمجھ گیا کہ چوکیدار لالچی ہے اور روپیہ لئے بغیر دروازہ نہ کھولے گا۔ اس لئے اس نے چپکے سے ایک روپیہ نکالا اور دروازے کی دراز سے چوکیدار کو دیدیا۔ چوکیدار کو جیسے ہی روپیہ ملا، اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ مسافر نے اندر آکر چوکیدار سے کہا "بھیّا ذرا میرا سامان تو لے آؤ۔" چوکیدار سامان لینے کے لئے باہر چلا گیا۔

جیسے ہی چوکیدار باہر گیا۔ مسافر نے فوراً دروازہ بند کر لیا۔ اب جو چوکیدار لوٹ کر آیا تو اس نے دروازہ بند پایا۔ اس نے مسافر کو زور زور سے آوازیں دیں۔ مسافر نے کہا "ارے بھیّا چوکیدار میری چابی کھو گئی اور تم جانتے ہو کہ رات کے وقت اس مسافر خانے کا تالا چاندی سے ہی کھلتا ہے۔" اب تو چوکیدار سمجھ گیا کہ مسافر سے جیتنا مشکل ہے۔ اُس نے چپ چاپ وہ روپیہ مسافر کو واپس کر دیا۔ اور مسافر نے پھاٹک کھول دیا۔

ا۔ع۔ انصاری
اسلام پوری



پیر چراغ حسن شاہ کی پورے گاؤں میں بڑی عزت تھی۔ کچھ لوگ تو اُن کے مُرید بھی تھے۔ گاؤں کے اَن پڑھ اور جاہل ہی نہیں، لکھے پڑھے لوگ بھی اُن کی بزرگی کے قائل تھے اور اُن کی بڑی خاطر مدارات کرتے تھے۔ جس کے یہاں ٹھہرتے، وہ اپنے آپ کو بڑا ہی خوش نصیب سمجھتا۔ صبح سے رات کے نو دس بجے تک ان کے ماننے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا

پیر صاحب ہر سال گاؤں آتے تھے اور دو ایک مہینہ تک رہ کر چلے جاتے تھے۔ دوا علاج، جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈے کے نام پر دو تین سو روپئے کما ہی لیتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو اپنے مُریدوں سے نذرانے کے طور پر بھی سو پچاس روپئے وصول کر لیتے تھے۔ اس طرح گاؤں والوں سے ہر سال ایک اچھی رقم اینٹھ لے جاتے۔

گاؤں کے چودھری عبدالکریم کی بیوی ہمیشہ بیمار رہا کرتی تھی۔ چودھری نے اس کا بہت علاج کیا، لیکن مرض پورے طور پر نہیں گیا۔ علاج سے صرف کچھ دنوں کے لئے آرام ہو جاتا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے چودھری اور اُن کی بیوی کو پیر صاحب سے علاج اور دعا تعویز کرانے کی رائے دی۔ چودھری نے سوچا کہ جہاں اتنے حکیموں اور ویدوں کا

علاج کرایا، پیر صاحب کا بھی علاج کر دیکھیں شاید انھیں کے ہاتھوں فائدہ ہو جائے۔

اگلے دن سویرے ہی چودھری پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے اپنی غرض بیان کی۔ پیر صاحب دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ انھیں تو چودھری ہی جیسے موٹے آسامیوں کی تلاش تھی۔ ایک تو وہ گاؤں کے چودھری تھے پھر مالدار بھی تھے۔ اس لئے گاؤں والوں پر اُن کا سب سے زیادہ اثر تھا۔

اُسی دن شام کے وقت چودھری پیر صاحب کو اپنے گھر لے آئے۔ اب انھیں کے یہاں پیر صاحب کا 'دربار' لگنے لگا اور ساتھ ہی انھوں نے چودھری کی بیوی کا علاج بھی شروع کر دیا۔

جب پیر صاحب چودھری کی بیوی کی نبض دیکھ رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ سونے چاندی کے زیوروں سے لدی ہوئی ہے۔ زیوروں کو دیکھ کر تو اُن کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔

اب پیر صاحب علاج سے زیادہ زیوروں کے اُڑانے کی ترکیب سوچنے لگے۔ دو ہفتے کے علاج کے بعد جب دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تو پیر صاحب نے چودھری سے کہا کہ تمہاری بیوی کو مرض ورض تو کوئی نہیں ہے البتہ تمہارے کسی دشمن نے تمہاری بیوی کے زیوروں پر جادو کرا دیا ہے۔ اب دوا دارو سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے لئے 'عمل' کرنا پڑے گا۔

پیر صاحب کی یہ بات سُن کر بے چارے چودھری کچھ ڈرے اور گھبرائے۔ لیکن پھر سنبھل کر بولے "حضور! پھر کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا؟ بس 'عمل' کرنا پڑے گا۔ لیکن جادو بڑا خطرناک ہے۔ اس کا توڑ خطرے سے خالی نہیں۔ بڑے جان جوکھم کا کام ہے" پیر صاحب نے دھونس جمائی۔

"نہیں، حضور! اس کام کے لئے آپ سے بہتر کون ملے گا۔ ہے تو ضرور خطرے کی بات۔ لیکن آپ کے لئے ......" چودھری نے عاجزی اور خوشامد سے کہا۔

پیر صاحب آنکھیں بند کر کے کچھ دیر تک تو سوچتے رہے پھر بولے "چودھری! بہت

تو نہیں پڑتی، لیکن تمہاری خاطر میں یہ کام شروع کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ اس کا حال تین آدمی کے سوا اور کسی کو نہ معلوم ہو۔ ورنہ اس جادو پر اثر نہیں ہوگا۔

"نہیں حضور! آپ اطمینان رکھیں ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ بھلا میں کیوں کسی سے کہہ کر اپنا نقصان آپ کروں گا۔" چودھری نے پیر صاحب کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ آج منگل ہے۔ پرسوں جمعرات سے میں 'عمل' کروں گا۔" پیر صاحب نے کہا۔

"حضور! اگر میری بیوی اچھی ہوگئی تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مانوں گا۔ اور آپ کی خدمت کرنے سے کبھی باز نہیں آؤں گا۔" چودھری بولے۔

"نہیں، نہیں چودھری! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ گھبراؤ مت، اللہ نے چاہا تو تمہارا کام ضرور ہو جائے گا۔" پیر صاحب نے یقین دلایا۔

"بہت اچھا حضور!" چودھری نے کہا۔

دو دن کے بعد رات کو جب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے، تو پیر صاحب نے چودھری کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اُن سے کہا کہ اپنی بیوی کے تمام زیورات ایک صاف اور سفید کپڑے میں باندھ کر لے آؤ۔ چودھری فوراً اُٹھ کر گھر میں گئے۔ اور سارے زیورات ایک صاف اور سفید کپڑے میں باندھ کر لے آئے۔

پیر صاحب نے چودھری سے زیوروں کی پوٹلی لے لی اور کہا: "اچھی بات ہے۔ اب تم جاؤ! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے جاکر سو جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو صبح ہی خوش خبری سناؤں گا۔" اور یہ کہہ کر انھوں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چودھری برآمدے کے دوسری طرف والے کمرے میں سونے چلے گئے۔

آدھی رات گزر چکی تھی لیکن ابھی تک چودھری کی آنکھ ذرا بھی جھپکنے نہ پائی تھی۔ جھپکتی بھی تو کیسے؟ بے چارے سیکڑوں روپے کے زیورات پیر صاحب کے حوالے کر آئے تھے۔ ان کو بار بار خیال آتا تھا کہ کہیں پیر صاحب کی نیت نہ ڈگمگا جائے!۔

طرح طرح کے خیالات ان کے دماغ میں آرہے تھے۔ نہیں توبہ توبہ بھلا پیر صاحب ایسا کیسے کریں گے؟ کبھی کوئی ایسی بات اُن کے بارے میں سننے میں نہیں آئی۔ لیکن کون جانے؟ کسی کے ماتھے پر تو کچھ لکھا نہیں ہوتا۔ دو چار دس روپیوں کی بات تو نہیں سینکڑوں روپیوں کا معاملہ ہے۔

چودھری اسی اُدھیڑ بن میں چارپائی پر کروٹیں لے رہے تھے۔ کہ اتنے میں ہلکی سی چوں چرررر کی آواز ان کے کان میں آئی۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھے۔ یہ آواز پیر صاحب کے کمرے کی طرف سے آئی تھی۔ جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہو۔ اب تو چودھری کا شبہہ اور بھی بڑھا۔ اُس نے سوچا: "کہیں سچ مچ پیر صاحب کی نیت خراب نہ ہو گئی ہو" یہ خیال آتے ہی چودھری جھٹ اُٹھ کھڑے ہوئے اور فوراً باہر نکل آئے۔ دیکھا تو سچ مچ پیر صاحب اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے بغل میں ایک گٹھری سی دبائے کھڑے ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ جیسے چودھری کے پاؤں کے نیچے کی زمین ہی تو سرک گئی۔

پہلے تو اُن کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھے اور پیر صاحب سے بولے۔

"کہئے حضور! کہاں تشریف لے جا رہے ہیں ــــ؟"

پیر صاحب، جو ابھی تک چپ چاپ کھڑے تھے، بگڑ ہی تو گئے۔

"کمبخت کہیں کا ــــ! عین وقت پر ٹوک کر تونے میری ساری ریاضت پر پانی پھیر دیا ــــ میں تو قبرستان جا رہا تھا اور تونے سمجھا کہیں پیر صاحب زیور تو نہیں لے جا رہے ہیں ــــ جب تیری نیت ہی میں شک ہے تو پھر ناحق تونے مجھے پریشان کیا ــــ!"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ناحق پریشان کیا ــــ لیکن خدا کے لئے میری زیور کی پوٹلی تو دے ہی دیجئے۔ اس کے بعد اگر آپ خیریت چاہتے ہیں تو ابھی ابھی وقت گاؤں سے نکل جائیے ــــ!" چودھری نے آہستہ آہستہ لیکن غصے سے کہا۔

"ارے چودھری! تجھے یہ کیا ہو گیا؟

کیسی باتیں کر رہا ہے ؟" اب پیر صاحب سنبھل کر بولے ۔

" دیکھئے پیر صاحب ! اب زیادہ بیوقوف تو نہ بنائیے ۔ میری پوٹلی دے دیجئے ۔ اور چپ چاپ اپنا راستہ لیجئے ۔ نہیں تو یقین جانئے ، آپ کی وہ درگت بنے گی کہ زندگی بھر یاد کریں گے " چودھری نے ذرا تیز ہوکر کہا

" اچھا بھائی ! تم جو کچھ کہو ! لیکن ...

۔" پیر صاحب نے کہا

لیکن چودھری درمیان ہی میں بول اُٹھے

" بس اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا زبان بند کیجئے ۔ نکالئے ابھی زیوروں کو ابھی آپ کے ساتھ بڑی رعایت کر رہا ہوں "

اب تو چودھری زبردستی پیر صاحب کو پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے ۔ چراغ جلایا ۔ پیر صاحب نے بغل کی گٹھری کھولی اور زیوروں کی پوٹلی



نکال کر چودھری کے حوالے کر دی ۔ چودھری نے پوٹلی کھول کر اپنے زیوروں کو گنا ، سارے زیورات جوں کے توں موجود تھے ۔ اس کے بعد پیر صاحب چپکے سے اُٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے ۔

دوسرے دن صبح جب پیر صاحب کے عقیدت مند وہاں آئے تو انھیں چودھری سے یہ سن کر بہت ہی تعجب ہوا کہ پیر صاحب کچھ کہے بغیر رات ہی میں اُٹھ کر نہ جانے کہاں چلے گئے ۔

بے چارے چودھری نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ کیونکہ اصل بات بتلانے میں اُن کو اس بات کا ڈر تھا کہ لوگ اُن کی بیوقوفی پر اُن کی ہنسی اُڑائیں گے ۔ اس کے بعد پھر کبھی پیر صاحب اُس گاؤں میں نہیں آئے ۔

اطہر پرویز



تھوڑی دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیجئے اور یہ سوچئے کہ اگر کسی کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تو دنیا کا کیا حال ہوتا۔ شاید آپ سب سے پہلے یہی سوچیں گے کہ یہ پیام تعلیم ہی نہ ہوتا۔ لیکن بھائی پیام تعلیم تو دور کی بات ہے اگر انسان کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تو پھر دنیا کی شکل ہی دوسری ہوتی۔ نہ ہوائی جہاز ہوتے، نہ اخبار ہوتے، نہ ٹیلیفون ہوتے، نہ ڈاک و تار کا سلسلہ ہوتا، لوگ پہلے کی طرح پیدل چلتے، یا بیل گاڑیوں میں سفر کرتے۔ ریل گاڑی اگر کسی طرح بن بھی جاتی تو گاڑیوں کا ٹھیک طرح چلنا مشکل ہوتا۔ یہ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتیں۔ اور یہی نہیں ہم کو چند سال پہلے سے زیادہ کا حال معلوم ہی نہ ہو سکتا۔ دنیا کی تاریخ تو بہت دور، ہم اپنے ملک کے بارے میں بھی کچھ نہ جانتے۔ انسان کے خیالات جو آج ذرا سی دیر میں اس کونے سے اُس کونے تک ہزاروں میل دور پھیل جاتے ہیں، وہ بھی ایک ہی جگہ کے ہو کر رہ جاتے۔

آپ کو لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ اس لئے کتنی سہولتیں حاصل ہیں۔ اب یہ سوچئے کہ ہزاروں برس پہلے کے لوگوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی، اس لئے کہ اُن کے پاس نہ تو قلم تھے اور نہ کاغذ، نہ

وہ لکھنا ہی جانتے تھے۔آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ تب تو لکھنے کی ایجاد ہی دنیا کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کو ایجاد کہنا ہی غلط ہو گا۔ اس لئے کہ اس کی ابتدا ایکدم سے نہیں ہوئی۔ انسان نے لکھنے کا ڈھنگ دھیرے دھیرے اور تھوڑا تھوڑا کر کے سیکھا۔

شروع شروع میں جب انسان نے لکھا ہوگا، تو کیسی عجیب عجیب شکلیں بنائی ہوں گی۔ ایسی شکلیں کہ ہم اور آپ اگر اب دیکھیں تو ہنسی آ جائے۔

پہلے انسان اپنا خیال جانوروں کی یا اور دوسری چیزوں کی شکلیں پتھر پر بنا کر ظاہر کرتا تھا۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی یہ تصویریں ایک قبیلہ کے سردار دوسرے قبیلہ کے سردار کو بھیجا کرتے تھے۔ اور ان تصویروں کے ذریعے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچایا کرتے تھے۔ تصویر دیکھ کر دوسرے قبیلے کا آدمی سمجھ جاتا تھا کہ بھیجنے والے کا کیا مقصد ہے۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ ان اشاروں میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ ادھر بادشاہوں کو یہ خیال ہوا کہ ان کی بہادری کے کارناموں کا حال آنے والی نسلوں کو معلوم ہو۔ ابھی تک تو یہ کارنامے لوگ قصّے کہانیوں کی طرح سُنایا کرتے تھے۔ اب انھوں نے لکھنے کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ گیلی مٹی کو گوندھ لیتے تھے اور اس پر پتھر یا کسی سخت چیز سے نشانات بنا کر مٹی کو سکھا لیتے تھے۔ گو یہ طریقہ آسان تھا لیکن بہت دن چلنے والا نہ تھا اس لئے انھوں نے غاروں، پتھر کی لاٹوں پر کھدائی کرکے نشانات بنانے شروع کر دئے۔

جب لکھنے کی ضرورت زیادہ ہوئی اور رواج بڑھا تو انھوں نے بہت سے حروف بنا لئے اور قریب قریب اس طرح لکھنے لگے جیسے ہم آپ لکھتے ہیں۔ اور اب تو لکھائی میں شارٹ ہینڈ بھی رائج ہے۔آپ بڑی سے بڑی باتیں ذرا سی جگہ میں لکھ سکتے ہیں۔ پھر وقت بھی تو زیادہ نہیں لگتا۔ ادھر آدمی بول رہا ہے ادھر شارٹ ہینڈ والا لکھ رہا ہے۔ اب آپ سمجھے کہ انسان نے کس طرح لکھنا ایجاد کیا۔ اگر لوگوں کو لکھنا نہ آتا ہوتا تو انسان ترقی نہ کرتا۔ لیکن انسان کو تو ترقی کرنا ہی تھی اور ابھی اور بھی کرنا ہے۔ شاید لکھنے پڑھنے



لطیفے

ماں ۔ بیٹا ! تمہاری بولی بڑی میٹھی ہے۔
بیٹا ۔ اسی لئے تو میں روز چینی کھاتا ہوں۔

ماسٹر۔ انسان اندھا کب بن جاتا ہے ؟
ممتاز ۔ (جلدی سے اُٹھ کر) اندھیرے میں ۔

گاہک ۔ (پنجرے والے سے) مجھے جلدی سے ایک پنجرہ دو مجھے گاڑی پکڑنی ہے ۔
دوکاندار ۔ جی جناب ! میرے پا اتنا بڑا پنجرہ نہیں ہے کہ اس میں گاڑی رکھیں ۔

اے۔ آر محمد جمشید پوری

مالک ۔ نالائق میرے گھنٹی بجانے پر کیوں نہیں آیا ؟
نوکر ۔ حضور میں نے گھنٹی نہیں سُنی تھی ۔
مالک ۔ (غصے سے) جب تو گھنٹی نہ سُن سکے تو آکر مجھ سے کہہ جایا کر ۔

سوتنتر سنگھ آزاد
(جمشید پوری)



مالک ۔ (نوکر سے) اس بات کا خیال رکھو کہ میں بہت اونچا سُنتا ہوں ۔
نوکر ۔ آپ فکر نہ کیجئے حضور ! میں آپ کو بہت اونچی منزل سے پکارا کروں گا ۔

مالکہ ۔ (نئی خادمہ سے) میں بہت کم بولتی ہوں جب میں ہاتھ کا اشارہ کروں تو سمجھ جانا کہ میں تمہیں بلا رہی ہوں ۔
خادمہ ۔ مجھے بھی کم بولنے کی عادت ہے جب میں سر ہلا دوں تو سمجھ لیجئے گا کہ میں نہیں آنا چاہتی ہوں ۔

سید انور حسین نانڈیڑ (دکن)

ماں ۔ بیٹا ! پہاڑی سے لکڑی چن لاؤ ۔
لڑکا ۔ نہیں ماں میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے
ماں ۔ اچھا تو چل کھانا ہی کھالے ۔ میں لے آؤنگی۔
لڑکا ۔ ابھی آیا ماں ۔ ہاتھ دھو کر ۔

لاڈلی بیگم ۔ جبلپور



"کیوں صاحب چھ مہینے ہمارے ہوٹل میں رہنے کے بعد آپ کو کیا تکلیف ہوئی جو اچانک چھوڑ رہے ہیں"
"سیٹھ جی! اب مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ کے یہاں غسل خانہ نہیں ہے!"

"بیوقوف لومڑیاں"

کیشو نند



کسی گاؤں کے قریب ایک جنگل تھا۔ اس جنگل میں کئی لومڑیاں رہا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک لومڑی بڑی چالاک تھی۔ وہ رات کے وقت چپکے چپکے آ کر گاؤں کے ہرے بھرے کھیتوں سے مکا لے جایا کرتی تھی۔ وہ اتنی چالاک تھی کہ گاؤں والوں کے کتے بھی اس کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اور اگر دیکھ بھی لیتے تو اس کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکتے تھے۔ اس طرح خوب کھانے کی وجہ سے موٹی بھی تو ہو گئی تھی۔

اس کے موٹاپے کو دیکھ کر جنگل کی دوسری لومڑیوں کو بھی لالچ پیدا ہوئی اور انھوں نے ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا "بہن، تم آخر اتنی موٹی کس طرح ہو گئیں۔ ذرا ہم کو بھی تو وہ ترکیب بتاؤ۔

اس نے بڑا اکڑ کر شان سے کہا "میں کھیتوں میں مکا کھا کر آتی ہوں۔ تم چاہو تو تم بھی آسانی سے کھا سکتی ہو۔"

لومڑیوں نے کہا "بہن وہاں کے کتے ہمارا کام تمام کرنے کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

کیا وہ تم کو کچھ نہیں کہتے جو ہر روز مکّا چرا کر آجاتی ہو؟"

لومڑی یہ سُن کر ہنس پڑی اور بولی "اری نا سمجھ لومڑیو! کیا تم اتنا بھی نہیں جانتی کہ سرکار کی طرف سے مجھے لائسنس ملا ہے، جتنا چاہے کھا سکتی ہوں۔ کتّے کی کیا مجال کہ پھر آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔"

لومڑیاں بولیں "تو بہن آج ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے۔ جب کتّے آئیں تو اپنا لائسنس دکھا کر ہمیں بھی بچا لینا۔"

لومڑی نے ہنس کر کہا "ہاں میں تیار ہوں چلو آج میری طرف سے تمھاری دعوت ہے۔"

چالاک لومڑی سب لومڑیوں کو لے کر ایک کھیت میں پہنچ گئی، سب لومڑیاں مکئی کے بھٹوں پر ٹوٹ پڑیں اور وہ چالاک لومڑی دور سے یہ تماشہ دیکھتی رہی۔ کتّوں نے بھی لومڑیوں کو کھیتوں میں گھستے دیکھ لیا تھا وہ بھی اکدم دوڑ پڑے۔ اب تو چالاک لومڑی بھاگ نکلی۔ سب لومڑیاں چلّا چلّا کر کہنے لگیں "دکھاؤ لائسنس .... جلدی دکھاؤ، یہ کتّے آگئے۔ تم بھاگ کیوں رہی ہو۔"

چالاک لومڑی بولی "نا سمجھو، کہیں لومڑیوں کو بھی لائسنس ملتا ہے؟" یہ کہہ کر وہ لومڑی بھاگ نکلی۔

ہر کتّا ایک ایک لومڑی کے پیچھے دوڑا اور انھوں نے ہر لومڑی کو پکڑ لیا۔ ادھر کچھ کتّے چالاک لومڑی کے پیچھے دوڑے مگر وہ تو کہیں کی کہیں پہنچ گئی

یہ لومڑیاں رو رو کر کتّوں سے کہنے لگیں "بھائیو، ہمیں تو وہ بدمعاش لومڑی پھسلا کر یہاں لائی تھی۔ ہمارا قصور نہیں ہے۔ پھر ہم کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔ آج چھوڑ دو ہمیں۔ ہم سب تمھارا احسان مانیں گے۔ ہمارے بچے رو رہے ہوں گے آج تو ہمیں چھوڑ دو۔"

مگر کتّے بڑے زوروں سے بھونکے "بھوں ..... بھوں۔ ہم تم کو نہیں چھوڑ سکتے۔ تمھارا زندہ رہنا بھی بے کار ہے۔ کیونکہ تم کو خود اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہے۔ بچوں کے لئے ہم تم کو نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ تم جیسی دوسروں کے بہکاوے میں آنے والی ماؤں سے تو یہ اچھا ہے کہ تمھارے بچے بلا ماں کے رہیں، تم نے نہ تو لائسنس کبھی دیکھا تھا اور نہ کبھی سنا تھا، پھر بھروسہ کیوں کر لیا۔ اب اپنے اندھے پن کا مزا چکھو۔"

وقار خلیل شاہ پوری

امریکی بچوں کی حکومت

آج کے امریکی بچے جو کل کے بڑے ہوں گے آپسی امن ، اتحاد اور ترقی کے لئے ابھی سے تیاریوں میں لگے ہیں ، یہ بچے اپنی تربیت اپنے آپ کرتے ہیں۔ اپنی تنظیم خود برقرار رکھتے ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ امریکی بچوں نے اپنے اپنے مدرسوں میں اپنی چھوٹی موٹی حکومت بنالی ہے اور وہ اپنے سب کام نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔

آئیے .. اب ہم آپ کو امریکہ کے ایک شہر "بریڈلے" لے چلتے ہیں۔ وہ دیکھئے دور سے اسکول کی عالی شان عمارت نظر آ رہی ہے۔ کوئی بچہ باہر کھیلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ سب اپنی اپنی جماعتوں میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔

اب ہم ایک جماعت میں پہنچے اور تماشہ دیکھنے لگے ، ہم نے دیکھا کہ درجے میں چناؤ ہو رہے ہیں۔ یہ پانچواں درجہ تھا۔ اُستانی ایک طرف کرسی پر بیٹھی تھیں اور ایک دس سال کا بچہ اپنے درجے کی صدارت کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمیں بڑا تعجب ہوا۔ پھر اُس بچے نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ " بتاؤ ، تم کونسل کا صدر کس کو بنانا چاہتے ہو؟" اچانک پیچھے کی سیٹ سے آواز آئی کہ " میں نینسی پوٹر کو چاہتا ہوں " یہ صدر کے سوال کا جواب تھا۔ پھر صدر نے یہی سوال دوسرے ساتھی سے پوچھا اور اس نے ایک اور ساتھی کا نام لیا اسی طرح تین نام اور پوچھے گئے اور پھر ان پانچ ناموں پر رائے لی گئی۔ ہر ایک بچے

نے اپنی مرضی سے اپنے امیدوار کے ڈبے میں ووٹ ڈالا، اب ووٹ گنے گئے۔ ان میں سے ایک لڑکے "جان ایوری" کو چھبیس ووٹ ملے اور اس طرح اُسے صدر چُن لیا گیا۔

یہ صدر دو مہینوں تک رہتا ہے۔ چناؤ کے بعد اپنے ساتھیوں میں سے کونسل کے ممبر چُنتا ہے۔ یہ کونسل کلاس کا انتظام ٹھیک رکھنے کے لئے خود قانون بناتی ہے۔ ان قانونوں کی پابندی ہر بچے پر لازمی ہے۔ ان بچوں نے ساری دنیا کی جمہوری حکومتوں کے قانونوں کو پڑھا ہے اور ان کی روشنی میں، دوستوں کے مشورے اور امداد لے کر اسکول کا اپنا قانون بنا لیا ہے جس کا نام "دی کانسٹی ٹیوشن آف دی یونائیٹیڈ ففتھ گریڈ" (پانچویں درجے کا متحدہ آئین) ہے۔ ان بچوں کی یہ کونسل اپنے آئین کے مطابق پانچ ممبروں کی ایک کمیٹی بناتی ہے جن میں ایک صدر ایک مالیات کا ڈائرکٹر، ایک جج، ایک منشی اور دو کیپٹن ہوتے ہیں۔ کونسل ایک کو منیجر مقرر کرتی ہے جو کلاس کا انتظام برقرار رکھتا ہے اور دوسروں کو باقی کاموں کے لئے مقرر کرتا ہے۔

ان کے آئین میں کہا گیا ہے کہ ایک شہری طالب علم کے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ڈیسکوں، میزوں اور کمروں کو کس طرح صاف ستھرا رکھا جائے اس آئین میں غیر ضروری باتوں کو رد کرنے، نوٹ لکھنے، سبق کو تیز رفتاری اور ٹھیک طرح سے سننے کی بھی ہدایتیں ملتی ہیں۔ آئین میں اچھے لیڈر بننے، سچ بولنے اور قابلِ اعتبار بننے کی باتوں پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس کونسل کا ہر ممبر خوش باش اور ملنسار ہوتا ہے۔ اگر کسی لڑکے میں یہ خوبیاں نہ ہوں تو وہ دوستوں سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ اور اسے ووٹ دینے کے حق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کسی عہدے کے لئے چُنا نہیں جا سکتا۔ وہ ووٹ بھی نہیں دے سکتا، اور نہ انتخابات کے وقت کچھ کہہ سکتا ہے۔ اور نہ اُسے کھیل کود میں شریک ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ صرف جسمانی تربیت کے وقت شریک کر لیا جاتا ہے، مگر اُسے چپ چاپ اور خاموش رہنا پڑتا ہے۔

ایسے لڑکوں کو دوبارہ کونسل میں لینے کے لئے اِن شرطوں کو پورا کرنا پڑتا ہے جو ان کے آئین کی رو سے اُسے ملتے ہیں۔

۱۔ طالب علم کوئی نمایاں کام کرکے دکھائے۔

۲۔ اپنے گھر یا اسکول یا محلے کے لئے رضاکارانہ طور پر کوئی کام کرے۔

۳۔ اپنے اسکول کے ہر کام میں دوبار سو سو نمبر حاصل کرے۔

اگر کوئی طالب علم ان شرطوں کو پورا کرلے تو اس کو پھر کونسل میں لیا جاتا ہے اور اس طرح اُس لڑکے کا اس بات کا بُرا اچھا اور کڑا مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ دوستوں سے مل کر رہنے اور اچھے کام میں شریک ہونے سے کیا فائدے ہیں اور علیحدگی اختیار کرنے میں کتنی مشکلیں ہیں۔

اگر کوئی بچہ اسکول کی چیزوں کے استعمال کرنے میں لاپروائی اور بد احتیاطی کرے تو اُسے ان چیزوں کے استعمال کی اجازت نہیں ملتی اور کونسل کے حقوق سے محروم ہو جانا پڑتا ہے۔ ہاں، اگر اتفاقاً کوئی ایسا واقعہ ہو جائے تو اور بات ہے۔

اس طرح بچوں کی یہ آزاد حکومت (سوراج) بہت کامیاب ہے، جس کے باعث تنظیم برقرار رہتی ہے اور بچے بری صحبتوں سے ہمیشہ کے لئے بچے رہتے ہیں۔ امریکہ کے ایک صدر ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"جمہوریت ایک ایسی حکومت ہے جو عوام کی ہو، عوام کے لئے ہو اور عوام ہی کے ذریعہ کی جاتی ہو"

امریکی بچے آج اس مقولے کو عملی شکل دینے کے لئے اپنی محنتوں میں لگے ہوئے ہیں جو آگے چل کر دنیا میں چاروں طرف امن، خوش حالی اور ترقی کے سرسبز باغ لہلہائیں گے۔ چڑیاں امن کے گیت گائیں گی اور پھول امن کی مدھر فضاؤں میں جھومنے لگیں گے۔

"امریکی بچے زندہ باد"

دولت

رضوان رضوی

اس ناٹک میں حصہ لینے والے

کلوّا
بھنوّا
شیرا
راہل
} شہر کے بہت مشہور چور

اور بہت سے دوسرے

پہلا منظر

مقام ۔۔۔۔ ایک سنسان سڑک ۔ وقت ۔۔۔۔ ۲ بجے دن

(ایک سنسان سڑک ہے ۔ اس سڑک پر کلوّا، بھنوّا، شیرا اور راہل ۔ یہ چاروں شہر کے بہت ہی مشہور چور ہیں ۔ ان کی چوریوں اور شرارت سے سارا شہر تنگ آ گیا تھا ۔ حکومت کو ان کی وجہ سے پولیس کا خاص انتظام کرنا پڑا ہے ۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ کسی نے بھی کلوّا، بھنوّا، شیرا اور راہل کو دیکھا نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ ہی نقاب لگا کر چوری کرتے ہیں)

کلوا ۔ بھئی سالے سپاہیوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے ۔

بھنوا ۔ اور سنا ہے کہ چچا منّو بھگت نے وہ دولت کمائی ہے وہ دولت کمائی ہے کہ اب وہ دل کھول کر دان دے رہے ہیں ۔

شیرا ۔ یہ تو واقعی منہ میں پانی بھر آنے کی بات ہے ۔

راہل ۔ مگر بھئی چوری کی کوئی ترکیب نکالیں تو ممکن ہے کہ ہم کامیاب ہو سکیں ۔

بھنوّا ۔ (سنجیدگی سے) ہاں جو وہ پرانا طریقہ تو اب نہیں چلے گا ۔ رات بھر سپاہیوں کا پہرہ جو رہتے

رہتے ہیں۔ اُن کے علاوہ شہر کے
لوگ بھی تو باری باری پہرہ دیتے
ہیں
کلوا۔ تو پھر کرنا کیا چاہیئے؟
شیرا۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔
راہل۔ سوال بڑا ٹیڑھا ہے چوری کی کوئی
نئی ترکیب نکالنا آسان نہیں۔
کلوا۔ صرف ایک ترکیب ہے بس۔
راہل۔ وہ ترکیب کیا ہے؟
بھنوا۔ ترکیب یہ ہے کہ ہم لوگ بازار چلیں
اور ہمیشہ کی طرح چوری کریں۔
شیرا۔ نہیں جی اس طرح چوری ہم لوگ کیوں
کرنے لگے، وہ ترکیب پرانی ہے پٹ
جائیں گے۔ آؤ میں ایک ترکیب بتاؤں
وہ ترکیب یہ ہے کہ ہم لوگ بازار
چلیں اور کسی کی دوکان میں چل کر
دو دو آدمی مار پیٹ شروع کر دیں
گے۔ اور دو دو آدمی کسی دوسری دوکان
کے نزدیک کھڑے رہیں۔ جب وہ دو
مار پیٹ شروع کر دیں گے تو اس
پاس کے لوگ ضرور دوڑیں گے پھر
یہ دونوں اپنا کام کریں گے۔
یعنی جتنا بھی روپیہ ہاتھ لگے گا سب
کو اٹھا کر یہ جا وہ جا۔
کلوا۔ ارے بھئی بہت اچھی ترکیب ہے۔
کیا بات کہی ہے ظالم نے۔ بھگوان تمھیں
چوری میں برکت دے۔
راہل۔ بس تو چلے ہی چلو دیر کس بات کی؟
بھنوا۔ پر یہ بھی تو چوری ہی ہوئی؟
کلوا۔ ارے جانے بھی دو بھئی ایسی چوری میں
بُری بات نہیں سمجھتا۔
(چاروں ہنسنے لگتے ہیں، اور ہنستے ہنستے
چلے جاتے ہیں)

دوسرا منظر

مقام ۔۔۔۔ ایک خوبصورت بازار
وقت ۔۔۔۔ ذرا سی دیر بعد
(ایک خوبصورت سا بازار ہے۔ بازار میں
جگہ بہ جگہ بھیڑ ہی لگی ہوئی ہے اور
کچھ دوکانیں بند ہیں۔ اور خاص کر
منو بھگت (حلوائی) کی دوکان پر بہت
بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بہت سے آدمی ان کے
یہاں سے مٹھائیاں خرید رہے ہیں)

راہل ۔ چچا منو بھگت (حلوائی) کی دوکان پر اتنی بھیڑ کیوں ہے؟ دوکان تو یہاں بہت ہیں۔ لیکن قریب قریب کسی دوکان پر اتنے خریدار نہیں ہیں۔

کلوا ۔ یہ سب سے سستا فروخت کرتے ہیں

بھنوا ۔ (منہ بنا کر) نہیں جی یہ سستا نہیں بیچتے ہیں۔ بلکہ ان کا مزاج اتنا اچھا اور گفتگو اتنی میٹھی ہے کہ لوگ لٹو ہو جاتے ہیں۔

راہل ۔ ارے یار لٹو؟

بھنوا ۔ ارے وہ لٹو نہیں۔ بلکہ یہاں پر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسی کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔

شیرا ۔ میں تو جانتا ہوں کہ ملنسار طبیعت اور میٹھی بات چیت سے سبھی لوگ خوش ہوتے ہیں

راہل ۔ ارے یارو ہم لوگوں کو ملنسار طبیعت اور شیریں گفتگو کی کیا ضرورت ہے ہمیں تو روپیہ چاہیئے روپیہ:۔

کلوا (شیرا اور راہل سے) اچھا خیر چھوڑو، جاؤ تم دونوں جھیش حلوائی کی دوکان پر جا کر اپنا کام کرو۔ اور ہم دونوں منو بھگت (حلوائی) کی دوکان کے پاس ٹھہرتے ہیں۔

راہل۔ بہت اچھی بات ہے۔

(اور پھر دونوں حلوائی کی دوکان کے پاس جا کر مار پیٹ کرنے لگتے ہیں۔ آس پاس کے جتنے لوگ تھے سبھی جھیش کی دوکان کی طرف دوڑ پڑے اور منو بھگت اور اس کے جتنے خریدار تھے وہ سب بھی جھیش کی دوکان کی طرف "کیا ہے؟ کیا ہے؟" کہتے ہوئے دوڑ پڑے اور ادھر بھنوا اور کلوا منو بھگت کی دوکان میں گھس کر روپے ڈھونڈنے لگتے ہیں۔)

کلوا ۔ ارے یہ دیکھو صندوقچہ میں خالی چاندی کے سکّے بھرے پڑے ہیں اور اس تھیلی میں تھاک کا تھاک نوٹ ہے۔ لو صندوقچہ کو تم سر پر اٹھاؤ اور میں تھیلی کو لے کر چلتا ہوں۔

(یہ دونوں صندوقچہ اور تھیلی لے کر وہاں سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر منو بھگت

چھڑانے میں لگے رہے۔

تیسرا منظر

مقام..... ایک سنسان گلی

وقت..... چار بجے دن

(گلی میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان ہے۔ اس مکان میں بھنّوا اور کلّوا ان دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس مکان میں کوئی نہ رہتا تھا وہاں پر بالکل ویرانی ہے)

شیرا۔ (آتے ہوئے) ارے یار کہو کل کتنے روپے ہاتھ لگے۔

کلّوا۔ بس نہ پوچھو یار! ایک تھیلی اور ایک صندوقچہ۔

(شیرا اور راہل یہ سن کر کہ صندوقچہ اور تھیلی میں نوٹ بھرے ہوتے ہیں بہت خوش ہوئے اور سوچا کہ برابر برابر تقسیم کر لیں گے اور خوب مزے اڑائیں گے۔

شیرا۔ بھئی مجھے بھوک معلوم ہو رہی ہے۔ کیونکہ رات بھی ماں نے غصّہ میں کھانا نہیں دیا۔

بھنّوا۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔

کلّوا۔ تو اس صندوقچہ اور تھیلی کو تم رکھو میں مٹھائی لاتا ہوں۔

شیرا۔ (بھنّوا اور کلّوا سے) اچھا تو میں اور راہل اس کو رکھتے ہیں۔ تم دونوں جا کر مٹھائی لے آؤ۔ کیونکہ اب ہم دونوں بالکل تھک چکے ہیں۔ دیکھو نا میری پیٹھ میں بہت سخت چوٹ آئی ہے۔

راہل۔ (شیرا سے) اور تم نے بھی تو مجھے خوب زور سے مارا ہے دیکھو میرا سر ابھی تک درد کر رہا ہے

(بھنّوا اور کلّوا مٹھائی لینے تو چلے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کی نیت میں خرابی آ گئی اور انھوں نے مشورہ کیا کہ مٹھائی میں زہر ملا دیں تاکہ شیرا اور راہل کا خاتمہ ہو جائے اور دولت چار حصوں میں نہ بانٹنی پڑے۔ اور اِدھر شیرا اور راہل نے بھی صلاح کی کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں قتل کر ڈالیں۔ اور پھر جب وہ دونوں وہاں مٹھائی لے کر داخل ہوئے تو کلّوا شیرا اور راہل نے ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ

دیا۔
وہ گھر بالکل سنسان تھا۔ رات میں وہاں کسی کا پہنچنا بالکل ناممکن تھا۔ چنانچہ راہلی اور شیرا کو ڈر بھی نہ لگا۔ بھنوّا اور کلّوا کو مار ڈالنے کے بعد بھی وہ اطمینان سے بیٹھے مٹھائی کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر انہیں نیند آنے لگی اور وہ وہیں سو گئے۔

اور دوسرے دن اخبار میں خبر چھپی کہ شہر کے چار مشہور چور بھنوّا، کلّوا شیرا اور راہلی ایک پرانے مکان میں مرے پائے گئے۔ اور منوبھگت کی دوکان سے جتنی چیزیں چوری ہوئیں تھیں وہ سب وہیں ملیں۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں
منیجر

ایران کی ایک قدیم کہانی

مسافر کی ہوشیاری

ایران میں ایک جگہ نیشا پور ہے۔ وہاں داؤد نامی ایک تاجر رہتا تھا۔ ایک بار وہ اپنے دو ساتھیوں کو لے کر حج کے لئے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ کئی دن کے سفر کے بعد وہ قافلہ ایک بڑے ریگستان میں پہنچا۔ اتفاق کی بات ہے کہ داؤد اور اس کے ساتھی راستہ بھول گئے۔ بے چاروں نے بہت تلاش کیا مگر قافلہ کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ آخر کار یہ لوگ تھک کر ایک کھجور کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ ابھی اُن کو بیٹھے ہوئے زیادہ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ اُن کو سامنے سے ریت اُڑتی دکھائی دی۔ ذرا سی دیر میں انھوں نے دیکھا کہ کوئی آدمی گھوڑے پر سوار اُن کی طرف چلا آ رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سوار نے اُن کے سامنے اپنا گھوڑا روکا اور بولا۔

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ میرے سامنے رکھ دو ورنہ ——"

یہ سُن کر اِن تینوں کے پیروں تلے سے گویا زمین ہی تو نکل گئی۔ مگر اب کرتے کیا، سمجھ گئے کہ یہ ڈاکو ہے اور اس کا کام ہی لوٹ مار کرنا ہے۔ داؤد میاں بڑی

عاجزی سے بولے " ہم غریب مسافر ہیں۔ حج کرنے جارہے تھے۔ اتفاق سے اپنے قافلے سے چھوٹ گئے۔ ہمارے اوپر رحم کیجئے "

سوار آگ بگولا ہوگیا اور بولا " اچھا تو تم اپنے پاس سے خوشی خوشی کچھ دینا نہیں چاہتے !۔ اچھی بات ہے، ابھی میں تم کو ختم کئے دیتا ہوں " یہ کہہ کر اس نے تلوار میان سے نکالی اور گھوڑے سے اترتے اترتے داؤد کے دونوں ساتھیوں کو وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن جیسے ہی وہ داؤد کی طرف بڑھا داؤد نے موقع پاکر اس کی تلوار چھین لی، اور بات کی بات میں ڈاکو کا خاتمہ کر دیا۔ اب داؤد اس کے گھوڑے پر بیٹھا۔ مگر بیچارا راستہ تو جانتا نہ تھا۔ اسی لئے اس نے لگام کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا تیزی سے بڑھا اور ایک طرف کو چل دیا۔ تین چار گھنٹے کے بعد داؤد نے دیکھا کہ سامنے خیمے لگے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور ڈاکوؤں کے خیمے ہیں۔ جیسے ہی گھوڑا رکا خیمے سے لوگ نکل آئے اور لگے چلّانے ـــ " ہمارے سردار کا گھوڑا آگیا، مگر ہمارا سردار نہیں ہے "! چنانچہ سب نے سوالوں کی بوچھار کر دی کہ " ہمارا سردار کہاں ہے ؟"

داؤد نے کہا کہ " میں بہت بھوکا ہوں میلوں کا سفر کرنے کے بعد ادھر آرہا ہوں لہٰذا پہلے مجھے کھانا کھلاؤ تو میں تمہیں اطمینان سے سردار کا حال سناؤں گا "

سردار کے بیوی بچے بھی وہاں موجود تھے۔ وہ پہلے سے ہی پریشان تھے۔ داؤد کو اپنے خیمے میں لے گئے اور کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔ داؤد کھانا کھاتا گیا اور سوچتا گیا کہ اب کیا قصہ گڑھ کر سنانا چاہئیے۔ ذرا سی دیر میں اور ڈاکو بھی آگئے اور اس نے کھانا کھا کر کہنا شروع کیا کہ " بھائیو! تمہارے سردار نے ایک قافلہ پر حملہ کیا تھا۔ تین آدمیوں کو جان سے مار ڈالا۔ لیکن چونکہ ہمارا کارواں بہت بڑا تھا، اس لئے اس پر سینکڑوں آدمی ٹوٹ پڑے اور اس کو پکڑ کر کارواں کے سردار کے پاس لے گئے۔ سردار نے اس کو قتل کرنے کی اجازت دیدی۔ لیکن قافلے کے

کچھ لوگوں نے یہ کہہ کر سزا رکوادی کہ موت کے بجائے اس سے خون کا بدلہ لے لیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ آیندہ کے لئے لوٹ مار کرنے سے توبہ کرے اس پر سردار بھی تیار ہوگیا "۔

" اب یہ طے ہوا کہ تمہارا سردار خون کے بدلے میں دس ہزار دینار[1] دیدے مگر پھر سردار کے پاس وہاں کچھ نہ نکلا۔ اس نے کہا کہ میرے گھر پر تو بہت کچھ ہے اگر تم میں کوئی شخص میرے گھر جائے اور وہاں میرے ساتھیوں اور گھر والوں کو میرا حال سنائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ دس ہزار دینار ضرور دیدینگے۔ قافلے میں سے ہر شخص نے انکار کر دیا۔ کوئی بھی ڈاکوؤں کی بستی میں جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ مگر پھر مجھے اُس پر بڑا رحم آیا اور میں ہمت کرکے چل پڑا "۔

ایک ڈاکو بولا " مگر ہم تمہاری بات پر کیسے یقین کرلیں۔ ہمارا سردار بڑا بہادر ہے۔ وہ اس طرح گرفتار نہیں کیا جاسکتا"

اب تو تمام ڈاکوؤں میں چہ می گوئیاں شروع ہوگئیں۔ لیکن ان میں سے ایک ڈاکو نے کہا۔

" بھائیو! ذرا غور سے سوچو، یہ آدمی ہمارے سردار کے گھوڑے پر آیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ واقعی وہ مصیبت میں پھنسا ہو "۔

جب یہ سہارا ملا تو داؤد نے کہا " جو کچھ میں نے کہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ میں کتنا دُبلا پتلا آدمی ہوں اور میں کس طرح اس کا گھوڑا چھین سکتا ہوں۔ ذرا عقل سے کام لو۔ کہیں یہ ممکن ہے؟ میں اپنے سردار سے صرف دو دن کی مہلت لے کر آیا ہوں۔ اگر تم یہ دو دن کھو دوگے تو بعد میں پچھتاؤ گے "۔

آخرکار ڈاکوؤں نے داؤد کا کہنا مان لیا اور دس نوجوانوں کو دس ہزار دینار دے کر داؤد کے ساتھ کر دیا۔ ریگستان کے ڈاکو سب راستے اور سمتیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ داؤد ان کی مدد سے چار پانچ گھنٹے میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں خود اس کا قافلہ رُکا ہوا تھا۔ داؤد نے ان دسوں

[1] ایک دینار برابر ہے تیرہ روپے چھ آنے کے یعنی ایک پونڈ سکہ انگریزی

آدمیوں کو قافلے سے کچھ دور پر کھڑا کیا اور خود اپنے قافلے کے سردار کے پاس گیا۔ اس کو اپنا دُکھڑا سُنایا اور اس طرح ان دس ڈاکوؤں کے بارے میں بھی بتایا جو دس ہزار دینار لئے کھڑے تھے۔ اس کے بعد وہ ان دسوں ڈاکوؤں کو قافلے کے سردار کے پاس لے گیا۔ سردار نے ان کو فوراً قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ لیکن کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے اُن سے توبہ کرالی کہ وہ آئندہ اس طرح مسافروں کو تنگ نہ کریں گے۔ دسوں ڈاکوؤں نے توبہ کرنے کے بعد اپنی راہ لی اور داؤد کو اتنی مصیبت اٹھانے کے بدلے میں دس ہزار دینار ملے۔



حضرت محمدؐ صلعم کو کون نہیں جانتا۔ یہ مسلمانوں کے رسول ہیں۔ ایک بار اُن کے پاس ایک یہودی آیا۔ اور وہ ان کا پکّا دشمن تھا۔ اس نے کہا کہ میں بہت بھوکا ہوں۔ ایک رات آپ کے یہاں رہنا چاہتا ہوں کیونکہ شام ہو چلی ہے۔ چنانچہ آپ کو اس پر رحم آگیا۔ اور اسے ایک رات اپنے یہاں مہمان رکھا۔ وہ کھانا کھا کر لیٹ گیا اور آدھی رات کو اٹھ کر چار پائی میں پاخانہ کرکے بھاگ گیا۔ آپ جب صبح اُٹھے تو معلوم ہوا کہ یہودی چار پائی کو گندہ کرکے بھاگ گیا ہے۔ سب لوگ کہنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو ابھی ہم اس کو پکڑ کر لاتے ہیں۔ مگر آپ نے منع کر دیا۔ اور بولے "وہ خود اپنے کئے کی سزا پائے گا۔" پھر پانی لے کر آپ نے خود اپنے ہاتھ سے گندگی صاف کی۔ اتفاقاً یہودی اپنی قیمتی تلوار بھول گیا تھا۔ جب اُسے خیال آیا تو بھاگا بھاگا آیا۔ تو آپ نے فرمایا "اگر تم نہ بھی آتے تو میں تمہارے گھر جاکر تلوار دے آتا۔" مگر آپ نے اس سے کوئی شکایت نہیں کی۔ جب یہ منظر یہودی نے دیکھا تو اس کا دل پگھل گیا۔ اور آپ کے قدموں پر گر گیا۔

(اے، اے شمس فریدی)

"نہ لینا ایک نہ دینا دو"

ایک بوڑھا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ بوڑھا کافی دولت مند تھا۔ مگر بیٹیوں کی شادی میں اُس نے اپنی ساری دولت خرچ کردی۔ اس کی بیٹیاں قریب کے ایک گاؤں میں بیاہی گئی تھیں۔ ایک دن اُس سے ملنے کے لئے وہ گاؤں کی طرف چل دیا۔

راستے میں چند لڑکے اینٹوں اور پتھروں سے ایک کچھوے کو مار رہے تھے یہ حال دیکھ کر اُس بوڑھے کو کچھوے پر بڑا ترس آیا۔ اور اس نے لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اور کچھوے کو اپنی کمر پر رکھ کر آگے چل دیا۔ قریب ہی ایک دریا تھا۔ اس میں اس نے کچھوے کو ڈال دیا۔ اور خود پانی پینے بیٹھ گیا۔ اُٹھنے والا ہی تھا کہ کچھوا نکلا اور بوڑھے سے بولا۔

"مہربان تم نے میری جان بچائی ہے اس کے بدلے میں یہ قبول کرو" یہ کہکر اس نے ایک خوبصورت لعل بوڑھے کے پیروں میں ڈال دیا۔ بوڑھا اس لعل کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر ایک اور لعل مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اُسے اُس لعل کی قیمت کا اندازہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کچھوے سے ایک لعل اور وصول کرنا چاہیئے۔ اُس نے لپک کر کچھوے کو پکڑ لیا اور کہا "اس طرح کا ایک لعل اور لادو، ورنہ میں تمہیں انھیں لڑکوں میں پھینک آؤں گا" یہ سن کر کچھوے کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا "اچھا میں لادوں گا" یہ سنتے ہی بوڑھا لالچی خوش ہوگیا۔ اور جھٹ کچھوے کو چھوڑ دیا۔ اب کچھوے نے بوڑھے سے کہا "میں تمہیں اس سے بھی بڑے دو لعل لادوں گا۔ لاؤ یہ مجھے دیدو" بوڑھے نے جھٹ لعل دیدیا۔ تھوڑی کے بعد کچھوے نے پانی سے سر نکال کر کہا "لالچی بوڑھے تجھے لینا ایک نہیں مجھے دینا دو نہیں" اور جھٹ پانی میں چلا گیا۔

(عارف اللہ خاں - رامپور)

سلیقہ مند طاہرہ

ایک چھوٹی سی لڑکی جس کا نام طاہرہ تھا۔ جب وہ چھ مہینے کی ہی تھی تب ہی اس کے باپ مرچکے تھے۔ اس کو اپنی گڑیا کی شادی کا بڑا شوق تھا۔ لیکن طاہرہ کے پاس اتنے پیسے کہاں تھے جو وہ اپنی گڑیا کا جہیز اور اس کے دولہا کے لئے کپڑے تیار کرتی۔

اس نے اپنی سہیلی عذرا سے کہا جو اس سے عمر میں بڑی تھی اور سمجھ دار بھی تھی۔ طاہرہ کو اس نے بہت سے کام سکھادئے تھے۔ کاڑھنا۔ بننا اور کاغذ کے کھلونے وغیرہ بنانا۔ طاہرہ کاغذ کے بہت اچھے کھلونے بنالیتی تھی کیونکہ اس کام کو اس نے بڑی دلچسپی سے سیکھا تھا۔

عذرا نے اس کو یہ ترکیب بتائی کہ وہ کاغذ کے کھلونے بنائے۔ عذرا اپنے بھائی سلمان سے اس کو بکوا دیا کرے گی۔ اس طرح طاہرہ کے پاس پیسے جمع ہو جائیں گے اور وہ گڑیا کی شادی کر سکے گی۔

طاہرہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور بھاگ کر اپنا مٹی کا وہ خزانہ اٹھا لائی جس میں اس نے ایک ایک پیسہ ڈال کر کچھ دام جمع کئے تھے۔ اور لاکر عذرا کو دے دیا عذرا نے خزانہ توڑ کر پیسے نکالے جو سب ملا کر سوا چھ آنے ہوئے۔ عذرا نے اپنے بھائی سلمان سے ان پیسوں کا کھلونے بنانے کا سامان منگا کر طاہرہ کو دیدیا۔ دفتی، رنگین کاغذ اور چمک دار پنّی۔ یہ سب چیزیں منگائیں اور طاہرہ سے کہا کر لو اب تم ان کے کھلونے بناؤ۔

طاہرہ سب سامان لے کر اپنے گھر آگئی اس نے پہلے لیئی پکائی پھر دفتی، رنگین کاغذ، پنّی، چاقو اور قینچی، یہ سب سامان لے کر کھلونے بنانے بیٹھی اور اس نے شام تک بڑی محنت سے تین کھلونے بنائے ایک خرگوش کا پنجرہ، ایک گول میز اور ایک بچے کی گاڑی — اب وہ ان کھلونوں کو لے کر عذرا کے پاس گئی۔

" دیکھئے عذرا آپا یہ کھلونے کیسے بنے ہیں؟"

" واہ وا۔ طاہرہ شاباش بھئی تم نے تو کمال کر دیا۔ بڑے خوبصورت کھلونے بنائے اور کتنی صفائی سے۔ بس اب تم دو تین ہفتے ایسے ہی دل لگا کر کھلونے بنا لو تو پھر تمہاری گڑیا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو جائے گی۔"

عذرا نے سلمان کو بلا کر کھلونے دکھائے سلمان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کو کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ اتنے اچھے کھلونے طاہرہ نے بنائے ہیں۔

نواب حیدر بخش کے لڑکے سلمان کے دوست تھے۔ سلمان کھلونے لے کر ان کے پاس گیا وہ دیکھتے ہی لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور ایک ایک کھلونا آٹھ آٹھ آنے میں خرید لیا۔ سلمان ایک روپیہ آٹھ آنے لے کر واپس آیا اور عذرا کو دئیے۔ عذرا نے طاہرہ کو دکھائے طاہرہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا وہ مارے خوشی کے ناچنے لگی۔

اسی طرح طاہرہ نے دو ہفتہ تک لگاتار محنت اور جانفشانی سے دس روپے جمع کر لئے اور پھر اپنی گڑیا کا جہیز اور اس کے دولہا کے لئے کپڑے اور چیزیں بنائیں۔

گڑیا کے جہیز کا سامان خود طاہرہ کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا۔ گڑیا کے جہیز کے میز پوش، کشتی پوش، تکئے کے غلاف، مسہری کی چادریں اور ٹی کوزی وغیرہ سب طاہرہ نے اپنے ہاتھ سے بُنے اور کاڑھے تھے۔ طاہرہ نے اپنے گڈے داماد کو سلامی میں ایک بڑی سی کار بھی دی جو اس کے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تھی۔۔۔۔ اس طرح طاہرہ کی گڑیا کی شادی ہوئی۔

(اسماءالسہیل فریدی)

جن خانوں کے عدد تین سے تقسیم ہو سکتے ہیں

ان میں رنگ بھریئے

پھر دیکھئے کیا بنتا ہے



۲ کے بعد ۴، ۶ اور اسی طرح
ترتیب وار نقطوں کو ملایئے پھر دیکھئے
کیا بنتا ہے۔

صحیح حل معما نمبر ۱۶
دائیں سے بائیں
۱۔ اردو
۴۔ چراغ
۵۔ عبادت
۷۔ منزل
۱۰۔ ماؤ

معما نمبر ۱۶ کا نتیجہ

صحیح حل معما نمبر ۱۶
اوپر سے نیچے
۱۔ انعام
۲۔ فصل
۶۔ قلم
۸۔ نم
۹۔ دو

سات صحیح حل موصول ہوئے

پہلا انعام مبلغ سات روپیہ بحساب ایک روپیہ فی کس تقسیم کیا گیا۔

(۱) شریفہ بیگم عثمانی جودھپور (۲) سلیم الدین دہلی (۳) وقار احمد انبالہ (۴) بدرالنساء اجمیر (۵) رام پرکاش امرتسر (۶) وارث علی۔ علیگڈھ (۷) شمشاد احمد بریلی۔

ایک غلطی والے ۱۰ حل بحساب ۸/ فی کس تقسیم کیا گیا۔

(۱) صلاح الدین ضلع گیا (۲) ظہیر احمد بھوپال (۳) عابدہ بیگم ضلع نظام آباد (۴) محمد احمد ایٹاؤ (۵) نونہال کلب ہانسوٹ (۶) امتیاز علی دہلی (۷) سیدہ زینت سلطان المورڑہ (۸) بھگوان داس کیرانہ (۹) مامونہ بیگم جودھپور (۱۰) بلقیس بیگم دہلی۔

دو غلطی والے سولہ حل آئے ان میں ۳/ فی کس تقسیم کیا گیا۔

(۱) سردار جنیا سنگھ بھاٹبہ (۲) اکبر علی برہانپور (۳) محمد یوسف ہبلی (۴) شاہ ولی اللہ گوموہ (۵) سید محمد مسعود علی شاجاپور (۶) عبدالرؤف خاں جبلپور (۷) کلیم اللہ نلورگ (۸) گوردیال سنگھ جمشید پور (۹) اقبال حسین ایت محل (۱۰) ظفر علی جھنگل (۱۱) طاہر سلیم ضلع عثمان آباد (۱۲) سید یوسف اختر زکی کوروائی (۱۳) گوردیال سنگھ ٹاٹانگر (۱۴) لطف اللہ گورکھپور (۱۵) محمد یونس لکھنؤ (۱۶) معین الدین پٹنہ۔

معما نمبر ۱۸ کے حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰/ دسمبر ۵۲ء ہے

۱۵ روپے کے نقد انعامات

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

فیس دا
ٹکٹ کی ...

داخلے کی آخری تاریخ ۲۰ر دسمبر ۵۲ء ہے۔

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۷ روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی پر ۵ روپے۔ تیسرا انعام د...
پر ۳ روپے۔

پیامی معمّا نمبر ۱۸

دائیں سے بائیں

(۱) سب سے اچھا ــــ ہمارا۔

(۲) مانگ کر کھانے والے ہی تو ــــ سمجھے جاتے ہیں۔ (حقیر۔ فقیر) چار حرفی

(۵)۔ اس سے بارش کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے (بدلی۔ بجلی)

(۸)۔ اس سے آپ بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں (ادیب۔ امیر)

(۹)۔ اسے ہر شخص عزیز رکھتا ہے۔ (نسیم۔ ندیم)

(۷) انسانی زندگی کے لئے بہت ضروری۔
(آگ۔ ...

اوپر سے نیچے

(۲) اسے حاصل کرنے کے بعد پھر چین مشکل سے ہی نصیب ہوتا ہے۔ (راج۔ تاج)

(۳) بہت سے لوگ دولت کو ــــ بھی سمجھتے ہیں۔ (لعنت۔ نعمت)

(۶) اس سے کام لینے سے عموماً نقصان ہی ہوتا ہے۔ (قہر۔ مہر)

معمّا نمبر ۱۸

۱ د	ی	س				در
۲ ح	ق	ی	ر			ا
۵ ب	ح	ل	ی			ج
۷ ق	۸ آ					
ہ	۹ ب	ا	ح	ی	ب	
ر			ون	س	.	

کوپن پیام معمّا نمبر ۱۸

نام ....

پتہ ....

....

ہندوستانیوں کے الگ الگ لباس






Regd. No. D. 96.
DECEMBER 1952.